



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْأَذْرَارُ عَلَيْكَ

پیش لفظ

”ہوشربا“ کا تیرا ایڈیشن اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ناول ”اخبار جہاں پبلی کیشنز“ کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ امید ہے، اس ایڈیشن کو بھی سابقہ ایڈیشنوں کی طرح پذیرائی حاصل ہوگی۔

یہ ناول ہوشربا واقعات کا ایسا صحراء ہے جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ آدمی جب انوکھے واقعات سے بھرے اس صحراء میں قدم رکھتا ہے تو وہ ان کے ظلم میں کھو جاتا ہے۔ ”ہوشربا“ ایسے بھائی بہن کی داستان ہے، جنہوں نے نہ صرف اپنوں کے ظلم ہے بلکہ غیر انسانی مخلوق کے ہاتھوں بھی بُری طرح ستائے گئے۔ ذرا اُس لڑکی کے ذکھ کا اندازہ سمجھ جس کا باپ کوئی اور تھا، اور وہ بیٹی کسی اور کی کھلاتی تھی اور اس کم سن لڑکے کو تصور میں لایے جس کے پچانے جائداد کی خاطر اُس کے باپ کو قتل کر دیا اور اس لڑکے کی بھی جان لینے کے لئے اُسے قاتلوں کے حوالے کر دیا۔ جب بہن کو سارے حقائق کا علم ہوا تو وہ اپنے بھائی کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور یوں ایک ہوشربا داستان کا آغاز ہوا۔

یہ ایک تخلیقی ناول ہے، اس ناول کا تاثر اتنا گہر اور گرفت اتنی مضبوط ہے کہ پڑھنے والا تمہیر کے محسن میں گم ہو جاتا ہے۔ منظر کشی ایسی کہ پورا ماہول آنکھوں کے سامنے جاگ امتحنا ہے۔ کردار متحرک ہو کر متغیر کر دیتے ہیں۔ یہی انوار علیگی کا کمال ہے۔ ان کا فسانہ، حقیقت بن کر دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

ہوشربا ایک ایسا توانا، بھرپور اور سدا بہار ناول ہے جسے وقت کی گرد سبھی پرانا نہ کر سکے گی۔

(میر جاوید رحمن)

ہوائیں جیخ رہی تھیں۔ موسلا دھار بارش جاری تھی۔ رات کے دو بجے تھے۔ ہولناک تاریک رات،
گرجتے بادل، کڑکتی بکلی، بارش کے شور اور دروازے بجاتی ہوا نے ماہول کو پُر آسیب بنا دیا تھا۔
ایسے میں اس نے وہ خواب پھر سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک عجیب خواب تھا۔ بیت ناک، خوفزدہ اور سما
دینے والا..... اس خواب کو وہ اب لوٹا تر سے دیکھنے لگی تھی۔ آج جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے جسم پر
کچپی طاری تھی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ پسلے تو
اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اس کی آنکھ کھل گئی ہے یادوں ابھی تک خواب دیکھ رہی ہے۔
وہ ابھی ایک گھنہ پسلے ہی تو سوئی تھی۔ آج شام سے اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی دل پر کچھ بوجھ سا تھا۔
آج اس سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چل قدمی کے لئے ضرور
نکلنی تھی۔ آج وہ ٹلنے بھی نہ نکلی تھی، میں تھوڑا سا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔
کچھ درودہ ٹوی کے مختلف چیل گھماتی رہی۔ ایک چیل پر انگریزی فلم آرہی تھی۔ وہ دیکھنے بیٹھ گئی۔
فلم بارہ بجے کے قریب ختم ہوئی۔ اس نے ٹوی بند کر دیا فلم پر اسرار تھی اس کے کئی مناظر بار بار اس کی
نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ یونہی کمرے سے نکل کر گلیری میں آگئی اور باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ صحیح
قریب کے درخت سے ایک پرندہ اڑا اور تیزی سے اس کے سر کے پاس سے گزر گیا۔ وہ ایک دم سم
گئی۔ وہ کافی بڑا پرندہ تھا۔ چیل جتنا بڑا تو ہو گا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ رات کے بارہ بجے آخر کس
پرندے کو اڑانے کی ضرورت پیش آئی۔ اسے کچھ یوں احساس ہوا جیسے وہ پرندہ اسے گلیری میں دیکھ کر اس
کی طرف لپکتا تھا۔ اس خیال نے اسے سما دیا۔ وہ فوراً کمرے میں آگئی۔ دروازہ اچھی طرح بند کیا اور بست
پائیٹ گئی۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ایک تو پر اسرار فلم کا اثر پھر اس پرندے کا نہایت قریب سے گزر

اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ کر وہ ذر کر جانے لگتی تو چیچے سے آواز آتی۔
”ڈرمٹ آؤ جھونپسی کے اندر آجائو۔“

یہ کسی مرد کی آواز ہوتی۔ پکارنے والے کی آواز میں ایک درد کی کیفیت ہوتی جیسے بلانے والا کسی تکلیف میں بنتا ہوا اور اپنی مدد کے لئے کسی کو اندر بلانا چاہتا ہو۔
اس آواز پر وہ پلٹ کر دیکھتی تو پکارنے والا تو دکھائی نہ دیتا بتہ وہ سانپ اچانک اس کی طرف چھپتا۔
اور وہ چیخ مار کر دوڑنے لگتی۔ تب ہی گھبرا کر اس کی آنکھ کھل جاتی۔
اس وقت بھی اس نے یہی خواب دیکھا تھا لوقت صحراء، گول جھونپسی کی چھٹ پر بیٹھا تھا اسے سانپ اور اندر سے آتی آواز۔
”ڈرمٹ آؤ جھونپسی کے اندر آجائو۔“

اس نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا تھا کہ وہ اس آواز کو پہچان جائے۔ لیکن وہ پہچان نہیں سکی تھی۔
یہ آواز قطعاً اپنی تھی۔ اس کے کسی عزیز، رشتے دار یا جانے والے کی آوازنہ تھی۔
وہ ایک نذر لڑکی تھی لیکن اس خواب نے اس کی جرأت مندی میں درازیں ڈالتا شروع کر دی تھیں۔
اب وہ سوچنے لگی تھی کہ کل سے وہ یخچے سوکے گی یا پھر اپنے ساتھ کہرے میں کسی کو سلاٹے گی لیکن ملاٹے گی کس کو لے دے کے ایک دردانہ تھی جو اس کے ساتھ سوکتی تھی یا پھر غالباً فرزانہ تھیں..... مگر وہ اپر نہیں آسکتی تھیں۔ وہ گھٹکی مربیں تھیں۔ سیرھیاں چڑھاناں کے بس کی بات نہ تھی۔ بس یہی ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے کرے میں جا کر سوچائے۔
انہیں تک اس نے اپنایا خواب کسی کو نہیں بتایا تھا غالباً فرزانہ کو بھی نہیں لیکن اب اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ چھ ہوتے ہی خالہ فرزانہ کو اپنایا خواب ضور بیتاے گی۔
یوں تو انہیں اس کی عمر خیر سے خواب دیکھنے والی تھی۔ سامنے اور میٹھے خواب اس عمر میں لڑکیاں ایسے پڑا اسراز اور خوفزدہ کرنے والے خواب کماں دیکھتی ہیں؟ انہیں تو ہر طرف گھوڑے پر سوار ایک خبر و شنزراہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنی اپنی پسند کے مطابق اپنے اپنے آئیندیں کے خواب دیکھتی ہیں۔ وہ کون ہو گا؟
کماں سے آئے گا؟ کب آئے گا؟

لڑکیاں ہی کیا خواب تو بھی دیکھتے ہیں۔ کیا بڑھے؟ کیا بچے؟ کیا جوان؟ اپنی اپنی نا آسودہ خواہشوں کو آسودہ کرنے کے لئے۔ عمر طبعی کا آدھا حصہ انسان آنکھیں بند کر کے گزار دیتا ہے یہ بند آنکھیں کس قدر نعمت ہیں یہ بات کوئی ان لوگوں نے پوچھئے جو راتیں کروٹیں بدلت کر کھلی آنکھوں سے گزار دیتے ہیں۔ نیند اور خواب اور والے کا تحفہ ہیں۔ اگر انسان سے اس کی نیند، اس کے خواب چھین لئے جائیں تو یہ زندگی چشم بن جائے۔ کیسی عذاب ناک ہو جائے۔
یہ خواب غریب کو ایم برہاتے ہیں اور کنواروں کو شادی شدہ وہ تو غدا کا شکر ہے کہ ان خوابوں پر کوئی احتساب نہیں انسان کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے اگر یہ خواب قابل تعریر ہو جائیں تو کیسے کیسے معصوم کیسی کیسی سزا پائیں۔

جانا۔ اس نے سوچا کہ وہ نیچے جا کر سوجائے یا نیچے سے کسی کو اپنے پاس بلائے لیکن یہ دونوں صورتیں اسے مناسب محسوس نہ ہوئیں۔ کیشوں کے ریک سے اس نے ایک کیسٹ منتخب کیا اور میوزک سننے لگی۔

وہی موسیقی کے اس کیسٹ نے دھیرے وہیرے اس پر اڑ کر ناشروع کیا اسے نیند آنے لگی۔ اس نے لیٹنے لیٹنے ریبوٹ کنٹرول سے کیسٹ پلیسٹ آف کیا اور کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اچانک ہی اسے پروں کی پھر پھر پھر اہٹ شانکی دی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی پرندہ اس کے سر پر سے گزر گیا ہو۔ وہ فوراً ہی ابھی کر پیٹھے گئی۔ کمرے کی لائٹ روشن تھی جب سے پراسرار خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کمرے میں لاست جلا کر سوچی تھی۔ دروازہ بھی بند تھا۔ کسی پرندے کے اس کے سر پر سے گزر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہ محض اسکا وہم تھا۔ اپنے اس خیال پر اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ روز بروز اس قدر ڈرپوک کیوں ہوتی جا رہی تھی۔

ریبوٹ کنٹرول اٹھا کر اس نے کیسٹ پلیسٹ پھر آن کر دیا۔ لوری دیتی ہوئی موسیقی پھر سے کمرے میں سنائی دینے لگی۔ موسیقی سنتے سنتے بالا خودہ نیند کے آغوش میں چلی گئی۔

انہیں وہ ایک گھنٹہ ہی سوئی ہو گی کہ اس ڈراؤنے خواب نے اچانک اس کی نیند کا قفل کھول دیا۔ جب وہ سوئی تھی تو دور تک بارش کے آثار نہ تھے۔ آنکھ کھلی تو فضا کارگ ہی کچھ اور تھا کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ انہی خواب دیکھ رہی ہے یا جاگ گئی ہے۔

کیسی دور پارادول کی گزگڑاہٹ شانکی دی۔ اچانک ہی بجلی بڑے زور سے چکی اور باہر دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ گھبرا کر ابھی بھی تک آن تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاپ رہے تھے۔ دل کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ ریبوٹ کنٹرول اٹھا کر کیسٹ پلیسٹ آف کر دے۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس درست ہوئے، اعصاب قابو میں آئے تو اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی نکالا اور غٹ غٹ کر کے پی گئی۔ کچھ اس طرح جیسے صدیوں سے پیا ہو، خنک حلقات تھے۔ ماڈ فن کھلا تو اسے وہ خواب یا وہ آیا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

یہ عجیب خواب وہ کئی ماہ سے دیکھ رہی تھی۔ شروع میں یہ خواب مینے دو مینے کے بعد نظر آتا تھا۔ پھر دھیرے وہ قفن کم ہونے لگا ہفتہ، دس دن کے بعد راب روز ہی یہ خواب نظر آئے لگا مگر پچھلے پانچ روز سے وہ اس خواب کو مسلسل دیکھ رہی تھی۔

وہ دیکھتی کہ اندر ہیری رات ہے۔ کیسی دور سے بھیڑیوں کی غرامہٹ کی آواز آرہی ہے۔ پھر اچانک ہی تاریک رات ایک روشن دن میں تبدیل ہو جاتی۔ اب اسے ایک لق لق دیکھا دیتا دور تک بڑا اور گرم ریت پر چلتے چلتے ریت اڑتی دکھائی دیتی۔ اس صحرائیں وہ خود کو بھکٹا محسوس کرتی۔ نیگے پاؤں اور گرم ریت پر چلتے چلتے اچانک ایک جھونپسی اس کے سامنے آ جاتی۔ اس جھونپسی کی چھٹ پر اسے ایک اتو بیٹھا دکھائی دیتا اور جھونپسی کے دروازے پر کنٹلی مارے ایک سانپ کا لے رنگ کا پھن اٹھائے بار بار زبان کا لات نظر آتا۔

”وہ کیسے خالد؟“ اس نے بخش سے پوچھا۔

”نُبُر کی نماز پڑھتے پڑھتے اپنے خالقِ حقیقی سے جاتے گھر کے افراد جب اٹھتے تو انہوں نے انہیں سجدے میں پایا۔ وہ قضاہ نماز پڑھنے کے عادی نہ تھے اور نُبُر کا وقت کب کا قضاہ ہو چکا تھا پہلے انہیں آوازی گئی وہ جائے نماز پر ہوتے تو اٹھتے پھر ہاتھ لگایا گیا ہاتھ لگاتے ہی وہ ایک طرف کو لڑک گئے۔“ خالد فرزانہ نے گراٹھنڈا سانس لیا۔

”خالد، کیا عمر ہو گی دادا کی۔“

”بس ایک سال کی کسرہ گئی، اگر ایک سال اور جی جاتے تو پورے سو سال کے ہو جاتے۔“

”واقعی خالد، اتنی عمر تھی ان کی۔“

”اب تو وہ دوبارہ سے جوان ہونے لگے تھے۔ بال کا لے ہو رہے تھے اور دانت دوبارہ ابھر رہے تھے۔“

”رہنے دیں خالد۔“ اس مرتبہ افضل بولا۔ اسے خالد کی بات پر جیسے لیکن نہ آیا۔

”کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ خالہ فرزانہ نے ناراضی سے کہا۔

”یہ کون کہ رہا ہے لیکن خالد کیا یہ انوکھی بات نہیں۔“ افضل نے بڑے مُؤبدانہ لبجے میں کہا۔

”تم نے کب دیکھا تھا انہیں۔“

”میں دو سال پہلے ان کے گھر گیا تھا تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔“ افضل نے بتایا۔

”اور تم نے کب دیکھا تھا۔“ خالد اس مرتبہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

”میں تو خالہ چھلی عورت پر انہیں سلام کرنے گئی تھی۔“

”تم دونوں کو ملے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا یہ بات ابھی تین چار ماہ پہلے کی ہے فرخہ آپا ہمارے گھر آئی تھیں انہوں نے بتایا تھا۔“

”خالد کیا یہ بچ ہے۔ کیا واقعی مرد سو سال کا ہو کر جوان ہونے لگتا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”او، باو!..... یہ مرد بوڑھے ہوتے ہی کب ہیں۔“ خالہ فرزانہ نے ایک جاندار تقدیر لگا کر لاما۔

”خالد، یہ محض ایک مفروضہ ہے۔“ افضل نے پلٹ کر کہا۔ ”اس بات میں کوئی صداقت نہیں سب مرد بوڑھے ہو جاتے ہیں بلکہ میں نے جوان بوڑھے بھی دیکھے ہیں۔“ افضل خالد کی طرف دکھ کر لالا۔

”اچھا، گاڑی سامنے دیکھ کر چلا۔“ خالہ فرزانہ نے بات کا رخ دوسرا طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”ایک بات اور مشورہ ہے انا کے بارے میں وہ خواب کی تعبیر بست اچھی بتاتے تھے۔“

”یہ خالد۔“ وہ ایک دم جو نک گئی۔ اور سوچنے لگی ہائے دادا عظیم آپ نے جانے میں اتنی جلدی

”وں کی۔ کاش! وہ اپنا خواب انہیں سن سکتی اور ان سے رہنمائی حاصل کر سکتی۔“

اسے دکھائی دینے والا یہ خواب اس کے لئے کسی سزا سے کم نہ تھا۔ وہ سوچ کر ہلکا ہوئی جا رہی تھی کہ آخر سے یہ سزا کیوں مل رہی تھی۔ وہ خواب اس پر کیوں مسلط کر دیا گیا تھا۔ اس دل ہلا دینے والے خواب کے بارے میں سوچتے سوچتے بالآخر سے نیند آگئی۔

صح اگر دروانہ اسے آکر نہ اٹھاتی تو وہ نہ جانے کب تک سوئی رہتی۔

”بی بی کیا را را دے ہے۔ آج اٹھنا نہیں کیا؟“ دروانہ نے اس کا بازو ہلا کیا۔

”دروانہ، کیا بجا ہے؟“ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

”بہت کچھ نجع گیا ہی بی اور بہت کچھ ہو گیا۔ اب اٹھ جاؤ۔“

”کیا ہو گیا؟“ وہ ایک دم جو نک گئی۔ رات کا خواب بڑی سرعت سے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ ”خیر تو ہے، دروانہ؟“

”ہاں، بی بی..... خیر ہے۔ پریشانی والی بات کوئی نہیں۔ وہ آپ کے ایک دا اٹھنا..... ارے وہی دادا عظیم..... وہ جی چل بے گھر کے سب لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

”ارے، دروانہ تم نے پھر مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟“ وہ تینی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم بھی حد کرتی ہو۔“

”اوہ بولی بی۔ ابھی فون آیا ہے۔ بڑی بی بی نے جیسے ہی مجھ سے کہا۔ میں فوراً آپ کو اٹھانے آگئی ہوں۔“

”کیا خالد بھی جا رہی ہیں وہاں؟“

”جارہی ہیں؟..... وہ تو دروازے پر کھڑی ہیں تیار ہیں جانے کے لئے۔“

”اچھا، دروانہ، تم خالہ سے کہو، میں منہ وہو رفرائیجے آرہی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر باٹھ دروم کی طرف بڑھی۔ ”میرا انتظار کریں، میں انہی کے ساتھ جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے بی بی..... آپ ذرا جلدی سے آ جائیں۔“

وہ جلدی جلدی تیار ہو کر نیچے پکنچی۔ لا تیس دھاناشت کیا اور پھر وہ خالہ فرزانہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

افضل جو زرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اس نے ذرا ساتھ چھا ہو کر اسے دیکھا اور بولا۔ ”آج آپ کچھ زیادہ دیر سے نہیں انہیں۔؟“

”ہاں بھائی، آج کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

یہ جواب دے کر اسے فوراً ہی گزری ہوئی بھیانک رات یاد آگئی تھی۔ وہ خوناک خواب اس کی نظریوں میں گھوم گیا تھا اس نے دھیان ہلانے کے لئے ایسے ہی خالہ فرزانہ سے پوچھا۔ ”خالد دادا عظیم کا انتقال کب ہوا۔؟“

”صح نُبُر کے وقت۔“ خالہ فرزانہ نے بتایا۔ ”برے خوش نصیب شخص تھے وہ، اللہ ایسی موت سب کو دے۔“

”اہ، میں نے ان کے غصے سے تگ آکر ایک عامل سے عمل کروایا تھا۔“ آصفہ نے اکشاف کیا۔

”اری کم بخت کیا عامل؟“ اماں کا پارہ اچانک چڑھ گیا۔ ”تجھے موت آئے تو نے میرے بیٹے کا کیا حال کر دیا۔“

”اماں، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ معاف کرویں۔“

”بیتا تو سی۔ آخر ہوا کیا؟“ شاکر کی اماں نے غصے سے پوچھا۔

”پھر رورو کر آصفہ نے پورا قصہ سنایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاکر غصے کا بست تیز تھا۔ اس کا غصہ خاندان بھر میں مشورہ تھا کہانے میں اگر نمک تیر ہو گیا تو کھانے کی پلیٹ اخہار پھینک دیں۔ کپڑے استرنی نہ ہوں، جوتے پاش نہ ہوں، قیسیں کا کوئی بین نہ ٹھانکل آئے۔ وقت پر کھانا نہ ملے، کھونی گرم چائے نہ ملے غرض ذرا کی کوتاہی ہوتی اور قیامت آجائی۔ زندگی بھر کام کوئی کیا نہیں زیمندار آؤی تھے۔ زمینوں سے اس قدر آمدی تھی کہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پھر شوق بھی سارے تھے شکار کھیلانا، پتگ بازی، سیر و ترقی وغیرہ وغیرہ۔ ایک دن کسی بات پر شاکر نے آصفہ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ وہ پسلی اس کی عادتوں سے تگ تھی کہ مارپیٹ نے اسے بالکل ہی باذلا کر دیا کسی پرودن نے کسی عالم کا پتہ بتا دیا وہ اس سے ملنے چل گئی عامل نے ساری بات سن کر اسے تلی دی اور کہا کہ وہ اسے ایک الوفراہم کروے تو وہ اس کے خون سے تعویذ لکھ دے گا۔ اس تعویذ کو شاکر کے سکنے میں سنا ہو گا تعویذ کے اڑ سے نہ صرف شاکر کا غصہ ختم ہو جائے گا بلکہ وہ اس کا مطیع اور فرمانبردار ہو جائے گا اندھے کو کیا چاہتیں وہ آنکھیں اس نے ایک پر لیں مار کیتے سے ایک الوفراہم خاصہ منگالا خیر وہ اتو عامل کے حوالے کر دیا گیا عامل سفی علم کا ماہر تھا اس نے ایک مگزی رقم لے کر تعویذ کے حوالے کر دیا۔

آصفہ نے اس تعویذ کو بہت احتیاط سے ہدایت کے مطابق شاکر کے سکنے میں سی دیا۔ اس عامل نے کہا تھا کہ شوہر کے مطیع ہونے کے تین ماہ بعد اس تعویذ کو نکال کر سمندر میں پھینک دیا جائے۔ اس تعویذ نے واقعی اثر دھکایا شاکر کا مزارج تبدیل ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ غصہ ہوا ہوا۔ ساری شوقین مزاہی کو اگ گئی اور شاکر آصفہ کی پتی پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آصفہ کی زندگی میں بھار آگئی۔ عامل نے تین ماہ کا عرصہ دیا تھا مگر وہ لاٹیں میں آگئی۔ اس انتظار میں وقت گزارتی گئی کہ ابھی اور مطیع ہو جائے فرمانبرداری میں مزید اضافہ ہو جائے اب وہ بے چارہ تخت پر کسی الوفی طرح ساکت و جامد بیمارہ تھا اس طرح تعویذ کرائے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ آصفہ بھول ہی گئی یا پھر اس نے دانستہ بھولا دیا کہ عامل نے کیا ہائی کی تھی۔

اب آہستہ آہستہ شاکر کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ ملائج جاری تھا ڈاکٹر ڈاکٹر بدالے جا رہے تھے میٹنے سے منگلے نیٹ ہو رہے تھے پسہ پانی کی طرح بیا جا رہا تھا مگر اس کی طبیعت سخنچے میں نہیں آری تھی اور ایک دن تو اس کی طبیعت اس قدر خراب ہوئی کہ گھر میں رونا پیٹنا بچ گیا تھا اس کی گیاتر گھبرا کر آصفہ نے شاکر کے پاؤں کپڑے لئے معافی مانگی اور سارا قصہ بتایا۔

”ہاں، یہ تجھے ہے۔“ خالہ فرزانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”خالہ، ایک بات بتائیں۔ الوکے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”ارے، یہ تمیں اچانک آلو کا خیال کیے آگیا۔“ خالہ فرزانہ بڑی حیران تھیں۔ ”مغرب والے اسے لفڑی سمجھتے ہیں عقل و دانش کی علامت جانتے ہیں مغرب کے ایک بڑے پیلسنر نے الوکی تصویر کو بطور مونوگرام اپنایا ہوا ہے اور مشرق والے الو کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ کسی کوبے وقوف کہنا ہو تو اسے الو کہہ دیتے ہیں۔“

”عقل مند بے وقوف کا تو تجھے معلوم نہیں البتہ اپنے بڑوں سے اس کی خوبست کے بارے میں ضرور نہیں ہے الوجہ بیٹھتے ہیں وہاں ویرانی پھیلنے لگتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے الوبولے کا محاذہ بناتے ہے ویسے ایک بات ہے۔“ یہ کہ خالہ چب ہو گئیں اپنے ریشمی بٹوے سے پان کی ڈسیہ نکالی، پان کھایا اور جلدی جلدی منہ چلانے لگی۔

”ہاں خالہ، کیا بات؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”جادو ٹونے کے کام آتا ہے۔“

”وہ کیسے خالہ۔“ اس نے پوچھا۔

”چی بات ہے مجھے تو ان جادو ٹونوں پر یقین نہیں ہے لیکن ایک واقع میں اپنی آنکھ سے دیکھے چکی ہوں۔“

”وہ آصفہ پچی والاتونیں۔؟“ افضل نے پوچھا۔

”ہاں وی۔“ خالہ فرزانہ نے تصدیق کی۔ ”تمیں معلوم ہے ہاں تم نے کمال سنا ہو گا ان دونوں تم بیساں کمال تھیں۔“

”کیا ہوا خالہ؟“ وہ ایک وہ چونک کر بولی۔

”ہونا کیا ہے بیٹی آصفہ کا شوہر ایک مرتبہ بیمار ہوا اور یہ بیماری طول پکننی لگی۔“ زینا بھر کے ڈاکٹروں کو دکھالیا، ہر طرح کے ٹیسٹ کرالئے مگر کوئی بیماری تشخیص نہ ہو پائی۔ شیشوں کی روپورٹیں ویکھ کر ہر ڈاکٹر کی جواب دیتا کہ انہیں کوئی بیماری نہیں لیکن بیماری تو انہیں تھی وہ روز بروز کمزور ہوتے ٹپے جا رہے تھے۔ ایک دن تو اتنی حالت خراب ہوئی کہ رونا پیٹنا بچ گیا آصفہ کو جانے کیا ہوا کہ وہ اپنے شوہر شاکر کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی اور وحاظیں، مار مار کر رونے لگی۔ روٹی جاتی تھی اور کھتی جاتی تھی۔

”ہائے شاکر مجھے معاف کر دو، مجھ سے غلطی ہو گئی۔“

”جس نے یہ سنا دہ پر شان ہوا، شاکر کی اماں اس وقت حیات تھیں۔ ان کے کان کھڑے ہوئے وہ جھاگی ہوئی آئیں اور آصفہ سے پوچھا۔“ ”لہن کیا ہوا؟ تم کیوں معافی مانگ رہی ہو؟“

”اماں آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔“ آصفہ نے روٹے ہوئے کہا۔

”آخر ہوا کیا؟ کچھ تو بتاؤ۔“ شاکر کی اسی جھنچلا کر بولیں۔

”ویکھیں خالہ مجھے کچھ ملت کئے گا میں نے آج تک کسی عورت کو نہیں ستایا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے اور نہ آئندہ کرنے کا راہ ہے۔“

”افضل تو کیا نوارے ہی اٹھ جانے کا راہ ہے۔“ خالہ نے ہنس کر وار کیا۔

”ہاں خالہ آپ کا بھانجا جو ہوا، آپ کے نقش قدم پر چلوں گا۔“ افضل بھال کہاں پوئے والا تھا۔

”افضل دیکھے میری مثال مت دینا، میرا کچھ اور معاملہ ہے۔“ خالہ فروہی سنجیدہ ہو گئیں۔

”اچھا چھوڑیں خالہ، یہ بور ہو رہی ہیں، آپ آصفہ پچی کی بات کریں۔“ افضل نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”بُن اب آصفہ کی بات کیا کروں۔ نہ آصفہ رہی، نہ شاکر رہا، کتنے ہیں کہ شاکر کی قبر پر آج بھی ایک الوبیتھار ہتا ہے۔“ خالہ فرزانہ نے انکشاف کیا۔

”خالہ ایک بات تو تکھی نہیں سنی۔“ اس نے اپنا شہر ظاہر کیا۔ ”ہاں لیکن یہ تھے ہے۔ مجھے کئی لوگوں نے بتایا ہے جنہوں نے اپنی آنکھ سے اس کی قبر پر الوکو بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔“

”خالہ اب مجھے آصفہ پچی کی قبر پر جانا ہی پڑے گا۔“ افضل بولا۔

”ہاں، ضرور جاؤ۔۔۔ مجھے صحیح صور تحال کا پتہ چل جائے گا۔ لوگوں نے ایسے ہی اڑادی ہے یا واقعی اس کی قبر پر الوبیتھار ہتا ہے۔“ خالہ نے کہا۔

”بھائی، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔“ اس نے پرشوق انداز میں کہا۔ ”اچھا ہیک ہے۔ ضرور چلن؟“

”لبی۔ پاگل ہوئی ہو قبرستان میں عورتوں کا جانا منوع ہے۔“ خالہ فرزانہ نے تنبیہ لیج میں کہا۔

”پرمیں نے آصفہ پچی کی قبر ضرور دیکھا ہے۔“

”ایک کام ہو سکتا ہے۔ لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی اور سانپ بھی مر جائے گا۔“ افضل نے چکلی بجاتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا بھائی؟“

”ارے میں کیرہ لے جاؤں گا قبر اور الوکی تصویر بنا لاؤں گا۔“

”وندر فل۔ گذہ آئیٹیا بھائی۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”آپ کب جائیں گے بھائی۔“

”جلدی جاؤں گا۔“ افضل نے اسے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

”میں اسی طرف تیں کرتے یہ لوگ دادا عظم کے گھر بیٹھ گئے کافی لوگ اکٹھا ہو چکے تھے اور جیسے چیزے لوگوں کو ان کی موت کی جرمیتی جاری تھی رش بروحتا جا رہا تھا۔

”انسان کی اصل مقبولیت کا اندازہ اس کی موت کے بعد ہوتا ہے۔ زندگی میں تو بہت سی مصنعتیں آؤں گے۔“

سارا قصہ منے کے بعد شاکر کی ماں نے فروہی ادھیر ڈالا تاکہ اس تعویذ کو بلاتا خیر سمندر کے حوالے کیا جائے لیکن جیت انگیز بات یہ ہوئی کہ تعویذ نہ ملا سکئے کو تار تار کر دیا گیا تعویذ اس میں ہوتا تو ملتا۔“

”ہائے خالہ، تعویذ کہاں گیا؟“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”اللہ جانے بنی بی۔“ خالہ فرزانہ نے گمراہ اسنے لے کر کہا۔ ”وہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ فوری طور پر اس عامل سے رابطہ کیا گیا اس نے ساری بات سن کر کہا، اب بہت دری ہو چکی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تعویذ کو تین ماہ کے بعد ہر صورت میں سمندر کے حوالے کر دینا چاہئے تھا عامل کی منت سماجت کی گئی اس سے کہا گیا کہ جادو کا توڑ کرنے کا وعدہ کر لیا لیکن ہوا کچھ نہیں رو جانی علاج بھی کرایا مگر بے سود، شاید وقت گز چکا تھا۔ شاکر کی حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ بالآخر ایک رات وہ اپنے ابدي سفر پر روانہ ہو گیا۔“

”اوہ، خالہ، بہت افسوسناک۔“ اس نے اداس ہو کر کہا۔

”ہاں، اس جادو ٹوٹنے کے ہاتھوں وہ بے چارہ تو جان سے گیا ہی پر نچ آصفہ بھی نہ سکی۔ شاکر کی موت نے اسے بُری طرح متاثر کیا۔ وہ احساس جرم میں بنتا ہو گئی گھر کے افراد تو اس پر لعنت ملامت بھیجتے ہی تھے مگر وہ خود اپنی نگاہوں میں خوار ہو گئی۔ اس کے دل میں ایک کاننا ساچچہ گیا ہر وقت پریشان اور گھبرائی گھبرائی کسی رہنے لگی۔ کھانا پینا بھول گئی۔ بننے سنورنے کی تو خیر سے کوئی بُنگاش نہیں تھی کہہ بند کر کے روتی رہتی پھر جانے اسے کاخی چبائی کی کہاں سے عادت پڑ گئی۔ سرال والوں نے اسے اپنے گھر سے دھکے دے کر کھال دیا تھا۔ اب وہ اپنے والدین کے قدموں میں آپڑی تھی۔ اگرچہ اس کی اس حرکت سے وہ بھی ناراض تھے لیکن وہ ان کی بیٹی تھی اسے دھکے مار کر باہر نہیں کر سکتے تھے خیر کا خیج کھانے کی عادت جس پڑتی گئی۔ اب وہ دواؤں کی شیشیاں توڑ کر چبائی کی۔ گھر والوں کو اس کی اس عادت کا پتہ چل گیا تھا لہذا اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ آصفہ کے ہاتھ کہیں سے کوئی شیشی نہ لگے۔ مگر ان کے چل جاؤ دو وہ کہیں نہ کہیں سے کاخی کا مکڑا میسا کر لیتی۔ پھر اس عادت نے آہست آہست انتہائی سکینیں صور تحال اختیار کر لی۔ آصفہ کو کمرے میں بذر کھا جانے لگا اس کے کمرے سے شیشی کی تمام چیزوں ہٹالی گئیں مگر پھر بھی وہ باز نہ آئی ایک دن شریت کی ایک بولی تمام پاندیوں کے باوجود جانے اس کے ہاتھ کماں سے لگ گئی بیس وہ بولی اس نے توڑ کر پوری کی پوری چبائی۔ اس کامنہ لولمان ہو گیا مگر واے اسے اپستال لے کر بھاگے مگر وہ راستے میں ہی دم توڑ گئی۔“

”اوہ خالہ، کتنا بڑا ہوا۔“ وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

”ہاں بر اتوہو اگر کیہے عورتیں جادو ٹوٹوں سے باز نہیں آتیں۔“ افضل نے تبصرہ کیا۔

”عورت بے چاری بھی کیا کرے۔ تم مرد لوگ ہیش سے اسے ستاتے چلے آئے ہو۔“ خالہ فرزانہ نے پان کھانے کے لئے بنوہ کھوڑا۔

غالہ فرزانہ نے بیتھنی سے کما۔

”فرزانہ کیا یہ تماری بھائی نہیں ہے؟“

”کیا لفافے پر اس کا نام لکھا ہے۔ مجھے نہیں خیال کہ مر جوم نے محض ایک ملاقات میں اسے یاد رکھا ہو میرا خیال ہے کہ تمیں ضرور کوئی غلط فتحی ہوئی ہے۔ وہ لفافہ کسی اور کے لئے ہو گا۔“
اپنی یہ بات ہوئی رہی تھی کہ ذکیر ایک لمبا سا سفید رنگ کا لفافہ ہاتھ میں لئے اندر واخن ہوئی اور اس نے وہ لفافہ راغب کے ہاتھ میں دے دیا۔

راغب نے اس لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر بولا۔ ”فرزانہ لفافے پر کوئی نام نہیں لکھا لیکن تم مجھے میرے سوال کا جواب دو کہ کیا یہ تماری بھائی نہیں؟“

”بھائی ہے لیکن سن گئی نہیں اور یہ بات سب جانتے ہیں۔“

”یہاں بات سے یا سوتیلے کی نہیں ہے۔ یہ تماری بھائی ہے ناچاہے رشتے کی سی اور اس کا نام.....“ راغب کچھ بولتے ہوئے ایک دم رک گیا۔

”اس کا نام تانیہ ہے۔“ غالہ فرزانہ نے اس کا نام بتایا۔

”مجھے اب اپنے لفافہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ لڑکی فرزانہ کے ساتھ یہاں آئے گی۔ اسے یہ لفافہ دے دیا اور اسے ہدایت کر دیتا کہ وہ یہ لفافہ سب کے سامنے نہ کھولے۔ اپنے گھر جا کر تھانی میں کھولے اس لفافے میں اس کا خوب بندھے.....“

”خوب! خوب کاذکر سن کروہ ایک دم جو نکل اٹھی۔“ میرا خوب لیکن دادا عظیم کو کیسے پہنچا؟ میں نے ابھی اپنا خوب کسی کو بتایا ہی نہیں..... یہاں تک کہ غالہ کو بھی نہیں۔“

”یہ مجھے نہیں معلوم لیکن تمارے اقرار کرنے سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ لفافہ تمارے ہی لئے ہے ایک بات اور اب اتنے کی تھی۔“

”وہ کیا۔“ انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کا نام تانیہ ہے لیکن یہ اس کا اصل نام نہیں ہے۔ اس کا اصل نام ترکش ہے۔“

”ترکش!“ تانیہ پریشان ہو کر بولی۔ ”لیکن میرا نام تو تانیہ ہے اور میرا نام پورا خاندان جانتا ہے۔“

”اس سلسلے میں کچھ نہیں کہ سکتا۔ اب آنے مجھے جو کہا تھا، وہ میں نے تمہیں بتاویا یہ لوپی امانت۔“

یہ کہہ کر راغب نے وہ سفید لفافہ تانیہ کی طرف بڑھا دیا۔ تانیہ نے لزتے ہاتھوں سے وہ لفافہ قھام لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

”تانیہ، شاید تمہیں یہ بات معلوم نہ ہو کہ اباؤ بولی کی تجیر کے باہر تھے لوگ دور دور سے اپنے خوابوں کی تجیر معلوم کرنے آتے تھے۔“

کو ایک دوسرے کے درپر لے جاتی ہیں لیکن آدمی مرنے کے بعد تمام مصلحتوں سے آزاد ہو جاتا ہے نہ دولت رہتی ہے، نہ کرسی رہتی ہے، نہ حیثیت رہتی ہے، خاک کا پتلا، خاک میں ملے کو تیار ہوتا ہے تب معلوم ہوتا ہے وہ کس کے کتنے کام آیا۔

ظہرے بعد دادا عظیم کا جنازہ اخوات معلوم ہوا کہ دادا کیا چیز تھے بے شمار لوگ تھانے کے جازے میں ہر آنکھ اشکبار تھی دادا عظیم نے اپنی زندگی میں جانے کتنے لوگوں کا اور دباثا ہو گا کتنے لوگوں کا بوجھ اخوات ہوا کا آج وہی لوگ دادا کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔

تمہین کے بعد افضل گھر واپس چلا گیا تھا جبکہ غالہ فرزانہ اور وہ وہیں رہ گئی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ دونوں عصر کے بعد خود ہی گھر پہنچ جائیں گی۔ اسے آنے کی ضرورت نہیں۔ اگر ممکن ہو تو دادا کے گھر سے کوئی چھوڑ دے گا۔ درنہ وہ ٹیکسی یا رکشہ میں گھر پہنچ جائیں گی۔

دادا عظیم کے سات بیٹے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ ساتوں کے ساتوں اسی گھر میں رہتے تھے اور ساتوں زندہ تھے بڑا بیٹا راغب ساٹھ سال سے اپر کا ہو گا۔ ریاض زندگی گزار رہا تھا۔ سب کی شادیاں ہو چکی تھیں سب کے بچے تھے اور ان میں بعض کی شادی ہو چکی تھی گویا دادا عظیم، محض دادا نے تھے بلکہ پر دادا تھے ساتوں بھائیوں میں بڑی لیگانگت تھی لیکن ان بھائیوں کی اولاد میں یہ محبت نہ تھی ان میں کئی لڑکے گھر چھوڑ کر جا چکے تھے وہ علیحدہ مکانوں میں رہ رہے تھے ان ساتوں بھائیوں کی بیویاں بھی بہت اچھی تھیں انہوں نے اس گھر میں اکر گھر کو جوڑنے کی تو کوشش کی تھی تو زندگی کو شش نہ کی تھی۔

غالہ فرزانہ، دادا عظیم کے بڑے بیٹے راغب سے مرحون گھنگھوٹھیں۔ راغب دادا کی سیرت پر روشنی ڈال رہا تھا۔ وہ بھی بڑی پلچری سے دادا عظیم کی باتیں سن رہی تھیں۔ اتنے میں راغب کی بیوی ذکیرہ ہاتھ میں ٹڑے لئے اندر واخن ہوئی۔ ٹڑے میں چائے کے چار کپ رکھے تھے۔ ذکیرہ نے تینوں کو چائے کا ایک ایک کپ دیا اور چوچھا کپ لے کر صوفی پر بیٹھ گئی پھر جانے کیا خیال آیا چائے کا کپ میز پر رکھا اور راغب کے پاس جا کر اس کے کان میں کچھ کاما۔ راغب نے اپنی بیوی کی بات سن کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے جاؤ لے آؤ۔“

”فرزانہ، میں ابھی آئی۔“ یہ کہتی ہوئی ذکیرہ کمرے سے نکل گئی۔

”راغب بھائی، خیریت تو ہے۔“ غالہ فرزانہ بے مجھیں ہو کر بولیں۔

”اس لڑکی کی ایک امانت ہے، میرے پاس۔“ راغب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابانے مرنے سے ایک دن پہلے میرے حوالے کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب یہاں آئے تو اسے دے دیتا۔“

”ابی کیا چیز ہے جو دادا عظیم اس کے لئے دے گئے ہیں۔“

”یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ وہ ایک لفافہ ہے۔“ راغب نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لفافہ اسی کے لئے ہے۔ یہ دادا عظیم سے صرف ایک مرتبہ ملی ہے؟“

”یہ بچھو کمال سے آیا کون لایا ہے اس الکو۔“ تانیہ نے دردناہ سے بچھرے میں بند اس الکو و دلخت سے دیکھتے ہوئے کمال۔

”بی بی، ابھی ایک آدمی آیا تھا، وہ دے گیا ہے۔“ دردناہ نے بچھرے کا گنڈا چھوتے ہوئے کمال۔
”بی بی اسے اندر لے آؤ۔“

”نمیں، نہیں، دردناہ تم پاکل ہو گئی ہو کیا۔؟“ تانیہ نے اسے ڈانتھے ہوئے کمال۔ ”تم اندر آ جاؤ اسے وہیں رہنے دو۔“

وردناہ اس بچھرے کو دروازے پر چھوڑ کر اندر آگئی۔ تانیہ لرزتی ٹالکوں سے اپنے بیٹھ پر بیٹھ گئی۔ پہلہ پر اس کا بیگ اور وہ بند لفافہ پر اتھاٹے وادا عظیم نے دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ اسے سب کے سامنے نہ کھولا جائے۔ تانیہ نے فراؤہ لفافہ انھا کر بیگ میں ڈال لیا اور اس کی زپ بند کرتے ہوئے دروازے پر رکھے اس بچھرے کو دیکھنے لگی وہ اُتو اپنی بڑی بڑی زرد آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔
”وردناہ تم نے اس بچھرے کو کیم لے لیا؟ کون شخص تھا وہ؟“ تانیہ پر بیٹھانی سے بولی۔

”بی بی، اس آدمی نے زیادہ بات ہی نہیں کی۔ میں نے جیسے ہی گیٹ کھولا اس نے یہ بچھرہ میری طرف بڑھا دیا اور بولا کہ ترکش کو دیدیو، میں نے کما کر کون ترکش، یہاں کوئی ترکش نہیں ہے تو وہ بولا اپنی بی بی تانیہ کو جا کر دیدیو۔ اچھا میں چلتا ہوں یہ کہ کراس نے بچھرہ میرے ہاتھ میں تھما یا اور میرے کچھ کئے سے پہلے ہی وہ چلا گیا۔“ دردناہ نے بتایا۔

”کیا شخص تھا وہ؟ تم نے بڑی غلطی کی دردناہ مجھے فوراً بلا لیتا تھا۔“ تانیہ پر بیٹھان ہو کر بولی۔
”اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔“ دردناہ نے بتا۔ ”وہ کچھ عجیب سا آدمی تھا بی۔ کامے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بڑے لمبے بال تھے جو اس کے کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ سانوں رنگ کا تھا لمبا چورہ، کانوں میں چاندی کی بالیاں، ایک ہاتھ میں موٹا سا کڑا، اور انگلی میں چاندی کی پتھرگی انگوٹھی، کالی چیکلی آنکھیں بس میں اور کیا بتائیں، بی بی وہ کیسا آدمی تھا۔ میں نے اس طرح کا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“

تانیہ فوراً کھڑکی کی طرف گئی۔ اس کھڑکی سے گھر کا گیٹ صاف نظر آتا تھا۔ کھڑکی کھول کر اس نے اور ہر اُڑھ دیکھا اگر اسے کوئی آدمی نہ دکھائی دیا۔ اس نے کھڑکی بند کی اور دروازہ سے خاطب ہو کر بولی۔
”تمیں یقین ہے کہ اس شخص نے میرا نام لیا تھا۔“

”بی بی بالکل بی بی۔ پہلے تو اس نے ترکش کمال۔ پھر جب میں نے انکار کیا تو بولا اپنی بی بی تانیہ کو جا کر دے دیا نے صاف آپ کا نام لیا بی بی۔ کیا آپ اسے نہیں جانتیں۔“ دردناہ نے جیران ہو کر پوچھا۔

”نمیں، دردناہ پتہ نہیں وہ شخص کون تھا اور وہ دے کر بھی کیا گیا ہے۔“ تانیہ پر بیٹھان تھی۔
”ہاں، دیکھو بھلا، یہ بھی کوئی دینے کی چیز ہے۔“
”بھائی میں کیا گھر میں۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”مجھے معلوم ہے۔ خالہ نے راستے میں مجھے بتایا تھا۔“

”آج مجھے اپنے آپا کے بارے میں، ایک بات اور معلوم ہوئی کہ وہ خواب کی تعبیر کے ساتھ خواب دیکھنے والے سے بھی اچھی طرح واقع ہوتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بڑے پੱچے ہوئے بزرگ تھے لیکن انہوں نے خود کو بھی پوچھنہ رکھا۔“

”اُرے آپ کو نہیں معلوم ہو گا۔ مجھے تو باہمی کے بارے میں اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ کس پا یہ کے بزرگ ہیں۔ آخر لوگ ان کے پاس یونہی تو نہیں آتے تھے۔“ ذکرہ نے فوراً ہی اپنی اہمیت کا اظہار کر دیا۔

کچھ دیر بیٹھ کر خالہ فرزانہ اور تانیہ نے راغب سے اجازت لی۔ راغب نے فوراً اپنے بیٹھ کو حکم دیا کہ وہ دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑ آئے۔ تانیہ اور خالہ فرزانہ نے منجھی کیا کہ اس ٹکھ کی ضرورت نہیں۔ وہ بآسانی رکشہ بیگی کے ذریعے گھر پہنچ جائیں گی لیکن راغب نے ایک نہ سئی۔ وہ گھر کے گیٹ تک انسیں رخصت کرنے آئے اور جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلی نہ گئیں وہ گھر کے گیٹ پر کھڑے رہے۔

واپسی کا سفر بڑی خاموشی سے کٹا۔ خالہ فرزانہ نے بات کرنا بھی چاہی لیکن تانیہ نے خواب میں انہیں خالی خالی لگا ہوں سے دیکھا تو وہ سمجھ گئیں کہ تانیہ اندر سے پریشان ہے۔
”وہ واقعی پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وادا عظیم کو اس کے خواب کے بارے میں کس طرح پہنچ گیا تھا اور اس لفافہ میں اس کے بھی ایک خواب کی کیا تعبیر بند تھی وہ جلد از جلد اس سے واقع ہو جانا چاہتی تھی۔“

گھر پہنچ کر اس نے فوراً ہی اپنے کمرے کا رخ کیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اپنے بیٹھ روم میں داخل ہوئی اندر سے دروازہ بند کیا بیگ بیٹھ پر اچھا دیا اور واش روم میں گھس گئی۔ اچھی طرح منہ باتھ دھو کر باہر نکلی۔

ابھی اس نے بیگ سے لفافہ نکالا ہی تھا اور کھولنا چاہتی ہی تھی کہ ایک دم دروازے پر دستک ہوئی۔

دروازہ بڑے زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی دردناہ چیخ رہی تھی۔

”جلدی دروازہ کھولیں۔ بی بی۔“

تانیہ نے وہ لفافہ فوراً بیگ میں ڈالا۔ اور بیگ بیٹھ پر بھینک کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑ کرنے لگا تھا۔ انہیں خیر۔

تانیہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو ”اے“ دیکھ کر وہ بے اختیار چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

دردناہ کے ہاتھ میں ایک بچھو تھا اور اس بچھرے میں ایک آلو بند تھا۔ تانیہ نے بچھرے میں بند آلو کو دیکھ کر چیخ ماری۔ دردناہ نے وہ بچھو فوراً دیکھ پر کھدیا اور تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”ڈریں نہیں بی بی یہ بچھرے میں بند ہے۔“

"نہیں لی بی، وہ ایک گھنٹہ پلے کہیں گے ہیں۔"
اور خالہ؟"

"وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"اچھا، وروانہ تم اس پر بھرے کو لے کر نیچے چلو میں آتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے بی بی۔"

پھر وروانہ نے جیسے ہی پر بھرے کا گھنٹا پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھایا تو نے بے چین ہو کر فوراً پر پھر ہڑائے اور ایک بھی انک جیخ ماری۔ وروانہ نے گھبرا کر فوراً ہاتھ بچھپے کر لیا۔

"وروانہ، اسے فرو نیچے لے جاؤ۔" تانیہ نے حکم دیا۔

وروانہ نے اس کے حکم کی تھیں میں جیسے ہی پنجھا اٹھانا چاہا، وہ فوراً وروانہ کی طرف چھپنا اور زور زور سے اپنے پر پھر ہڑائے اگرچہ پنجھہ چھوٹا تھا اس کے پورے پر بھی نہیں کھل رہے تھے لیکن جتنے بھی کھل رہے تھے وہ بندے کو خوفزدہ کرنے کیلئے بہت تھے۔ وروانہ نے ڈر کر ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے وروانہ کیا کر رہی ہو؟ پنجھا اٹھا لو۔" تانیہ نے تختی سے کہا۔

وروانہ نے پھر اسے اٹھانا چاہا تو اس نے ایک مرتبہ پھر بھی انک جیخ ماری اور اپنے پر پھر ہڑائے لگا۔

"لبی بی، میں اس پر بھرے کو نہیں اٹھا سکتی۔ مجھے ڈر گ رہا ہے۔"

"اچھا، ٹھہر میں اٹھا کر ویکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر تانیہ آگے بڑھی اس کے آگے بڑھتے ہی وہ الٹاپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ تانیہ نے ہٹ کر کے پر بھرے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ تیار تھی کہ جیسے ہی الٹاپنی گا وہ فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ الٹاپنی ساکت بیٹھا رہا۔

تانیہ نے ہٹ کر کے پنجھا اٹھا لیا۔ اُتو نہ پھر پھر ہڑایا اور نہ بچپا اور نہ ہی اس نے خوناک آواز نکالی۔

"وروانہ، اب تم نیچے لے جاؤ اسے۔" یہ کہہ کر تانیہ نے پنجھہ، وروانہ کے ہاتھ میں دیدیا۔

پر بھرے کا دروanہ کے ہاتھ میں آتا تھا کہ وہ فوراً پھر پھر ہڑا اٹھا۔ ساتھ ہی اس نے ایک بھی انک جیخ ماری پکھا اس طرح کہ وروانہ نے فوراً وہ پنجھہ نہیں پر رکھ دیا اور تیری سے سیرھیاں اترنی نیچے چل گئی۔

شاید وہ مجری طرح ڈر گئی تھی۔

وروانہ کے جانے کے بعد تانیہ نے پر بھرے پر ایک نظر ڈالی وہ بڑی خاموشی سے بتتا تانیہ کو اپنی بڑی زر و آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کی بات تھی کہ ایک خوف کی لراس کے بدن میں اترنی چل گئی۔ تانیہ نے پر بھرے کو دیہی چھوڑا، اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"کیا ہو تانیہ؟ خیر تو ہے۔"

بیٹھ پر بیٹھ کر اس نے اپنا یہ اٹھا لیا۔ لفافہ نکلا۔ لفافہ ہاتھ میں آتے ہی اس کے دل کی وجہ کن تیز ہو گئی۔ ہاتھ میں لرزش آگئی وہ سوچنے لگی اس لفافے میں جانے کیا بد ہے۔

وہ نوچ لبا اور چار اچ چوڑا ایک سفید رنگ کا لفافہ تھا۔ روشنی کی طرف کر کے تانیہ نے ویکھا تو اس میں کوئی خط رکھا کھائی دیا۔ تانیہ نے ہٹ کر کے لفافہ چاک کیا اور اس میں رکھا خط باہر نکال لیا۔

وہ خط ہرگز نہ تھا۔ کاغذ پر کوئی تحریر نہیں تھی، اس پر بینیں سے ایک اسکچ بنانا ہوا تھا اور یہ وہ اسکچ تھا جسے وہ مسلسل پانچ راتوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک گول جھونپڑی، جھونپڑی کی چھت پر بیٹھا ہوا الٹو دروازے پر کنٹلی مارے بیٹھا سانپ، جھونپڑی کے اندر اندر ہمراہ ایک توہہ منظر تھا جو اسے خواب میں نظر آتا تھا۔

بیس ایک آواز کی کسر تھی پھر اپاٹک ہی اس کے دماغ میں وہ آواز بھی گوئنچنے لگی۔

"ٹرود مٹ آڈ اندر آجائو۔"

وہ کاغذ بھی سفید تھا۔ اس خواب والے مظہر کے علاوہ اس پر کچھ نہیں لکھا تھا۔ تانیہ نے کاغذ پلٹ کر ویکھا تو اس پر ایک اور اسکچ دکھائی دیا وہ ایک دروازہ تھا بند دروازہ اس دروازے کے ہینڈل پر ایک تعویذ لٹکا ہوا تھا۔

تانیہ نے اس کاغذ کو کئی باراں لٹکا کر دیکھا۔ اس پر بھی وہ تصویریں بنی تھیں۔ ایک طرف اس کے خواب کی تصویر تھی تو کیا وہ سری طرف اس کے خواب کی تغیرت تھی؟ یہ کیسی تغیرت تھی۔ بند دروازہ جس کے ہینڈل پر ایک تعویذ لٹکا ہوا تھا۔

تب ہی اس کے دماغ میں ایک چھٹا کاسا ہوا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ارے یہ تو نیچے والے کمرے کا دروازہ ہے۔"

اس نے جلدی سے اس کاغذ کو لفافے میں ڈالا۔ اور وروانہ کھول کر باہر نکلی۔ دروازے پر وہ پنجھہ ہوں کاتوں رکھا تھا۔ وہ الٹو بردے سکون سے بیٹھا تھا۔ تانیہ کو دیکھ کر اس اٹو نے اپنی گردن ذرا سی میز میں کی اور پھر ایک عجیب سی آواز نکالی تانیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس اٹو نے اسے دیکھ کر خوشی کا اندر کیا ہو۔

تانیہ نے گھنٹا پکڑ کر پر بھرے کو اٹھا لیا۔ الٹو نے کوئی اچھل کو نہ مچائی۔ تانیہ پر بھرے کا گھنٹا پکڑنے نیچے اتر آئی۔ اس نے اوہ ہڑا دھر دیکھا۔ اسے غالہ فرزانہ کی تلاش تھی۔ اس زینے کا ایک راستہ گھر کے اندر جاتا تھا اور وسرا راستہ ذرا سا گھوم کر باہر لان کی طرف جاتا تھا اس نے پر بھرے کو باہر والے دروازے کی طرف چھوڑا اور خود غالہ فرزانہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اسے معلوم تھا کہ غالہ اس وقت اپنے کر کر میں ہوں گی۔

غالہ ابھی نماز سے فارغ ہی ہوئی تھیں، تانیہ کو جو اس طرح کرے میں مگتے ہوئے ویکھا تو ایک لمحے کو وہ گھبرا گئیں۔

”ارے نمیں خالہ، ایسا بھی کیا ذرا مجھے بس تھوڑی ہی دپور لگتا ہے، پھر میں سو جاتی۔ میں آپ کو خواب بتاتی ہوں، پھر آپ کو یہ تصویر دکھاؤں گی۔ دادا عظیم کی ہدایت کے مطابق میں نے اس لفافے کو اکیلے میں کھوا ہے۔ خواب بتانے یا اس تصویر کو نہ کھانے کی تو انہوں نے کوئی ہدایت نہیں کی۔“ تانیہ نے کہا۔

پھر تانیہ نے بڑی تفصیل سے اپنا وہ خواب خالہ کے سامنے دھرایا۔

”ارے یہ منہوس دیں تو تم نہیں جھوپڑی کی چھٹ پر بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔“ خالہ فرزانہ کو خواب سن کر اکلوپھر یاد آگیا۔ ”تانیہ تم بھی عجیب لڑکی ہو، تم خواب میں کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں دیکھ سکتی تھیں۔“

”خالہ، خواب اپنی مرضی سے کماں دکھائی دیتے ہیں۔“

”اچھا، لفافے میں کیا ہے؟“

”یہ دیکھتے میرے خواب کی تصویر۔“ تانیہ نے کاغذ نکال کر ان کے سامنے کیا۔ پہلاں نے ده تصویر دکھائی جس میں جھوپڑی، اکتوار سانپ بتاتھا۔

”ارے، یہ تو ہو، بوس تھا را خواب ہے۔“

”اب ذرا پلٹ کر دیکھیں، تب آپ کو اس خواب کی تعبیر نظر آئے گی۔“

خالہ فرزانہ نے فوراً کانڈ پلاٹا، پچھلی طرف بنی ہوئی تصویر دیکھتے ہی خالہ فرزانہ کپکا اٹھیں۔ ان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”نمیں۔“ اور پھرہ زرد ہوتا چلا گیا۔

”خالہ کیا ہوا؟“ تانیہ نے ٹکرمندی سے پوچھا۔ ”آپ نے اس دروازے کو پہچاتا۔“

”پہچان ہی تو لیا ہے۔ اسی لئے اس قدر خوفزدہ ہو رہی ہوں۔“ خالہ فرزانہ ٹکرمند ہو کر بولیں۔

”یہ اسی کمرے کا دروازے نہیں ہے آپ ہی شلاک رکھتی ہیں؟“ تانیہ نے تصدیق چاہی۔

”ہاں، وہی ہے۔“ خالہ کی زبان میں لرزش تھی۔

”خالہ، ایک بات بتائیں، کیا دادا بھی اس گھر میں آئے ہیں۔“ تانیہ نے سوال کیا۔

”آج تک نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”پھر یہ کس قدر جران کن ہات ہے کہ انہوں نے نہ صرف میرے خواب کو جان لیا بلکہ اس کمرے کی ٹھیک نہیں نشاندہی کر دی۔ اگر دروازے کے پینڈل پر تیونی لٹکا ہوانہ دکھاتے تو شاید اس دروازے کو پچاننا مشکل ہوتا۔“

”سوال یہ ہے تانیہ کہ تمہارے خواب سے اس دروازے پا کیا تعلق ہے۔“ خالہ نے سوال کیا۔

”خالہ ضرور کوئی تعلق ہے ورنہ دادا عظیم کو اس کی تصویر بنانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”تم اس کمرے کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“ خالہ فرزانہ نے سوال کیا۔

”خیر کہاں ہے خالہ۔“ وہ نیچے ہی قالمین پر ان کے نزدیک بیٹھ گئی۔ ”بی بی، آپ کی چائے بیس لے آؤں یا پاہر بیسیں گی۔“ دردانہ نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

”دردانہ، دیکھو وہ پچھرہ پیڑھیوں کے نزدیک رکھا ہے تم ذرا اسے اٹھا کر باہر دیوار کے ساتھ رکھ آؤ۔ کہتے ہیں کہ اکو برا منہوس ہوتا ہے جماں بیٹھتا ہے ویرانی پھیل جاتی ہے۔“

”اُتوا!“ خالہ فرزانہ ایک دم چکنیں۔ ”کمال ہے اُتوا۔“

”ہائے بی بی، مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ میرے پچھرہ اٹھاتے ہی مجھ پر جھپٹتا ہے۔“ دردانہ سم سی گئی۔

”اچھا، تم اسے رہنے دو، اور میری چائے ادھر ہی لے آؤ۔“

”جی ٹھیک ہے بی بی۔“ دردانہ نے بڑے مغوبانہ انداز میں کما اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اسے ڈر تھا کہ تانیہ کہیں اسے پچھرہ اٹھانے کو نہ کر دے۔

خالہ فرزانہ کامنہ بھی تک حیرت سے کھلا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک یہ اکو کہاں سے آگیا۔ اور وہ بھی پھرے میں، خالہ نے پھر سوال کرنا چاہا تو تانیہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں صبر کرنے کو کما اور بولی۔ ”میں بتاتی ہوں خالہ، آپ پریشان نہ ہوں۔“

اور پھر تانیہ نے اس اکلوکی داستان سادی کہ وہ کماں سے آیا اور کیسے آیا۔ اس اثناء میں دردانہ چائے دے گئی۔

”ارے۔ وہ کون منہوس شخص تھا جو اپنے لگے لگے کو ہمارے حوالے کر کے چلا گیا۔“ خالہ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”تانیہ تم جلدی سے اس منہوس کو اپنے گھر سے نکالو۔ مجھے ایسی باتوں سے بہت ڈر لگتا ہے ارے کہیں کوئی چادو ٹوٹا تو نہیں کر گیا۔“

”خالہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی اس کا کچھ بندوبست کرتی ہوں۔“ تانیہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ خود اس کی اپنی جان نکلی جارہی تھی۔

”خالہ سننے، یہ لفافہ میں نے کھول لیا ہے۔“ تانیہ نے ان کے سامنے لفافہ لہرا یا۔ ”ہاں کیا نکلا اس میں۔“ خالہ اس اکلو ایک لمحے کیلئے بھول گئیں۔

”خالہ اس میں ایک کاغذ ہے۔ اس پر ہاتھ سے دو تصویریں نہیں ہوئی ہیں۔“ تانیہ نے بتایا۔ ”لیکن وہ تو تمہارے کسی خواب اور اس کی تعبیر کا ذکر کر رہے تھے۔ اے، تانیہ تم نے مجھے بتایا نہیں تم نے کیا خواب دیکھا تھا۔“

”بس خالہ آج میں آپ کو بتاتی، میں پانچ دن سے مسلسل وہ خواب دیکھ رہی تھی۔“ ”ارے تانیہ، کوئی ڈراؤنا خواب تھا وہ۔“

”ایسا ویسا خواب دیکھنے کے بعد جب میری نیزد نوٹی تو میری جان نکلی ہوئی ہوتی۔“ ”تو پہلی مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اکیلی اپر سوتی ہے۔ اب مت سونا اپر۔“

ہو گا۔ چاند کی تیرہ تاریخ تھی۔ ہر طرف چاندنی پنکی ہوئی تھی۔ وہ اپنی چارپائی سے انھ کر اپنی جھونپڑی کے دروازے پر آیا تو اس نے سامنے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔

وہ کوئی ملٹک کا بندہ تھا۔ دونوں ہاتھ اور انھائے ایک ملٹک سے چھٹ اونچی دیوار پر رقص کر رہا تھا۔ گھنگھروں کی چھٹک سے پوری فضائیں ارتھاں ساتھا دھنگ قدم کا ٹھنڈ دیوار پر اس صمارت اور خوبصورتی سے رقص کر رہا تھا جیسے وہ دیوار پر نہ ہو، زمین پر ہو۔

اگرچہ یہ منظر ایک اچھے بھلے آدمی کے ہوش ازادی نے کیلئے کافی تھا لیکن عامل خان پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا، وہ فوراً پلٹ کر اپنی جھونپڑی میں آیا۔ لاٹین کی لوکوز راتیز کیا۔ چارپائی کے سہانے رکھی موٹی سی لالھی اٹھائی اور آیت الکری پرستا ہوا باہر آگیا۔

باہر آگر اس نے پانی کے نکست میں زور زور سے لاٹھی ماری۔ نکستر کی آواز سے پورا علاقہ گونج آئتا۔ رقص کرتا ہو ملٹک دیکھتے ہی دیکھتے دیوار پر غائب ہو گیا۔

اس طرح رقص کرتے ہوئے اس ملٹک کو عامل خان نے ہی نہیں، جھونپڑی میں رہنے والے لوگوں نے دیکھا۔ کچھ دن کے بعد یہ رقص ایک طرح کا معمول بن گیا۔ لوگ اس رقص کے عادی ہو گئے۔ اگر کوئی شخص دیوار پر ناچتا ہے تو ناچا کرے، ان کا کیا گزیدا ہے، عامل خان نے شروع شروع میں تو اس شخص کی پردائی۔ انھ کر آیت الکری پڑھی۔ لاٹھی سے نکستر جایا۔ لیکن جب روز ہی اس نے رقص بدل دکھانا شروع کر دیا تو عامل خان نے اس پر سوبار لعنت بھیجی اور پر پسار کر آرام سے سونے لگا۔

جلد ہی درمیان والے پلاٹ پر تعمیر شروع ہو گئی، لوگوں نے دیکھا کہ رات خالی زمین پر ایک خوبصورت مکان نے ابھرنا شروع کر دیا ہے۔ جلد ہی اس مکان پر چھٹ پڑنے کی چھٹ پڑتے ہی ایک حادثہ ہوا، ایک رات عامل خان اپنی چارپائی پر مردہ پایا گیا۔ یہ پتہ نہ محل سکا کہ وہ کیسے مرا، ظاہر اس کے جسم پر کسی قدم کے نشانات نہ تھے۔ نہ ہی اسے قتل کیا گیا تھا۔ جن لوگوں نے اس کی لاش دیکھی تھی وہ بتاتے ہیں کہ عامل خان اپنی چارپائی پر اس طرح لینا تھا جیسے سور ہا ہو۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ سوتے میں اس کا ہارٹ فلٹ ہو گیا ہو۔

عامل خان کے اس دنیا سے انھ جانے کے بعد کوئی چوکیدار زیادہ عرصے تک اس مکان کی گرفتاری نہ کر سکا۔ وہ بغیر تھا تھے تھی غائب ہو جاتا۔ غالباً مکان کی تھا کہ شاید خوف کی وجہ سے چوکیدار تھا بخیری یہاں سے روپکھر ہو جاتے ہیں۔ پھر اس مکان کی تعمیر رک گئی۔ مالک مکان باہر چلا گیا۔

رات کے وقت یہ ادھورا مکان برا بھائیک منظر پیش کرتا۔ اس ملٹک کا رقص جاری تھا بیرون رقص اس ادھورے مکان کی چھٹ پر ہوتا۔ سڑک کے اس پار جھونپڑوں میں رہنے والے ادھورا مکان رقص کو دیکھا کرتے۔

سات سال کے بعد پھر اس مکان کی تعمیر شروع ہوئی۔ دو تین ماہ کام ہوا۔ اس کے بعد پھر نہ ہو گیا۔ کام بند ہونے کی وجہ بھی معقول تھی۔ ایک دن مالک مکان اپنے بیوی بچوں کو مکان کی تعمیر دکھانے لایا۔ بیوی اور اس کے بچوں نے اچھی طرح مکان کو دیکھا۔ یہ لوگ چھٹ پر بھی گئے۔

”میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں، بیشہ اسے بندی دیکھا ہے اور دروازے پر کالے کپڑے میں پلاٹ تعویذ بوجیٹل میں لٹکا ہوا ہے، آپ نے اس کمرے کے بارے میں یہی بتایا کہ اس کمرے میں کافی کبڑا پڑا ہے۔ ایک طرح کا استھر ہے۔“ تانیہ نے کہا۔

”نہیں تانیہ میں نے غلط کہا تھا، وراصل میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اس کی حقیقت جان کر ڈر جاؤ لیکن اب تم سے کچھ چھپا بیکار ہے۔ اب یہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔“

”اگر یہ استھر نہیں ہے، اس میں کسی قدم کا سامان نہیں ہے تو پھر اس میں کیا ہے؟“ سوال کیا گیا۔

”کچھ نہیں بالکل خالی ہے۔“ خواب ملا گر کتنا سادہ۔ ”آئیں خالہ، ذرا اس کا تالا کھولیں، میں اسے اندر سے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ خواہش کا اطمینان ہوا۔

”ہائے نہیں تانیہ، ایسی بات سوچنا بھی نہیں۔“

”یا مطلب خالہ..... کیا ہو جائے گا۔“

”یہ توجھ نہیں معلوم کر کیا ہو جائے گا، لیکن اتنا ضروری یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا ہمیں اس کمرے کو کھولنے سے منع کیا گیا ہے۔“ خالہ فرزانہ کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔

”کس نے منع کیا ہے خالہ۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”اس شخص نے جس سے ہم نے یہ مکان خریدا۔“ خالہ فرزانہ نے بتایا۔ ”ویسی نامی اس شخص نے اس مکان کو پڑے شوق سے بنایا تھا لیکن اسے رہنا نصیب نہ ہوا۔“

اس مکان کی کمائی بڑی عجیب تھی۔ ایک ہزار گزر پر بنایا ہوا یہ دمنزلہ مکان گھنشن اقبال میں تھا۔ اس مکان کے دائیں بائیں کوئی مکان نہیں تھا۔ وائیں طرف محض چار دیواری کچھی ہوئی تھی اور بائیں طرف والے پلاٹ کی صرف بنیادیں بھر کر چھوڑ دی گئی تھیں۔ البتہ بچھے والے پلاٹ پر مکان بنایا ہوا تھا اور وہ آباد بھی تھا۔ اس مکان کے سامنے ساٹھ فٹ پوزی سڑک تھی۔ سڑک کے اس طرف تمام مکان بنے ہوئے تھے۔

مکاںوں کی تعمیر سے پہلے یہاں جھونپڑیاں بڑی ہوئی تھیں یہاں ادؤلوگ آباد تھے جن کی عمر تیس اور مرد دنوں مل کر روزی کماتے تھے۔ تب کیس جا کر شام کو ان کے گھروں کے چولے روشن ہوتے تھے۔ یہ برابر کے تینوں پلاٹ، تین بھائیوں نے خریدے تھے۔ دو بھائی باہر تھے، تیرا جو کہ کراچی میں رہائش پذیر تھا ایک فرنچیکی بڑی وکان کا مالک تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے مکان کی تعمیر شروع کی۔ اس نے تینوں پلاٹوں کی ہادندری بیوادی اور چوکیدار ملازم رکھ دیا جو چوبیں گھٹنے ان خالی پلاٹوں پر رہتا تھا۔

ایک رات جب عامل خان کی اچانک آنکھ کھلی تو اس نے گھنگھروں کی آواز سنی۔ کوئی ایک بجے کا عمل

”یہ بھی منکور۔“ دوسری ہدایت بھی مان لی گئی۔

”جب یہ کرو اور پر اماکن تعمیر ہو جائے گا تو ایک رات میں اس کرے میں گزاروں گا۔ صحیح نظر کے وقت میں باہر آؤں گا۔ اس کرنے کے لوگوں میں گا۔ اس کے پینڈ میں ایک تعویز لکھاں گا اور یہ یہ کرو ہیشہ کیلئے بند ہو جائے گا۔“ روشن علی نے بتایا۔

”بھیشہ کیلئے بند ہو جائے گا؟“ مالک مکان پر بیشان ہو گیا۔

”جی، بھیشہ کیلئے بند ہو جائے گا۔“ یقین سے کہا گیا۔

”ارے..... یہ کتنی عجیب بات ہو گی۔ پھر اس کے بعد تو یہاں کچھ نہیں ہو گا۔“

”کچھ نہیں ہو گا۔ ہیشہ کے لئے سکون ہو جائے گا۔“ یقین دلایا گیا۔

”روشن صاحب۔ یہ سب کیا ہے؟“ مالک مکان بے یقینی کی کیفیت میں جلا تھا۔

”جو کچھ بھی ہے، آپ کے سامنے ہے۔ اتنے عرصے سے بھگت رہے ہیں پھر بھی پوچھ رہے ہیں؟“

”میری تو عمل دلگ ہے۔“ مالک مکان کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”میاں صاحب زادے..... یہ دنیا ایک عجائب خانہ ہے جو میں دیکھتا ہوں، اگر وہ تم دیکھ لے تو تو بولاۓ پھر، آڑا ب میاں سے چلیں۔“ روشن علی نے کچھ نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ کچھ کہتے رہ بھی گئے۔

مرض کی تشخیص کے بعد مالک مکان و سیم نے زیادہ دیر نہ لگائی۔ فراؤ دا دراورو شروع کر دی۔ اس نے دنی گی لیبر لگا کر تیری سے مکان کی تعمیر مکمل کر لی۔ پھر رنگ و روغن شروع ہوا۔ و سیم نے آسیب زده کرنے میں کوئی کھڑکی نہیں رکھی تھی۔ دوسری ہدایت کے مطابق روشن علی سے پوچھ کر اس کرنے میں مطلوب رنگ کرانا تھا..... و سیم نے فون پر روشن علی سے بات کی۔ انہوں نے ساری بات سن کر شام کو اپنے گھر پر بلا یا۔ وہ گھر پر بچا تو انہوں نے ایک چھوٹی سی شیشی میں کالے رنگ کا سیال دیا اور ہدایت کی۔ ”اس پورے کرنے میں کالا رنگ کروانا ہے۔ حتیٰ کہ چھت پر بھی کالا رنگ ہو گا۔ اس شیشی کا پانی رنگ میں ملوا رہتا۔ یہ عمل کیا ہوا پانی ہے۔ ایک بات کا اور خیال رکھنا رنگ کا کام ایک دن میں اور مغرب سے پہلے ہر صورت میں ختم ہونا چاہئے۔ رنگ ہونے کے بعد دروازہ بند کر کے لاک کر دینا۔

اس کے بعد کوئی بشر اندرونہ جائے تم بھی اندر نہیں جاؤ گے۔ جب مکان ہر طرح سے مکمل ہو جائے تو مجھے مطلع کرنا، میں رات کو دیہیں رہوں گا۔ سمجھ گئے میری بات۔“

”جی بالکل۔“ و سیم نے شیشی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں کیا ہے؟“

”یہ اُنکی بھی کاپانی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک چیز اور ملائی گئی ہے۔“

”دی کیا؟“ و سیم نے پوچھا۔

”یہ نہیں بتاؤں گا۔“ روشن علی نے کو اجواب دیا۔

”ٹھیک ہے، کوئی حرج نہیں۔“ و سیم نے کہا۔

کوئی آدھے گھنٹے کے بعد یوں پہچے گھر جانے کیلئے گاڑی میں بیٹھنے لگے تو معلوم ہوا کہ چار سالہ لڑکا عمر علی غائب ہے۔ پہلے تو انہوں نے اسے آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ گھبرا کر دونوں میاں یوں زیر تعمیر مکان کے اندر بھاگے۔ گھر کے ہر کونے میں اسے تلاش کیا مگر عمر کیں نہیں تھا۔

اچانک خیال آیا کہ واٹر بینک میں بھی دیکھ لیا جائے۔ بس دیکھنا ہی غصب ہو گیا۔ مال بینک میں جھاٹکے ہی چیز مار کر بے ہوش ہو گئی۔ وہ چار سالہ بچہ بینک میں تیر رہا تھا۔ اسے جلدی سے نکال کر ماں سمیت اپنیل پہنچا یا گیا مگر وہ تو کب کام پر چکا تھا۔

مکان کی تعمیر پھر رک گئی۔ تعمیر اتنی سامان پر احتیاط لیکن وہاں کوئی چوکیدار دو تین دنوں سے زیادہ نکالتا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو گئی کہ اس مکان پر کسی قسم کا اثر ہے کوئی سایہ ہے۔

علمون کی تلاش شروع ہو گئی۔ کمی لوگوں کو ”جائے واردات“ پر لایا گیا لیکن کوئی ایسا کام عمل نہ کر سکا جس سے مکان سے گزرے اثرات دور ہو جاتے۔

عالی کی تلاش جاری رہی پھر کسی نے پاکستان کوارٹر کے ایک عالی کاپٹہ بتایا لیکن وہ پیشہ ور عالی نہ تھے۔ سرکاری ملازم تھے۔ روحانی عملیات کے مابر تھے۔ ضرورت مندوں کو تعویز گذئے دیتے تھے لیکن یہ سارے کام کار خیر کے طور پر کرتے تھے، بد لے میں دعاوں کے طالب ہوتے تھے پیوں کے نہیں۔

مالک مکان کی پریشانی دیکھ کر انہوں نے اس مکان کا آسیب دور کرنے کی ہائی بھرپوری۔ دوپہر کو جب سخت تیز و ہوپ تھی، وہ عالی صاحب جن کا نام روشن علی تھا۔ مالک مکان کے ساتھ اس زیر تعمیر مکان پر آئے، پورے گھر کا ایک چکر لگایا، اس کے بعد ایک کمرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ مالک مکان کو اشارة کیا کہ وہ باہر گاڑی میں جا کر بیٹھے، کوئی آدھے گھنٹے کے بعد روشن علی مکان سے باہر آئے۔ پیسے میں نہ مائے ہوئے۔ اشارے سے مالک مکان کو اپنے ساتھ آئے کو کہا۔ روشن علی پھر اس کرنے میں جا کھڑے ہوئے جاں وہ پہلے کھڑے ہوئے تھے۔ اس کرنے میں ابھی چوکھت دروازے نہیں لگے تھے۔

”اس کرنے کو غور سے دیکھ لیں؟“ روشن علی نے بڑی سمجھیگی سے کہا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ مالک مکان نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”آپ چاہتے ہیں کہ اس مکان کی تعمیر مکمل ہو جائے؟“ روشن علی نے پوچھا۔

”صف خاہر ہے، آپ کو میں اسی لئے یہاں لایا ہوں۔“

”پھر ایک کام کرنا ہو گا“ روشن علی نے کہا۔

”میں فرمائیے۔ میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔“

”اس کرنے میں کوئی کھڑکی نہیں ہو گی۔“ پہلی ہدایت ملی۔

”ٹھیک ہے، یہ کھڑکیاں بند کروادوں گا۔“ ہدایت پر عمل کرنے کی ہائی بھرپوری گئی۔

”اس کرنے میں جو رنگ بتاؤں گا، وہ ہو گا۔“ دوسری ہدایت ہوئی۔

نے آسیب کو کمرے میں تو بند کر دیا ہے۔ اب کمرے والوں کو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مکان میں وسیم رہ رہا ہے یا سجاد قیام پذیر ہے۔ پھر کچھ عزیز رشتہ داروں نے بھی اس کے خیال کی تائید کی۔

تب اس نے اپنے اس محنت سے بنائے، بے انتہا خوبصورت مکان میں شفت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے اس مکان کے لئے اس نے یا فرنچ برج یا تھاپس سے پہلے اس نے اسے شفت کیا۔ پورے گھر میں قالین پہلے ہی بچھائے جا چکے تھے فرنچ پر سیٹ کرنے کے بعد گھر ایک دم جگہا اٹھا۔

دوسرے دن جب صبح وسیم مزید سامان لے کر آیا، اور وہ گھر میں گھساتو اس کی شی گم ہو گئی ہر کمرے میں بچھا ہوا تالین اور فرنچ پر کوئی طرح کالا ہو چکا تھا۔ اُگ کے اُندر دیواروں اور دروازوں پر کسیں بوجوہ نہ تھے لیکن فرنچ اور قالین جل کر کوئلہ ہو چکے تھے۔

جھنکا لگا تو وسیم کو روشن علی یاد آئے۔ انہوں نے ٹھیک ہی کما تھا کہ وسیم کے رہنے کی صورت میں کان میں بجا ہی پھیلے گی۔ تباہی واقعی پھیل چکی تھی۔

وسیم نے فوراً کان پکڑے اور مکان فروخت کرنے کا اشتہار دیا۔ افضل نے یہ اشتہار پڑھا تو اس نے فوری رابطہ قائم کیا۔ شام کو مکان دیکھا۔ مکان بے حد شاذانہ تھا۔ اسے بہت پسند آیا وسیم نے اس سے کوئی بات نہ چھپائی اس مکان بنانے کے سلسلے میں اس پر جو گزرنی تھی وہ بلا کم و کاست سناؤں۔ مکان کے بارے میں پوری تفصیل سن کر افضل ذرا بچھایا وسیم نے فوراً اسے روشن علی کافون نمبر دیا کہ وہ ان سے مل کر مزید تسلی کرے۔

افضل روشن علی سے ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ کاملے کمرے والا مکان خریدنا چاہتا ہے گھر میں صرف دو بندے ہیں ایک وہ ہے اور ایک اس کی خالہ، دونوں ہی کاشادی کرنے کا کارادہ نہیں۔ روشن علی کے اہل میں اس مکان کے لئے آئینیں پارٹی تھیں۔ لہذا انہوں نے افضل کو ہدایت کی کہ وہ بلا بچھاہٹ اس ان کو خرید لے انشاء اللہ اس مکان سے اسے کوئی لفڑانہ نہ پہنچے گا۔

اور یوں افضل نے وسیم سے اس مکان کو خرید لیا۔ اس مکان میں رہتے ہوئے اب ایک عرصہ ہو گیا تھا ن کوئی بات سانس نہ آئی تھی۔ البتہ روشن علی کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا تھا۔ اس کاملے کمرے کے سطح میں اپنے کسی بچس کا تلفرانہ کیا تھا۔ نہ بھی کسی آئے جانے والے کو اس بارے میں بتایا تھا ویسے ایسے کہ وہ بالکل آخر میں تھا۔ مکان کے پچھلے حصے میں جانے کیلئے اس کے سامنے سے گزرنی پڑتا تھا۔ باہر اُدی اور حرشاڑی جاتا تھا اور گھر کے لوگوں کو پچھلے حصے میں جانا ہوتا تو وہ بیٹھ روم والے دروازے کو مال کرتے تھے۔ خالہ فرزانہ کے بیٹھ روم کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔

دروانہ کو بھی اس کمرے کی حقیقت کا پتہ نہ تھا سے بھی بس اتنا ہی پتہ تھا کہ اس میں کاٹھ کیا ہے خالہ فرزانہ سے افضل نے کوئی بات نہ چھپائی تھی۔ تائید کے سارے گھر میں آئیں ایک سال کا عرصہ ہوا تھا۔ خالہ فرزانہ نے اسے اس کمرے کے بارے میں اڑ کھاتا۔ تائید کے سارے گھر میں آئیں ایک سال کا عرصہ ہوا تھا۔ خالہ فرزانہ نے اس کمرے کو بھیت امور قبل کر لیا تھا۔ لیکن

وسیم نے روشن علی کی ہدایت کے مطابق اپنی گھر انی میں سارے کام کروادیئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب مکان ہر طرح سے مکمل ہو گیا۔ وسیم نے روشن علی کو مکان کی تکمیل کی اطلاع دی۔ اتفاق کی بات دیکھنے کے اگلے دن فوچنڈی جھرات تھی یہ جھرات اس کام کیلئے نہایت موذوں تھی۔ وہ جھرات کی بات کو ٹھیک بارہ بجے کر کے میں داخل ہوئے اور صبح فجر کے وقت کمرے سے باہر آگئے۔ اندر کمرے میں انہوں نے کیا کیا وہ رات انہوں نے کس طرح گزاری اس کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے دروازہ بند کیا۔ پھر اسے لاک کیا۔ اور جیب سے ایک کالے رنگ کا تعمیری نکال کر دروازے کے ہینڈل پر لکا دیا اور وسیم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

گھری میں بیٹھ کر دتوں نے قربی مسجد میں فجری نماز پڑھی۔ پھر انہوں نے راستے میں تھا یا۔ ”میاں صاحب زادے ایک بات کھنچا ہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا اس طرح کہوں۔“

”روشن علی صاحب خیر تو ہے۔“ وسیم نے پوچھا۔

”میاں ہم نے تو ہست سمجھا یا مگر وہ مان کر ہی نہیں دیا۔“ روشن علی نے بتایا۔

”کون روشن صاحب؟“ وسیم سمجھ نہ سکا۔

”وہی کاملے کمرے والا۔“ روشن علی نے ٹھیک ہر لمحے میں کہا۔

”آپ بہنے کیا کہا اور اس نے کیا نہیں مانتا۔“ وسیم نےوضاحت چاہی۔

”میاں صاحب زادے، میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ مکان بہت شوق سے بنا یا ہے مگر تم میں اس مکان میں رہنا نصیب نہیں ہو گا۔ وہ کاملے کمرے والا تمہیں قبول کرنے کو ہرگز یار نہیں۔ تمہیں یہ مکان ہر قسم پر فروخت کرنا ہو گا۔ اگر تم نے اس مکان میں رہنے کی ضروری تو جاہی پھیلے گی۔ ہم اتنا ہی بتکے ہیں۔ پھر اس کی ایک ہدایت اور بھی ہے کہ یہ مکان ایسے لوگوں کو فروخت کیا جائے جن کے افادہ خانہ کم ہوں۔ پنج بالکل نہ ہوں۔“

”عجیب سڑتھ ہے۔“ وسیم نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔ ”پھر کیا فائدہ ہوا آپ کے دہان جانے کا جب میں اس مکان میں نہ رہ سکوں گا۔“

”فائدہ یہ ہوا کہ تمہارا یہ مکان فروخت ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں یہ مکان تعمیر ہو یہی نہیں سکتا تھا۔ زندگی بھر ہونی پڑا تھا۔ جیسے دائیں بائیں کے پلاٹ پڑے ہیں۔ ان پلاٹوں پر کبھی کوئی مکان تعمیر نہ ہو سکے گا۔“ انہوں نے اکٹھاف کیا۔

”یہ میرے بھائیوں کے پلاٹ ہیں۔ آپ کچھ سمجھئے تا۔“

”میں جو کر سکتا تھا وہ کر دیا ہے جو جانا سکتا تھا جادیا ہے میاں اب تم جانا تو تمہارا کام جانے۔ بس ہمیں ہمارے گھر تک جھوڑ دو۔“ اتنا کہنے کے بعد وہ بالکل خاموش ہو گئے۔ جب گھر آگیا تو گھری میں اتر کر اللہ حافظ کہا اور یتھے پڑ کر بھی نہ دیکھا۔

”روشن علی کہا، باض ہدایت کے مادہ و وسیم کے دل میں بے تینی پیدا ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ روشن علی

جیسے کسی نے تیز دھار کے آئے سے اس کا پیٹ پاک کر دیا ہو۔ اس کا بخوبہ بالکل درست حالت میں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ یہ بھی شب نہیں کیا جاسکتا تھا کہ پنیرے کا دروازہ کھل جانے کی صورت میں کسی بھی طرف سے بخوبی ڈالا ہو۔

گھر میں موجود تینوں خاتمی بڑی خاموشی سے ابھی اس پر ہمیت منظر کا نظارہ کر رہی تھیں کہ اچانک تانیہ کی نظر قدموں کے ان نشانوں کی طرف پڑی جو آلتو کے خون سے نکل کر برآمدے کی جانب چلے گئے تھے۔

یہ نیچے پیروں کے نشان تھے کیونکہ پیروں کی پانچوں انگلیاں اور ایڑی کا نشان بت داشت تھا۔ ”ہائے، یہ پیروں کے نشان کس کے ہیں؟“ تانیہ نے خالہ فرزانہ کی طرف سمی ٹھاکھوں سے دیکھا۔

”دردانہ کیا تو گھسی تھی، اس خون میں۔“ خالہ فرزانہ نے پوچھا۔

”بڑی بی بی..... کیا بات کر رہی ہیں۔ میں جادوگی خون میں..... میرا تو دیکھ کر ہی دم باہر آ رہا ہے۔“

”خالہ..... قدموں کے نشان تو برآمدے کی جانب مزدگی ہیں۔ آئیے آگے چل کر دیکھیں۔“ تانیہ نے کہا۔

”یہ افضل نہیں آیا بھی تک۔“ خالہ فرزانہ نے دردانہ کی طرف دیکھا۔

”نہیں، بڑی بی بی۔“ دردانہ نے جواب دیا۔

”یہ اس طرف کون جا سکتا ہے۔ تانیہ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“ خالہ فرزانہ م Fletcher ہو کر بولیں۔

”ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے خالہ۔“ تانیہ نے خالہ کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

”بی بی..... جان تو میری بھی نکل رہی ہے۔“ دردانہ بولے بنا نہ رہ سکی اور تانیہ کے نزدیک ہوئی۔

”جس نے الٹو کومارا ہے، وہ ضرور گھر کے پچھو اڑے چھپا بیٹھا ہے۔“

”یہ کیا ضروری ہے..... ہو سکتا ہے وہ مار کر جا چکا ہو۔“

”لیکن، یہ کون ہو سکتا ہے۔“ سوال اٹھا۔

”کہیں بی بی..... وہی کا لے کپڑوں والا عجیب سا آدمی تو داپس نہیں آیا۔“ دردانہ دور کی کوڑی کی۔

”وہ کون؟“ تانیہ کو وہ شخص یاد نہ آیا۔

”بی بی، جو یہ بخوبی دے گیا تھا۔“ دردانہ نے وضاحت کی۔

”اسے اس الٹو کومارنا ہوتا تو دے کر جانے کی کیا ضرورت تھی۔؟“ سوال ہوا۔

”اس بندے کی بھی بھج نہیں آئی کہ آخر دہ کون تھا۔ یہ بخوبی کس خوشی میں دے گیا اور میرے نام

آج جب تانیہ نے خالہ فرزانہ کو دادا عظم کے دیے اس نفافے میں لکھنے والے کانڈ کو دکھایا اور اس کا لغز پر بنی تصویر پر خالہ کی نظر پڑی تو چند لمحوں کے لئے وہ کانپ کر رہا تھا۔

پھر مجبوراً خالہ فرزانہ کو اس مکان اور کاملے کرنے کی رواداد کو تانیہ کے گوش گزار کرنا پڑیں۔ ”اوہ، ماں گاؤ۔“ تانیہ اس مکان اور کاملے کرنے کی کمالی سن کر دل اٹھی۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے خالہ؟“

”پچھے سمجھ میں نہیں آ رہا بھی۔ تمہارا خواب دیکھنا۔ پھر تمہارے دادا عظم کا تمہیں لفافہ دیتا۔“

افافے میں کاملے کرنے کے دروازے کی تصویر لکھنا اور کسی شخص کا پنیرے میں بند الودے جانا۔ تانیہ اللہ رحم کرے۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ ”خالہ فرزانہ نے بڑی فکر مندی سے کہا۔ اسی وقت دردانہ کرنے میں داخل ہوئی۔ وہ بے حد بھرا ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے صرف اتنا ہو

کل سکا ”بی بی..... وہ آلتو.....“

”ہاں کیا ہوا آلتو کو؟“ تانیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ دردانہ کی حالت دیکھ کر سُم گئی تھی۔ ”بی بی، وہ مر گیا..... اسے کسی نے مار دیا۔ وہاں خون ہی خون پڑا ہے۔“ دردانہ نے اٹک انکہ کر جایا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے دردانہ، یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ تانیہ کا دل کانپ رہا تھا۔ ”جو میں نے دیکھا ہے، وہی کہہ رہی ہوں، آپ خود چل کر دیکھ لیں۔“ دردانہ کی حالت بھر تھی۔

”کہاں ہے اس کا پنیرے؟“ تانیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی ٹانگوں میں لرزش تھی۔ ”وہیں، جہاں آپ نے چھوڑا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے۔“ دردانہ نے بتایا۔

”تم نے اس کا بخوبی اٹھا کر باہر نہیں رکھا تھا کیا؟“ تانیہ نے سوال کیا۔ ”نہیں بی بی، میری بہت ہی نہ ہوئی..... میں فروآپن میں چل گئی۔ آپ کو چائے دینے کے بعد۔

کچن میں کام کرتی رہی۔ کام کرتے کرتے خیال آیا کہ ذرا چل کر دیکھوں کہ وہ آلتو کا حال میں ہے۔ کردیکھا تو وہاں خون پھیلا ہوا تھا اور وہ پنیرے میں مرا پڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔

فوڑا آپ کو چانے آگئے۔ دردانہ نے جلدی جلدی تمام رواداد بیان کر دی۔ ”چلو، میں دیکھتی ہیں۔“ تانیہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“ خالہ فرزانہ نے بھی اپنے گھٹنے پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ جب تانیہ سیڑھیوں کے نزدیک پچھی تو چند لمحوں کے لئے سُم اٹھی۔ دردانہ نے صحیح کما تھا۔

پنیرے کے چاروں طرف خون ہی خون پڑا تھا۔ اتنا خون؟ ایک اتنے سے پرندے میں بکرے جتنا کہاں سے آیا بھلا؟

اس آلتو کا ایک پرکھلا ہوا تھا۔ گردن عجیب طرح سے مڑی ہوئی تھی اور پیٹ میں شکاف تھا۔ یوں آ

”آج صحی سے میری بائیں آنکھ پھرک رہی تھی۔ مجھے پتھرا ج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔“
خالہ کا وہم جاگ اٹھا۔

سے کس طرح واقع تھا جبکہ میں ایسے عجیب و غریب حلے کے آدمی کو سرے سے نہیں جانتی۔“
”آؤ۔ ہمت کر کے ذرا آگے چلیں۔“ خالہ فرزانہ نے کہا۔

”لبی، میں تو ادھر جاؤں گی نہیں۔ پتہ نہیں ادھر کون بیجا ہو۔“

”کوئی بات نہیں تو ادھر ہی کھڑی رہ۔ ہم آگے جا کر دیکھتے ہیں۔ یہ قدموں کے نشان کماں تک گے ہیں۔“

”ٹھیک ہے خالہ ہم دونوں چلتے ہیں؟“

تائیہ اور خالہ فرزانہ ہمت کر کے آگے بڑھیں۔ جب یہ ذرا درہ ہو گئیں تو دروانہ کو خوف کے مار۔
پتھرے کے پاس تناکھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ بھی ان دونوں کے پیچے پیچھے چل دی۔

گھر کی ساری بیان روش تھیں۔ اس روشنی میں، خون میں سے قدموں کے نشان واضح نظر آ رہے تھے۔ رہبری کے گھوٹتے ہی یہ نشان دور جاتے دکھائی دے رہے تھے جوں جوں یہ آگے بڑھ رہی تھی
قدموں کے نشان مدھم ہوتے جا رہے تھے۔

ند تو یہ نشان مکان کے پچھوڑ اڑ کی طرف گئے تھے، نہ ہی دائیں جانب سیر چھوٹوں سے نیچے اتر
تھے کہ قیاس کر لیا جاتا کہ آنے والا پھلانگ کر خالی پلاٹ کے احاطے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ نشان آگے جا
آخری کمرے کے دروازے پر رک گئے تھے۔

یہ آخری کمرہ، وہی مقفل کمرہ تھا، جس کے دروازے کے پینڈل پر کالا تھویڈ لٹکا ہوا تھا۔
قدموں کے نشان دروازے پر رک گئے تھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ شخص کمرے کے اندر چلا گیا۔
اور اس نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا ہے لیکن اس کا لے کرے کا دروازہ بند تھا اور اس کے پینڈل
تھویڈ جوں کا توں لٹکا ہوا تھا۔

قدموں کے نشان ہیاں ختم ہوتے دیکھ کر تینوں خواتین کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے وہ تینا
غیر ادھر طور پر ایک دوسرے کے قریب آگئیں۔

”خالہ، یہ کیا؟“ تائیہ نے خالہ کی طرف ڈری ڈری لٹکا ہوں سے دیکھا۔
”الی خیر۔“ خالہ فرزانہ اندر لے رہا تھا۔ ”آ جامیری پی آ جا۔“
”لبی، یہ تو اس سور میں گھس گیا ہے۔“ دروانہ نے اپنی رائے پیش کی۔ اسے اس بند کر کے
واسستان معلوم نہ تھی۔ ورنہ وہ اس گھر کی ملازمت چھوڑ کر کب کی جا بھی ہوتی۔

خالہ فرزانہ نے تائیہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی تکلیف کے باوجود جس قدر تیر چل سکتی تھیں، چلیں۔ انہو
نے اپنے کمرے میں آ کر ہی دم لیا۔ اتنی سی ہی دیر میں وہ بری طرح ہانپے گی۔ اشارے سے انہوں
پانی مانگا۔ دروانہ نے ان کے کمرے میں رکھے ہوئے چھوٹے سے فرنچ میں سے پانی نکال کر اپنے
پلاپا۔ پانی پی کر انہوں نے گمراہی لیا۔

”یہ اس گھر میں کیا شروع ہو گیا ہے۔“ خالہ فرزانہ نے تشیش بھرے لبھے میں کہا۔
”میں کیا کہوں خالہ؟“ جواب دیا گیا۔

”خالہ آنکھ واںکھ پھرکنے سے کچھ نہیں ہوتا، یہ محض اتفاق ہے۔“

خالہ فرزانہ نے جواب دینے کے لئے اپنی منہ سکھلا ہی تھا کہ گھر کی گھنٹی بجی۔

”افضل آگیا۔“ خالہ فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”جا، دروانہ جا کر دروازہ کھول۔“

”یہ انہوں نے گھنٹی کیوں بھائی ہے، گاڑی کا ہارن کیوں نہیں دیا۔“ تائیہ نے سوال کیا۔

”ہاں تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ خالہ فرزانہ بولیں۔ ”دروانہ دیکھ تو کون آیا ہے؟“

دروازے پر افضل ہی تھا، گاڑی میں کچھ خرابی تھی، اس نے وہ گیراج میں چھوڑ آیا تھا، خود ٹھیک سے
آگیا تھا۔ دروانہ نے اس کی آواز پہچان کر چھوٹا گیٹ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

”خالہ اور تائیہ آگئیں۔“ اس نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

”بھی صاحب، وہ عصر کے وقت آگئی تھیں۔“ دروانہ نے بتایا۔

”خالہ کماں ہیں؟“ سوال ہوا۔

”اپنے کمرے میں ہیں۔“ دروانہ نے بتایا۔ ”صاحب بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔“

”کیا ہوا درداشت، خیر تو ہے؟“ افضل خالہ فرزانہ کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”تائیہ اور پری ہیں؟“

”نہیں جی..... بی بی، بی بی کے پاس ہیں ان کے کمرے میں۔“

جب وہ سڑھیوں کے پاس پہنچا تو ایک بچہ اور اس کے چاروں طرف تازہ تازہ خون دیکھ کر ایک دم
بوکھلا گیا۔ ”یہ کیا ہے؟“ پھر اس کی نظر پھرے کے اندر الورپڑی۔ ”یہ بچہ کماں سے آیا؟ اور اس
بچہ میں یہ کون سا پرندہ ہے۔ اسے کس نے مارا؟“

”صاحب جی۔ اندر چلیں۔ بی بی بی بی کے پاس۔“ دروانہ نے اتنے سارے سوال کا ایک جواب
دیا۔

افضل جب خالہ فرزانہ کے کمرے میں پہنچا تو دونوں کے چہرے پر ہوایاں گزری ہوئی تھیں۔ خالہ
فرزانہ بید پر ناگلیں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ تائیہ ان کے قدموں میں قابین پر بیٹھی تھی۔ افضل بھی تائیہ کے
ساتھ بیٹھ گیا اور فکر متند لجئے میں بولا۔ ”یہ ہاہر کیا ہوا ہے؟“

”افضل، میں نے تمہیں کیا بتایا تھا؟“ خالہ فرزانہ نے سوال کیا۔

”کیا بتایا تھا، خالہ مجھے تو یاد نہیں؟“ افضل نے جواب دیا۔

”تیج میں نے تم سے کہاں تھا کہ میری بائیں آنکھ پھرک رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔“ خالہ نے
یاد دلایا۔

”ہاں، کہا تو تھا۔“ افضل کو یاد آگیا۔

”بس پھر دیکھ لو۔“ خالہ فرزانہ نے افضل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے وہاں تک جتنے بھی قدموں کے نشان ہیں۔ یہ سب ایک پیر کے ہیں اور یہ دایاں پیر ہے، کیونکہ ان نشانوں میں انگوٹھے کا نشان پیر کے باسیں جانب ہے۔ اگر یہ دونوں پیروں کے نشان ہوتے تو انگوٹھے کا نشان پیروں کے دونوں جانب ہوتا۔ اس شخص کا بیباں پیر نہیں ہے۔“

”بھائی آپ نے خوب پچانا، واقعی یہ سارے کے سارے ایک پیر کے نشان ہیں۔“ تانیہ نے افضل کو سراحتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب ایک سوال اٹھتا ہے۔“

”وہ کیا؟“ افضل نے پوچھا۔

”اگر یہ شخص ایک نائگ کا ہے تو یہ پھر کسی بیساکھی یا لامبی کے سارے چلتا ہو گا۔“

”ہاں۔ صاف ظاہر ہے۔“ افضل نے تانیہ کی۔

”تو پھر پیر کے ساتھ بیساکھی کا نشان کیوں نہیں ہے؟“

”ہاں واقعی۔“ افضل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”یہ بات بھی غور طلب ہے؟“

”بھائی ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کی بیساکھی یا لامبی خون آسودہ ہوئی ہو۔“ تانیہ نے اپنے سوال کا خود بھی جواب دیا۔

”ہاں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔“ افضل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اس مکان کی کمانی نشانے ہوئے سابقہ مالک مکان نے ایک نائگ قدم کے شخص کا مذکورہ کیا تھا جو چاندنی راتوں میں چھٹا فٹ اونچی دیوار پر ایک نائگ سے رقص کیا کرتا تھا۔ اس وقت وہی ایک نائگ کا نائگ افضل کو یاد آگیا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ تانیہ کی توجہ اس نائگ کی طرف دلانے لیکن وہ کچھ سوچ کر رہ گیا۔

اب یہ معاملہ خاص انگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن صور تھال کی اس عینی کو وہ تانیہ کے سامنے گھرنی کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے اس نے دردانہ کو آواز دے کر حکم دیا۔ ”دردانہ سارے کام چھوڑ کر یہ خون صاف کرو۔“

”صاحب جی اگر آپ پنجربے سے اس آلو کو نکال کر باہر پہنچ دیں تو میں یہ پنجربہ بھی دھو دوں۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ افضل سمجھ گیا کہ دردانہ اس مرے ہوئے آلو سے ڈر رہی ہے۔ وہ فوراً آگے بڑھا اس نے پنجربے کو پیرسے زرا آگے کھکھایا۔ خنک فرش پر بیٹھ کر اس نے پنجربے کا دروازہ کھولا اور ہاتھ ڈال کر آلو کا پھیلایا اور کپڑکر افضل نے اس آلو کا بہر کھینچ لیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس مرے ہوئے آلو کو برابر والے غالی پلاٹ کی طرف اچھال دے گا۔

”بھی وہ آلو کا پر کپڑ کر کھڑا ہی ہو رہا تھا کہ ایک دم زبردست پھر پھر اہست کی آواز آئی۔ آلو کا بازو افضل کے ہاتھوں سے نکل گیا اور اس منظر سب کو دم بخود کر دیا۔ وہ آلو افضل کے ہاتھ میں بری طرح پھر پھرایا تھا جیسے ہی افضل کی گرفت ڈھیلی ہوئی، وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر اڑتا ہوا چھست کی طرف پرواز کر گیا۔

”تانیہ چیز مار کر بیچ پہنچے ہی۔“ دردانہ بھی بری طرح چالا۔ افضل نے اپنے حواس پر قابو رکھا وہ ایک دم

”یہ سب کیا چکر ہے۔ یہ مرا ہوا پر نہ۔ یہ خون، یہ پنجربہ؟“ افضل جیت زدہ تھا۔ ”تانیہ آپ کچھ بتائیں۔“

”جی بھائی، میں آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔“ اور پھر بہانے سے دردانہ کو باہر بھج گیا۔ اور پھر ساری داستان افضل کے گوش گزار کر دی۔ یہ کمانی تانیہ کے خواب سے شروع ہوتی تھی، پسلے اس نے اپنا خواب بتایا۔ اس کے بعد ادا عظم کے بذریغے کا ذکر کیا۔ پھر ایک پسر اسرا ر شخص کا اُتو کا بچپن دے جانے کا مذکورہ کیا۔ پھر یہ بتایا کہ اس لفافے میں سے کیا کنلا۔ اس کے بعد اُتو کے خون کی کمانی سائیں اور یہ بتایا کہ خون آلو قدموں کے نشان کماں جا کر ختم ہوئے ہیں۔

”افضل کے ہوش اڑ گئے۔ چند گھنٹوں میں بات کماں سے کماں پہنچ گئی تھی۔ اسے ان واقعات کی زیادہ فکر نہ تھی، لیکن یہ بات کا لے کر پر ختم ہو رہی تھی۔ سب سے تشویش ناک بات یہ تھی۔ افضل نے جب سے یہ مکان خریدا تھا اور اس مکان کو خریدے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے تھے۔ ابھی تک کوئی خوف میں بتلا کر دینے والا اقمع پیش نہیں آیا تھا۔ اس کا لے کر کے کوہہ سرے سے بھلا چکا تھا بلکہ وہ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ سابقہ مالک مکان کوئی تو ہم پرست شخص تھا خواہ مخواہ خوف میں بتلا ہو کر اس نے

ستے داموں اپنا مکان فروخت کر دیا۔ یہاں آسیب واسیب نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ لیکن تانیہ کی اس ہوش ربا داستان نے اس کے ہوش واقعی اڑا دیئے تھے۔ وہ خالہ فرزانہ کے کمرے سے نکل کر کا لے کر کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے ان خون آلو قدموں کے نشان کو بغور دیکھا وہ واقعی اس دروازے پر آخر ختم ہو گئے تھے۔

پھر وہ ان قدموں کو غور سے دیکھتا ہوا بچھرے تک پہنچا۔ اس نے مرے ہوئے الپر ایک نظر ڈالی اور پھر سے ان قدموں کے نشان کے تعاقب میں چلا۔ تانیہ اس کے پیچے چل رہی تھی۔ خالہ فرزانہ اپنے کمرے سے نیس نکلی تھیں۔

”تانیہ، کیا آپ نے ان قدموں کے نشان کو غور سے دیکھا ہے؟“ افضل نے سوال کیا۔

”جی دیکھا تو ہے، اس شخص نے جو تے نہیں پہنچے ہوئے نیکے پاؤں ہے۔ یہی بات کہنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے کہ یہ شخص نیکے پاؤں ہے۔“ افضل نے خون آلو پیر کے نشان کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ ایک بات اور ہے۔“

”وہ کیا بھائی؟“ تانیہ نے پرچس لمحے میں دریافت کیا۔

”یہ ایک پیر کا نشان ہے۔“ افضل نے بتایا۔

”ایک پیر کا نشان؟“ تانیہ کچھ الجھس گئی۔ ”میں سمجھی نہیں بھائی۔“

”یہ شخص ایک نائگ کا ہے۔“ افضل نے اکشاف کیا۔

”یہ سن کر تانیہ کے جسم میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔“ ایک نائگ کا۔ ”وہ سُم کر بولی۔“

”یہ آپ نے کیسے پچانا۔“

”یہ بات بس اتفاق سے میرے ذہن میں آگئی۔“ افضل نے تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں جی۔“ دردانہ نے تینیں دلایا۔

”ہاں، ان سے کہنا کہ کوئی صحرائیں ان کا مختصر ہے۔ یہاں وقت برپا نہ کریں۔“

”اچھا جی، کہہ دوں گی۔“ دردانہ نے بڑی فرمادری سے کہا۔

پھر وہ خالی پنجوہ گھٹاتا ہوا، تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ دردانہ نے فوراً گیٹ بند کر لیا۔ کچھ دیر وہ گیٹ بند کے خاموشی سے کھڑی رہی۔ پھر اس نے گیٹ کھول کر باہر جھا نکا۔ وہ جا پڑا تھا۔

دردانہ فوراً سڑک پار کر کے سامنے والے گیٹ پر پہنچی۔ جلدی سے اس نے کال بیل پر ہاتھ رکھا اور کسی کے گیٹ پر آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد گیٹ حیرا کے ملازم نے کھولا۔

”ہاں، کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بی بی کماں ہیں، تانیہ بی بی۔“ دردانہ بولی۔
”اندر ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر جلدی سے ہٹ میرے سامنے سے، پورا گیٹ گھیر کر کھڑا ہو گیا ہے۔“ دردانہ نے اس ملازم کو ڈائی اور بے دھڑک اندر چلی گئی۔

تانیہ نے دردانہ کو اندر آتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹنکا۔ وہ فوراً بولی۔ ”کیا ہوا دردانہ؟ خیر تو ہے۔“

”ہاں جی، بالکل خیر ہے..... وہ جی آپ کو بڑی بی بی بڑا رہی ہیں۔“

”کوئی خاص بات ہے یا مجھے بیٹھنے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے؟“ تانیہ نے سوال کیا۔

”خاص بات کا تو مجھے پہنچنے نہیں، بن انہوں نے کہا ہے بی بی کو فوراً بیلا لو۔“

”اچھا، تانیہ فوراً کھڑی ہو گئی۔“ حیرا، میں چلتی ہوں، تم آنا۔“

”ہاں، میں ضرور آؤں گی۔“ حیرا اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔

جب وہ دونوں سڑک پار کر کے اپنے گیٹ کے نزدیک آگئیں تو دردانہ نے تانیہ کے قریب ہو کر بڑی رازداری سے کہا۔ ”بی بی، وہ آیا تھا۔“

”وہ کالے کپڑوں والا؟“

”ہاں جی، پر آپ کو کیسے پتہ چل گیا۔“

”تمہی شکل دیکھ کر، ہوا یاں جواہری ہوئی ہیں۔“

”وہ جی خالی پنجوہ لے گیا ہے اور آپ کے نام ایک پیغام دے گیا ہے۔“ یہ کہہ کر دردانہ نے اس کے ساتھ ہوئے مکالے کو پوری تفصیل سے دہرا دیا۔

دردانہ کی زبانی، ملاقات کی پوری رواداد سن کرتا ہے فکر مند ہو گئی۔ وہ بات کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اس وقت وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور دردانہ اس کے پیڈ کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔

تفصیلہ مار کر ہنسا۔ ”کم بخت زندہ تھا۔“

”یہ کیا ہوا؟“ تانیہ چکرائی تھی۔

”پکھ نہیں ہوا۔“ افضل نے مکراتے ہوئے کہا۔ ”ہاتھوں کے طوطے اڑنے کے بجائے آج ہاتھوں کے آٹو اڑنے گے ہیں؟“

”آپ کو مذاق سو جھا، میری جان پر بنی ہے۔“

”دردانہ، اب فناٹ یہ خون و ہوا لو۔“ افضل نے تانیہ کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور بغیر منید بات کے وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

یہ دوسرے دن شام کی بات ہے۔ تانیہ سامنے والے گھر میں اپنی دوست حیرا سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ افضل اپنے دفتر میں تھا۔ گھر پر خال فرزانہ اور دردانہ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ یہ وہی وقت تھا کہ گھر کی گھنٹی بجی۔

دردانہ نے چھوٹا گیٹ کھول کر باہر جھا نکا تو اس کا اور پر کاسانس اور پر نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ سامنے وہ پراسرار شخص کھڑا تھا۔ اس وقت وہ جیسے غسلے میں تھا۔ اس نے دردانہ کو دیکھ کر بڑے خشک لبجے میں کہا۔ ”ہمارا پرندہ وابس کرو۔“

”پرندہ..... اچھا وہ آٹو..... وہ تو بی مر گیا۔“ دردانہ نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں جی وہ تو اڑ گیا۔“ ”ترکش کو ایک امانت دی گئی تھی، بڑے افسوس کی بات ہے کہ وہ اس کی حفاظت نہ کر سکی۔“

”ہیں جی۔“ دردانہ منہ کھول کر رہ گئی۔

”وہ آزاد ہو گیا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔“ اس پراسرار شخص نے بدستور تیکھے لبجے میں کہا۔

”اپنی ترکش بی بی کو بلاو۔“

”ہیں جی..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ دردانہ بوکھلا گئی تھی۔

”تمہاری تانیہ بی بی کماں ہیں؟“

”وہ تو جی گھر پر نہیں ہیں۔“

”جانتا ہوں..... ان سے کہنا کہ اب میری ملاقات ان سے صحرائیں ہوگی۔ لا اؤ وہ خالی پنجوہ میرے حوالے کر دو۔“

”اچھا جی، آپ ٹھہریں..... میں لاتی ہوں۔“ دردانہ بہت تیزی سے وہ پنجوہ اٹھالا کی۔ وہ نزدیک ہی دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ ”یہ لیں جی۔“

اس پراسرار شخص نے وہ پنجوہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر ہاتھ اونچا کر کے پنجرے کو بڑی حرست بھری

نظر دیں سے دیکھا اور جانے کے لئے مڑا۔

”وہ جی۔ آپ کا نام کیا ہے؟ بی بی سے میں کیا کہوں کہ کون آیا تھا۔“

”کالا چراغ۔“ اس پراسرار شخص نے جاتے جاتے مڑ کر کہا۔ ”میرا پیغام و نہامت بھولتا۔“

اس مکان میں نثارے بہت تھے کوئکہ یہ تین طرف سے کھلا ہوا تھا۔ ایک طرف خالی پلاٹ تھا تو دوسری طرف ایک ایسا زیر تعمیر مکان تھا جس کی صرف بنیادیں بھری ہوئی تھیں۔ ان دونوں پلاٹوں کے بعد اگرچہ مکان بننے ہوئے تھے لیکن وہ خالی پلاٹ اور زیر تعمیر مکان والی سائینڈ پر بہت کم جاتی تھی۔ ان خالی زمینوں کو دیکھ کر اس کے دل میں جانے کیوں ویرانی سی پھیل جاتی تھی۔

اوہ چھٹے نک وہاں وہار بارش ہونے کے بعد کچھ بھلی ہو گئی۔ وہ پھر اپنے کمرے میں آئی۔ اس نے کمرے میں آکر میوزک لگایا اور بیڈ پر نیم دواز ہو گئی۔

کچھ دیر کے بعد دروانہ کمرے میں داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں ڈھکی ہوئی ٹڑے تھی۔ ”پکوڑے اور چائے۔“ دروانہ نے نفرہ لگایا۔

”واہ، دروانہ وہ، تمہارا کوئی جواب نہیں۔“ تانیہ نے خوش ہو کر کہا۔

دروانہ نے ٹڑے بیٹھ پر رکھ دی۔ تانیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پکوڑے، بہت مزے کے تھے۔ پھر بر سات نے اس موم میں ان پکوڑوں کا مزہ ہی پکھے اور تھا۔

”بی بی، پکوڑے اور لاؤں۔“ دروانہ نے پوچھا۔

تانیہ نے پکوڑوں سے بھری بلیٹ پر نظر والی انگلی اس نے دو تین پکوڑے کھائے تھے۔ پکوڑے اسے بہت پسند تھے۔ لیکن اتنے پکوڑے وہ کماں کھا سکتی تھی بھلا۔ وہ نہ کرو بولی۔ ”دروانہ خیز تو ہے۔ یہاں تھے میرے علاوہ کوئی اور بھی نظر آ رہا ہے۔“

”ہائے بی بی، ایسا نہ بولیں، مجھے بہت ڈر گلتا ہے۔“ وہ جلدی سے اٹھ کر بھری ہو گئی۔ ”میں چلتی ہوں، انگلی بڑی بڑی کو دیئے ہیں پکوڑے۔ صاحب تو ابھی آئے نہیں۔ آجاتے تو وہ بھی کھا لیتے گرم گرم۔“

دروانہ کے جانے کے بعد وہ یونہی دروازے کو دیکھتی رہی۔ دروازے کو دیکھتے دیکھتے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اندر آیا ہے۔ یہ اس کی عجیب عادت تھی وہ بیٹھے بھائے اپنے ارد گروں کی اور مخلوق کو محسوس کرنے لگتی۔ وہ اکثر یہ بات کرتی بھی تھی کہ گھروں میں انسانوں کے ساتھ کوئی اور مخلوق بھی رہتی ہے۔ اس مخلوق کے بارے میں اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا۔ ٹھوس تو در کی بات ہے اس کے پاس کوئی ”سیال“ ثبوت بھی نہ تھا۔ وہ لمبے پانچ لکھ باتیں تھیں اور اسی ان وکیلیں لکھ کر کسی کے ذریعے دوڑیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی تھی وہ ایک طاقتور تخلیل کی مالک تھی۔ بے حد حساس ہونے کی بنا پر دیوار پر ریگتی چھپکی کی سر سراہست بھی محسوس کر لیتی تھی۔ کبھی کبھی لوگوں کو ڈرانے کے لئے وہ اس طرح کی بات بھی کرتی۔ ”بھی ویکھو کری پر بیٹھنے سے پسلے پوچھ لیا کری، بھی کوئی اس پر بیٹھانے ہو۔“ سننے والا اگر وہی مزاج کا ہوتا تو بیٹھنے بیٹھنے رک جاتا اور اگر ذرا بہادر ہوتا تو اس کے جملے سے مظوظ ہوتا اور کری پر بیٹھنی اس ان دیکھی خصوصیت سے یہ کہہ کر ”بھائی تم اٹھ جاؤ اب مجھے بیٹھنا ہے۔“ بنتا ہوا بیٹھ جاتا۔ غیر انسانی مخلوق کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا دھیان اس بنڈ کمرے کی طرف چلا گیا۔ بے انتی اس کا بھی چاہا کہ وہ اٹھے، اس کمرے کا تالا کھولے اور اندر چل جائے۔ اندر جا کر دیکھے تو سی اس

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون شخص ہے جو اچانک ہی کمیں سے نازل ہو جاتا نام بھی بڑا عجیب تھا۔ کالا جاغ، بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا۔ جاغ سے تروشنی پھوٹتی ہے اور روشنی کا لی کب ہوتی ہے۔ وہ اسے پیغام دے گیا تھا کہ اب صحرائیں ملاقات ہو گی۔ اسے صحرائیں جانے کی ضرورت تھی۔ اگر کوئی اس کا صحرائیں منتظر ہے تو پھر زندگی بھروسہ انتظار ہی کرتا رہے گا وہ یہاں آرام سے رہ رہی تھی۔ اسے صحرائیں بھکنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔

وہ یہ سب سوچ رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ وہ جو سوچ رہی ہے غلط سوچ رہی ہے۔ آنے والا وقت اس کے لئے جو جال بن رہا تھا، اس جال میں پھنس کر اس نے جانے کمال بھکنا تھا۔

دروانہ، تانیہ کو خاموش بیٹھا دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”بی بی، میں نیچے جا رہی ہوں۔ ذرا اپن کی دیکھوں، آپ کے لئے کوئی خاص چیز تو نہیں پکنی۔“

”نہیں دروانہ، جو پکاؤ گی وہ کھالوں کی۔“ تانیہ نے سادگی سے جواب دیا۔ ”مجھے حرست ہی رہی کہ کبھی آپ اپنی پسند کی شش بتائیں۔“

تانیہ جواب میں مسکرا کر رہ گئی۔ وہ کیا جواب دیتی بھلا۔ دروانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ تانیہ کو دراصل کھانے پینے کا کوئی خاص شوق نہ تھا جو بھی سامنے آتا تھا میں۔ البتہ کوئی پسند کی چیز ہوتی تو تھوڑا سا زیادہ کھا لیتی۔ دروانہ کے نیچے چلے جانے کے بندہ کر کری سے اٹھی۔ میلیون اٹھا کر بیڈ پر لے آئی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے افضل سے بات کرنے کی ٹھانی۔

نمبر ملکار کاس نے رسیور کان سے لگایا۔ وہ گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے رسیور اٹھایا۔ اوہ رہے ”ہیلو“ کرنے والا شخص افضل نہیں تھا اس کا نائب شاہد تھا۔

”بھائی کمال میں؟“ تانیہ نے اس کی آواز پچان کر سوال کیا۔ شاہد، تانیہ کی آواز پچانتا تھا، اس لئے وہ فوراً سمجھ گیا کہ کس بھائی کو پوچھا جا رہا ہے، اس نے بتایا۔ ”جی، وہ تو پڑے گے۔“

”کمال؟“ تانیہ نے پوچھا۔ ”کسی صاحب سے ملنے پا کستان کو اڑا گئے ہیں وہاں سے گھر چلے جائیں گے۔“ شاہد نے بتایا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر تانیہ نے فون بند کر دیا۔ اچانک ہی بارش شروع ہو گئی اور وہ بھی بہت تیز۔ بڑی موٹی موٹی بوندیں پڑنا شروع ہوئیں اور پھر

موٹی بوندیں موسلا و حار بارش میں تبدیل ہو گئیں۔ تانیہ کو بارش بہت پسند تھی۔ وہ بارش کاظراہ کر کے لئے پچھلی گلی میں چل گئی۔ پیچھے ہو مکان تھا اس کے احاطے میں ایک آم کا درخت لگا ہوا تھا۔ جس سے مکان کا پچھلا حصہ کافی ڈھک گیا تھا۔ آم کے درخت پر پریتی ہوئی بوندیں اور ہوا کے زور شاخوں کا بلتا تانیہ کو بہت بھلا لگتا تھا وہ گلیری میں کھڑی بس کی نظر اور سامنے بنے مکانوں کو دیکھا کری۔ اسی کی طرف کجا والی کھڑکی کی طرف آکر کھڑی ہو جاتی اور سامنے بنے مکانوں کو دیکھا کرتی۔

”ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔“ تانیہ نے سادگی سے کہا۔

”چالی کہاں ہے۔ مجھے خود یاد نہیں ہے۔ ویم صاحب، چالی نے مجھے دی بھی تھی یا نہیں۔ سات آٹھ سال ہو گئے مکان تیریے۔ اب پوچھ یاد نہیں ویسے بھی جب یہ بات ویم نے مجھے تاوہ تھی کہ اس کرے کو کبھی کھونا نہیں ہے تو پھر میں نے اس کرے کی چالی کے بارے میں زیادہ تردید کیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ویم نے چالی مجھے دی تھی نہیں۔“

”باں، نہیں دی تھی چالی، ویسے ہم نے مانگی بھی نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے تائیدی بیان دیا۔ چالی کے بارے میں اس انکشاف نے کہ وہ گھر میں موجود نہیں، بڑا بیویس کیا۔ کرے میں جانے، اسے اندر سے دیکھنے کی خواہیں میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی باقاعدہ اس کے کائن میں آگر کھتا تھا کہ آؤ، تانیہ، چلو وہ کمرہ دیکھ لو۔

رات کوئی دیکھتے ویکھتے اس کاول اچاٹ، ہو گیا تو اس نے اپنی دی بند کر کے ڈیکھ کھول لیا۔ کرے کا دروازہ بند تھا۔ قفقے سے بارش ہو رہی تھی۔ بچلی کی چمک کھڑکی کے پروں سے کھلائی دے جاتی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ خوف کی ایک بکلی سی لمراں کے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ کرے کی لائٹ روشن تھی۔ دھیمی آواز میں موسیقی نجح رہی تھی یہ اس کا پسندیدہ کیست تھا۔ اسے سنتے سنتے وہ سو جاتی تھی۔

اب بھی ایسا ہی ہوا۔

کیست سنتے جانے کب اسے نیند آگئی۔ رات کے دو بیجے کامل ہو گا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا گلا نشک ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر سائیڈ نیبل پر رکھ کے جگ سے پانی کا کانا چالا گر جگ تو خالی تھا آج و روزانہ پانی رکھنا بھول گئی تھی۔ اس نے جگ انھیا اور دروازہ کھول کر بیڑھیاں اترنے لگی تاکہ پیچے رکھے فریق سے پانی لے کر آجائے۔ پیچے پیچے تو اس کا خیال بدلت گیا۔ اس نے جگ ڈائنگ نیبل پر پچھوڑا اور اس بند کرے کی طرف بڑھی۔

جرت کی بات یہ تھی کہ ابھی کچھ ویرپلے پیاس کی وجہ سے اس کے گلے میں کانے سے چھوڑ رہے تھے مگر اب پیاس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے اس پر اسرار کرے کی طرف بڑھنے لگی۔ جب وہ اس کرے کے نزدیک پیچی تو یہ دیکھ کر جیران رہ گئی کہ خالہ فرزانہ پلے ہی وہاں موجود ہیں۔ ”آؤ، تانیہ آؤ، مجھے معلوم تمامیں ہیں ضرور آؤ گی۔“ ابھی وہ کوئی جواب وینے کا سروچ رہی تھی کہ خالہ فرزانہ بڑی تیری سے اس کی طرف لپکیں۔ جیسے وہ اسے مارنا چاہتی ہیں۔ ”بیوقوف لڑکی، کیوں اپنی زندگی کے پیچے باٹھ و ہو کر پڑی ہے۔ ٹھہر جائیں تجھے جاتا ہوں۔“

خالہ کو اپنی طرف لپکتے دیکھ کر وہ پلٹ کر بھاگی، پھر وہ کسی چیز سے الجھ کر گری تو اس کی چیز نکل گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اپنے کرے میں، اپنے بیڈ پر پالیا، اس کا مطلب تھا کہ وہ خواب ویکھ رہی تھی، اس نے سائیڈ نیبل پر رکھے جگ پر نظر ڈالی۔ وہ پانی سے بھرا ہوا تھا اس نے اٹھ کر تھوڑا سا پانی آیا؟“

میں کیا ہے۔ اٹو کا خون، قدموں کے نشان، زخمی اٹو کا اڑ جانا، دادا عظم کا لفاف، بند کرہ اس پر لٹکا ہوا تعویذ، ان سب چیزوں نے اسے سخت البحص میں ڈال دیا تھا، اس کی پر جتنی طبیعت اسے اس بات پر اکسا رہی تھی کہ وہ کسی طرح اس کا لی دیواروں والے کمرے میں داخل ہو جائے۔

اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کرے کی چالی کس کے پاس ہے۔ اس نے سوچا اس سلطے میں خالہ فرزانہ سے بات کرنا چاہئے۔ چالی اگر اس گھر میں ہوئی تو اسیں ضرور معلوم ہو گا کہ کہاں ہے۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی جلدی دوچار پکوڑے اور کھائے، چائے لے اور فوراً نیچے بھاگی۔

خالہ فرزانہ کے بیڈ روم میں پہنچنے تو اس نے دیکھا کہ افضل بیٹھا ہوا خالہ سے باتیں کر رہا ہے۔ اسے دیکھ کر دونوں نے خوش آمدید کہا۔ ”آؤ تانیہ۔“ خالہ فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

”بارش کا منہ لے رہی ہیں آپ؟“ افضل نے منہ کر پوچھا۔

”ہاں، بھائی، مجھے بارش بہت پسند ہے، میرا بھی چاہتا ہے، ایسی بارش میں نہماں۔“

”تو نہماں، کس نے روکا ہے۔“

”ارے، افضل کیا بات کر رہے ہو؟“ خالہ فرزانہ نے تبیہ کی۔ ”ہرگز نہیں، بیمار ہو جاؤ گی۔“

”سن لیا بھائی۔“ تانیہ نے منہ کر کہا۔

”ارے تانیہ اچھا ہوا، تم آگئیں، میں تمہیں بلوانے والی تھی۔“ خالہ فرزانہ نے سنجیدہ لبجے میں کہا۔ ”ابھی میں افضل سے سی بات کر رہی تھی۔“

”کیا خالہ؟“

”وہ وردانہ بیماری تھی کہ وہ موکا لے کر ڈیوں والا پھر آیا تھا۔ اپنا اٹو والیں لینے۔“

”اٹو تو اسے ملا نہیں، خالی پیچھوے لے گیا اور ساتھ میں آئندہ ملاقات کا وقت دے گیا۔“ افضل نے معنی خیز تبسم کے ساتھ کہا۔

”جی بھائی، وہ کہہ گیا ہے کہ صحراء میں ملے گا۔“ تانیہ نے بڑی سادگی سے کہا۔ ”پڑھ نہیں کون شخص ہے میں نے تو آج تک اسے دیکھا نہیں۔“

”اب تو اس سے ملنے کے لئے صحراء کا رخ کرنا پڑے گا۔“ افضل نے کہا۔

”اللہ نہ کرے۔ افضل تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔“ خالہ فرزانہ نے افضل کو یار سے ڈالنا۔

”بھائی، ایک بات تو تائیں۔“ تانیہ نے موضوع تبدیل کیا۔

”جی فرمائیے۔“ افضل نے پوچھا۔

”اس کا لی دیواروں والے کمرے کی چالی کہاں ہے؟“ تانیہ نے سوال کیا۔

”کیوں نہیں؟“ خالہ فرزانہ ایک دم سم گئی۔ ”اے تانیہ، یہ اچانک تمہیں چالی کا خیال کیے آیا؟“

دو گونٹ پانی پیا۔ پھر سیدھی لیٹ کر چھت کو خالی نظروں سے گھورنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کا خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔

یہ برا عجیب تجربہ تھا۔ یہ اس کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ دروازہ اس طرح کھلا جائے گا۔ وہ اس کرنے کے اندر جانے کی خواہش تو رکھتی تھی کیونکہ واوا عالم نے اس دروازے کی تصویر بنا کر اس کے خواب کو اس دروازے سے منسلک کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ اس پر اسرار دروازے کی چالی ملکاں کر رہی تھی۔ جب چالی کے بارے میں اسے کوئی واضح معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو وہ بایوس سی ہو گئی تھی لیکن سورج ڈوبتے ڈوبتے اس کی بایوس پر تجسس اور شوق غالب آتا چلا گی۔ جیسے وہ کسی نادیدہ مخلوق کے اڑیں آگئی ہو۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی غیر انانی مخلوق نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہو اور گن پوائنٹ پر انداز کر کے کسی کو اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے بالکل ایسے ہی اس نادیدہ مخلوق نے تانیہ کو اس طرح جکڑ لیا کہ وہ بے بس ہو کر اس کا حکم بانی جلی گئی۔

تب اس پر مکشف ہوا کہ وہ پر اسرار دروازہ کھلا ہوا ہے لاک نہیں ہے۔ یہ جانے کے باوجود کہ دروازہ مقتول نہیں ہے، وہ اندر نہیں جاسکی۔ اندر جاتا تو دروکی بات ہے، وہ دروازہ کھول کر دیکھنے کی۔ ذرا سا دروازہ کھلتے ہی اسکی ٹھنڈی ہوا آئی کہ خدا کی پناہ۔ اس کرنے میں تو ٹھریں بھی نہیں تھیں پھر بھی اس قدر ٹھنڈی ہوا۔

اس تجربے سے یہ توفیکہ ہوا کہ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ دروازہ مقتول نہیں ہے۔ یہ بات وہ خالہ فرزانہ اور افضل بھائی کو بتانے تو وہ کتنے حیران ہوں گے۔ شاید خوفزدہ بھی ہو جائیں۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ وہ اس راز کو راز ہی رہنے دے۔ کسی کو نہ بتائے کہ دروازہ کھلا ہے اور دن میں موقع پا کر خاموشی سے اندر چل جائے۔

اسی طرح کی باتیں سوچتے سوچتے کوئی تین بیجے کے قریب اسے نیند آگئی۔

رات کو دیر سے سوئی تھی تو صبح جلدی اٹھنے کا سوال ہی نہ تھا۔ دروازہ بند اور پر کے چکر لگانی تھی۔ ہر بارے دروازہ بند رہا تھا۔ تانیہ کے بارے میں خالہ فرزانہ کی مرتبہ پوچھ پچھی تھیں۔ انہیں ہر باری ہی جواب ملا تھا۔ ”بڑی بی بی، وہ سوری ہیں، دروازہ اندر سے بند ہے۔“

تب انہوں نے مجبوراً اپنے بیٹی پر کی ناشتہ مگلو کر کر لیا تھا۔ اپنے بیٹے سے دوبار پان ٹکال کر بھی کھا پچھی تھیں۔ اخبار بھی پڑھ لیا تھا۔ مگر تانیہ کے اٹھنے کی خبر بھی تک نہیں آئی تھی سائز ہے تو بے کے قریب افضل دفتر جانے سے پہلے انیں اللہ حافظ کئے آیا تو خالہ فرزانہ کو وقت کی عینی کا احساس ہوا۔

انہوں نے سایہ نہیں پر کر کی تائماں پیس پر نظر ڈالی۔ سائز ہے نونج رہے تھے۔ انہوں نے بڑی بے چیزی سے اواز لگائی۔ ”دروانہ۔“

دروانہ ان کے کرنے کی طرف آرہی تھی۔ آواز سن کر وہ باہر ہی سے بولی۔ ”آئی بڑی بی بی۔“ کرنے میں آئی تو وہاں افضل کو بھی کھڑا پایا۔

”اچھا خالہ، میں چل رہا ہوں، اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ کرنے سے نکلنے لگا۔

پیا۔ اس کے حواسِ مجال ہوئے تو وہ انہ کروش روم گئی۔ وہاں سے نکلی وہ خیالِ جو شام سے اس کے دل میں بار بار آ رہا تھا۔ اچانک اس نے پھر سر اٹھایا۔

کوئی اسے اس بات پر اکسرا رہا تھا کہ وہ انہ کر نجیج جائے۔ باہر اب بھی بکلی بکلی بارش ہو رہی تھی۔ اور اس کے دل میں نجیج جانے کا خیالِ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

تب وہ انتخیار ہو کر انہ اور کسی سخر زدہ معمول کی طرح آہست آہست سیڑھیاں اترنے لگی۔ رات کے سانچے میں بھیگردوں کے بونے کی آوازیں بہت صاف سنائی دے رہی تھیں۔

اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ کب وہ اس بند دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ جس کے پینڈل میں کا ہے دھاگے اور کا لے کر ٹرے میں لپٹا ایک تعویذ لکھا تھا۔

تعویذ کو ہاتھ لکائے بغیر اس نے پینڈل پر ہاتھ رکھا۔ تب بے انتخیار اس کی زبان سے نکلا۔ ”ارے!“

واقعی یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ اس کی زبان سے ٹھیک ہی ”ارے!“ نکلا تھا۔ ایک طویل عرصے سے اس دروازے کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ مقتول ہے لیکن وہ مقتول نہ تھا۔

تانیہ بنے جیسے ہی تعویذ کو ہاتھ لگائے بغیر پینڈل کو گھا بیا تو وہ فوراً گھوم گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر سے سردی کی ایکس ٹیز لبر آئی۔ سخت ٹھنڈی ہوا تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اندر ایک ساتھ کمی ایئر کنٹریشن چل رہے ہوں۔ سردی کی امر کے ساتھی خوف کی لہر بھی آئی جو سیدھی ریڑھ کی ہڈی میں اترنی چل گئی دل کپکا اٹھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

یہ کیفیت چند لمحوں میں ہوئی۔ اس سے پہلے تانیہ پر خوف کی کیفیت کے ساتھے شوق کی کیفیت طاری تھی۔ شام ہی سے کوئی اسے دروازے کی طرف بھیج رہا تھا۔ پھر رات کو جب وہ ایک خواب سے چونکہ کہ اٹھی تو دروازے پر جانے والی خواہش نے شدت انتخیار کر لی اور وہ کسی سخر زدہ معمول کی طرح اس پر اسرا دروازے پر آکھڑی ہوئی اور پھر اس نے بے دھڑک پینڈل پر ہاتھ رکھ رکھ دیا۔

تھوڑا سا دروازہ کھلتے ہی خوف چکا ڈر بن کر اس کے جسم سے چٹ گیا۔ وہ تھرا اٹھی۔ اس نے فوراً دروازے کا پینڈل اپنی طرف کھینچ لیا، دروازہ بکلی کی ”کٹ“ کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس نے اپنے دیکھا رہا ہی میں کوئی نہیں تھا۔ اس وقت وہاں کوئی ہوتا بھلا۔ سب اپنے کمزور میں سور ہے تھے۔

وہ لڑکھڑا تے قدموں سے چلتی زینے کی طرف آئی اور پھر جلدی جلدی سیڑھیاں پھلاٹنی اور پہنچنی۔ اپنے کرنے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دروازے سے پشت لگا کر باپنے گئی۔

تیجھی بڑے زور سے بکلی چکی، بادل گر جے اور ایک دم موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ غضا بڑی ہولناک ہی ہو گئی۔ وہ دھیرے دھیرے پہنچ کر طرف آئی اور دم سے کٹے ہوئے۔ سہیتکری طرح اس کی گر پڑی۔ کچھ دیر اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر جگ لٹھایا اور اسی سے منہ لگا کر

پھنسا بھی کوئی وہم میں بٹلا کرنے والی بات ہے۔ مگر نہیں، ان کے نزدیک تو یہ بڑی خطرہ اک بات تھی۔ برا شگون تھا اور اس کے توڑ کے لئے انہوں نے لال مرچ ڈال کر پھٹے ہوئے دودھ کو ایک ابال دینے کو کہا تھا۔

پر دردانہ بھی ایک ہی چیز تھی۔ وہ ان کے سامنے تو پکھنہ بولتی تھی لیکن ان کے کے پر کبھی نہ چلتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ان کی ہدایت پر کچن میں چلی گئی تھی اور دودھ بھی سنک میں بہادی تھا مگر اس میں لال مرچ نہ ڈالی تھی۔ وسکھی دھوکر وہ جلدی سے اپر چل گئی۔

اور پچھتی تو دردانہ کو دروازہ کھٹکتا نے کی ضرورت نہ پڑی۔ دروازہ کھل چکا تھا اور تانیہ تو یہ سے منہ پوچھتی ہوئی واش روم سے نکل رہی تھی۔ تانیہ اسے دیکھ کر مسکرا کی اور دھیرے سے بولی۔ ”جی؟“ ”سلام بی بی۔“ دردانہ نے اس کے ہاتھ سے تو یہ لے کر گلبری میں پھیلایا اور پھر واپس آکر بولی۔ ”بی بی آپ کو بڑی بی بی نے بلایا ہے۔“

”مجھے آج اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ کیا غالہ نے ناشتہ کر لیا۔“ ”ہاں جی، ناشتہ کر لیا اور پان بھی کھالیا۔ اب وہ پریشان ہیں کہ آپ اب تک کیوں نہیں اٹھیں۔“

”ان کی پریشانی بجا ہے۔“ تانیہ نے فرماتھرداری سے کہا۔

”ایک خریہ ہے بی بی کہ درود پھٹ گیا۔“ دردانہ نے بڑی سنجیدگی سے بتایا۔ ”تو اور آجائے گا۔ اس میں پریشانی والی کیا بات ہے بھلا۔“ وہ نہ کر بولی۔ ”ہائے بی بی، آپ کتنی ابھی ہیں۔“ دردانہ اس کا جواب سن کر خوش ہو گئی۔ ”میں سچھی نہیں تمہاری بات دردانہ؟“

”بڑی بی بی نچھے پریشان ہیٹھی ہیں۔ ان کے خیال میں آج کے دن ضرور کچھ ہو کر رہے گا۔“ دردانہ کا یہ جملہ اس کے دماغ پر تھوڑے کی طرح لگا اسے فوراً رات کا واقعہ یاد آگیا۔ پراسرار کر کے کار دروازہ مغلنہ تھا، وہ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا تھا۔ اور یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ اگر وہ یہ راز جاکر غالہ فرزانہ کو تبادلے تو ان کا وہ یقین میں بدلت جائے گا۔ اس سے بڑی اور اس سے بڑی خر آج کے دن اور کیا ہو سکتی تھی۔

”آپ کو کیا ہوا بی بی۔ آپ کا چہرہ ایک دم بدلت کیوں گیا؟“ دردانہ نے ٹوکا۔ ”کچھ نہیں دردانہ مجھے تو کچھ نہیں ہوا، میں تمہاری بڑی بی بی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ وہی نہیں ہوتی جا رہیں۔“

”ہاں بی بی، بہت زیادہ، انہوں نے کما تھا کہ پھٹے ہوئے دودھ میں لال مرچ ابال کر دودھ سنک میں بہادو۔ بی بی میں ایسے ہی دودھ بہا آئی ہوں۔ میں نے ٹھیک کیا ہا۔“ ”ہاں، دردانہ تم نے ٹھیک کیا..... یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔“ تانیہ نے اس کی تائیکی کی۔ ”بی بی، اللہ آپ کو خوش رکھے۔“

”بڑی بی بی..... وہ دودھ پھٹ گیا۔“ دردانہ نے خبر شائعی، وہ یہ خبر دینے کے لئے ہی ادھر آرہی تھی کہ غالہ فرزانہ نے اسے آواز لگادی تھی۔

”ہائے۔“ غالہ فرزانہ نے بڑا سامنہ کھول کر اس طرح اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے چھیسے دودھ نہ پشاہو، بم پھٹ گیا ہو۔ ”اری، یہ تو نے صحیح ہی صحیح کیا خبر شادی۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ ہائے افضل ذرا ایک منٹ ٹھہرو۔“ یہ کہہ کر غالہ منہہ ہی منہہ میں کچھ پڑھنے لگیں۔

”ارے، غالہ کچھ نہیں ہوا، دودھ پھٹا ہے اور آجائے گا۔ میں دودھ والے سے کتنا جاؤں گا، وہ ابھی آکر دے جائے گا۔ آپ تو دن بدن وہی ہوتی چلی جاوی ہیں۔“ افضل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”افضل تمہیں نہیں معلوم، دودھ کا پھٹنا اچھا نہیں ہوتا۔“ افضل پر تین پھوٹکیں مار کر کہا۔ ”کیا ہو جاتا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”اللہ کرے آج کا دن خیریت سے گزر جائے۔“ سوال کا براہ راست جواب نہ ملا۔ ”ارے چھوڑیں خالہ۔ کچھ نہیں ہو گا۔ خراب دودھ تھا، پھٹ گیا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ وہم مت سمجھے گا۔“

”اچھا، ٹھیک ہے تم جاؤ۔ اللہ حافظ۔“ افضل کے جانے کے بعد وہ دردانہ سے مخاطب ہوئیں۔ ”دردانہ، ایسا کرو پھٹے ہوئے دودھ میں ایک لال مرچ ڈال کر اسے ایک ابال دے دو۔“

”اس سے کیا ہو گا بڑی بی بی؟“ دردانہ نے پوچھا۔ ”جو کہتی ہوں، وہ کرو، زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ غالہ فرزانہ نے غصے سے کہا۔

”جی، بڑی بی بی۔“ وہ فرانسیصل گئی۔ ”آپ نے مجھے آواز لگائی تھی؟“

”ہاں، دیکھو، جا کر تانیہ کو اٹھاؤ۔“

”دروازہ بند ہو تو ٹھکٹا دوں۔“

”ہاں..... کچھ کیس تو میرا نام لے دینا۔“ غالہ فرزانہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اور سن، اسے سے پہلے کچن میں جانا۔ دودھ میں لال مرچ ڈال کر، اسے ابال دے کر سنک میں بہارت۔ سمجھا تھا نامیری بات۔“

”جی، ابھی طرح۔“ دردانہ نے بڑی سعادت مندی سے کہا اور ان کے کمرے سے نکل آئی۔

پڑھ نہیں یہ بڑی بی بی کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ بات بات پر وہم کرنے لگی تھیں۔ کوئی چھینک دیا تو کیہ چھینکا۔ بالوں میں لکھنگی الجھ گئی یا بال سمجھاتے ہوئے لکھا ہا تھے سے نکل کر زمین پر جا چڑا۔ دیوار پر بی گزر گئی۔ کوئی گلاؤٹ گیا۔ منی پلانٹ کا کئی پزار دھو گیا۔ کسی کو ٹکنی آگئی۔ رات کو کیسی۔ مرغ کی بانگ کی آواز آگئی۔ یہ یا اسی طرح کی کوئی بات ہو گئی اور بڑی بی بی لگ گئیں اس کے پیچے۔“

جھول رہا تھا۔ خالہ فرزانہ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے خالہ کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے خالہ فرزانہ کو میلیغون پر جیخ جیخ کر بتیں کرتے ہوئے پایا۔ تانیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اُسیں سلام کیا اور ان کے قدموں میں قائم پر بیٹھ گئی۔

”لوہ آگئی۔“ خالہ فرزانہ نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور میلیغون پر اس کے بارے میں بتایا۔

”خالہ کس کافون ہے۔“ تانیہ نے خوش ہو کر تجسس سے پوچھا۔

”تمہارے عمار اکل کا۔“ خالہ فرزانہ کے چڑے پر ایک رنگ آیا ہوا تھا۔

”ہا۔“ وہ خوشی سے چلائی۔ ”لائیں فون مجھے دیں۔“

”لو بھتی، تانیہ سے بات کرو۔“ خالہ فرزانہ نے رسیمہر تانیہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”السلام علیکم اکل۔“ تانیہ نے پر خلوص لبے میں کہا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

”وعلیکم السلام..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”اکل آپ نے اتنے دونوں کے بعد فون کیوں کیا؟“

”اتنے دونوں کے بعد؟ کیا مطلب چار پانچ منیتے ہو گئے کیا؟ ابھی پانچ دن پہلے ہی تو کیا تھا۔“ اکل عامر نے ہنس کر کہا۔ ”کیوں خیریت تو ہے تانیہ۔“

”ہاں، اکل سب خیریت ہے۔“ تانیہ نے گمراہیں لے کر کہا۔

”لیکن مجھے تو تم پکھ پریشان نظر آرہی ہو۔“ اکل عامر نے قیافے سے کام لیا۔

”ارے نہیں اکل..... ایسی کوئی بات نہیں۔ بے شک آپ خالہ فرزانہ سے پوچھ لیں۔“ تانیہ نے خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں، مجھ سے پوچھ لو کیا پوچھنا ہے؟“ خالہ فرزانہ نے بات سمجھے بغیر تانیہ کی تائید کر دی۔

”تانیہ تم وہاں خوش تو ہو۔“ اکل عامر نے فرمدے لبے میں کہا۔ ”فرزانہ تمہارا خیال تو رکھتی ہیں ہا۔“

”کوئی ایسا دیسا۔“ تانیہ نے بڑے جوش سے کہا۔ ”خالہ فرزانہ تو مجھ پر جان چھڑکتی ہیں جان۔“

”کمال ہے بھتی..... یہ تمہاری خالہ فرزان آخڑ کس پر جان چھڑکتی ہیں۔“ اکل عامر نے ہنس کر کہا۔

”خالہ نے آپ کو کچھ کہا ہے کیا؟“ تانیہ نے خالہ فرزانہ کو شوخ نظر وہ سے دیکھتے ہوئے منی خیز لبے میں پوچھا۔

”وروانہ، ایک بات بتاؤ، تم اس گھر میں کب سے ہو؟“

”کوئی چار سال تو ہو گئے ہوں گے۔“ ”وروانہ نے فواؤ جواب دیا۔

”تم نے کبھی اس دروازے کو کھلا دیکھا ہے جس پر تعویذ لٹکا ہوا ہے۔“

”نہیں بی بی۔“ ”وروانہ نے تانیہ کو الجھے انداز میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کبھی تمہارے دل میں جتنی نہیں ہوا کہ اس دروازے کو کھول کر دیکھا جائے۔“ ”تانیہ نے سوال کیا۔

”شروع شروع میں خواہش تو ہوئی کہ دیکھوں اس کمرے میں کیا رکھا ہے لیکن بڑی بی بی نے کچھ اس طرح تنبیہ کر دی تھی، اس کمرے کے بارے میں کہ میں کبھی اس دروازے کے سامنے بھی نہیں کھڑی ہوئی۔ پھر بڑی بی بی نے تعویذ کی وجہ سے دروازے کی صفائی کو بھی منع کر دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی خود ہی صاف کر دیا کرتی ہیں دروازے کو..... لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔؟“

”ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔“ ”تانیہ نے شیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

”بی بی آپ کو اس گھر میں آئے ہوئے ایک سال کے قریب ہو گیا۔ آج تک تو آپ نے کبھی پوچھا نہیں۔“

”میں نے ایک مرتبہ خالہ فرزان سے پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا کہ اس میں کاٹھ کبڑا ڈا ہے۔ ایک طرح کا اسٹور ہے۔ اس تعویذ کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ سابقہ مالک مکان نے لٹکایا ہے۔ تاکہ گھر میں برکت رہے۔ میری طبیعت میں کوئی کھونج نہیں۔ اس لئے کبھی اس کمرے کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔“

”تو اپ کیا ہوا؟“ ”وروانہ نے سوال کیا۔

”اب میرا تھی چاہتا ہے کہ میں اس کمرے کا نہ ازاں معلوم کر دیں۔ دروانہ کیوں نہ ہم دونوں مل کر اس کمرے میں چلیں۔“

”مجھے تو بی بی آپ معاف رکھیں۔“ ”وروانہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ابھی یہاں ملازمت کرنی ہے جی۔ ایسا اچھا گھر، ایسے اچھے لوگ مجھے کہاں ملیں گے مجھے آپ نوکری کرنے دیں۔“

”اچھا جاؤ، میرا ماشتو لاؤ اور اس بات کا تذکرہ خالہ سے نہ کرنا۔ میں خالہ کے کمرے میں جا رہی ہوں میرا ماشتو دیں لے آتا۔ پر دودھ کا کیا ہو گا۔“

”آپ بے فکر ہو کر جائیں، میں بڑی بی بی سے کچھ نہ کیوں گی۔“ ”وروانہ نے بڑی صداقت سے کہا۔ ”صاحب دودھ والے کو کہتے ہوں گے۔ دودھ ابھی آ جاتا ہے۔ دیسے گھر میں خشک دودھ کو ہے۔“

خالہ فرزانہ کے کمرے میں جاتے ہوئے جب تانیہ کی نظر اس پر اسرار دروازے پر پڑی تو اچانک اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دروازہ جوں کا توں بند تھا اور دیسے ہی دروازے کے پینڈل پر کالا تعینا

”بائلکل نیک ہے۔ تمہیں اکٹھیا دکرتی ہے۔“
”میں بھی اسے یاد کرتی ہوں۔“ تانیہ نے کہا۔

اکل عامر نے ووچار باتیں اور کیں۔ اور انہوں نے وہی کما جو وہ اکٹھ کر تے تھے ان کے میلیغون کا مقصد ہی ہوتا تھا کہ وہ خود کو خوش رکھے اور یہ کہ وہ جلد ہی اسے آکر لاہور لے جائیں گے۔ تانیہ نے چاہا کہ وہ خواب ویکھنے سے لے کر اس پر اصرار کرے تک کی ساری ررواؤ بیان کروئے۔ مگر وہ کچھ سوچ کر رک گئی وہ جانتی تھی کہ یہ سب سن کر وہ پریشان ہو جائیں گے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اکل عامر اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ اس کی وجہ سے پسلے ہی پریشان تھے۔ یہ واقعات تو انہیں بوکھلا کر رکھ دیں گے۔

اکل عامر نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ان کی عمر پچاس سال سے کیا کم ہو گی۔ خالہ فرزانہ ان سے ووچار سال چھوٹی ہوں گی۔ نوجوانی کے زمانے میں اکل عامر اور خالہ فرزانہ کے رومیان زبردست عشق چلا تھا۔ وہ نوں ایک وسرے پر جان دیتے تھے لیکن اپنی اس محبت کو انہوں نے کبھی رسوانہ ہونے دیا۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن خاندانوں میں وشنیاں ہوتی ہیں وہیں محبت بھی سراخھائیتی ہے۔ اسی خاندان میں وہ باغی بیدار ہو جاتے ہیں جو اپنی محبت کے آبشار سے نفرت کے الاؤ کو ٹھہڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ نفرت کے اس قلعے کو سمار کرنا تو وہی بات ہے، وہ اس کی فضیل کا ایک پھر بھی نہیں اکھاڑ سکیں گے، خاندان جتنا بڑا ہوتا ہے اتنی وہاں وشنیاں ہوتی ہیں۔ خاندان کے لوگ ان وشنیوں کو کم کرنے کے بجائے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عامر اور فرزانہ بھی ایسے ہی خاندان کے فرد تھے۔

وہ نوں یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جو کھلیل وہ شروع کر رہے ہیں۔ اس کا انجام جدائی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔ والدین ان وہ نوں کو ایک قبرستان میں وفاتاً تو گوارہ کر لیں گے لیکن زندگی کے آنکھ میں اکھاڑ ہونے دیں گے۔ پھر یہ محبت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے کسی مغلقت کو نہیں جانتی نہ اس کی آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ کان ہوتے ہیں، اندر ھی اور بہری ہوتی ہے۔ نہ ذات ویکھتی ہے، نہ رنگ و نسل ویکھتی ہے۔ غربت اور امارت اس کے سامنے چیز ہیں۔ بخیر عامر اور فرزانہ کے خاندان میں زیمن آسان کافاصلہ تھا۔ اور اس فاصلے کو سرے سے مٹانا تو وہ کبی بات ہے، کم کرنا بھی آسان نہ تھا۔

عامر نے فرزانہ کو سب سے پسلے ایک شادی کی تقریب کی ویڈیو میں ویکھا تھا۔ فرزانہ کو ویکھ کر اس نے ایسا چھوٹا کیا تھا جیسے اچانک ہی زندگی کی منزل سامنے آگئی ہو۔ پھر اس نے فرزانہ کو مندی کی ایک تقریب میں دیکھا۔ ایسی تقریبوں میں اتنا شور، اتنا جوش و خوش ہوتا ہے کہ کچھ دیور کے لئے آدمی اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے فرزانہ کو معلوم نہیں تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ عامر لڑکے والوں کی طرف سے تھا اور فرزانہ لڑکی والوں کی جانب سے مدعا تھی۔ اسے اگرچہ گانہ نہیں آتا تھا لیکن اس کی سیلیوں نے اس کا

”اے تانیہ، تم آخر میرا نام بار بار کیوں لئے جا رہی ہو؟ میں نے کیا کیا ہے۔“ خالہ فرزانہ نے مداخلت کی۔

”خالہ پریشان ہو رہی ہیں، وہ کہہ رہی ہیں کہ بار بار میرا نام کیوں لے رہی ہو، میں نے کیا کیا ہے؟“ تانیہ نے خالہ فرزانہ کی بات درہائی۔

”ان سے پوچھو کہ اب اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“ اوہر سے عامر اکل نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس سے پسلے بھی کچھ کرچکی ہیں۔“ تانیہ شرارت سے بولی۔

”بہت کچھ کرچکی ہیں۔“ اکل عامر نے فوڑاً نواب دیا۔

”اچھا، میں خالہ کو جاتا ہوں۔“ تانیہ نے ریسیور میں کما پھر خالہ فرزانہ سے مخاطب ہو کر بولی۔

”خالہ، اکل پوچھ رہے ہیں، اب اور کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ ساتھ میں وہ یہ بھی کہ رہے ہیں کہ خالہ بہت کچھ کرچکی ہیں۔“

”غصب خدا کا۔“ خالہ فرزانہ نے اپنا سرچینٹ لیا۔ ”یہ عامر کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کس قسم کی ٹھنگو کرنے لگے ہیں۔“

”خالہ پوچھوں، اکل سے۔“ تانیہ نے سوال کیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں۔“ اوہر سے پوچھا گیا۔

”تانیہ، اگر تم نے فضول بکواس کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“ خالہ فرزانہ کچھ پریشان سی ہو گئیں۔

”کیا کہہ رہی ہیں، کچھ بولو تو۔“ اوہر سے مسلسل اصرار ہو رہا تھا۔

”سوری اکل، میں کسی کی ذاتی باتیں آپ کو نہیں بتا سکتی۔“ تانیہ نے خالہ فرزانہ کے تیور ویکھ کر کہا۔

”اچھا چلو، چھوڑو، یہ جاؤ تم خوش تو ہو دہا۔“ عامر اکل نے پوچھا۔

”میں یہاں بہت خوش ہوں، خالہ فرزانہ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ پھر بھی میرا لاہور جانے کو جی چاہتا ہے۔“

”کچھ اور رک جاؤ، میں تمہیں خود لینے آؤں گا۔“ اکل عامر کے لیے میں فکر مندی تھی۔

”یہ بات تو آپ پوچھنے کی ماہ سے کہ رہے ہیں۔“ تانیہ نے الجھ کر کہا۔

”تمہیں کچھ اور پیسے بھیج دوں۔“ اکل عامر نے اسے بھلانا چاہا۔

”اکل میں چیزوں کا کیا کروں گی۔ پیسے میں میرا مسئلہ نہیں ہے اکل۔“

”میں تمہارے مسلسل کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن تمہیں کچھ سبھ کرنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے اکل جیسا آپ حکم فرمائیں۔“ تانیہ نے گمراہیں لے کر موضوع بدلا۔ ”وہ صائمہ کیسی ہے؟“

پڑا۔ اگرچہ اس کے کی اس حرکت پر غصہ تھا لیکن یہ غصہ دھیرے دھیرے عائب ہوتا جا رہا تھا۔

جب اسے معلوم ہوا کہ عامر کس گھر کا لڑاکا ہے تو وہ ایک دم سم اٹھی۔ یہ آگ کس نے اس کے دل میں بھڑکا دی تھی۔ بہرحال یہ آگ جس نے بھی بھڑکائی تھی، بھڑک اٹھی تھی، فرزانہ خود کو جلنے سے محفوظ کرنے کی ہزار تدبیر کے باوجود، اپنے وجود کو آتشِ عشق سے نہ بچا سکی۔

عامر بھی عجیب لڑکا تھا اس نے اپنی محبت کو ابتداء کے بجائے انتہا سے شروع کیا تھا لوگ پہلے محبت کرتے ہیں۔ پھر شادی کی آفریدی تین اس نے پہلے شادی کی پیشکش کی، بعد میں اقرار محبت کیا۔

کلائی زخمی ہونے کے بعد فرزانہ کو عامر جمال کیسی نظر آیا، وہ اسے دیکھتے ہی بھاگتی، چھپنے کی کوشش کرتی لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں ان دونوں کے درمیان فاصلے کم ہوتے گئے اور پھر یہ محبت عام ہونے لگی دونوں اپنی محبت کو روایتی سے پہنچا چاہتے تھے لیکن کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں طرف کے لوگ اس محبت کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتے۔

ساری کوششوں کے بعد بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ خفیہ شادی کر لی جائے۔ اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا لیکن یہ شادی بھی اس شر میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لئے دونوں کو اپنا شہر، اپنا گھر چھوڑنا تھا۔ فرزانہ اگرچہ اپنا گھر چھوڑنے پر راضی نہ تھی لیکن عامر کے مجبور کرنے پر مجبوراً راضی ہو گئی تھی۔

اور جس رات فرزانہ نے اپنا گھر چھوڑا تھا اتفاق سے اسی شام اس کے والدے اپنے کمرے میں بلا یا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سرپر کھاتا اور کما تھا۔ ”فرزانہ میری قسم کھاؤ کہ تم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاوے لیں جس سے اس گھر کی عزت منی میں مل جائے۔“

تب فرزانہ کو اپنی بھیگی آنکھوں سے یہ قسم کھانی پڑی اور یوں حالات نے ایک عجیب رخ اختیار کر لیا فرزانہ ترقی رہی مگر گھر سے نہ نکل سکی عامروقت مقربہ پر گلی کے اس موڑ پر ہبے کے نیچے پہنچ چکا تھا۔ اسے فرزانہ کا انتظار تھا۔ مگر فرزانہ نہ آئی۔

بارش آگئی۔ سردی نکے موسم میں وہ کئی گھنٹے اس کے انتظار میں لکھا بارش میں بھیگتا رہا۔ جب وہ زرانہ کی آمد سے بالکل مایوس ہو گیا تو لکھڑا تے قدموں سے چلتا ہوا میں روڑ پر آیا۔ صبح زندیک تھی۔ یہ بھی روک کر وہ اس میں بیٹھ گیا اور اس میں بیٹھتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

بھی واپسے اسے اپنالیا پہنچایا۔ اس کے ساتھ ایک سوٹ کیس تھا وہ اس نے اپنالیا والوں کے حوالے کیا اور اپنی بھی لے کر وہاں سے نکل گیا۔ صبح اتنی بھی بہت تھی۔

بارش میں مسلسل بھیگنے، کئی گھنٹے ایک جگہ کھڑے رہنے، بخت سردی، محبوب کا انتظار اور پھر محبوب کے نہ آئنے کا سخت صدمہ، عامر کے اعصاب شکستہ ہو گئے۔ نہ سب بیک ڈاؤن ہوا۔ بھی واپسے کے

ہاتھ کپڑ کر بھالیا تھا۔ گانوں کا مقابلہ جاری تھا۔ اسی محفلوں میں سمجھی گی کم بے ہو گی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ ہر طرف ایک شور پہا تھا۔

اور اسی شور پہا میں وہ ایک طرف کھڑا اسے ایک نک دیکھ جاتا تھا۔ نظر کی یہ تکنیکی بالآخر اپنا اثر دکھانے میں کامیاب ہو گئی۔ تایاں بجا تے بجا تے فرزانہ کی جو نظر، میں جا ب اٹھی تو اٹھی رہ گئی۔ عامر بلاشبہ ایک پرکشش اور اسارت لڑکا تھا۔ اس کی سفید رنگت، قد کاٹھ، بالوں کا اشتائل، آنکھوں کی جاہزیت نے فرزانہ کو مسحور کر دیا۔ عامر تو فرزانہ کی شخصیت سے پہلے ہی متاثر ہو چکا تھا۔ آج اسے اپنے سامنے دیکھا تو احساس ہوا کہ کیمرے نے اسے صحیح طرح ایکسپووزنہ کیا تھا۔ فرزانہ کا انداز بڑا شہنشاہ تھا جس نے اسے مزید دیوانہ کر دیا تھا۔

جب دونوں کی نظریں پہلی بار ایک دوسرے سے ملیں تو کہیں دور بجلی کڑی اور اس کی چک نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ نظریوں کے تکڑاؤ نے دونوں کے دونوں میں روشنی سی کر دی تھی۔ خوبصوری بھر دی تھی۔

فرزانہ بی اے کے پہلے سال میں تھی جبکہ عامر ایم اے کرچکا تھا اور ملازمت کی جلاش میں تھا۔ پھر جلد ہی اسے ایک کالج میں لیکچر شپ مل گئی۔ وہ لڑکوں کو انگلش ادب پڑھایا کرتا تھا وہ استاد تھا لیکن محبت کے کتب میں ابھی طالب محبت تھا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ دل سے دل کو رہ ہوتی ہے۔ آپ کسی سے پچی محبت کریں، کسی کو ٹوٹ کر چاہیں تو یہ ناممکن ہے کہ وہ آپ کی طرف متوجہ ہو۔ ویسے خاموش محبت بڑے ظلم ڈھاتی ہے۔ دانا کتے ہیں کسی سے محبت کرو تو اسے فوڑا چادو ورنہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں ملتا۔ البتہ زندگی بھر لوں سے وصول ضرور امتحار ہتا ہے..... لیکن عامر نے توکال ہی کرو دیا۔

اس نے اپنی محبت کا اتمہار، اس تیزی اور اس انداز سے کیا کہ فرزانہ سکتے میں آگئی۔ اور اپنی اس جرأت پر وہ خود شنسدر رہ گیا وہ اتنا بہادر تو نہ تھا، بہ شاید محبت آدمی میں طاقت پیدا کر دیتی ہے کیونکہ وہ بذات خود بہت طاقتور ہوتی ہے۔

فرزانہ کا تھا تھا کرتے ہوئے اور نظریوں سے نظریں ملاتے ہوئے ایک ایسا موقع آیا کہ عامر نے فرزانہ کو اپنے بہت قریب پایا تھے قریب دیکھ کر عامر کو جانے کیا ہوا شاید وہ خود پر قابو نہ رکھ پایا اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنامہ اس کے کان کے نزدیک لے جا کر سر گوشی کی۔ ”مجھ سے شادی کریں گی۔“

فرزانہ ایک دم نانے میں آگئی۔ اس کی سمجھی میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے حواس بحال ہوئے تو سب سے پہلے اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا، اس نے ہاتھ اتنے زور سے کپڑا تھا کہ کئی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی کلائی کو زخمی کر گئیں۔ ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے دھیمے مگر سخت لبجے میں کہا۔ ”چھوڑیں میرا ہاتھ۔“

عامر نے فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”چکچکے دیوانے پیں آپ؟“ فرزانہ یہ کہ کر پیچھے ہٹ گئی۔ خدا کا شکر تھا کہ اس ”ہاؤ ہو“ میں کسی نے اس بات کا نوٹ نہیں لیا تھا۔ اس کی کلائی زخمی ہو گئی تھی لیکن یہ زخم صرف کلائی پر نہ لگا تھا کہیں دل

فرزانہ کے اعصاب قابو میں آئے۔
دلو بات کرو، خدا کے واسطے اب
چھپے کہا۔

”عامر مجھے معاف کر دو، میں نے تم سے بے وفائی ضرور کی ہے لیکن یقین کرو کہ میں بے وفائیں ہوں۔“

”فرزانہ، میں پوری رات بارش میں بھیگتا رہا، سردی میں بھٹکتا رہا۔ کھڑے کھڑے میں نے پوری رات کاٹ دی۔ میں نے قیامت کا انتظار کیا۔ تم کیوں نہیں آئیں فرزانہ؟“
 ”بُس اسی شام مجھ پر قیامت گز گئی۔ ابو نے مجھ سے قسم لے لی۔ پھر میں گھر سے نکل کر امین کیسے رسو اکرتی۔ عامر مجھ سے جرم ہوا لیکن میں جرم نہیں ہوں۔ مجھے اب اپنے باپ سے کیا ہوا عمد نہ جانا ہے۔ اب میں تم سے نہیں ملوں گی۔ لیکن میں تمہیں بھولوں گی نہیں۔ میں تمہاری ہوں، یہی شماری رہوں گی، یہ میرا تم سے عمد ہے۔ میری تم سے شادی نہ ہو سکی تو کیا ہوا اب کیا۔ مجھ سے شادی نہ کر سکے گا۔ لیکن تم ضرور شادی کر لیتا۔ مجھے بے وفا سمجھ کر بھول جانا.....“ فرزانہ اور جانے کیا کیا کہتی رہی، وہ جانے کیا کیا مستمارا رہا، پھر اس نے کیا کما اور فرزانہ نے کیا کیا۔ یہ کسی کو کیا کہتی رہا۔

پھر وقت نے ایک نئی کروٹ لی۔ پانچ چہ ماہ بعد فرزانہ کے لئے ایک رشتہ آیا۔ لاکا خاندان کا تھا۔
ڈاکٹر تھا، امریکہ میں رہائش پذیر تھا۔ اس رشتے سے کون انکار کر سکتا تھا بھلا۔
فرزانہ کو اس رشتے کی بینک پڑ گئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ رشتہ فوراً منظور کر لیا جائے گا تو اس
سے پہلے کہ اس کے ابو اس رشتے کے سلسلے میں اس سے بات کرتے، وہ ابو کے کمرے میں چل گئی۔ اس
نے ابو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا اور بولی۔ ”ابو! آپ کو میرے سرکی قسم مجھے اپنے آپ سے جدا
مٹت بچھے گا۔ میں اس گھر کی دبیزیر کو کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گی۔“
اور پھر یہی ہوا۔ فرزانہ کے ابو نے، ای نے، دیگر گھر والوں نے، خاندان والوں نے بت زور لگایا
ہذا بھجوں کیا مگر فرزانہ اپنے قفل سے نہ پھری۔ اس نے اپنے باپ کی بھی عزت رکھی اور اپنی محبت کی بھی
لارج نہیں کیا۔

شادی عاشر نہیں کی۔ اب نہ دشمنیاں رہیں۔ نہ وہ والدین رہے۔ نہ وہ خاندان والے رہے وہ چاہتے تو شادی کر لیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا کیا شیں۔ ہر چیز وقت پر اچھی لگتی ہے۔ اور گیا وقت کبھی لوٹ کر آیا نہیں۔

حالفہ فزانہ کو لاہور چھوڑے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو چکا تھا۔ بہنوں کے انتقال کے بعد خالہ فزانہ نے مستقل ہی بین کے ساتھ رہائش اختیار کر لی تھی۔ ان کی بین ایک ہی بینا تھا افضل، بین کے انتقال کے بعد افضل اور وہ تمارہ گئے۔ خالہ فزانہ کو وہی میں جو کچھ ملا، وہ اپنے بھانجے کے حوالے کر دیا۔ افضل کنسٹرکشن کا کام کرتا تھا۔ بیکلے بنانے کا فروخت کرتا تھا۔ وہ خالہ فزانہ سے آٹھ سال چھوٹا تھا، اب وہ چالیس کے پیٹھے میں تھا۔ شادی اس نے بھی نہ کی تھی۔ اور نہ ہی کرنے کا رادہ تھا۔ کہتا ہے یہی تھا کہ

دل میں نیکی آگئی ورنہ وہ اسے سڑک کے کنارے پھینک کر سوٹ کیس لے کر نکل جاتا تو عامر کی زندگی خوبی میں کوئی شبہ نہ رہتا۔ بروقت طبقی امداد نے عامر کی زندگی بچا دی۔ اگرچہ اسے اپنی زندگی بچ جانے کو خوش بنتا تھا۔ اس کے دامک، ادنا تا قوتہ و مالا جو کی تھی۔

امر کو فرما دے پر شدید غصہ تھا، اس کی سبھیں میں نہیں آیا تھا کہ وہ وعدے کے مطابق مقررہ جگہ پر کیواں پہنچتی۔ اسے غصہ ضرور تھا لیکن وہ غصے کے بجائے ہوش سے کام لینا چاہتا تھا جب تک اسے؛ صور تھاں کا متحملہ نہ ہو جاتے، وہ فرما دے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک اور مشکل در پیش تھی۔ وہ اپنی اس حالت کے بارے میں کیا بیان دے؟ گھر والوں۔ خاندان والوں نے دوستوں نے، سب ہی نے اپنی چوٹی کا زور لگالیا کہ عامر صحیح صور تھمال بتادے گیم۔ اکرے نے ائے لے کیا تھت کو کہیا قیمت مر رسوائیں کرنے جاتا تھا۔

جد، فرزانہ کو یہ معلوم ہوا کہ عامر کو بے ہوشی کی حالت میں اپسٹال میں داخل کیا گیا ہے تو وہ تمہارے پاس چاہا کہ وہ ہر قسم، ہر بندھن کو توڑ کر اپسٹال پہنچ جائے اور اس کا ہذا اٹھی۔ اس کا بے اعتیار جی چاہا کہ وہ اپسٹال میں اپسٹال کا کہہ سکتا تھا، کیا مات نہ تھا، لیکن، وہ روشن کر کے دستہ پر رکھ دیا تھا۔ وہ اپسٹال اپنے حاصل کر کے بڑے کہے اس کے پیش میں اپنے بزرگی کا پیش کر رکھ دیا تھا۔

تھی، یہ اس کے بُس کی بات تھی۔ وہ سکنے میں منہ دیئے بہت دیر تک روٹی رہی..... روٹی رہی اور اس زندگی کی دعائیں مانگتی رہی۔

شاید یہ فرزانہ کی دعاؤں کا ہی ارتھا کہ عامر بڑی تیزی سے صحت یا بہ ہو کر اپستال سے گھر آیا
ورنہ شروع میں ڈاکٹروں نے اس کی زندگی سے مابینی کاظمی کار دریافت کی۔ صحت یا بہ ہونے کے بعد ہم
اسے ایک ہی مکر تھی کہ کسی طرح فرزانہ سے رابطہ کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیوں نہیں
آئے۔

خود فرزانہ بھی پریشان تھی، وہ چاہتی تھی کہ غامر سے کسی طرح بات ہو جائے۔ وہ اس سے آخری بات کرنا چاہتی تھی اور آخری بار بات کرنا چاہتی تھی۔ پھر اسی نے راہ نکالی۔ اپنی ایک سیل کے ذریعے ٹیلیفا پر اس کے کالج بیکام بھجوایا۔ فرزانہ مقررہ وقت پر اپنی سیل کے گھر پہنچ گئی۔ سیل نے کرہ بند کر لیا۔ عامر کی فون کاں کا انقلاب شروع ہو گیا۔

وقت مقررہ پر میلیوں کی گھنٹی بجی۔ فرزانہ کی سیلی نے فون اٹھایا۔ عامرکی شناخت کے بعد اس۔ رسیپر فرزانہ کے باہم میں دے دیا۔ فرزانہ نے کامیتے تھوں سے رسیپر لیا۔

”عامر۔“ لرزتے ہونوں پر بکشل اس کا نام آیا۔ اور پھر ذمیم کے جیسے سارے گیٹ کھل گئے چسبات کاریلا آیا۔ دل میں دھواں سا اٹھا۔ گھٹنی گھٹنی سی جیچ اس کے منہ سے نکلی۔ اندر سے الہ آنسوؤں کے سیالاب کو وہ باوجود کوشش کے روک نہ سکی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ عامر سے غیر جذبیاتی الہ میں بات کرے گی۔ بات کرتے ہوئے ڈر ابھی نہ روئے گی مگر سب معاملہ اتنا ہو گیا۔ وہ بات کرنے پسلے ہی روپڑی اور اس قدر ثوٹ کر رونی کہ فرازدہ کی سیلی پریشان ہو گئی۔ اس نے اس کے باختہ رسیور چھکن کر عامر کو ہولہ کرنے کو کہا۔ اسے ایک گلاس یاں پایا۔ تسلی وی، ڈانٹا شاتب کہیں جا۔

متفل نہ ہونا۔

دوسر کا کھانا کھا کر وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی یہ سب سوچ رہی تھی کہ اچانک اس کے دل میں ایک اسراری اٹھی۔ اس کی آنکھیں بندی ہوئے گیں۔ اس کے کافنوں میں جیسے کوئی کہ رہا تھا کہ چلوتا ہے، اس پر اسرار کمرے کی طرف چلو۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ تائیہ کی معمول کی طرح اٹھ گئی۔ وہ نیچے پکجی تو اسے کوئی نہ دکھالی دیا۔ خالہ فرزانہ اپنے کمرے میں تھیں اور ان کا دروازہ بند تھا۔ درداش بھی اپنا کام سمیٹ کر اپنے کمرے میں جا پہنچی تھی اور افضل تو گھر میں تھا ہی نہیں۔ وہ بڑے اٹھیاں سے چلتی ہوئی اس پر اسرار کمرے کے سامنے پہنچ گئی۔ دروازے کے بینڈل پر ہاتھ رکھتا تو اس کا دل بری طرح دھڑکتے لگا۔ بینڈل پر ہلاکا بادوڑاں کر اس نے دروازہ کھولا۔ ابھی دروازہ تھوڑا سا مکھلا تھا کہ اندر سے ایک مرد انہ آواز آئی۔
”ابھی نہیں، رات کو آتا۔“

اس آواز میں ایک تینیہ تھی تغییر یا بلا وادہ تھا۔ بڑی گونج دار آواز تھی۔ لبجو اگر سخت نہیں تو زرم بھی نہ تھا۔ اگر کوئی آدمی ضروری کام میں مصروف ہوا تو آپ اس کے کام میں غل ہوتا چاہیں تو پھر اسی طرح کا جملہ سنائی دیتا ہے۔ اس آواز کو سن کر تائیہ کو بھی یہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ دروازہ کھول کر مغلالت چیخائی مرستک ہوئی ہو۔

اس نے فرادر واڑہ بند کر دیا۔ اول تدر واڑہ کھلا لای کرتا تھا۔ جتنا کھلا تھا اس سے اندر کے سوچ کچھ نظر نہ آیا تھا۔ وہ دھرمکتے دل کے ساتھ بھاگتی ہوئی میری ہمیں تھک آئی، تیزی سے میری ہمیں چڑھیں اور دھرم سے اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ خدا کا شکر تھا کہ کسی نے اس پر اسرار کمرے کو کھولتے اور پھر فروائی وہاں سے بھاگ کر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

رات کو اس نے جب دروازہ کھولا تھا تو دروازہ کھولنے ہی نہ ہوا کا ایک تیر جھوٹا اندر سے آیا تھا جیسے کمرے میں چار پانچ ایک رنگی نیز ایک ساتھ چل رہے ہوں لیکن اس وقت ایسا محسوس نہیں ہوا تھا۔ مٹھنڈی ہوا تھی نہ گرم ہوا تھی اور نہ ہی وہ بو تھی جو عرصے سے بند کروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مرتبہ ہوا کے مجھے آواز آئی تھی یہ بڑی پر رعب آواز تھی۔
”ابھی نہیں..... رات کو آتا۔“

تینیہ کے ساتھ اسے ہدایت کی گئی تھی اور اس ہدایت کے مطابق اسے رات کا انتظار کرنا تھا۔ جب سے اس نے اس کمرے کے بارے میں سنا تھا، وہ یہ سوچتی رہی تھی کہ اس کمرے کے اندر کوئی اسرار نہیں ہے، مخفی کسی غلط فہمی کی بناء پر اسے بند کر دیا گیا ہے۔ مگر اب آہستہ آہستہ ان کمرے کے اسرار اس پر کھلتے جا رہے تھے۔ اور وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اس کمرے میں ضرور کوئی چیز ہے۔ اس آواز نہ ہر بشپہ کو یقین میں بدل دیا تھا۔

اس نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ اس کمرے میں جا کر رہے گی۔ یہ علم کر کے رہے گی کہ وہاں کیا ہے۔ دادا عظم نے اس کمرے کے دروازے کی تصور بنائی تھی تو کچھ سوچ کر ہی بنائی ہو گی۔ وہ بے چینی

میں شادی نہیں کروں گا اور کیوں نہیں کروں گا، یہ آج تک اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ جایا تو خیر خالہ فرزانہ نے بھی کسی کو کچھ نہیں تھا وہ تو انکل عامر کی فون پر گفتگو سے تائیہ کو کچھ شہہ ہوا تھا۔ تب اس نے خالہ فرزانہ سے بہت سارے سوال کئے تھے۔ اس کے اصرار پر بالآخر خالہ فرزانہ کو اپنی کمائی ساتھ پڑی تھی اور تائیہ اس داستان محبت کی پہلی سامنہ ثابت ہوئی تھی۔

تائیہ میں جانے اسی کی بات تھی کہ اس سے اپنے دل کی بات کئے کوئی چاہتا تھا اور وہ ایسی تھی کہ اپنے دل کی بات کسی کو شہ جاتی تھی اور اس کی وجہ غائبی یہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا ہمدرد یا ہمراز نہ پاتی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ اس نے اپنے اندر ایک دنیا آباد کر لی تھی۔

جب وہ تباہوتی تو دراصل تباہت ہوتی۔ خیالات کا ایک ہجوم ہوتا ہے جاتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی ہوتی۔ اس کا تخلیق بہت طاقتور تھا۔ اگر وہ ٹیلی ویرین پر برف پوش پہاڑوں کے مناظر دیکھ رہی ہوتی اور اگر وہ چاہتی کہ ان مناظر کا حصہ بن جائے تو وہ اپنے تخلیق کے ذریعے ان مناظر کا حصہ بن جاتی تھی۔ فرواہ ہی اسے ٹھہر محسوس ہونے لگتی تھی۔

انکل عامر کے فون نے تائیہ کو الجھاوایا تھا۔ انہوں نے مزید ہمارا ٹھہر نے کو کہا تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ وہ شیں جانتی تھی۔ انکل عامر اسے ہمارا کیوں چھوڑ گئے تھے اور خواہش کے باوجود وہ اسے لاہور کیوں نہیں بلاتے تھے۔ اس کے پیچھے کیا سائل تھے۔ یہ وہ نہیں بتاتے تھے۔ نہ کرناں جاتے تھے یا کتنے تھے اچھا بتاؤں گا صبر کرو۔

صبر کرتے ہوئے تو اسے ایک سال ہو گیا تھا اگرچہ اسے ہمارا کوئی پریشان نہ تھی خالہ فرزانہ اور افضل دونوں ہی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ویسے وہ ہمارا کسی پر بوجھنے تھی۔ اور وہاں کمرے میں جہاں وہ رہتی تھی اس کی ہر چیز انکل عامر کے پیسے سے خردی گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ہر ماہ استمنے پیسے بھیج دیتے تھے کہ تائیہ سے باوجود کوشش کے خرچ نہ ہو پاتے تھے۔ اسے میوزک کا زیادہ غور تھا۔ ایک سال کے عرصے میں اس نے ہزاروں آڈیو کیسٹ خرید ڈالے تھے۔ اسے قلمیں بھی پسند تھیں۔ اپنی پسند کی قلم وہ کسی ٹیڈی یا شاپ سے کرائے پر لا کر دیکھنے کے بجائے قلم کا کیسٹ خرید لاتی تھی۔ اس طرح اس کے پاس فلموں کے سیکروں کیسٹ جمع ہو گئے تھے۔ قلم وہ اکیلی نہ دیکھتی تھی۔ کوئی نئی فلم لاتی تو درداش کو اپنے ساتھ بھایتی تھی۔ درداش کو بے انتہا شوق تھا فلموں کا۔ بعض اوقات وہ اس کی فرباش پر بھی قلم خرید لاتی تھی۔

قلم وہ دوپر کو دیکھتی تھی۔ دوپر کے کھانے سے فارغ ہو کر درداش اپر آ جاتی۔ اگر کوئی قلم پاس ہوتی تو دیکھ لی جاتی درداش کچھ دیر گپ ٹپ کے بعد بیچے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ تین چار دن پہلے وہ ایک نئی فلم خرید کر لائی تھی لیکن اسے دیکھنے کا بھی تکمیل موقع نہ ملا تھا یاد کیجئے کوئی نہ چاہتا تھا۔

جب سے اسے وہ خواب دکھانی دینا شروع ہوا تھا۔ وہ ابھیں کاشکار ہو گئی۔ اس کے دل کا جیسی لٹ گیا تھا۔ واقعات بھی عجب ہوشرا ہو رہے تھے۔ وہ ڈرائنا خواب، دادا عظم کا لفاظ، پراسرار شخص کا اتو دے جانا، آلو کا خون، قدموں کے نشان، پراسرار کرو..... کمرے میں جانے کی شدید خواہش، کمرے کا

سے رات کا انتقال کرنے لگی۔

بالآخر رات کافوں ہر سو پھیلا۔

آسمان تاریک تھا اور گردے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دو بجے کامل تھا۔ ایک آتواس مکان کے اوپر سے کئی بار گرچکا تھا اور وہ جب بھی گزرتا تو ایک تیزی خیز مارتادر پروں کے پھٹپٹاہٹ کی آواز دور تک گونج جاتی۔ اس مکان کے سات پچھر لگانے کے بعد وہ تانیہ کے کرے کی چھت پر بیٹھ گیا۔

تجھی تانیہ ہر پڑا کر انھی بیٹھی۔ اے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی برا سا پر نہ اس کے سینے پر آبھٹھا ہو۔ آنکھ کھلی تو اسے احساس ہوا کہ وہ جیسے خواب دیکھ رہی تھی۔ گھری پر نظر ڈالی۔ دونج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھا کر وہ اپنے کرے میں آگئی تھی۔ پھر یہ سوچتے سوچتے کہ کس وقت کرے میں جائے اسے نیند نے آدبو چاہا۔ اور اب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپر کا عمل تھا۔ کرے میں لاش جل رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سینے پر کسی بڑے سے پرندے کا احساس، خواب تھا خیال تھا یا اس کا وہم تھا۔

خیراب وہ انھی تھی۔ رات کو آئنے کی بدایت اس کے کافوں میں گونج رہی تھی۔ نیچے جانے کی خواہش اس کے دل میں گھری ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی اسے کہہ رہا تھا چلو۔ پھر وہ کسی معمول کی طرح انھی۔ اور سحر زدہ انداز میں زینہ اترنے لگی۔

برآمدے کی لاش روشن تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اس پر اسرار کمرے کے دروازے پر جا گھٹری ہوئی۔ پھر اس نے تیزی چھوئے نایپنڈل کو ہلکا سا گھایا۔ دروازہ کٹ کی آواز کے ساتھ تھوڑا سا کھل گیا۔ ایک لمحے کو اس نے توقف کیا۔ جیسے اندر آئنے کی اجازت چاہی ہو۔

تجھی اندر سے آواز آئی۔ ”اندر آجائو، کب تک دروازے پر کھٹری رہوگی۔“

وہ فرماہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہوئی تو کمرے کا منظر ویکھ کر اس کا اورپ کا سانس اور اور پنجے کا نیچے رہ گیا۔ اس کے دہم و مگاں میں بھی نہ تھا کہ اندر یہ سب کچھ ہو گا۔ اس کے تصور میں یہ تھا کہ اندر سے بے حد تاریک ہو گا کیونکہ اسے تیاگی تھا کہ کرے کی دیواروں میں تھی کہ چھت پر بھی کالارنگ کروایا گیا ہے۔ جگہ جگہ جا لے لگے ہوں گے۔ اندر کیڑے مکڑے ریکھ رہے ہوں گے۔ بند کمرے کی بو ہوگی۔ سیلن ہوگی لیکن یہاں کا تو نقشہ ہی الٹا ہوا تھا۔

جب وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو اس سے کہا گیا۔ ”دروازہ، بند کر دو۔“

دروازہ بند کر کے پہنی تو اس نے دیکھا کہ کرے میں بے حد روشنی ہے جیسے دن لکھا ہو۔ کرے کے عین وسط میں ایک اپنی مندپ ایک شخص زرق برق لباس میں بیٹھا ہے۔ کرے میں سرخ رنگ کا دیز قالین چھا جاوے ہے۔ وہ ادھیز عمر کا شخص کسی ریاست کا راجہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز، قیمتی زرق برق لباس اور گلے میں پڑے موتیوں کے ہار اس کے والی ریاست ہونے کے غماز تھے۔ گھنٹھر یا لے بال، سرفی مائل سانوی رنگت، صحت مند جسم، ایک ہاتھ میں سانپ کی طرح بل کھایا عصا تھا۔

”آئی بیٹھو۔“ اس شخص نے پر تکشت انداز میں کما۔

ابھی تانیہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ کہاں بیٹھے کیونکہ اس کمرے میں کری نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ چند لمحوں میں اس شخص کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر محل کی گدی والا ایک اشول نمودار ہو گیا۔ اس شخص نے مسکرا کر اس نشست کی طرف اشارہ کیا۔ تانیہ حرزدہ انداز میں ایک اشول پر بیٹھ گئی۔ تب تانیہ کی نظر اس کے پیروں پر پڑی۔ وہ نگکے پاؤں تھا مگر اس کا ایک پیر تھا۔

”تم جران ہو؟“ اس ادھیز عمر والی ریاست چیز شخص نے بڑی گرج دار آواز میں سوال کیا۔ ”ہاں!“ تانیہ بمشکل بول پائی۔

”اس کمرے کا ماہول دیکھ کر؟“ اس نے سوال کیا۔ ”ہاں۔“ اس نے منخر جواب دیا۔

”بورات تم لوگوں کے لئے رات ہے، وہ رات ہمارے لئے دن ہے۔ ہماری راتیں روشن ہوتی ہیں اور دن تاریک۔ جب تم لوگ سو جاتے ہو تو ہم ہاہر آجاتے ہیں۔ ہر سو ہمارا راج ہوتا ہے۔“

”آپ کون ہیں؟“ تانیہ نے سوت کر کے سوال کیا۔

”یہ میں بتانا بھی چاہوں تو نہیں بتا سکتا۔ سچھانا چاہوں بھی تو نہیں سمجھ سکتا۔ میں تم اتنا سمجھ لو کہ تمہاری وجہ سے مجھے آزادی ملی ہے۔ میں تمہارا منون احسان ہوں۔“

”میری وجہ سے؟“ تانیہ جیرت زدہ تھی۔ ”وہ کیسے؟“

”ند تم یہاں آتیں، نہ پنجرے میں وہ آتا، نہ خون پھیلتا اور نہ اس خون میں ہم غسل کرتے۔“

”میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ واقعی کچھ نہیں سمجھی تھی۔

”ہم سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اور تمہیں کچھ بخختی کی ضرورت بھی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو اس کی پھیلی پر ایک کتاب نمودار ہو گئی۔ ”یہ لو یہ ہماری طرف سے چھوٹا سا تنفس ہے اسے رکھ لو۔“

تانیہ نے اٹھ کر اس کے ہاتھ پر رکھی ہوئی کتاب کو لے لیا اور چاہتی تھی کہ اسے کھول کر دیکھے۔ اس نے فرما کیا۔ ”نہیں بھی نہیں، اپنے کرے میں جا کر دیکھنا۔“

”میں بھتر..... آپ کا شکریہ۔“

تب وہ ادھیز عمر کا شخص جوانی وضع قطع سے کسی تاریخی ڈرائے کا کدرار لگتا تھا، اپنے مل کھانے عصا کے سارے اٹھا، اور بولا۔ ”اب تم جاؤ۔ اور ہاں کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہمارے راز تم اپنے لوگوں پر ٹھوٹی پھوٹی۔ میری بات سمجھ گئیں تا تم۔“

”ہاں۔“ تانیہ نے فرمابنداری سے گردن ہلائی۔ اور وابسی کے لئے مڑی۔ اس نے باپسی کے لئے

”دردانہ کمال ہے؟“ تانیہ نے پوچھا۔
”آرہی ہے، چائے لیتے گئی ہے۔“

”میں آنگی بی بی۔“ دردانہ یہ کہتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ چائے کی کیتیلی میز پر رکھی۔ اسے فی کوزی سے ڈھکا۔ اور کری ٹھیکیٹ کر خود بھی بیٹھ گئی۔ جب سے تانیہ آئی تھی، وہ اسے ناشتے کی میز پر ساتھ ہی بھاتی تھی۔ خالہ فرزانہ کو شروع شروع میں اعتراض ہوا تھا، وہ توکر اور مالک کے درمیان تھوڑے بہت فاصلے کی ضرور تاکل تھیں۔ مگر تانیہ کی خوشی کی خاطر اس معاملے کو اتنا کامٹلہ نہیں بنایا تھا۔

”بھائی کمال ہیں؟“ تانیہ نے ٹوست پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔
”بھائی اپنے کمرے میں ہو گا اور سورہا ہو گا۔“
”ناشتر نہیں کریں گے وہ؟“

”اس نے کبھی ہمارے ساتھ ناشتہ کیا ہے جو آج کرے گا۔“

”اب خالہ ایسا بھی نہیں..... انہوں نے کئی بار ہمارے ساتھ ناشتہ کیا ہے۔؟“

”اب رہنے بھی دو تانیہ۔ سال میں ایک در مرتبہ کر لیا تو اس کو باقاعدہ ناشتہ کرنا کہتے ہیں۔“

”اچھا ٹھہریں..... میں انہیں اٹھا کر لاتی ہوں۔“

”لبجھے میں خود ہی آگیا۔“ افضل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ خالہ ضرور میری برائیاں کر رہی ہوں گی۔“

”بھائی ایسی ولی۔“ تانیہ نے ہنس کر کہا۔ دردانہ اسے دیکھ کر اٹھ گئی۔ اس کے لئے کہے ہوئے سلاسک لانے کے لئے۔

”خالہ آپ مجھ کنوارے کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہیں۔“ افضل نے مخربے پن سے کہا۔
”تو کر لے ناشادی میں نے منع کیا ہے۔“ خالہ جل کر بولیں۔

”انہوں نے منع کیا ہے۔“ افضل نے بڑی مصوصیت سے کہا۔

خالہ فرزانہ سمجھیں کہ افضل نے تانیہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ ایک دم چونک گئی۔ خود تانیہ بھی کی سمجھی کہ اشارہ اس کی طرف ہے۔ وہ جیرت بھری نظریوں سے افضل کو دیکھنے لگی۔

”وہ انہوں نے۔“ افضل نے کمرے کے باہر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

”باہر کوں ہے۔ کسی کو کھڑا کر کے آئے ہو کیا؟“ خالہ فرزانہ نے پوچھا۔

”اوہ خالا..... اتنی عقائد ہو کر بھی آپ میرا اشارہ نہیں سمجھیں۔ وہ کمرے والے صاحب۔“

افضل نے یہ کہہ کر ایک لمحے کو توقف کیا۔ خالہ فرزانہ کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ تب وہ بولا۔ ”اس گھر کو فروخت کرنے کی دوسرا شرط یہ تھی کہ گھر میں پچھے نہ ہوں تو اچھا ہے۔ اب اگر خالا

میں ناشادی کر لیتا تو ان آٹھ سالوں میں کتنے بچے آپ کے دائیں بائیں کھیل رہے ہوتے تو پھر ہم کمال ہوتے؟“

دوقم ہی بڑھائے ہوں گے کہ کمرے میں اچانک تاریکی چھائی اسے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گھب اندر ہر اتنا اور ایک عجیب طرح کی ٹھنڈک۔

وہ دروازے کے نزدیک تھی مگر اسے دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے نٹول کر دروازے کا بینڈ ڈھونڈا۔ اسے گھما یا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ باہر کا وی ماحول تھا۔ اس نے پلٹ کر دروازہ بند کیا۔ لبے لبے دو تین گھرے سانس لئے۔ پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

جب وہ دروازہ بند کر رہی تھی تو اسے کسی پرندے کی چیخ اور پروں کے پیچڑی پہنچانے کی تیز آواز سنائی دی تھی۔ پروں کی پیچڑی پڑھاہٹ اور چیخ سن کر اس کی نظریوں کے سامنے پنجھے والا آؤ آگیا تھا۔ پنجھے میں آؤ کا زخمی ہوا۔ بے پناہ خون کا پھیلتا، خون آلوڈ پیر کے خشان اور اس زخمی آلو کا پنجھے سے اڑ جاتا۔ تب اس کا جملہ یاد آیا۔

”نه تم یہاں آتیں، نہ پنجھے میں وہ آتا، نہ خون پھیلتا اور نہ اس خون میں ہم عمل کرتے۔“

کیا تھا یہ سب کچھ۔ یہ کیا گور کھ دھندا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال وہ خوش تھا اور اپنی آزادی کو تانیہ سے منسوب کرتا تھا اور اسی خوشی میں وہ اسے ایک تحفہ دے گیا تھا۔

تانیہ نے بیٹھ پر بیٹھ کر اس تھنے کو والٹ پلٹ کر دیکھا۔ خوبصورت چڑی کی جلد تھی۔ وہ کتاب نہ تھی، ڈائری تھی۔ بغیر لائنوں کا سفید چکدار کاغذ۔ سارے ورق سادہ تھے۔ ان پر کچھ نہ لکھا تھا۔ یہ عجیب تحفہ تھا۔

اس نے اس ڈائری کو ایک کیسٹ نکال کر اس کے کور میں رکھ دیا۔ وہ ڈائری بڑے آرام سے ایک کور میں آ گئی۔ تب اس نے اس کو کوئی یوکیشوں کے درمیان رکھ دیا۔ اب اس تھنے پر آسانی سے کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ دیے بھی اس کے کمرے میں دردانہ کے سوا کوئی نہیں آ رہا تھا۔ دردانہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ وہ اس کی چیزوں کو بالکل نہ پچھیتی تھی۔ بہت احتیاط سے غصانی کر کے چلی جاتی۔ کبھی کھارا افضل آ جاتا تھا، وہ بھی تانیہ کے اصرار پر۔ تھوڑی دیر بیٹھتا، گپ شپ لگاتا اور چلا جاتا۔

خالہ فرزانہ اپنے مرض کی وجہ سے اپر آتی ہی نہ تھیں۔ جب تانیہ یہاں نئی نئی آئی تھی اور اس نے اپنا کمرہ سیٹ کیا تھا تو کچھ اس کے اصرار اور کچھ اپنے شوق میں اس کا کرہ دیکھنے کے لئے اپر آتی تھیں۔

اب تانیہ کی آنکھوں میں نیند اتر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹی تو پانچ منٹ کے اندر گردی نیند میں چل گئی۔

صحیح جب وہ منہ باتھ دھو کر پیچے پیچی تو خالہ فرزانہ ڈائنک نیبل پر حسب معمول اس کی منتظر تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراہیں اور بولی۔ ”آکر، تانیہ۔“

”آگئی خالہ۔“ تانیہ نے خوش اخلاقی سے کہا۔ انہیں سلام کیا اور کسی ٹھیکی کران کے قریب پیٹھی گئی۔ سلام کے جواب میں خالہ فرزانہ نے دعائیں دی۔

بچھے ہٹ سکتا ہوں۔ ”فضل نے پالیسی بیان دیا۔
”آئیے، بھائی، پھر چلئے۔ چل کر دیکھتے ہیں۔ نیک کام میں درج کا ہے کی۔
”اے، تانیہ کچھ ہوش کے ناخن لو۔ باذلی ہوئی ہو کیا؟“

”غالہ جب دروازہ مقتل ہے تو وہ ہمارے پر ہاتھ لگانے سے تھوڑا ہی مکمل جائے گا۔ ہم کوئی تالا توڑ کر
ڈکرے میں نہیں واپس ہو رہے۔ ہم تو صرف پینڈل گھما کر دیکھیں گے اگر تالا کھلا ہو گا تو تھوڑا سا دروازہ
ٹولی کر دیکھیں گے۔“ تانیہ نے بڑے پر سکون انداز میں کہا۔

”غالہ، تانیہ بات تو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“
”تم دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جو مرضی آئے کرو، میں تو جاتی ہوں، اپنے کمرے میں۔“
مالہ فزانہ اپنے گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے لگیں۔

”غالہ ٹھیک ہے، آپ چلیں اپنے کمرے میں۔ ہم ابھی آکر آپ کو پورٹ دینے ہیں؟“ تانیہ بھی
رسی بچھے کھنکا کر کھڑی ہو گئی۔

تانیہ کے دل میں ذرا سابھی خوف نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور اب اس کمرے میں
نہ نہیں ہے جو تھا، وہ رخصت ہو چکا ہے اس لئے وہ بے خوبی سے آگے بڑھنے لگی۔ بچھے بچھے فضل

۔ غالہ فزانہ کمرے سے ابھی نکلنے پائی تھیں۔

تانیہ اور فضل اسی پر اسرار دروازے کے سامنے آکر رک گئے۔ فضل کو اگرچہ اس گھر میں شفت
بئے مات آٹھ سال ہو چکے تھے مگر اس نے آج تک اس دروازے کو بغور نہ دیکھا تھا۔ آج اس نے
لبی بدر اس پر اسرار دروازے کو بغور دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ تعویز کا لے کپڑے میں سلا ہوا تھا اور
نیلن کی کالی ڈوری اس میں لگی ہوئی تھی۔ سفید اسٹائل کے پینڈل میں، اس کالی ڈوری کو تین چار مل
کر تعویز لکھا دیا گیا تھا۔ ڈوری اس طرح پینڈل کے گرد، لپیٹی گئی تھی کہ وہ تعویز گر نہیں سکتا تھا۔
فضل دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھنے لگا تو تانیہ نے اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر پینڈل پر
تھوڑا کھل دیا۔ فضل کا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ تانیہ بھی تھوڑی سی پیشان ہوئی اس اثناء میں، اس نے
نڈل پر بنا ڈال کر اسے گھمنا چاہا۔ پینڈل تھوڑا سا گھوما لیکن دروازہ نہ کھلا۔

دروازہ مقتل تھا۔ تانیہ نے دو تین بار پینڈل کو ادا پر بچھے کیا۔ دروازہ کھولنے کے لئے زور لگایا لیکن
واڑہ نہیں کھلانا تھا۔ تب وہ گھر اسنس لے کر بچھے ہٹ گئی۔ اسے بڑی حیرت بوری تھی۔ اس نے تین
تباہ اس دروازے کو کھولا تھا اور جب بھی پینڈل پر ہاتھ رکھتا تھا، دروازہ کھل گیا تھا۔

وہ رات ہی کو تو اس کمرے میں گئی تھی۔ اس لنکڑے خص سے ملی تھی جو کسی ریاست کا راجہ و کھانی
نا تھا۔ کیا یہ سب اس کا وہم تھا۔ اس کے تخلیل کی پرواز تھی۔ اس کے ذہن کی کرشمہ سازی تھی۔
”خماں۔ آپ ذرا کو شوش کریں۔“

فضل نے خاموشی سے آگے بڑھ کر پینڈل کو زور دے کر ادا پر بچھے کیا۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ دروازہ
ستھا۔ ”تانیہ۔ یہ لاک ہے۔“

فضل کی یہ بات سن کرتا نیہ بے اختیار مسکرا پڑی۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی۔ آپ نے
اس وجہ سے اب تک شادی نہیں کی۔؟“

”ارے تانیہ..... تم کس کی باتوں میں آرہی ہو..... یہ ایک نمبر کی چیز ہے۔ فضل جس کا نام
ہے۔“

”خدا کا شکر ہے غالہ آپ نے مجھے دو نمبر کی چیز نہیں کہا۔“ ”فضل ہنس کر بولا۔
”بھائی ایک بات بتائیں۔“ تانیہ نے سمجھی اختیار کی۔

”ایک نہیں، دو بات پوچھیں لیکن یہ باشی شادی سے متعلق نہیں ہوں گی۔“
”ٹھیک ہے۔“ تانیہ نے وعدہ کر لیا پھر بولی۔ ”میں یہ پوچھ رہی تھی کہ اس پر اسرار کمرے کو کبھی
کسی نے کھونے کی کوشش کی۔“

”نہیں، آج تک نہیں۔“ ”فضل نے کہا۔“ لیکن یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا۔؟“
”ہو سکتا ہے۔ یہ دروازہ بند ہے۔“ تانیہ نے سادگی سے کہا۔ ”کیوں نہ یہ دیکھا جائے کہ وہ
بند ہے یا کھلا ہوا۔ اگر کھلا ہو تو اندر جانے کی ہمت کی جائے آخر پر تاچلے کہ بند دروازے کے بچھے کا
ہے؟“

”آپ کا مطلب ہے کہ یہ دروازہ مقتل نہیں ہے۔“ ”فضل نے سوال کیا۔
”ہاں ہو سکتا ہے..... کیونکہ آپ میں سے کسی نے اس دروازے کے پینڈل کو گھمانے کی کوشش
نہیں کی یا کی ہے؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”میں کی..... اور وہ اس لئے نہیں کی کہ سابقہ ماں اک مکان و سیم نے مجھے بخوبی سے اس سلسلے میں منع کیا
تھا۔ پھر میں کیوں خواہ مخواہ مصیبت مول لیتا..... ویسے میں روشن علی صاحب کی تلاش میں پاکستان کو اڑ
گیا تھا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ اسلام آباد شفت ہو چکے ہیں۔ وہ جس ٹھیکے میں ملازم تھے، وہ فرنٹی
اسلام آباد منتقل ہو گیا ہے۔“

”تانیہ تھا می سر پر اس کمرے کا بھوت کیوں سوار ہو گیا ہے۔ تم آخر کیا کرنا چاہ رہی ہو۔ پسلے ہی
اس گھر میں کیا کم پر اسرار و اقفال پیش آرہے ہیں۔ اس رات کا واقعہ جب بھی یاد آتا ہے۔ دل دھاڑ
وہاڑ کرنے لگتا ہے۔“

”ارے غالہ..... آپ روز بروز اتنی بڑول کیوں ہوئی جا رہی ہیں۔ آپ ڈریں نہیں۔ میں کروں گی
یہ کام۔“ تانیہ نے بڑے محکم لبجے میں کہا۔

”شی۔“ غالہ فزانہ نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر اسے بولنے سے منع کیا۔ تب اس نے دیکھا ک
دروازہ آرہی ہے۔ وہ خاموش ہو گئی پھر ناشتہ بھی سب نے بڑی خاموشی سے کیا۔

ناشستہ کے بعد جب دروازہ برتن اٹھا کر کچن میں چل گئی تو تانیہ فضل سے مخاطب ہوئی۔ ”آپ کہ
کہتے ہیں؟“ ”بھی جب آپ خاتون ہو کر جڑات کا مظاہرہ کرنے کو تیار ہیں، میں تو پھر مرد ہوں، میں بھلا کیے

طرح بند ہو گیا تھا۔
یہ سب کیا اسرار تھا۔

یہ کیا اس کی زندگی میں بہت اسرار تھے۔ اس کی زندگی کی معنی سے کم نہ تھی۔ چاروں طرف اشارے ہی اشارے تھے۔ ان اشاروں کا کوئی حل نہ تھا۔ لوگ اسے ترکش کیوں کہتے تھے۔ دادا عظیم نے اس کا صل نام ترکش بتایا تھا پھر وہ پا اسرار شخص کالا چراغ، اب نے بھی آکر ترکش ہی کہا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ نام کس نے رکھا؟ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنا نام تائیں تھی ساتھا۔ پھر وہ جس گھر میں پلی بڑھی اور جن کو وہ اپنا نام باپ سمجھتی رہی وہ اس کے ماں باپ ثابت نہ ہوئے۔ لاہور سے اسے کراچی کیں منتقل کیا گیا۔ اٹکل عامر اسے لاہور واپس کیوں نہیں بلاتے تھے۔ پھر وہ پا اسرار خواب..... دادا عظیم کا لفاف۔ پا اسرار کرو۔ ایک سلسلہ تھا سالوں کا۔ سوال ہی سوال تھے جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ کاش کوئی ایسا ہو، جو اس کی ذات سے پرده اٹھا کے جو بتا کے کہ وہ کون ہے۔ کاش کوئی بتا سکتا۔ بڑی شدید خواہش تھی۔ اتنی شدت سے تو اس نے آج تک نہ سوچا۔

بھلاکیے معلوم ہو گا، یہ سب کچھ، کون بتائے گا۔
تھیجی اس کے ہاتھ سے ڈاڑھی چھوٹ کر قالین رپر گر پڑی۔ اس نے جھک کر ڈاڑھی اٹھا کی اور بیٹھ پر بیٹھ کر ایسے ہی اس کے ورق کھول کر تیری سے دیکھنے لگی۔

اپاک اس کی نظر پڑی تو وہ کچھ جیران سی ہوئی۔ ڈاڑھی کے اندر اسے چند صفات پر کوئی تحریز نظر آئی فی الحال کہ جب اس نے ڈاڑھی کو میں رکھی تھی تو اس وقت اس میں ایک لحظہ بھی تحریز نہ تھا۔ اپنا شبہ دور رستے کے لئے اس نے ڈاڑھی کے صفات کو پھر دیکھا اور پھر اس نے ان صفات کو پکڑ لیا جن پر واقعی کچھ خریر تھا۔

”بڑی خوش خط تحریر تھی۔ ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح نکلا ہوا تھا۔ یہ تحریر کالی روشنائی سے لکھی تھی۔ اس نے تحریر کا پھلا صفحہ نکلا اور پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟ ہم بتائیں گے کہ تم کون ہو؟ تمہارے دماغ میں آنے والے ہر سوال کا اب ملے گا۔ چلو پہلے اپنے بارے میں جان لو، پھر جو چاہے سوال کر لینا۔

تمہارے والد ایک بنت بڑے زمیندار کے بیٹے تھے۔ تمہارے دادا اسرار اور فرمان علی بڑے اثر و سرخ نہ آدمی تھے۔ انہوں نے انگریزوں سے سرکا خطاب پایا۔ بڑے بیٹک دل انہاں تھے۔ ساون پور میں دل نے اپنی رہائش کے لئے جو حیلی بنوائی تھی وہ اپنے طرزی انوکھی تھی۔ دور دور سے لوگ اس حیلی کو نئے آیا کرتے تھے۔ سرفراز کو دیہات کی زندگی بہت پسند تھی لیکن ان کے بیٹے یعنی تمہارے والد اور شادگان کی زندگی سے الرج تھے۔ انہوں نے تمہارے دادا سے خد کر کے ماذل ماؤن لاہور میں کوئی بنوائی تھی۔ ماذل ٹاؤن کی اس کوئی میں رہنے ہوئے انہوں نے اپنی تعلیم تکمیل کی۔ تمہارے

اب تانی یہ کیسے کہتی کہ اب تک یہ دروازہ لاک نہیں تھا، مگر جب اس دروازے کو کھول چکی ہے۔ ایک مرتبہ اس کرے کے اندر جا چکی ہے۔ وہ یہ بات نہیں کہ سکتی تھی۔ اگر کہتی تو یقینی طور پر اس کی دماغی حالت پر شبہ کیا جانے لگتا۔

گمراہ خود اپنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

یہ اسے کیا ہو رہا تھا۔ کیا وہ کسی نفیقی بیماری میں بنتا ہو گئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ”بلنگرے راجہ“ نے اسے ایک تحفہ دیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت ڈاڑھی تھی۔ اس ڈاڑھی کو اس نے ویڈیو کیسٹ کے کور میں چھپا کر کیسٹ کی قطار میں لگایا تھا۔ اپر جا کر اس ڈاڑھی کو دیکھنا چاہئے۔

”ارے کیا ہوا؟“ پیچھے سے خالہ فرزانہ کی آواز آئی۔ وہ آہست آہست چلتی ہوئی اب پہنچی تھیں اور اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی ان دونوں کو پریشانی سے دیکھ رہی تھیں۔

”خالہ، دروازہ لاک ہے۔“ افضل نے اطلاع دی۔

”میرے لئے یہ کوئی نئی اطلاع ہے۔ یہ بات میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں، جانتی ہوں اور اس بات کو جانتے ہوئے مجھے سات آٹھ سال ہو گئے۔“ یہ کہ کر خالہ فرزانہ اپنے کمرے میں چل گئیں۔

پھر افضل نے بغیر کچھ کے اپنے کمرے کا رخ کیا، اسے دفتر جانے کی تیاری کرنا تھی۔

اب وہ دروازے کے سامنے تھا۔ اس نے اپر جانے کے لئے زینے کی طرف قدم بڑھائے۔ دو چار قدم چل کر وہ پھر رک گئی۔ واپس بیٹی۔ اس نے سوچا ایک مرتبہ اور کیوں نہ دروازے کی آزمائش کرے۔ اس وقت اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

اس نے بہت احتیاط سے دروازے کے بینڈل پر ہاتھ رکھا نیچے کی طرف دباؤ ڈالا۔ بینڈل نیچے ہو گیا۔ دروازہ نہ کھلا۔ دروازہ والی مقابلہ تھا۔

اسے اپنی ذات کے بارے میں فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اب وہ یقین اور غیر یقین کی کیفیت میں بنتا ہو گئی تھی۔ ہونے یا نہ ہونے کا ورد و راب اس ڈاڑھی پر تھا جو اس نے کیسٹ میں چھپا ہوئی تھی۔

وہ تیری سے سیرھیاں چڑھتی ہوئی اوپر پہنچی۔ دروازہ بند کیا اور ہڑکتے دل سے کیسٹ میں کے شیلف کی طرف بڑھی۔ نزدیک جا کر اس نے بے قراری سے کیسٹ میں کیسٹ کی قطار پر نظر ڈالی تب اسے وہ کیسٹ کو نظر آگیا۔ جس پر کوئی لیبل نہیں لگتا تھا اس نے جلدی سے وہ کوہا بہر کاں لیا۔ اور اس کو میں سے وہ ڈاڑھی کھینچ لی۔

چہرے کی جلد ولی خوبصورت ڈاڑھی موجود تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اللہ کا شکردا اکیا۔ اگرچہ ڈاڑھی نہ ملتی تو وہ اپنی نظر میں ہی پاگل قرار پاتی۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ اب تک جو کچھ ہوا۔ وہ اس کے ذہن کی اختیاع تھی مگر اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ”لکنگرے راجہ“ کا تحفہ موجود تھا اور یہ تحفہ اسے کمرے کے اندر یا گیا تھا۔ وہ کمرے میں کس طرح گئی تھی۔ اگر دروازہ اس وقت کھلا تھا تو اب کس

کر کے شادی کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی اصرار کرنے والا نہ تھا اور راؤ ششاڈ کو شادی سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ پھر تمہارے پچھے بھی کسی چاہتے تھے کہ برا بھائی شادی نہ کرے تو اچھا ہے۔ شادی ہو گئی تو اولاد بھی ہو گی اور اولاد ہو گی تو جارہاد بھی تیقین ہو جائے گی۔ راؤ احمد علی نے کبھی شادی کی طرف توجہ دلانے کی کوشش نہ کی تھی بلکہ وہ ان کے سامنے اپنی اولاد کی نالائقی کا روشناروئے لگاتا تھا۔ وہ اولاد کو مصیبت کرتا تھا اور تمہارے والد کو خوش نصیب گردانتا تھا کہ انہوں نے شادی نہ کر کے بروی عقائدی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہر طرح کے جنجال سے بچے ہوئے تھے۔

بات یہ ہے بی بی کہ کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شادی بیہا کا معاملہ تقدیر سے نسلک ہوتا ہے۔ جب تقدیر انہوں کی زندگی میں خونگوار لمحے لانا چاہتی ہے تو یہی ہی انساب پیدا کر دیتی ہے۔

تمہارے والد راؤ ششاڈ علی چالیس سال کے ہوئے کو آئے تھے۔ شادی کا معاملہ کبھی ان کے ذمہ میں آیا بھی تھا تو اتنی عمر ہو جانے کے بعد وہ بالکل ذہن سے نکل گیا تھا۔

تب اچانک ہی ایک خاتون تمہارے والد کی زندگی میں آگئی تھیں۔ تمہارے والد نے اپنی آرٹ گلری میں ایک آرٹسٹ کی چند تصاویری نمائش کی تھی۔ انہوں نے بہت منتخب لوگوں کو نمائش دیکھنے کے لئے مدعا کیا تھا۔ وہ خاتون موش کی مہمان کے ساتھ آئی تھیں جب اس مہمان نے تمہارے والد نے موش کا تعارف کرایا تو یہ تعارف زندگی بھر کا تعلق بن گیا۔ پہلی ملاقات میں گویا دونوں نے جانا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں جب دو اجنبی ایک دوسرے کو دیکھ کر یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہم ایک دوسرے کو صدیوں سے جانتے ہیں تو پھر یہ انجانتا تعلق، ایک خونگوار بندھن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جلد ہی دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

تمہارے پچھا احمد علی نے جب اپنے بڑے بھائی کی شادی کی خبر سنی تو بظاہر تو اس نے بروی خوشی کا انہصار لیا لیکن اندر ہی اندر اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ اگر اس کے لئے کسی طرح ممکن ہوتا تو وہ ہر ممکن کوشش کر کے اس شادی کو روکا دیتا۔ وہ بے بی سے ہاتھ مٹا رہ گیا اور تمہارے والد نے شادی کر لی۔

تمہاری ماں موش بہت سلسلی ہوئی خاتون تھیں۔ وہ خود بڑے باپ کی بیٹی تھیں، اس نے روپے میں سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ان کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوئی تو وہ اپنے شوہر کی بیوی چوڑی جاندار دیکھ کر اس پر اپنا بغضہ بحال کرنے کی کوشش ضرور کرتی۔ موش نے دیکھا کہ ان کے شوہر کو زمین جاندار سے کوئی لگاؤ نہیں ہے تو انہوں نے کبھی اس مسئلے پر ان سے کوئی بات ہی نہ کی۔

تمہارا پچھا راؤ احمد علی خوش تھا کیونکہ شادی کو ایک سال سے اوپر ہو گیا تھا مگر ابھی تک کسی پچھے کی ولادت کی کوئی خبر نہ آئی تھی۔ تمہارے والد راؤ ششاڈ اپنی ماڈل ناون والی کوئی میں خوش و خرم زندگی کزار رہے تھے۔ تمہارے پچانے کئی مرتبہ انہیں ساون پور آئے کو کہا تھا مگر وہ وہاں جانے سے کتراتے تھے۔ شادی کے فوراً بعد میں ایک مرتبہ وہ ساون پور گئے تھے۔

والد راؤ ششاڈ اپنے باپ کی طرح نیک نیت انسان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو نقصا نہیں پہنچایا تھا۔ اس کے مقابلے میں تمہارے پچھا راؤ احمد علی نے کبھی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں تھی۔ یعنی کرنا اور غریبوں کے کام آنا تو دور کی بات ہے۔ وہ ایک سازشی ذہن کا شخص تھا۔ وہ بچپن، ہی اتنا شاطر تھا کہ شرارت خود کرتا تھا لیکن ڈاٹ بڑے بھائی یعنی تمہارے والد کو پڑھتی تھی اور تمہارے والد راؤ ششاڈ اپنے بڑے پن میں اسے معاف کر دیا کرتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی زندگی بھر عادت رہی۔ تمہارے پچھے بچانے اپنی خونہ چھوڑی اور تمہارے والد نے اپنی وضع نہ بدی۔

سرفراز علی کے انتقال کے بعد وہیست کے مطابق زمینیں اور دیگر جاندار تقسیم ہو گئی۔ جاندار کی تھے کے ساتھ ہی ساون پور کی حوالی بھی منقسم ہو گئی تھی لیکن مارے والد والے حصے پر بھی تمہارے پچھے کاٹھا کیونکہ تمہارے والد کو دیساٹی زندگی پرمندہ تھی اس لئے وہ شاذ ہی ساون پور کا رخ کرتے تھے۔ پھر، والد کے انتقال کے بعد تو انہوں نے ساون پور کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح زمینیں، باغات حوالی نام توارو ششاڈ کے ہی تھی لیکن عملکر پھر راؤ احمد علی کا تھا۔

ساون چچ میں بعد وہ ساون پور اگر اپنی زمینوں کی آمدی آکر لے جایا کرتے تھے۔ اور ساون پور وہ پیسوں کی غرض سے نہیں آتے تھے، انہیں اصل میں شکار کا شوق تھا۔ وہ یہاں شکار کھلے کے لئے کرتے تھے۔ تب راؤ احمد علی زمینوں کی آمدی کے نام پر کچھ رقم ان کے بریف کیس میں رکھ دیا کرتا تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے بھائی سے اپنی جاندار اپنی آمدی کا حساب نہ لیا تھا۔ لیکن راؤ احمد علی بڑے حاکم کا آدمی تھا۔ وہ بروی خوبصورتی سے ایک ایک پانی کا حساب رکھتے ہوئے تھا۔ اور ایک ایک قدم ہوشیاری سے اٹھا رہا تھا۔

تمہارے والد آرٹ کی دنیا کے آدمی تھے۔ شعر و شاعری سے لگاؤ تھا، خود بھی شعر کرتے تھے پینٹنگ کا بھی شوق تھا۔ اپنا شوق بورا کر کر کے لئے انہوں نے لاہور میں ایک ذاتی گلری کھول دی تھی۔ اس آرٹ گلری نے ساتھ ہی انہوں نے ایک ریستوران کھول رکھا تھا۔ پیسوں کی ان کے کوئی کمی نہ تھی، یہ کا دوبار انہوں نے اپنا دل لگانے کے لئے کھولا تھا۔

تمہارے والد نے ابھی تک شادی نہ کی تھی جبکہ تمہارے پچھا کی شادی، تمہارے والد کی زندگی میں ہو گئی تھی۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ آفتاب راؤ، اشتبہ راؤ اور اقبال راؤ۔ وہ تینوں حوالی میں دنما پھرتے تھے انہیں کوئی روکنے نہ کئے والا نہ تھا۔

تمہارے والد نے ابھی تک شادی نہ کی تھی اور شادی نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ بھی نہ تھی۔ ان مشاغل کچھ اس طرح کے تھے کہ انہی سے انہیں فرستہ نہ ملتی تھی بس یہ نہیں زندگی گزرتی جاتی تھی تمہارے والد نے اس طرف توجہ بھی دلائی گردوہ میں کر تال جاتے تھے۔ ماں تھیں نہیں۔ وہ دو بیٹا جنم دے کر کب کی ملک عدم جا چکی تھیں۔ اپنی بیوی سے سرفراز کو اتنی محبت تھی کہ اس کے بعد ان نے زندگی بھر شادی نہ کی۔ بیٹوں کی شادی میں ماں کی دلچسپی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے بیٹوں کو اُ

کسی انجانے خوف کے پیش نظر انہوں نے محن راؤ کے ساتھ و تربیت یافتہ محافظ بھیجنے شروع کیا۔ جب محن راؤ پسے محافظوں کے ساتھ، اپنی حیلی کے سامنے جیپ سے اترتا تو راؤ احمد بنا چاہتا آنکھوں میں کسی کا نئے کی طرح چھپ جاتا۔

بلا آخر راؤ احمد علی نے پروگرام بنایا لیا کہ کیا کرنا ہے۔ راؤ احمد علی کا چھوٹا بیٹا اقبال راؤ اگرچہ محن عرب میں بر اتحادیں اس سے اس کی دوستی تھی۔ ساون پور میں وہ جماں جاتے اکٹھے جاتے۔ محن راؤ اپنے والد کی طرح شکار کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ ساون پور آیا تو حسب معمول تیر کے شکار کا پروگرام بن گیا۔

رااؤ احمد علی نے اس مرتبہ ساری منصوبہ بندی کر لی تھی۔ محن راؤ کے دونوں محافظوں کو دو دہ میں افیون ملا کر دے دی گئی۔ علی الصلاح جب محن راؤ اپنے چچا زاد بھائی اقبال راؤ اور دیگر ملازمین کے ساتھ شکار جانے کے لئے نکلا تھا جو یہی کے گیٹ پر اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے دونوں محافظ بہت گری نیند میں ہیں۔ بازار اٹھائے جانے پر نہیں اٹھے۔ شاید دونوں رات بھر تاش کیلئے رہے ہیں۔ محن راؤ کو شکار پر نکل گیا۔

اور پھر اپنیاں میں تمہارے والد کو دو خبریں میں۔

تم اندازہ کر سکتی ہو کہ وہ دو خبریں کیا ہوں گی؟..... بھی بھلی خروج تمہارے بارے میں تھی یہ خونخبری تمہارے والد کو پورے بارہ سال بعد میں تھی۔ جب رس نے ایک بچوں سی بچی پیدا ہونے کی اطلاع تمہارے والد کو دی تو یہ خبر سن کر ان کا دل بالغ باغ ہو گیا۔ اتنی خوشی تو انہیں تمہارے بھائی محن راؤ کی پیدائش پر بھی نہ ہوئی تھی۔ تمہارے والد کو لڑکیاں ہست پسند تھیں۔ وہ تمہاری پیدائش کو بڑی دھوم دھام سے منانا چاہتے تھے لیکن وقت نے کچھ اور ہی گل کھلادیا۔

ایک بھی خبر کے بعد فوراً ہی دوسرویں بھری طرفی اور یہ بھری خبر تھی تمہارے بھائی محن راؤ کے بارے میں اور یہ خبر لیکر آیا تمہارا راؤ احمد علی کا بیدا بیٹا آفتاب راؤ۔

تمہارے والد راؤ شمشاد علی کے چہرے پر خوشی کے آثار پھوٹ رہے تھے اور وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ یہ خوشی کی خبر فروzn کس کو سنائیں۔ ان کی نظر آفتاب راؤ پر پڑی۔ وہ اچانک ہی کہیں سے آکر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر دھشت بر سر ہی تھی۔ راؤ شمشاد اس کی صورت دیکھ کر اپنی خوشی بھول گئے۔ ان پر تھراہست طاری ہو گئی فوری طور پر ان کے دماغ میں جو خیال آیا ہے یہ تھا کہ راؤ احمد علی کا انتقال ہو گیا۔ لیکن راؤ احمد بھلا آسانی سے مرنے والی چیز کہاں تھا۔ یہ خبر تمہارے والد کے بھائی کے بجائے تمہارے بھائی کے بارے میں تھی۔

آفتاب راؤ نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنا سر اٹھایا۔ بانہیں پھیلائیں اور تمہارے والد سے لپٹ کر بے تھا شارو پڑا، اور روٹے روٹے بولا۔ ”تایا..... تایا جی..... ہمارے بھائی کو ڈاکو اٹھا کر لے کر“۔

اب تمہارے پچھا اور پچھی کو یہ فکر دن رات گھن کی طرح کھلائے جاتی تھی کہ راؤ شمشاد کے ہاں اگر کوئی وارث آگیا تو کیا ہو گا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہاتھ میں آئی ہوئی جائیداد وارث آجائے کے بعد ان کے ہاتھوں سے نکل جائے۔ چچا چھپی نے ان دونوں لعنی تمہارے والد اور والدہ پر ٹوٹنے توکلے بھی کرواۓ لیکن پچھے تو اشک دیں ہوتے ہیں۔ نہ وہ کسی کی خواہش پر روکے جاسکتے ہیں اور نہ کسی کی خواہش پر پیدا ہو سکتے ہیں۔ کائنات کا مالک ہی انسانوں کو وارث دے سکتا ہے۔

شادی کے دوسال کے بعد راؤ شمشاد کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اس کا نام محن رکھا گیا۔ وہ محن راؤ کھلایا۔ بیٹی کی ولادت نے ساون پور کی حیلی میں صفات بچھادی جبکہ تمہارے ماں باپ بہت خوش تھے۔

ہاں، بھائی کے نام پر چوکومت۔ تمہارا ایک سماں بھائی اس دنیا میں موجود ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے، یہ بعد میں پڑے چلے گا۔ فی الحال یہ سنو کہ محن راؤ کی پیدائش نے تمہارے چچا کے دل میں کیسی آگ بھر دی۔ اس کے سارے ٹوٹنے توکلے بیکار گئے۔

محن راؤ بہت ذہین لڑکا تھا۔ وہ بارہ سال کی عمر میں چخنے پہنچنے اس نے بہت سے فن سیکھ لئے۔ تیراں، گھر سواری، ڈرائیورگ، کشتی رانی، نشانہ بازی، اس کی امتحان بھی بہت اچھی تھی۔ وہ بارہ سال کی عمر میں چھوڑنے پر بھردار سال کا لگتا تھا۔ تمہارے والد کے برخلاف اسے دیبات کی زندگی سے بہت لگا تو تھا۔

کابس نہیں چلتا تھا کہ وہ ساون پور میں مستقل رہا اسکے پذیر ہو جائے۔ محن راؤ نے بہت جلد اندازہ لگایا تھا کہ اس کے پچانے اپنے بڑے بھائی کے سیدھے پن سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ محن راؤ اپنی نینم جائیداد کے بارے میں مجسح تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کے والد کی زمین جاندرا کتھی ہے۔

جب راؤ احمد علی نے محن راؤ کو سر اٹھاتے ہوئے ویکھا تو وہ فکر مند ہو گیا۔ اور لگا مختلف تدبیر سوچنے۔

اسے اپنے بھائی سے کوئی خطرہ نہ تھا کیونکہ وہ چون (54) سال کا ہو پہلا تھا وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ رہا تھا۔ محن راؤ تو اس کے نزدیک وہ ڈاکو تھا جو گھر کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر اسے فوائد رہا کہ گیا اس کا گھر میں گھس آتا تھی۔

رااؤ احمد علی کا شاطر ڈھن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ تمہارے بھائی محن راؤ کے بارے میں مختلف منصوبہ سازی میں معروف تھا۔

اوھ تمہارا اچھا مصروف کا رختا تو ادھر تقدیر اپنے کھیل میں معروف تھی۔ وہ کسی طرح راؤ شمشاد کے اکلوتے وارث سے چھٹکا رہ چاہتا تھا کہ ایک اور وارث دنیا میں آگیا وہ تم تھیں۔ بارہ سال کے بعد اس نے راؤ شمشاد کے گھر میں رونق پیدا کر دی۔ راؤ شمشاد کو بیٹی کی بہت خواہش تھی۔ آخر یہ خواہش تمہارے موبہنی صورت میں پوری ہو گئی۔

محن راؤ نے جب سے ساون پور کے چکر لگانے شروع کر دیئے تھے تب سے راؤ احمد علی کے تیز بدلنے لگے تھے۔ ان تیروں کو شمشاد اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ محن راؤ جب بھی ساون پور جاتا تو رہا شمشاد کا دل ایک انجانے خوف سے دھڑکنے لگتا۔ وہ اپنے بیٹی کو جانے سے روکتے نہیں تھے لیکن اس

مُرثافت نے کوئی راست اقدام اٹھانے نہ دیا۔ وہ خالم کے بجائے مظلوم بننا پسند کر لیتے تھے۔ وہ تھپڑ مارنے والے کے منہ پر جواب اپنے تھپڑ مارنے کے بجائے اپنا دوسرا گال پیش کر دینے کے عادی تھے۔ ہر شخص انہیں سمجھا رہا تھا کہ تم سارا بھائی تھیں صفحہ ہستی سے مٹا کر زمین، جاندے اور بقشہ کر لینا چاہتا ہے۔ حسن راؤ کو بھی اسی نے غائب کروایا ہے اور اس کے بعد اب ترش کا بمبر ہے ہوشیار ہو جاؤ۔ جواب میں وہ بھس کر کرتے۔ "ارے نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ تم ساری والدہ مدد و شتمیں صفحہ دینے کے بعد مشکل سے تین ماہ زندگی رکھنی۔ انہیں اپنے بیٹے حسن راؤ سے بہت محبت تھی۔ اس کے گم ہونے کی خبر نے انہیں دنیا سے بیگانہ کر دیا۔ راؤ شمشاد جب بھی گھر میں داخل ہوتے وہ بس ایک ہی سوال پوچھتیں۔ "میرا حسن کماں ہے؟" راؤ شمشاد علی کوئی چھوٹے مونٹے آؤں نہ تھے۔ وہ وسیع تعلقات رکھتے تھے پھر روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ پولیس نے اس علاقے کا چھپے چھپے چھان مارا لیکن حسن راؤ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کا سارا غبھلامتا بھی کیسے۔ اسے ڈاکوؤں نے کب اٹھایا تھا۔ بہرحال حسن ملا، نہ اس کے بارے میں کوئی خبر ملی اور نہ اس کی لاش ملی۔ تم ساری والدہ اپنے بیٹے کی یاد میں ہوش گوا بیٹھیں۔ بالآخر میں ماہ کے قلیل عرصے میں ترپ ترپ کر مر گئیں۔ مرتبے وقت ایک فرمیں شدہ تصویر ان کے بیٹے پر رکھی ہوئی تھی یہ حسن راؤ کی تصویر تھی۔

حسن راؤ کی گشیدگی اور مدد و شتمیں کے انتقال نے تم سارے والد کو بلا کر رکھ دیا۔ وہ بہت سی باتیں سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اب انہیں تم ساری لفڑیں رات کھائے جاتی تھیں۔ کچھ اس طرح کے شواہد ملے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ راؤ احمد علی اب تم ساری جان کا دشمن بن چکا ہے۔

اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تم ساری زندگی کو کس طرح حفظ کیا جائے۔ تم سارے والد نہیں چاہتے تھے کہ تم جاندے کی قربان گاہ پر بھیٹت چڑھا دی جاؤ۔ وہ تمیں، تم سارے چھاپی دوست برداشتے ہیں کیلئے پچار بنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے مضمود بندی کی اور خوب کی۔

تم سارے والد کے ایک بہت اچھے دوست تھے رحمت خان۔ وہ کوئی میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے فوراً رحمت خان کو فون کر کے لاہور بلوایا۔ انہیں ساری صورت حال سمجھائی اور ان سے درخواست کی وہ تمیں اپنے ساتھ لے جائیں اور تمیں اپنی بیٹی ہنار کر پورو ش کریں۔ اسی مسئلہ جاندے جانے تھے کہ تم ساری زندگی کا تھا۔ تم سارے والد کا خیال تھا کہ مجھے اپنی بیٹی کی زندگی بچائی ہے۔ اگر یہ حق گئی تو پورے ہو کر اپنا حق خود حاصل کر لے گی۔ اگر یہ ماروی گئی تو پھر جاندے کو برتنے والا کون ہو گا۔ حسن راؤ کو پہلے ہی غائب کیا جا چکا تھا اور وہ خود بڑھاپے کی وہی پر قدم رکھ رہے تھے۔

تم اس وقت تین ماہ کی تھیں جب تمیں رحمت خان کے ساتھ کوئی روانہ کر دیا گیا۔ یہ کام بڑی اختیار اور مکمل رازداری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ رحمت خان اپنی بیگم کے ساتھ آئے تھے جب وہ تمیں لیکر ساتھ خیرت کے کوئی پیغام نہ تو انہوں نے تم سارے والد کو مطلع کر دیا۔

خیرت سے پہنچنے کی اطلاع ملتے ہی تم سارے والد نے ایک خبر تم سارے چھاپ کو بھجوائی۔ جانتی ہو یہ خبر کیا

اب تمیں کر راؤ شمشاد کی روح میں ستانا اتر گیا وہ گھبرا کر بولے۔ "کس بھائی کو؟"

وارث آگے بھائی حسن راؤ کو۔ آفتاب راؤ نے اپنی بھگل پلکیں پوچھتے ہوئے کہا۔

ہاتھوں طرح اپستال میں، تم سارے والد کو دو اچھی برقی خبریں بیک وقت ملیں۔ ان کا جو حال ہوا سو ہوا لیکن براو احمد علی کو یہ خبر ملی کہ بڑے بھائی کے ہاں بارہ سال کے بعد ایک بچی نے جنم لیا ہے تو وہ خوش ہوئے۔ راؤ کو ڈاکوؤں کے اٹھا لے جانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ دل میں تمیرن کر چکھ گئی۔

اس نے تو اپنے تینیں جاندے اور اپر اپر والے نے اس کو شش کی تھی لیکن اورپر والے نے اس کو شش کو ناکام بنایا تھا۔ وہ بڑے خبیث مراج کا آدمی تم سارے والد کا جاتا تھا اسے نکالنا پھر آسان نہ ہوتا۔ جاندے جاندے کا لامپ تھے اس کو اندر جا کر دیا تھا۔ اس کے دماغ میں جو خناس بھر جاتا تھا سے نکالنا پھر آسان نہ ہوتا۔ جاندے جاندے کے ماں کو کچھ کہنا نہیں ہے کہ وہ خود بخوبی قبر کے نزدیک ہوتا چلا جا رہا ہے اور جاندے کے وارثوں کو چھوڑنا نہیں ہے تاکہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور جتنے سانپ بھی راہ میں آئیں وہ مر جائیں اور اس پر کوئی انگلی بھی نہ اٹھا سکے۔

تم سارے بھائی حسن راؤ کے ساتھ کیا ہوا؟ جگل سے اسے کس نے اغوا کیا اور کس نے کروا یا۔ وہ کہاں پہنچا اور اس پر کیا ہی؟ اگر موقع ملا تو یہ سب بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم اپنے بارے میں جان لو۔ ایک بے نام سی کٹک جو تم سارے والد کے دل میں ہوتی رہتی تھی اور کسی انجانے و سو سے جوان کے دماغ میں سرا بھارتے رہتے تھے حسن راؤ کے اغوا نے اسے سچ نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حسن ساون پور جائے لیکن وہ لڑکا مانتا تھا۔ بالآخر نتیجہ سامنے آگیا۔ اب وہ اپنے بھائی کی طرف سے مشکوک ہو گئے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان کا بھائی تھا بغیر ثبوت کے وہ اس سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔

تم سارے والد بغیر ثبوت کے راؤ احمد علی پر انگلی اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے اور وہ ایسا شاطر تھا کہ کوئی ثبوت نہ چھوڑتا تھا۔ تم سارے بھائی کو غابر رہا کہ وہ بہت خوش قہاد جانتا تھا کہ اب اس کی راہ میں کوئی کانتانہ آئے گا مگر تم سارے والد کو غابر بنا یا اور وہ کسی طرح جنم بلا بینے کو تیار نہ تھا۔

اس نے اپنے ذہن کی مکان میں سازش کا ایک تیر اور چڑھایا۔ اب تم اس کے نشانے پر تھیں لیکن وہ جانتا تھا جس لڑکی کو وہ نشانہ بنانے جا رہا ہے وہ خود ترش ہے تیاروں سے بھری۔

جس نام کوں کر تم پار بار چوکتی ہو۔ یہ نام دراصل تم سارے والد، راؤ فربان علی کو بہت پسند تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر میری کوئی لڑکی ہوتی ہوئی تو میں اس کا نام ترش رکھتا۔ اللہ نے انہیں کوئی بیٹی دی۔ جب تم نے جنم یا تو تم سارے والد کو اپنے والد کی خواہش یاد آئی۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے انہوں نے تم سارے نام ترش رکھ دیا۔ لیکن یہ نام چل نہ سکا۔ حالات نے کچھ ایسا پلاٹا کھایا کہ تم سارے نام تبدیل کر کے تانیہ رکھ دیا گی اس طرح تم اپنے اصل نام کے بارے میں کچھ نہ جان سکیں۔ یہ نام بس چند روزوں میں محفوظ ہو کر رہ گیا۔

تم سارے والد راؤ شمشاد، اپنے بھائی احمد علی کی طرف سے مشکوک تو ہو چکے تھے لیکن ان کی ازل

خان نے تمیس بپ بن کر پالا۔ اس راز سے وہ دونوں پر وہ اٹھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسی رات ایک حادثہ پیش آیا۔ رحمت خان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اپنال جاتے جاتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اب تمارے کوئی رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ تمیس لاہور میں روک لیا گیا۔ دنیا والوں کو یہ بتایا گیا کہ تم یہاں ایم اے جوائن کرنا چاہتی ہو۔ الذاذ علی تعلیم دلوانے کیلئے تمیس یہاں روک لیا گیا ہے۔ روک تو لیا گیا لیکن اب ایک اور مسئلہ کھڑا ہوا۔ تماری شکل، تماری ماں مدد و مش سے بہت ملتی ہے اور جوں جوں تماری عمر بڑھ رہی ہے۔ یہ شبہت گھری ہوتی جاتی ہے۔ کچھ جھلک تم میں، تمارے والد کی بھی ہے۔ راؤ ششاو کے گھر میں جو بھی تمیس دیکھتا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ وہ فرمادہ مش کا ذکر کئے بغیر نہ رہتا۔

ایک مرتبہ لاہور کی کام سے اعتبار راؤ آیا۔ اس نے تمیس و بھاتوبس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے فرماتی اب آگئیں۔ اس بات کا ذکر اس نے اپنے بپ سے کیا۔ وہ فرمائی اپنی بیوی کو لیکر لاہور پہنچ گیا۔ اور غلاف قلعہ دوستیں دن یہاں رہا۔

ایک رات جب سب کھانا کھانے میں مصروف تھے تو راؤ احمد علی کی نظریں بار بار تماری طرف اٹھ رہی تھیں۔ ان نظروں کی الجھن کو تمارے والد بھی محسوس کر رہے تھے لیکن وہ خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔

تب اچانک راؤ احمد علی تمارے والد سے غلط ہوا۔ ”بھائی جان، یہ آپ کے دوست کی بیٹی تو ہو بہو ہماری مرحومہ بھائی پر گئی ہے۔ کمال کی مشاہت ہے۔ یہ تو آپ کی بیٹی تھی ہے۔“

تمیس اگرچہ یہ بتا دیا گیا تھا کہ تم راؤ ششاو علی کی بیٹی ہو لیکن ساتھ ہی تمیس یہ بتا راز رکھنے کے لئے بھی کی گئی تھی۔ تمیس کما گیا تھا کہ اس راز کے فاش ہونے سے تماری جان کو خطہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس لئے تم راؤ احمد علی کی بات سن کر چوکی ضرور مگر خاموش بیٹھی رہیں۔

راؤ احمد علی کی اس بات نے تمارے والد کی روح میں سنانا تاریخی۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس

نے ان کی بیٹی کو پہچان لیا ہو۔

وہ اندر ہی اندر لرزائی۔ انہوں نے فرار فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد ہی تمیس کو بھی سے کہیں اور منتقل کر دیں گے۔ کیونکہ راؤ احمد علی کا منہوس سایہ تم پر پڑھا تھا۔ اور اس منہوس سائے سے تمیس فوری طور پر پچھا نہ شوری تھا۔

ان لوگوں کے جاتے ہی تمارے والد نے عامر کو فون کیا۔ یہ ایسے شخص تھے جن پر ہر طرح کا بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔

عامر سے تمارے والد کی دوسری رشتے داری تھی اور دوستی بھی تھی۔ وہ تمارے والد کے ریسوروں میں روزہ ہی آتے تھے۔ لیکن آج انہوں نے عامر کو ماذل ناؤں بلوایا تھا۔ انہوں نے ان سے ضروری ملاں مشورہ کیا۔ تمارے والد نے ہر وہ بات جو تمارے متعلق بتائی جا کر تھی بتا دی۔ ہر راز سے پر دہ

تھی؟ یہ خرچھی تمارے انتقال کی۔ اس خبر کوں کر تمہارا پچھا جھوم اٹھا، خواہ مخواہ اس کا دامن تمارے خون سے رنگیں ہوتا۔ وہ اس گناہ سے بچ گیا تھا۔ اب اس کی راہ میں کوئی پھر نہ تھا۔ کوئی دیوار نہ تھی۔

انتقال کی خبر سن کر وہ اپنی بیوی کے ساتھ غمزدہ صورت بنائے تمارے والد کی کوئی پسچا۔ اس وقت تمارے انتقال کو ہوئے تین دن گزر چکے تھے۔

اگرچہ قبرستان میں تماری ماں کے پہلو میں ایک نہی سی قبر بادی گئی تھی مگر راؤ ششاو یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ تین ماہ کی بھتیجی کے لئے قبرستان جانے کی ہر گز سخت نہ کرے گا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ صح آکر وہ بکشل شام تک رکا۔ اسے ساون پور لوٹنے کی جلدی تھی۔ وہ رات کو اپنی جو حیلی پہنچ کر گھی کے چڑاغ جلانا چاہتا تھا۔

تمارے والد کا ڈرامہ کامیاب رہا۔ راؤ احمد علی کے وہم و مگان میں بھی یہ بات نہ آسکی کہ اس کے سیدھے سے بھائی نے اسے کھلا فریب دیدیا ہے۔ وہ بہت خوش تھا دنوں وار ٹوٹ سے اسے نجات مل چکی تھی۔ بس بھائی رہ گیا تھا تو اس کا لیکا تھا..... وہ عملی طور پر زمین، باغات اور حوالی سے بہت دور تھا۔ جب تک جیتا ہے جیسے۔ اس کے بیٹے لاہور جاتے تو وہ اپنے تایا سے کچھ نہ کچھ جھاڑی لاتے تھے۔

محقریہ کہ تم مرحوم ہو کر کوئی میں پرورش پانے لگیں۔ تمارا نام ترکش سے بدلتا تھا رکھ دیا گیا۔ رحمت خان تمارے والد بن گئے اور ایک لمبے عرصے تک تمیس معلوم نہ ہو سکا کہ رحمت خان تمارے اصل والد نہیں ہیں۔

کوئی نہیں تھا تم رحمت خان کے گھرانے میں پلی بڑھیں۔ تعلیم حاصل کی۔ یہاں کے کالج سے گرجویشن کیا۔ اس عرصے میں تمارے والد کی مرتبہ کوئی نہیں آکر تمیس دلکھ گئے تھے تم انہیں رحمت خان کے دوست کی حیثیت سے جانتی تھیں۔ میرک کرنے کے بعد پہلی مرتبہ تم لاہور گئیں۔ رحمت خان اور ان کے گھر والے ساتھ تھے۔ اس دوران راؤ ششاو کے غیر معمولی رویے سے کچھ شہمات تمارے دل میں پیدا ہوئے لیکن رحمت خان نے یہ کہ کر معاملہ صاف کر دیا کہ راؤ ششاو کیونکہ تھا آدمی ہیں اس لئے وہ تمیس بیٹیوں کی طرح چاہنے لگے تھے۔

گرجویشن کے بعد تم جب دوسری مرتبہ لاہور گئیں تو حسب معمول رحمت خان کی فیملی بھی ساتھ تھی۔ رحمت خان ایک بہت خالص انسان تھے۔ انہوں نے تمارے سلسلے میں جو عمد کیا تھا اسے پوری دیانتداری سے نجایا۔ اس مرتبہ جب وہ تمیس اپنے ساتھ لاہور لیکر پہنچ تو دل میں بڑی بے کلی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اب تمیس، تمارے والد کے بارے میں بتا دیا جائے۔ اتفاق سے تمارے والد بھی کیا چاہتے تھے کہ اس راز سے پر دہ بہنادیا جائے۔ دنیا والوں کے سامنے نہیں بلکہ اپنی حد تک۔

تب رات کو تمہائی میں اپنے کمرے میں بلا کر انہوں نے تمارا باتھ، تمارے والد کے باتھ میں بیٹھا اور کہا۔ یہ تمارے اصل والد ہیں۔ بس اتنا ہی بتایا۔ اور یہ بتا کر تمیس مزید امتحان میں ڈال دیا تمارے دل میں زبردست نالش نے جنم لیا۔ اگر والد راؤ ششاو علی میں تو وہ کیا حالات تھے جن کے تحت رحمت

مشتعل۔ اس نے جلدی جلدی ورق لئے۔ لیکن اب کسی صفحے پر کچھ نہ تھا۔ کوئی تحریر نہ تھی۔ کوئی جملہ نہ تھا۔ کوئی لفظ نہ تھا۔ وہ ڈائری پلے کی طرح کوری ہو گئی تھی۔

تائیں اس ڈائری کو پکڑے دیر تک محیث رہی۔ اس کی زندگی کیا تھی فناہ یا جان بھی۔ اب کوئی بات ایکی نہ تھی جو اسے معلوم نہ ہو۔ لیکن کمال؟..... ابھی اسے معلوم ہی کیا ہوا تھا۔ ابھی تو کمی باقی میغراز میں تھیں۔ اس کا بھائی کمال تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ اسے معلوم نہ تھا۔ اس سے انتظار کرنے کو کما گیا تھا۔ وقت آنے پر پتا نے کو کما گیا تھا۔

راہ احمد علی کا چہرہ بار بار اس کی نظرؤں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس لاچی شخص نے اس کے باپ کی زندگی میں کیا نہ ہر گھول دیا تھا۔ ساری جانداؤ پر اسی کا قبضہ تھا۔ پھر بھی اسے سکون نہ تھا۔ بڑے بھائی کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ ہر چیز پر قبضہ کر آ جلا جا رہا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ قسم اس کے ساتھ کیا تھیں، کھیل رہی ہے۔ جو دوسروں کے لئے گھر کا ہوتے ہیں بالآخر وہ گڑھے ہی ان کی بربادی کا سبب بن جاتے ہیں ہر ٹلم کا ایک انجام ہوتا ہے۔ ہر رات کا ایک سویرا ہوتا ہے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے والد نے اپنے آپ پر کس قدر ٹلم کیا تھا بھی کی زندگی پچانے کے لئے اسے مرحوم کیا پھر اس سے خود محروم ہوئے۔ اس بڑھاپے میں تمازندگی گزارنا گوارا کری۔ اس کے والد کس قدر عظیم ہیں۔ ایسی قرآنی توکی بھی کسی باپ نے اپنی بیٹی کے لئے نہ دی ہوگی۔

میرے باپ، میرے عظیم باپ۔ میں آپ کی عظمت کو سلام کرتی ہوں آپ کی محبت کو حنفام کرتی ہوں۔ آپ کے جذبے ایسا رکی قدر کرتی ہوں۔ لیکن مجھے آپ سے ایک لٹکھو ہے۔ آپ نے مجھے اپنا ہم زار کیوں نہ بنایا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اگر اسے سارے حالات کا علم ہو گیا تو یہ لڑکی ہے پریشان ہو جائے گی۔ الجھ جائے گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راز کو راز نہ رکھ سکے۔ دشمن جان کے درپے ہے جانے وہ کب وار کر جائے۔ یہ سوچا ہو گانا آپ نے۔

آپ نے بھیتیت باپ تو ٹھیک سوچا لیکن مجھے میری سوچ سے محروم کر دیا۔ اولاً کا بھی تو کوئی حق ہوتا ہے کوئی فرض نہ تھا۔ آپ نے اب تک اپنا فرض نہیا۔ اب میں اپنا فرض نہیاں گی۔ میرا انتظار تکھج۔ میں آرہی ہوں۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گی۔ اپنی زین کا ایک فٹ گھر کا بھی کسی کے قبضے میں نہیں جانے دوں گی۔ آپ بے فکر ہو جائے میں اپنے بھائی کو تلاش کروں گی۔ آپ اگر بڑھے ہو گئے میں تو کیا ہوا؟ میں تو جوان ہوں۔ لڑکی ہوں تو کیا ہوا، میں آپ کو لڑکا بن کر دھکاؤں گی۔ اب آپ کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۵۵ بست دیر تک اسی طرح کی باتیں سوچتی رہی۔ اسے اپنے باپ پر بہت ترس آ رہا تھا اور ظالم چاپر بے حد غصہ۔ وہ کافی دیر تک پچھا تاب کھالی رہی۔ پھر ایک مضموم ارادے کے ساتھ انھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لاہور جائے گی۔

وہ انھی تک بڑی فرمابرداری سے ہر فیصلہ مانتی چلی آرہی تھی۔ لیکن اب اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی کی بات نہیں مانے گی۔ وہ کرے گی جو اس کے دل میں آئے گا اس کے دل میں طوفان انہر رہے تھے اور ان

اٹھا دیا۔ راہ احمد علی کے شبیہ کے تحت تمہاری زندگی کو جو ممکنہ خطرہ پیدا ہو چکا تھا اس سے بچنے کے لئے فوری طور پر تمہیں عامر نے اپنے گھر منتقل کر دیا۔ ماؤں ناؤں سے راوی روڈ تمہارے منتقلی بظاہر بڑے سکون کا باعث تھی۔ لیکن یہ سکون زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکا۔ تمہارے تیوں چچا زاد بھائی اور تمہارے چچا اپنے کاموں سے لاہور آتے رہتے تھے۔ ایک شام جب تم صائم کے ساتھ انہار کی میں گھوم رہی تھیں تو تمہارے چچا پچھی نے تمہیں دیکھ لیا۔ تمہیں دیکھتے ہی انہیں سانپ سا سوٹھ گیا۔

وہ دونوں شاپنگ کرنا بھول گئے۔ اور سیدھے ماؤں ناؤں پہنچے۔ شام کا وقت تھا تمہارے والد رستوران جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ اپنے رستوران میں شام کو دوڑھائی گھٹنے بیٹھا کرتے تھے اور یہاں بیٹھ کر بڑنس سے زیادہ اپنے دوستوں میں وقت گزاراتے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی اور بھاونج کو دیکھ کر انہوں نے رستوران جانے کا پروگرام متوقی کر دیا اور بہت محبت سے ان کی خیر و عائیت دریافت کی۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ وہ لوگ صبح کے لئے لاہور آئے ہوئے ہیں اور رات تک واپس لوٹ جانے کا ارادہ تھا اس لئے انہوں نے ماؤں ناؤں کا رخ نہیں کیا تھا لیکن اب وہ ایک رات قیام کر کے کل صبح واپس جائیں گے۔

کھانے کی میز پر باتوں باتوں میں تمہارے چچا نے تمہارے اہار کی میں دیکھنے کا ذکر کیا۔ اور اپنی بھاری موچھوں کو مرورتے ہوئے بولا۔ ”بھائی جان! وہ تو بالکل آپ کی بیٹی گئی ہے وہ یہاں سے کیوں چلی گئی۔ اسے اپنے پاس رکھیں“۔

اظاہر یہ ایک سادہ ساجدہ تھا لیکن اس جملے کے پیچھے جو زہریلے عزمِ حچپے ہوئے تھے ان کا احساس کر کے تمہارے والد کی خواہ رسیدہ پتے کی طرح کا پہنچے گے۔ انہوں نے سوچا کہ اب تمہارا لاہور میں رہنا کسی خطرے سے خالی نہیں۔

راہ احمد علی کے جانے کے بعد تمہارے والد گھرائے ہوئے عامر کے گھر راوی روڈ پہنچے۔ صلاح مشورہ ہوا۔ طے پایا کہ تمہیں فوری طور پر کراچی منتقل کرو یا جائے اور یہاں تم ایک سال قبل لاہور سے کراچی آ گئیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ہم نے تمہاری زندگی سے متعلق تمام اہم سوالوں کا جواب دی دیا ہے۔ ہم نے تو وہ راز بھی تباہیے ہیں جو تمہارے والد نے تم سے چھاپ کر رکھے ہیں۔ وہ تم سے بناہ محبت کرتے ہیں۔ تمہاری زندگی کی حنافت کیلئے انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ شاید یہ کوئی باپ اپنی بیٹی کے لئے کر سکے۔ اچھا ہم چلے ہیں..... ہمیں گیا وقت نہ سمجھنا، پھر آئیں گے۔

پھر کچھ عجب ہوا۔ ابھی وہ آخری جملے پر نظر ڈالیں ہی رہی تھی کہ لفظ اڑنا شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی ویکھتے وہ صفحہ ایسا ہو گیا جیسے اس پر کچھ لکھا ہی نہ ہو۔ یہ داستان تو کافی لمبی تھی۔ میں باہمی صفات پر

افضل کی آواز بچان کر تائیں ہوئی۔ ”بھائی، میں بول رہی ہوں تائیں۔“
”بی، تائیں خیر ہے۔“

”تی بھائی خیر ہے۔ آپ میرا ایک کام کر دیں میں فوری طور پر لاہور جانا چاہتی ہوں۔ آپ کسی
بھی فلاٹ سے میری سیٹ کفم کرواؤ۔“

”سیٹ توں جائے گی۔ لیکن یہ آپ کو لاہور جانے کی کیا سمجھی۔“ افضل نے پوچھا۔

”بن میرا بھی، بہت گھبرا رہا ہے۔ میں فوری طور پر لاہور جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز
میں کہا۔

”اچھا نہیں ہے، میں ابھی آدمی بیچ کر سیٹ کا انتظام کرواتا ہوں۔ اس اثناء میں آپ جانے کی
تیاری کمل کر لیں۔“

”نہیں ہے بھائی۔ آپ کا بہت شکریہ۔“ وہ ممنون ہو کر بولی۔
”بیلو۔“ افضل نے جلدی سے کہا۔

”بی، بی۔“ تائیں ریسیور رکھتے رکھتے رک گئی۔

”آپ نے خالہ سے بات کر لی۔ انہوں نے آپ کو اکیلے جانے کی اجازت دے دی؟“
”نہیں بھائی۔ میں نے خالہ سے ابھی بات نہیں کی ہے ابھی نیچے جا کر انہیں بتاتی ہوں۔ انہیں زراضی
کرتی ہوں۔ آپ بس میرے نکٹ کا انتظام کر دیں۔“

”نہیں ہے۔ میں کرتا ہوں اور جیسے ہی کوئی انتظام ہو جاتا ہے میں فون پر بتاتا ہوں۔“
”اوکے بھائی۔ اللہ حافظ۔“ تائیں نے ریسیور کھ کر ایک گمراہیں لیا اور پھر وہ فوراً ہی کھڑی ہو
ئی۔

نیچے پہنچی تو دراںہ کو کچن میں صرف پایا۔ وہ کچن میں جھانک کر خالہ فرزانہ کے کمرے کی طرف
بڑھ گئی۔ خالہ فرزانہ نظر کا چشمہ لگائے کوئی موٹا ساتاول پڑھنے میں صرف تھیں۔

تائیں بہت خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے نزدیک بیدر بیٹھ گئی۔ تائیں کو ان کے قریب پا کر خالہ فرزانہ
نے نبول پرے پہنچ کا در مکرا کر بولیں۔ ”سو کر آری ہو؟“
”نہیں خالہ۔“ اس کے لمحے میں بڑی ادائی تھی۔

”تائیں، خیر تو ہے۔“ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

”خالہ، میں نے بھائی کو فون کر کے جماز کا نکٹ منگوایا ہے۔ میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔“

”بائے۔“ خالہ فرزانہ نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”کب اور کیوں؟“

”آج..... چاہے جس فلاٹ کا نکٹ مل جائے۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ خالہ فرزانہ ایک دم فکر مدد ہو گئی۔ ”تم جانتی ہو کہ تمارے انکل عامر
نے تمارے بارے میں کیا کہہ رکھا ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ تائیں نے کہا۔ ”یہی تاکہ مجھے یہاں سے کہیں جانے نہ دیا جائے۔“

طفوفنوں پر بند باندھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ انکل عامر نے اسے منع کیا تھا کہ وہ بھول کر بھی لاہور ٹیلیفون نہ کرے۔ جب بھی فون کریں گے وہ
خود ہی کریں گے۔ ان کی اس ہدایت پر وہ مسکرائی۔ بڑے پر عزم انداز میں اٹھی۔ سائیڈ نیبل پر رکھے
ٹیلیفون کو اٹھا کر بیٹھ پر رکھا۔ اور انکل عامر کے گھر کا ٹیلیفون نمبر نہایت اطمینان سے ملانے لگی۔
کچھ دیر کے بعد ادھر گھنٹی کے بجھے گئی۔

کئی گھنٹیاں بجتے کے باوجود کسی نے رسیور نہ اٹھایا تو اسے تشویش ہوئی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی
تھی۔ کہ اس وقت انکل عامر گھر پر نہیں ہوں گے کافی بچے ہوں گے۔ لیکن گھر میں، گھر کے دیگر افراد تو
ہوں گے۔ لیکن اس وقت تو ایسا محضوں ہو رہا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔

پھر اسے خیال آیا، ہو سکتا ہے۔ غلط نمبر مل گیا ہو۔ اس خیال کے تحت اس نے دوبارہ نمبر ملا یا مگر
تیجے وہی ڈھاک کے تین پات نیل ہوتی رنگی گر کسی نے فون اٹھایا نہیں۔

تائیں نے مایوس ہو کر فون اٹھا کر سائیڈ نیبل پر رکھ دیا۔ اس کی طبیعت میں ایک سمجھی بیجان ساتھا۔ وہ
از کر لاہور پہنچ جانا چاہتی تھی وہ اپنے باپ کے قدموں میں یعنی کرامیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ ہر اس راز سے
آگاہ ہو گئی ہے جو آج تک چھاپا گیا ہے۔ اس کے دل میں لا اعلیٰ رہا ہے۔ وہ کسی قیمت پر اپنے سفاک
چچا کو نہیں چھوڑے گی۔ وہ انہیں شوٹ کر دے گی۔

تائیں نے بیٹھ پر اپنا تکیہ درست کیا۔ پھر ڈائری اٹھا لیت گئی وہ ڈائری کو تکٹے کے نیچے رکھ کر کچھ دیر
آنکھیں بند کر کے لینا چاہتی تھی۔ ڈائری کو تکٹے کے نیچے رکھتے رکھتے ایسے ہی اس کے صفات کو تیزی
سے پلٹ کر دیکھا۔ تب اسے اچانک ان صفات کے درمیان کیسی سرفی سی محضوں ہوئی۔
اس نے جلدی جلدی سے چھوٹا سا اٹھتی کے برابر سرنخ
وحتیہ تھا۔ یہ بالکل تازہ خون تھا۔ ڈائری بند ہونے کی وجہ سے خون دوسرے صفحے پر بھی لگ گیا تھا اور
صفہ کی پشت پر بھی جھلک آیا تھا یہ خون کماں سے آیا۔ وہ اس خون کو دیکھ کر سرم گئی۔

تب اچانک اس کے دل میں وہ جان بیوای خیال آیا تھک کیسی قیمت خیال کو فوراً ہن سے جھلک دیا۔
”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کے باپ کا خون نہیں ہو سکتا..... اس کی سمجھی میں یہ بات نہیں آئی کہ اس
خون کے وہتے کو دیکھ کر اسے راؤ ششادر علی کا خیال کیوں آیا۔

یہ خیال جس طرح بھی آیا۔ بہر حال اسے بے چین کر گیا۔ اس کی روح میں کانے بھر گیا۔
پھر وہ خون دیکھتے ہی دیکھتے خٹک ہونے لگا۔ کچھ دیر میں ہی صفحہ ڈائری سے مت گیا اس نے ڈائری
کے اوراق پر دوبارہ تیزی سے نظر ڈالی لیکن اب ڈائری پھر سے سادہ ہو چکی تھی۔

اس نے ڈائری تکٹے کے نیچے رکھی اور پھر تیزی سے انکل عامر کا ٹیلیفون نمبر ملانے لگی۔ چند سینڈ کے
بعد ادھر تیزی سے گلی گلی مل گئی اور پھر فون کی نے نہیں اٹھا۔

تب اس نے افضل کے دفتر فون ملایا وہ گھنٹیاں بجتے کے بعد ادھر سے افضل نے فون اٹھا کر ”بیلو۔“
کہا۔

”عامر، آپ کہاں ہیں؟ میں کب سے آپ کو فون کر رہی ہوں؟“ مجھے میں بے قراری تھی۔
”میں ماڈل ناکن گیا ہوا تھا، میں موقع نکال کر گھر آیا ہوں تاکہ تمہیں فون کر سکوں۔“

”آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“ خالہ فرزانہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

” بت بری خبر ہے فرزانہ۔ ادھر سے بڑے ٹھنڈے اور گرے سانس کی آواز سنائی دی۔“

”الشد رحم کرے۔“ خالہ فرزانہ کا دل وہک سے رہ گیا۔

”تانية کہاں ہے۔ اسے بلاڈ اور جتنی جلد ممکن ہو سکے، اسے لاہور بھیج دو۔“

”آخر کیوں؟“

”فرزانہ اس کے والدراو شمشاد علی کا انتقال ہو گیا ہے۔ انہیں کسی نے قتل کر دیا ہے۔“ دھماکہ نیز انکشاف ہوا۔

”ہے اللہ۔“ خالہ فرزانہ نے پنا دل پکڑ لیا۔ ”عامر، یہ کتنا عجیب اتفاق ہے۔“

”کیا؟“ عامر بات کو سمجھنے پائے۔

”وہ خود لاہور جانے کیلئے ترپ رہی ہے۔ شام کی فلاٹ سے اس کی سیٹ بک ہو چکی ہے اور اس قاتم دہ اپنا سامان پیک کر رہی ہے۔ میں دراصل اس سلسلے میں تم سے فون پر بات کرنا چاہتی تھی کہ اسے ہو رہیں ہو یا نہ ہو۔“

”چلو یہ تو اچھا ہو۔ تم ایسا کرو، اسے آئے دو، میں ایمپرورٹ سے اسے لے لوں گا۔ اب مجھے یہ ٹورہ دو کہ اسے موت کی اطلاع ابھی دے دوں یا لاہور آئنے کے بعد۔“

”میرا تو خیال ہے کہ اسے اپنے والد کی موت کی اطلاع مل چکی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ عامر جی ان ہوئے۔

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اچانک اس کا لاہور کے لئے عازم سفر ہونا اور اس کے چہرے کی اداہی، سبات کی غمازیں کہ اس کے دل نے اس حادثے کو کسی نہ کسی طرح محروس کر لیا ہے۔“

”جیت کی بات ہے۔“ عامر جی ان ہو کر بولے۔ ”فرزانہ، تم یوں کرنا چلتے وقت اس احسان کو گمرا کر دے۔ پھر میں جب یہاں اسے تفصیل بتاؤں گا تو وہ اس وقت تک خود کو سنبھال چکی ہو گی۔ اچھا تم اسے بلادو۔ میں اسے بتاؤں کہ ایمپرورٹ پر میں اسے لینے آؤں گا۔ اس سے فلاٹ نمبر وغیرہ اپوچھ لوں۔“

شام کو جب تانية گھر سے رخصت ہونے لگی تو خالہ فرزانہ نے اسے گلے سے لکار بس اتنا کہا۔
چند دل کی گواہی پر لاہور جاری ہو تو اس دل کو قابو میں رکھنا، حصے سے کام لینا۔ شاید ایمپرورٹ پر ل کوئی بری خبر سننے کو ملتے۔“

”میں اس بری خبر کے لئے تیار ہوں خالہ۔ مجھے میں بڑا حوصلہ ہے آپ فکر مند نہ ہوں۔“ یہ کہ کر ٹھنڈ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی نے ایمپرورٹ کی طرف رخ کر لیا۔

لاہور ایمپرورٹ پر عامر اس کے منتظر تھے تانية کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ اس کی طرف لپکے۔ ان کا

”ہاں کیسی؟“ - خالہ فرزانہ نے الجھے لجھے میں کہا۔

”خالہ..... انکل عامر میرے بارے میں فیصلہ کرنے والے کون ہیں؟“ تانية کا عجب سمجھا اوارہ۔

”یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔“

”خالہ آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی..... کاش آپ میرے بارے میں کچھ جانتیں۔

آپ کو سب کچھ بتا سکتی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”لاہور سے واپس آکر سمجھاؤں گی۔“ اس نے ایسے ہی ان کی تسلی کے لئے کہہ دیا۔ وہ نیز

تمی کی لاہور جانے کے بعد وہ واپس بھی آئیگی یا نہیں۔ خالہ فرزانہ بڑی پیاری خاتون تھی تانية کو ان سے محبت ہو گئی تھی خود خالہ فرزانہ اس پر کیا کام جان چھڑکتی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ لاہور کے بعد وہ انہیں بہت مس کرے گی۔

کوئی تین بیجے کے قریب افضل کافون آگیا۔ اس نے بتایا کہ شام کی فلاٹ سے اس کی سیٹ

کروادی ہے۔ وہ جانے کی تیاری کرے۔ وہ خود اسے پھر ایمپرورٹ چھوڑ دے گا۔

تانية کے اچانک لاہور جانے کے ارادے سے خالہ فرزانہ پریشان ہو گئی تھیں عامر نے زندگی پار کیئی ذمہ واری سوپنی تھی وہ اس ذمہ داری کو بخیر و خوبی نہ باندھ سکتی تھیں۔ وہ تانية کا بے حد خیال

تھیں۔ وہ اسے ایک منٹ کو بھی گھر سے باہر نہیں جانے ویتی تھیں۔ اگر جاتی تھی تو انہیں معلوم ہوں کہاں گئی ہے اور کب آئے گی۔ ویسے خود تانية نے انہیں اس معاملے میں قطعاً پریشان نہ کیا تھا۔

فرماتیدار اور سلبھی ہوئی لڑکی تھی۔

اسی سلبھی لڑکی کے دماغ میں اب جانے کیاختناس سماں یا تھا کہ وہ اچانک لاہور جانے پر قل گئی تھی۔

سیٹ بھی کنغم ہو گئی تھی۔ اور وہ اپر سوٹ کیس میں ضروری سامان رکھ رہی تھی۔

اس دوران خالہ فرزانہ، عامر کو کئی مرتبہ فون کر چکی تھیں مگر وہاں کوئی اٹھا ہی نہیں رہا تھا

محروس ہوتا تھا جیسے گھر بند کر کے سب لوگ کہیں چلے گئے ہوں۔

خالہ فرزانہ بہت دیرے سے پاؤں لٹکائے بیٹھ پریشانی تھیں۔ ان کا دل مفطر بھا۔ وہ عامر کو فو

پر صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتی تھیں۔ مگر لاسن مل ہی نہیں رہی تھی۔ پھر خالہ فرزانہ جانے

کر مسکرا دیں۔ بڑی پیچکی سی مسکراہست تھی۔ عامر اور وہ شاید دو مختلف کمکشاویں کے سیارے

دونوں نے پوری زندگی گرا دی ایسے ہی بغیر لائیں ٹلے۔

ان کی نظر پار بار ٹیلیفون کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ وہ اضطراب میں اب تک کئی پان کھا بھی تھیں

جب بھی پریشان ہوتیں پان پر پان کھانے لگتیں۔

پھر اچانک ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ پر بھا کر رسیور اٹھایا۔

”تے۔“

”عامر۔“ ادھر سے رنج میں ڈوبی ہوئی آواز اکھڑی۔

غاظی ہو گئی تھی۔ سوراخ بائیں جانب تھا جبکہ قاتل ریو الوران کے دائیں ہاتھ میں پکڑا گیا تھا۔ ابتدائی تقیش سے ہی یہ بات سامنے آگئی تھی کہ راؤ صاحب نے خود کشی نہیں کی بلکہ انہیں مار گیا ہے راؤ صاحب معمر ضرور تھے پھر بھی عمر کے لحاظ سے ان کی صحت قاتل روشن تھی۔ وہ کسی برے فعل میں نہ تھے بہت نیک اور صاف سترے انسان تھے۔ انہیں خود کشی کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔

اپنے باپ کی قتل کی رواداد سن کر وہ گم صم ہو گئی۔ اس پر سکھ ساطاری ہو گیا۔ عمار سے راستے بھر تکی دیتے رہے۔ سمجھاتے رہے۔ وہ خاموشی سے سب سنتی رہی۔ اور خالی نگاہوں سے عامر کو دیکھتی رہی۔

ماں ٹالن کی وہ کوئی جمال راؤ شمشاد علی کو قتل کیا گیا۔ رشتہ داروں، عزیزوں، دوستوں اور بھی خواہوں سے بھری ہوئی تھی۔ راؤ احمد علی کا پورا اگر انہے موجود تھا۔ اور پیش پیش تھا۔

بھائی کے غم میں راؤ احمد علی کی بربی حالت تھی۔ بار بار اس پر غشی کے دورے پر رہے تھے۔ اس کے بیٹے اسے سنبھال رہے تھے۔ اور سرگوشی میں اس سے کہہ رہے تھے۔ ”ابا، یہ کیا کر رہے ہو؟“

کوئی نہیں جانتا تھا کہ عمار اس وقت کہاں ہے کس کو لینے گیا ہے۔ راؤ احمد علی چند آنسو سا کر بازی بیٹت لینا چاہتا تھا۔ ساون پور کی جائیداد تو اس کے بخنسے میں تھی ہی۔ اب یہ کوئی اور ریسٹوران بھی کہا۔

بالآخر اس کی شطرانہ منصوبہ بندی کا سیاہ ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کامیابی پر جس تدریخ خوش ہوتا کم تھا۔ لیکن یہ وقت تو رونے کا تھا۔ اور وہ رورہا تھا۔ سک سک کر رو رہا تھا۔ رہ رہ کر رو رہا تھا۔

عامر کی پڑھائی ہوئی پی کے مطابق، تانیہ خاموشی سے عورتوں میں ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا آدھا چڑھا کے ڈھکا تھا۔

جنازہ اٹھائے جانے سے پہلے مرنے والے کا چڑھا دکھایا گیا۔ ہر سو اعلان کیا گیا کہ جو چڑھا دیکھنا چاہتا ہے آکر دیکھ لے۔ میت کرے میں رکھی تھی۔ لوگ ایک دروازے سے داخل ہو کر چڑھا دیکھتے ہوئے دوسرا دروازے سے نکل رہے تھے۔

جب گھر کی عورتوں کی باری آئی تو تانیہ بھی ان عورتوں میں شامل تھی۔ وہ میت کے نزدیک پہنچتے ہی اپنے ہوش گواہی بھی۔ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے باپ کی لاش پر جھک گئی۔ اور جیخ مار کر دنے لگی۔ صائمہ اس کے ساتھ تھی وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

تجھی دروازے میں اچانک راؤ احمد علی داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر عورتیں ادھر ادھر ہوئے گئیں۔ تانیہ کے نزدیک پہنچ کر وہ جھکا اور اس کے بھروسے اور کھردارے ہاتھ کی گرفت، تانیہ کے نرم ملائم باختہ پر بشرط ہوئی گئی۔

روشن ہوئی تانیہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ پہلے اس نے اپنے ہاتھ کو، پھر اپنے ہاتھ پکڑنے والے کو دیکھا۔ اور بڑے سرد لمحے میں بولی۔ ” Rao

جی چاہا کہ تانیہ کو بے اختیار لپٹا کر روپڑیں۔ مرنے والا رشتہ دار کے علاوہ ان کا بہت پیارا دوست تھا اور آنے والی مرنے والے کا خون تھی۔ اسے لپٹا کر نہ روتے تو پھر کے لپٹا کر روتے۔ ان کی حالت ہبھی تھی۔ لیکن پھر انہوں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ انہوں نے تانیہ کے سرپرہاتھ رکھ کر رہا سا گلے لگایا اور بولے۔ ”کیسی ہوتانیہ؟“

تانیہ نے جواب دینے کے بعد ان کی انکھوں میں دیکھا اور بڑی جرأت سے بولی۔ ”میرے یہ موت کیسے ہوئی؟“

یہ جملہ سن کر عامر ہڑپڑا گئے وہ تو یہی سرچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ تانیہ کو اس کے باپ کے مرزا اطلاع کن الفاظ میں دیں گے۔ لیکن وہ تو اس منزل سے آگے نکل چکی تھی۔ تو یہ فرزانہ نے اسے رکھ جو دیں بتا دیا۔

”فرزانہ نے تمیں کیا بتایا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”خالہ نے تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ یہ بھی نہیں کہ میرے ببا مر چکے ہیں۔“ وہ عجیب لمحے میں کر رہی تھی۔

”پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تمہارے ببا کا انتقال ہو چکا ہے؟“ سوال ہوا۔ ”انتقال نہیں..... خون کسئے خون۔ میرے ببا کا خون ہوا ہے۔“ تانیہ نے بڑے پر اسرار انداز کہا۔

”ادہ“۔ عامر کا حیرت کے مارے منہ کھل گیا۔ ”آج، گاڑی میں چلو راستے میں تمیں سب ہوں“۔

راؤ شمشاد علی اپنی کوئی تھی میں تumarتے تھے۔ اب ان کی عمر بھی مراجعت کرنے والی نہیں رہی ام انہیں قتل کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ گھر میں ان کے ساتھ ایک ملازم اور ملازمہ رہتے تھے۔ یہ میاں پیوری تھے اور راؤ صاحب کے بہت پرانے ملازم تھے۔ عبدال اور رشیدہ کی ایک ہی بیٹی تھی جو شدہ تھی۔ رات کو اچانک اس کے ایک بیٹے کی اطلاع میں توہہ دونوں راؤ صاحب سے اجازت لئی بیٹی کے گھر دھرم پورے چلے گئے۔ ان کی بیٹی اپنے تال سے گھر بھینچ کی تھی۔

بس وہ رات ہی قیامت کی تھی۔ شاید قاتل گھمات لگائے بیٹھا تھا۔ صبح کو دو دھواں والے نے تبلیجیا۔ گھر کا گیٹ لکھا گیا۔ کوئی باہر نہ لگا۔ تو اسے پریشان ہوئی کیونکہ آج تک نہ ہوا تھا۔ اس نے برابر والی کوئی واں کو تیاریا۔ جب لوگوں نے گیٹ کے اندر کو دکرہ اندر کو دکرہ روازہ خلا ہوا تھا۔ راؤ شمشاد علی خون میں لٹ پٹے تھے۔ وہیں ہاتھ میں ان کے ریلا دا تھا۔

قاتل نے اسے خود کشی کا کیس بنانے کی کوشش کی تھی۔ گولی کنپتی میں گئی تھی۔ گولی بہت قریب بلا جائی گئی تھی۔ بائیں کنپتی میں سوراخ ہو گیا تھا اور گولی اندر ہی کیس دھنس گئی تھی۔ قاتل سے ”احمد علی اپنا پاک ہاتھ پرے کر لو“۔

راڈ احمد علی سے اس انداز میں اور اس طرح کی بات کرنے والا آج تک پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ ساون حکمران تھا، اونچا بولنا تو دروڑی بات ہے لوگ اس کے سامنے سراخا کر بات نہیں کرتے تھے۔ پھر آس کی شامت آئی۔ بولنے والے کانہ صرف ہبج سخت تھا بلکہ جوبات اس نے کی تھی، وہ بات نے تیر تھا جو اس کے دل میں ترازو ہو گیا تھا۔

وہ بڑا کایاں شخص تھا۔ ایسا طشت آؤی تھا جو سانپ کو لاٹھی توڑے بغیر مارنا جانتا تھا۔ اس لڑکی۔

کماہدہ اس نے اچھی طرح سن لیا تھا اور سن کر اس بات کا اندازہ کرنے میں اسے ذرا بھی دیر نہ لگی کہ والا کسی وزن وار شخصیت کا ماں ہے۔ وہ کوئی چیز ہے جو اس نے اس کا نام لے کر اتنی بڑی بات آسانی سے کہ دی ہے۔

یہ ایک نازک موقع تھا اور وہ بڑا موقع شناس شخص تھا۔ وہ اپنی جنباتیت سے جنتی ہوئی بازی ہارنا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً اپنائی اختیار کرنے کے بارے میں سوچا۔ اس وقت سنی کر دنای، تاکہ اندر ہیرے میں چھپا ہوا شخص باہر آجائے۔

جب تانیہ نے ہاتھ پکڑنے والے کو گھور کر نہ رو لجھے میں کما۔ ”راڈ احمد علی اپنا ناپاک ہاتھ پر لو۔“

تو راؤ احمد علی کو فیصلہ کرتے ہوئے ایک سینئنڈ بھی نہیں لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ فوراً ہٹالیا جیسے کسی غسل کے تحت اس نے تانیہ کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔

اس کے ہاتھ چھوڑتے ہی تانیہ فوراً سیدھی کھڑی ہو گئی اس نے ترچھی نظرؤں سے راؤ احمد علی کو وہ بھی بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ وہاں رکی نہیں عورتوں کو ہٹاتی ہوئی اندا گئی۔

تانیہ اندر گئی تو راؤ احمد علی اپنے بائیں ہاتھ سے بھاری موچھ کو بل دیتا باہر نکل آیا۔ کسی اور عورت نے یہ بات سنی ہو یا نہ سنی ہو لیکن صائمہ نے بہت اچھی طرح سن لی تھی۔ وہ جیسا گئی تھی۔ وہ تانیہ کی اصل سے واقف نہ تھی، وہ اسے رحمت خان کی بیٹی سمجھتی تھی، وہ کیا بھی اسے رخان کی بیٹی سمجھتے تھے سوائے عامر کے اس کے باب کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

صائمہ، عامر کی بھائی تھی۔ بہن کے یہودہ ہو جانے کے بعد عامر نے دونوں ماں بیٹی کو اپنے پاس تھا۔ اب وہی ان دونوں کے کھلیل تھے۔ صائمہ تیری سے اپنے ماموں عامر کی تلاش میں نکلی۔ وہ خطرناک بات کو فوری طور پر اپنے ماموں کے گوش گزار کر دینا چاہتی تھی۔ ادھر راؤ احمد علی کو بھی عامر کی تلاش تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ گستاخ لڑکی آخر ہے کون؟ اگر رخان کی بیٹی ہے تو راؤ اششاو علی کی لاش سے لپٹ کر رونے کے کیا معنی؟ یہ اب تک کہاں تھی؟ اتنے سے کیوں پہنچی۔ پھر اس نے اس کا نام لے کر اس قدر نفرت سے ہاتھ ہٹانے کو کیوں کما۔ یہ سے گور کو دھندا ہے؟

راڈ احمد علی سے پہلے صائمہ نے اپنے ماموں کو تلاش کر لیا۔ پھر وہ انہیں ایک گوشے میں لے گئی اور

”جی اچھا۔“ کہ کہ صائمہ ووڑتی ہوئی اندر چل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تانیہ صائمہ کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی۔ کاملی چادر میں اس نے اپنا آٹھا چڑھ دھک رکھا تھا۔ عامر نے اوھرا وھر دیکھا، پھر کچھ درج کر سروفت کو اڑکی طرف چل دیئے۔ صائمہ اور تانیہ بھی ان کے تعاقب میں وہاں پہنچ گئیں عبد در شیدہ کوٹھی میں تھے۔

”ہاں کیا ہوتا تھا؟“ عامر نے پوچھا۔

”صائمہ آپ کو بتا تو پکھلی ہے۔“ تانیہ نے جواب دیا۔

”تمہیں، ایسا نہیں کہا جائے تھا، میں نے راستے بھر جیسیں اتنا سمجھا یا پھر بھی.....“

”اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ بس پھر میں اپنا غم بھی بھول گئی، اس پر رس پڑی۔“ تانیہ نے اپنی غالباً جیش کی۔

”جیرت ہے، اس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔“

”اچھا ہوا کہ وہ کچھ نہ بولا، درد نہیں بھی اسے بتاویتی کہ میں کون ہوں؟“

”وہ بہت چالاک ہے، تمہارے روتے ہی کسی نے اسے اطلاع دی دی اور وہ کسی عذاب کی طرح ناصل گیا۔ اس نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا کہ وہ تم سے پوچھ سکے کہ تم کون ہو، لیکن تمہارے جواب نے ساکے ہوش اڑا دیے اب اس کا شکر یقین میں بدلتا ہوا گا اور وہ ہماری تلاش میں گھوم رہا ہو گا۔“

مرنے قیاس آرائی کی جو بالکل چی تھی۔

”میں اس سے کب تک چھپوں گی؟“ یہ سوال بھی تھا اور احتجاج بھی تھا۔

”تم نہیں جانتے ہو، وہ کس قدر سفاک آؤی ہے۔“ عامر نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں اس سے زیادہ سفاک بن جاؤں گی۔“ تانیہ نے سمجھنے سے انکار کر دیا۔

”ہم قانونی جنگ لڑیں گے۔ جاندہ کے کافی نہیں اور وصیت نامہ ہمارے وکیل کے پاس موجود ہے، کل وکیل صاحب یہاں آئیں گے، وصیت سب کے سامنے پڑھ کر سنائی جائے گی۔ مجھے معلوم ہے وصیت میں لیکا ہے۔ راؤ اصحاب مجھے سب بتاچکے ہیں، تب پھر میں کھڑے ہو کر اعلان کروں گا کہ صاحب کاوارٹ کون ہے۔ خیریہ توکل کی بات ہے فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ تم صائمہ اور اس کی تھ۔“ یہ کہ رکارڈر کے ساتھ خاموشی سے انہیں راوی روڈ کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ کام اس قدر تیری اور

داری سے ہوا کہ کوئی اندازہ بھی نہ کر سکا کہ تانیہ جو ابھی میت سے لپٹ کر رورہی تھی، وہ اب یہاں

نہیں ہے۔ عامر نے خدا کا شکرا دیکھا کہ تانیہ نے اس کی بات بڑی فرمائی برداری سے مان لی تھی۔ جانے۔
انکار نہیں کیا تھا۔

”اللہ حافظ۔ انکل۔“ تانیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اپنے آنسو روکتی ہوئی تیری سے اندر چلی
گئی۔

وہ جہاز میں بیٹھ کر تیچ و تاب کھاتی رہی۔ ایک طرف اسے اپنے باپ کی موت کا شدید صدمہ تھا تو
وہ مری طرف اس بات کا درکھ تھا کہ وہ بزرگوں کی طرح وہاں سے جان بچا کر ہجاؤ آئی تھی۔ انکل عامر
نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا خواہ مخواہ بیباکی قسم دیدی تھی۔ پھر تو اسے جبور لاہور چھوڑنا ہی تھا وہ لاحر
چھوڑ آئی تھی۔ ظالموں کیلئے حکلہ میدان چھوڑ دیا تھا۔ اسے اپنے چاراڈ احمد علی پر اس قدر غصہ تھا کہ اس
کا کمی چاہتا تھا کہ اڑتے جہاز سے چھلانگ لگا کر ساون پور پنچے اور راؤ احمد علی کے سینے پر اس قدر گولیاں
بر سائے کہ ایک سوت بھی جگہ باقی نہ پنچے۔

کاش! وہ لڑکا ہوتی تو انکل عامر اسے اس قدر پریشان ہو کر کراچی روانہ ہرگز نہ کرتے۔ وہ اس وقت
اپنے باپ کی کوئی تھی میں ہوتی اور وہاں بیٹھ کر دشمن کے خلاف منصوبہ بننی کر رہی ہوتی۔ خیر کوئی بات
نہیں، وہ لڑکی ہے تو کیا ہوا، وہ لڑکی رہتے ہوئے ایسی جرأت کا مظاہرہ کرے گی کہ راؤ احمد علی کے ہوش اڑ
جاکیں گے ہوش تو اس نے اس وقت ہی اڑا دیئے تھے جب اس نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس کی ڈانٹ سن
کر وہ کیا بھیگی بلی بن گیا تھا۔ اس احساس نے اسے بڑی تقویت وی۔

کراچی ایئر پورٹ پر افضل موجود تھا۔ افضل کا داس چورہ دیکھ کر اسے یاد آیا کہ وہ اپنے باپ کو لاہور
دنفا کر آرہی ہے۔ تانیہ قریب آئی تو افضل نے دمکی لجھ میں کما۔ ”بڑا افسوس ہوا، تانیہ۔“
”ہاں بھائی۔“ میں بڑا عجیب نصیب لکھا کر لاتی ہوں، بھائی سب کچھ ختم ہو گیا۔ تانیہ کی آنکھوں
میں آتسو جملکنے لگے۔

”تانیہ کچھ ختم نہیں ہوا۔ ہم لوگوں کی زندگیاں ایک دوسرے کے پاس اللہ کی امانتیں ہیں جو دنیا ہے
وہ لینے کا بھی حق رکھتا ہے۔ اس نے اپنا حق استعمال کر لیا۔ اب آپ کو صبر کرنا ہو گا۔“ افضل نے
اسے دھار دینے کی کوشش کی۔

تانیہ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ کیا کہتی، وہ میڑھیوں پر گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ جب افضل
گاڑی لے کر آیا تو اسے یہ دیکھ کر جرت ہوئی کہ خالہ فرزانہ گاڑی کی پچھلی نشست پر موجود ہیں وہ دروازہ
کھلن کر گاڑی سے باہر آنا چاہتی تھیں لیکن تانیہ نے اٹھیں گاڑی سے اترنے کا موقع نہ دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے
ان سے پٹھ گئی۔ اس کی سکیاں بند گئیں۔

افضل نے گھوم کر تسلی آمیز لجھ میں کما۔ تانیہ پلیز روئیں نہیں۔“

پھر اس نے گاڑی سے اتر کر اس کا سامان ڈگی میں رکھا اور رائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر
دی۔ اس اثناء میں تانیہ ٹھیک سے بیٹھ کر گاڑی کا دروازہ بند کر چکی تھی۔

وہ سارے راستے خالہ فرزانہ کے کندھے پر اپنے سر کھے بیٹھی رہی اور خالہ فرزانہ دھیرے دھیرے اس
کے کرپہ ہاتھ پھیرتی رہیں، لیں اسی طرح خاموشی سے راستہ کٹ گیا۔

عامر نے اندر آتے ہی جنازہ اٹھائے جانے کا اشارہ دیا۔ بس پھر راؤ احمد علی کو عامر سے بات کرنا
موقع نہ ملا۔ تدقیق میں رات کے سازی سے گیارہ نج گئے۔ عامر نے پیرستان سے اپنے گھر کا رنگ لیا۔
ان کا ارادہ تھا کہ وہ رات کو یہیں قیام کریں گے۔ بد لے ہوئے حالات کی وجہ سے انہوں نے راؤ احمد
سے دور ہی رہنا مناسب سمجھا۔

دوسرے دن خاندان کے معزز لوگوں کے سامنے وکیل صاحب نے وصیت کھول کر پڑھی۔ ا
وصیت کے مطابق باطل نایک کی کوئی اور بال اور الاریستوران تانیہ کے نام کیا گیا تھا۔ ساون پر
جانکار دار محسن راؤ کو ہمرا ریا گیا اس کے نہ ملنے کی صورت میں پھر تانیہ اس جانکار دیکی مالک ہو گئی
یہ وصیت راؤ احمد علی کے سرپر کسی پھر کی طرح لگی۔ وہ اس وصیت کو سنبھلتے ہی کسی باوے کے تکنی ط
کاٹنے کو دوڑا اس نے وصیت کی نقل پھاڑ کر پڑے کر دی اور پھر کارتا ہوا کوئی سے نکل گئی
عامر کو اب تانیہ کی فکر تھی۔ راؤ احمد علی باکلا ہو چکا تھا۔ وہ کسی بھی وقت تانیہ کو کاث سکتا تھا۔
نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جو بھی فلاں دستیاب ہوئی، اس سے تانیہ کو کراچی کیلئے روانہ کر دیا۔
چوہیں گھنے کے اندر کراچی واپس پہنچ گئی۔

تانیہ اب کراچی واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ عامر نے مرحوم باپ کی قسم دے کر اسے کراچی وا
بھیجا تھا۔

انہوں نے اسے سمجھا تھا کہ تمہارے باپ نے تمہاری جان بچانے کی خاطر اپنی زندگی اجیرن کر لے
تمہاری زندگی کی حفاظت کیلئے انہوں نے تمہیں مرحوم بنادیا۔ پوری زندگی تمہارے لئے ترستے رہے؟
اپنی محبت کیلئے تمہیں موت کے منہ میں دھکیلہ پسند نہ کیا۔ اب تم چاہتی ہو کہ میں اس کام کی اجاز
ویدول۔ تمہیں بھیڑوں کے بھٹ میں چھوڑ دوں۔ وہ مجھے تمہارا گارجین بنانے کر گئے ہیں۔ خدا خوا
تمہاری زندگی کو کچھ ہو گیا تو اس کی روح کس قدر ترپے گی۔ تانیہ تمہیں اپنے مرحوم والد کی قسم
کراچی جانا ہو گا۔ میں یہاں موجود ہوں۔ تمہاری طرف سے قانونی جنگ لڑنے کیلئے۔ بے فکر ہو
میرے ہوتے ہوئے تمہارا حق تم سے کوئی نہ چھین سکے گا۔“

”ٹھیک ہے، انکل میں چلی جاتی ہوں، لیکن یہ بات میں اپنی طرح جانی ہوں کہ راؤ احمد علی
میرے بڑے بھائی محسن راؤ کو اغوا کیا ہے۔ وہ زندہ ہیں، مجھے شبہ ہے کہ وہ راؤ احمد علی کی تحویل
ہیں۔ انکل میں زمین جانکار پر لعنت بھیجنتی ہوں مجھے اپنا بھائی چاہئے۔ میں اٹھیں ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔
وہ مجھے مل گے تو پھر میں یہاں سے وہاں تک ایک کو دیکھ لوں گی۔“ تانیہ نے بڑے جوش
کہا۔

”تانیہ، میں اس سلسلے میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں انشا اللہ ہمارا محسن راؤ ضرور دے
آئے گا۔ تم فکر نہ کر، اچھا جاؤ، جہاز اب جانے والا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔“ عامر نے

”دردانہ کیسے آئی ہو؟“ تانیہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بی بی، آپ کا ناشتہ میں لے آؤ۔“

”میں میں بچے آرہی ہوں۔ خالہ کے کمرے میں ناشتہ کروں گی۔“ اس نے دھمکے لمحے میں کہا۔

پھر جب وہ خالہ فرزانہ کے کمرے میں بچپن تو اس نے دیکھا کہ وہ قرآن شریف پڑھ رہی ہیں۔ اس کی آہن محسوس کر کے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے قریب بینٹنے کو کہا۔ اس نے زدیک بینٹ کر خالہ کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر کے بعد جب خالہ نے آدھا پارہ مکمل کر لیا تو قرآن شریف بند کر کے چوہا اور اس کو الماری کے اوپر رکھنے کیلئے اٹھنے لگیں تو تانیہ نے فوراً قرآن شریف اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”لائیں، خالہ میں رکھ دوں۔“

”تانیہ میں تیزی سے قرآن شریف نہیں پڑھ سکتی انشاء اللہ آدھا اپارہ کر کے قرآن شریف مکمل کر دوں گی۔ قرآن شریف مکمل ہونے پر تمہارے والد کو بخشن دوں گی۔“ خالہ فرزانہ نے بڑی محبت سے کہا۔

”خالہ آج میں نے خود قرآن شریف شروع کیا ہے، ابھی تین پارے پڑھ کر آرہی ہوں، انشاء اللہ جلد ہی مکمل کر لوں گی۔“

”ہاں بھی ضرور پڑھو، ایصال ثواب کیلئے اس سے اچھی کوئی چیز نہیں ہے۔“
”بالکل صحیح کہا آپ نے۔“

”سازھے آٹھ بجے کے قریب عامر کافون آیا تھا۔ میں نے تمیں دکھوایا تم سوری تھیں۔ میں نے اخانا مناسب نہ سمجھا۔ پھر عامر نے بھی اخانا سے منع کیا ہے ہمارے تھے کہ آج ظرکے بعد سوم ہے لیکن تمہارا بچا اپنے بھر کے ساتھ واپس جاچکا ہے۔ جاتے جاتے وہ عامر کو دھمکیاں دے گیا ہے۔“

”کس قسم کی دھمکی؟“ تانیہ سے پوچھا۔

”یعنی کہ وہ عامر پر مقدمہ قائم کرے گا۔ تانیہ راوی شمشاد علی کی اصلی بیٹی نہیں ہے۔ یہ سارے اسونگ عمار نے رچا ہے۔ تاکہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی اور سستوران پر قبضہ کر سکے۔“

”اٹکل عامر تو یہ سن کر پریشان ہو گئے ہوں گے۔“

”ارے نہیں۔ تم نے عامر کو کیا سمجھا ہے، وہ بست نذر اور ضدی قسم کے انسان ہیں، شریف اور مختلف یہی مجرماں وفت تک جب تک سامنے والا رشتہ کا مظاہرہ کرے۔“

”کاش! میرے بابا بھی ایسے ہوتے۔ شریفوں کیلئے شریف اور بد معاعشوں کیلئے بد معاعش۔“

”تم اپنے والد کی کیا بات کرتی ہو، وہ بست پیارے انسان تھے، درویش صفت، وہ شریفوں کیلئے تو شریف تھے ہی بد معاعشوں لئے بھی شریف تھے۔ میں تمہارے والد کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ آج کے اس فرمی دوڑ میں ایسے لوگ ڈھونڈنے نہیں ملتے۔“ خالہ فرزانہ نے بڑی عقیدت سے

تانية رات گئے تک خالہ فرزانہ کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اس نے اپنی زندگی کا پورا کچھ خالہ فرزانہ کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ اس کی زندگی ایک معتمد بن کر رہ گئی تھی۔ ایک راز، ایک سر در دین کر رہ گئی تھی۔ اب اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنی زندگی سے متعلق حقیقی کوئی بات چھپا کر نہ رکھے گی اسے اپنی اس راز بھری زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنے پیاروں کو ہربیات بتا دنا چاہتی تھی۔ خالہ فرزانہ اور افضل کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا لیکن آج کی رات انہیں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اب وہ اس کی زندگی کی حفاظت بہتر انداز میں کر سکتے تھے۔

رات کے تین بجے کے قریب جب تانیہ اپنے کمرے میں جانے کیلئے اٹھنے لگی تو خالہ فرزانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بھایا اور بولیں ”اب اور جا بکر کیا کرو گی، یہیں سو جاؤ۔“

”ہاں، خالہ بھی بہتر رہے گا۔“ افضل نے تائید کی اور خود کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

افضل کے جانے کے بعد خالہ فرزانہ نے کہہ اندر سے بند کر لیا۔ تانیہ ان کے بازو پر سر رکھ کر لیت گئی اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چل گئی۔

نجر کے وقت خالہ فرزانہ نماز کیلئے اٹھیں تو تانیہ کی بھی آنکھ کھل گئی۔

”کیا ہوا؟ میں نے لائٹ جلا دی، اس نے تمہاری آنکھ کھل گئی۔ میں لائٹ بند کئے دیتی ہوں۔“

خالہ فرزانہ نے کما اور سوچ کی طرف بڑھیں۔

”میں خالہ رہنے دیں۔ میں بھی انھر رہی ہوں، اپنے کمرے میں جا کر نماز پڑھوں گی۔“ یہ کہہ کر تانیہ کھڑی ہو گئی۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ خالہ فرزانہ نے جانے کی اجازت دیدی۔

وہ خالہ فرزانہ کے کمرے سے باہر نکلی۔ ایک نظر اس نے پر اسرا رکھے پر ڈالی۔ دروازہ بند تھا

کا لات تھیڈن پر لٹکا ہوا تھا۔

وہ سڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں بچپن تو اپنے اپنے کام کا غلبہ ہونے لگا ہے یہ سوچ کر تھوڑی بھی اپنے بیٹر پر لیٹ جاؤں، پھر انھر کر نماز پڑھی ہوں، لیٹ تو ایسی سوچی کہ صبح نوبجے آنکھ کھلی۔ اس نے آنکھ کر نجر کی نماز پڑھی، پھر یہ سوچ کر کہ آج اس کے بابا کا سوم ہے، وہ قرآن شریف پڑھنے بینٹ گئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ پورا قرآن شریف غمٹ کر کے اپنے بابا کو بخشن دے گی۔ مرنے والے کیلئے اس سے اچھا ثواب کا کام کیا ہو سکتا ہے۔

سازھے نوبجے کے قریب جب دردانہ اور آئی تو اس نے دیکھا کہ تانیہ پورے انہاں کے قرآن شریف کی تلاوت کر رہی ہے۔ دردانہ کے لئے تانیہ کا یہ روپ نیا تھا۔ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ لگی۔

تانیہ کے چہرے پر ادا کے ساتھ ایک وقار پھیلا ہوا تھا۔

تین پارے پڑھ کر اس نے قرآن شریف بند کیا، آنکھوں سے لگایا تو سامنے دردانہ کو کھڑا پایا۔

کما۔

اہمی یہ باتیں جاری تھیں کہ دردانہ ناشتے لے کر آگئی۔

”بڑی دیر کر دی تم نے دردانہ۔“ خالہ فرزانہ نے ٹوکرا۔

”بڑی بی بی۔ سب کچھ تازہ پنا کر لائی ہوں۔ اس لئے تھوڑی سی دیر ہو گئی۔“ اس نے ناشتے کی ٹرے پر رکھنا چاہی۔

”نیچے قلین پر۔“ تانیہ نے کہا، پھر وہ لوازمات سے بھری ہوئی ٹرے کو دیکھ کر بولی۔ ”بھی کتنے لوگوں کا ناشتہ بنانا ہے تم نے۔“

”صرف آپ کیلئے جی۔“ دردانہ نے بڑی مخصوصیت سے کہا۔

”ارے کہاں ہے زیادہ، کرلو، تم نے رات کو بھی مشکل سے دو لئے کھائے تھے۔“ خالہ فرزانہ نے اسے محبت سے دیکھا۔

تانیہ ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جلی آئی۔ اس کا سوت کیس اہمی تک بند پڑا تھا۔ سوت کیس کھول کر اس نے اپنے کرے کا لے۔ انہیں اپنی جگہ پر پہنچائے۔ سب سے نیچے ڈاڑھی پر ٹھیک ہو ڈاڑھی اپنے ساتھ لا ہو رہے گئی تھی۔ اس نے دہاں کئی بار کھول کر دیکھی تھی مگر کوئی تحریر نظر نہ آئی۔

وہ چاہتی تھی کہ اپنے بیبا کے بارے میں اسے کوئی اشارہ ملے؟ کس نے انہیں قتل کیا ہے لیکن اسے کوئی پتہ نہ چل سکا۔ اس نے سوت کیس کی تہ سے وہ ڈاڑھی انھائی اور کیشوں کے درمیان اسے رکھنے چلے چلے چلے یہی ڈاڑھی کے اوراق پر نظر ڈال لی۔ تب اس کی جیرت کی انتہا رہی کہ اسے ڈاڑھی میں چھوٹے صفات لکھنے ہوئے نظر آئے۔

وہ فوراً اپس آگئی۔ بیٹھ پر بیٹھ گئی۔ پھر خیال آیا، دروازہ کھلا ہوا ہے، اس نے جلدی سے دروازہ کیا اور بیٹھ پر بیٹھ گئی۔ ڈاڑھی کا ایک ایک درق پلنچنے لگی۔

تب اچانک وہ لکھا ہوا صفحہ سامنے آگیا، وہ بے تابی سے پڑھنے لگی۔

ہم جانتے ہیں کہ تم کیا معلوم کرنا چاہتی ہو، ہم تمیں بتاتے ہیں کہ تمارے والد راؤ شمشاد علی کو کم نے قتل کیا ہے۔ ایک جملے میں جواب یہ ہے کہ راؤ احمد علی نے۔ ہاں تمہارا چچا، تمارے باپ کا کافا ہے۔

ایک دن وہ شام کوساون پور سے لا ہو رکھنچا تھا۔ وہ پورے انتظام سے آیا تھا۔ تمارے والد نے شام اور رات کی تمام مصروفیات کیسٹل کر دی تھیں اور عبدال کو حکم دیا تھا کہ وہ راؤ احمد علی کی مرضی کا کام پکائے۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب راؤ شمشاد علی بابرلان میں ٹھل رہے تھے کہ عہد نے اپنی بیٹی کے ایکیڈٹ کی خبر دی۔ یہ اطلاع اسے فون پر ملی تھی بیٹی اپنٹال سے گھر پہنچ چکی تھی عبدال نے دھرم پور جانے کی اجازت چاہی جو راؤ شمشاد علی نے فوراً دیدی اور ساتھ ہی پانچ سورج نوٹ بھی عنایت کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد راؤ احمد علی نے تمارے والد سے کہا کہ بھائی صاد

آئیے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔

وہ اسے اپنے ساتھ لاؤن گی میں لے آئے اور بڑے بازو والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ عام طور سے ٹی وی اسی کرسی پر بیٹھ کر دیکھتے تھے یہ برسوں پرانی کرسی تھی۔ گھر کا تمام فرنچ پر بدل گیا تھا مگر نہیں بدی تھی تو یہ کری، خیر وہ اس کرسی پر بیٹھ گئے اور راؤ احمد علی سے پوچھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے۔

جواب میں راؤ احمد علی نے اپنے بریف کیس سے کافیزات کی ایک فائل انہیں تمہاری اور کہا۔ ”بھائی صاحب! آپ ان کافیزات کو پڑھنا چاہیں تو پڑھ لیں اگر نہ پڑھنا چاہیں تو تھی کوئی ہرجنگی نہیں۔ آپ کو دستخط صورت میں کرنا ہوں گے۔“

بھائی کے اس انداز پر وہ چرکے۔ اسے سراخا کر دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”بھائی صاحب مطلب یہ ہے کہ اب مجھ سے آپ کی موت کا انتظار نہیں ہوتا جو جائداد مجھے آپ کی موت کے بعد نصیب ہو گی میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کی زندگی میں ہی مل جائے تو اچھا ہے۔“

”اچھا ہے زمیون کے کافیزات ہیں؟“

”بھی یہ تمام جائداد کے کافیزات ہیں آپ کے دستخطوں کے بعد یہ سب کچھ میرا ہو جائے گا۔“

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تم کو گے اور میں حکم کے غلام کی طرح ان کافیزات پر دستخط کہہ دوں گا۔“

”بھائی صاحب! آپ اس جائداد کو کہاں لے جاؤ گے۔“

”اس جائداد کے وارث موجود ہیں۔“

”موجود ہیں، کیا ایک سے زائد ہیں۔“ تمہارا چچا یہ سن کر پریشان ہوا۔

”ہاں، دو ہیں۔“

”کون کون، ذرا بتائیں، مجھے بھی تو پہنچ لے۔“

”میرا بیٹا محسن راؤ، ایک دن وہ ضرور واپس آئے گا۔“ راؤ شمشاد علی نے بڑے یقین سے کہا۔

”اور دوسرا۔“ راؤ احمد علی نے پوچھا۔

”دوسرے وارث کامیرے مرنے کے بعد تمیں پڑھ لے گا۔“

اس نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اپنے بریف کیس کھولا اور اس سے ریواں نکال کر تان لیا اور پھر بولا۔ ”چو پھر مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔“

”یہ کیا کہو اس ہے۔ تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ اس جائداد کے لئے تم اپنے بھائی کی جان لے لو گے کیا؟“

”جاںدا چیز ہی ایسی ہے، میں کیا کروں۔“

”تم جانتے ہو کہ میری زمیں زندگی بھر تمارے تصرف میں رہی ہیں۔ میں نے کبھی تم سے حساب

آنکھوں سے اوچھل ہو گئے۔ ڈائری پھر کوری کی کوری رہ گئی۔ تانیہ کو شہر تھا کہ یہ قتل اس کے چڑائے کروایا ہے لیکن یہاں تو معاملہ اور تنقیح نکلا تھا۔ یہ قتل خود اس کے چڑائے کیا تھا۔ کیسا درندہ صفت انسان تھا۔ ایسے انسان کو تو سویاں چھوپھو کو مارنا چاہئے۔ فکر مت کرو احمد علی وقت آئے پر تمارے ساتھ وہ ہو گا کہ تم زندگی بھر یاد رکھو گے۔

یہ ایک اہم اکشاف تھا۔ پوری زندگی ساتھ گزارنے والا ملازم بک گیا تھا۔ یہ کوئی ایسی جرأت میں ڈالنے والی بات نہ تھی۔ جب پیسے کے لئے بھائی نے بھائی کو اس سفاکی سے قتل کر دیا تو کسی غیر کالا لجع میں آجائنا کیا معمن رکھتا ہے۔ اس نے سوچا کہ فوراً انکل عامر کو فون کرنا چاہئے۔ انہیں بتانا چاہئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس اکشاف کا ذریعہ کیا تائے گی۔ کیا یہ بتائے گی کہ اس کے پاس ایک ایسی ڈائری ہے جس میں اس کی زندگی کے راز لکھے ہوئے آجاتے ہیں اور پھر وہ لفظ خود بخود مست جاتے ہیں۔

اس بات پر کون ہوشمند یقین کرے گا۔ اس بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا وہ خواہ مخواہ مذاق کا نشانہ بن جائے گی۔ لوگ کہیں گے کہ باپ کی موت کے صدرے نے اس کے دماغ کو متاثر کیا ہے اس کی وہی رو بیک گئی ہے۔ پاگل ہو گئی ہے۔

لیکن انکل عامر ایسے نہیں ہیں وہ اس کی بات پر ضرور توجہ دیں گے۔ پولیس اس کی تحقیق کر رہی ہے۔ پولیس نے اپنے طور پر عبدال کو شامل تحقیق تو لیا ہو گا۔ اور، بات بن سکتی ہے۔ ایک دم ٹکنی خیال کے تحت چکلی اور ٹیلیفون کی طرف بڑھی لیکن اس وقت انکل عامر راوی روز و اے گھر میں کماں ہوں گے۔ وہ ماڈل ٹاؤن گئے ہوئے ہیں۔ وہاں فون کرے لیکن وہاں کافون نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔

پھر یہ سوچ کر کہ خالہ فرزانہ سے اس مسئلے پر بات کرنا چاہئے، وہ یچھے چلی آئی۔ خالہ فرزانہ یچھے قالین پر بیٹھی پان بنا رہی تھیں تانیہ کو دیکھ کر پولیس۔ ”پان کھاؤ گی؟“ ”نہیں خالہ، جی نہیں چاہ رہا۔“

”اوہ بیٹھو۔“

”خالہ انکل عامر سے بات کرنی ہے۔“

”وہ اس وقت گھر پر کماں ہوں گے۔“

”ماڈل ٹاؤن ہوں گے۔ پر وہاں کافون نمبر کیسے معلوم ہو؟“

”عامر کے گھر فون کر کے دیکھ لو، ہو سکتا ہے ساجدہ اور صائمہ گھر ہوں، ان سے معلوم ہو جائے گا فون نمبر۔“

”گذ آئیڈیا۔“ تانیہ نے خوش ہو کر کما اور پھر وہ ٹیلیفون قالیہ پر رکھ کر ڈائل کرنے لگی۔

دو ٹکھیاں بجئے کے بعد ادھر سے کسی نے فون اٹھا کر کہا۔ ”بیلو۔“

تانیہ نے صائمہ کی آواز فوراً پہچان لی۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”صائمہ میں تانیہ بول رہی

نہیں مانگا جو تم دے دیتے ہو وہ رکھ لیتا ہوں۔ پھر بھی تم میرے قتل کے درپے ہو۔“

”تو پھر کر دیجئے نادستخط ماماکہ آپ کے حصے کی زمینیں مکمل طور پر میری ہو جائیں آپ کو ضرورت بھر کیا ہے میسے کی۔ ریستوران سے آپ کو اچھی خاصی آمنی ہے۔ آپ کے آگے کوئی اولاد بھی نہیں۔ میر تو بھر اپڑا گھر ہے۔“

”میرا محسن راؤ گم ہوا ہے۔ مرانہیں۔“

”یہ آپ کا خیال ہے بھائی صاحب۔ محسن راؤ اب اس دنیا میں نہیں۔“

”تم یہ بات کس طرح کہ سکتے ہو؟“

”آج میں آپ کو ایک رازکی بات بتائے دیتا ہوں۔ محسن راؤ کو جنگل سے میرے آدمیوں نے اٹھا تھا اور اسے جہاں پہنچایا تھا، وہاں سے آج تک کوئی والپن نہیں لوٹا۔“

”کینے تو نے میرے بیٹے کو مار دیا۔ میں تیراخون پی جاؤں گا۔“ وہ کاغذات کی فائل کو زمین پر پھینک کر اٹھنے لگے تو راؤ احمد علی نے آگے بڑھ کر ریواں اون کی کنپنی پر رکھ دی۔

”بھائی صاحب۔ زیادہ جوش میں آئے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوشمندی کا ثبوت دیجئے اور خاموشی سے کاغذات پر دستخط کر دیجئے۔“

”کسی قیمت پر نہیں۔“ تمارے والد نے اس سفاک شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بت جرأت مندی سے بولے۔ ”چلا گولی۔“

”یہ لو۔“ راؤ احمد علی نے ایک سیکنڈ کا بھی انتظار نہ کیا۔ اس نے گولی چلا دی۔ جیسے گولی چلا کا لہ کھیل ہو۔

چند لمحوں میں اس گولی نے تمارے والد کا کام تمام کر دیا۔ یہ ریواں تمارے والد ہی کا تھا، اور تھے میزکی دراز سے نکال کر اپنی واکٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ وہ ریواں اس نے راؤ شہزاد علی کے دامیں ہاتھ میں تھا، کاغذات سیئیے اور پورے اطمینان سے کوئی گاگیٹ بند کر کے وہاں سے نکل گیا۔ راول رات ساون پور ہنچ گیا۔

وہ دراصل پوری مخصوصہ بندی کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے گھر کے ملازم عبدال کو دھکی اور ریشم چک سے خرید لیا تھا۔ وہ دونوں اس کے اشارے پر کوئی سے چلے گئے تھے اس کی بیٹی کا ایکیڈ نشستہ ہوا تھا۔

اگرچہ اس قتل کی واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں ہے لیکن اگر عبدال اور اس کی بیوی کو پولیس کی تحریک میں دیکھا جائے تو وہ راؤ احمد علی کی آمد، اس کی دھکی اور ایک لاکھ روپے کی پیکش کے بارے میں بتانا ہوئے زیادہ درج نہیں لکھیں گے۔ ایک لاکھ روپے بھی برآمد ہو جائیں گے۔ راؤ احمد علی نے مخصوصہ ساند اس لئے کی تھی کہ وہ معاملے کو آریا پار کرنے آیا تھا اور پار کر کے چلا گیا تھا۔

اچھا ہم چلتے ہیں، ہمیں گیا واقعہ نہ سمجھنا۔ ہم پھر آئیں گے۔ اور پھر وہی ہوا کہ تانیہ آخری جملے پر نظر ڈال رہی تھی کہ لفظ ہلکے ہوتا شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے

ہوں۔
”کیسی ہوتانیے۔“

”میں ٹھیک ہوں، یہ بتاؤ اکل عامر کماں ہیں؟“
”ماڑل ناؤن، وہ تو صحیح کے گئے ہوئے ہیں، گاڑی آنے والی ہے، میں اور امی بھی جانے والے ہیں۔“

”پھر تم ایک کام کرو، ماڑل ناؤن ہجت کر اکل عامر سے کہنا کہ مجھے فرمی طور پر فون کریں اور یہ

تمہارے پاس وہاں کافون نمبر ہے؟“
”ہاں ہے۔ تمہیں چاہئے۔“

”ہاں، دیوو۔“

”اچھا ٹھرو، ڈاکری میں دیکھ کر بتائی ہوں پھر کچھ دیر بعد بولی ”ہاں، لکھو۔“

”ایک منٹ۔“ تانیہ نے سائیڈ نیبل پر رکھا ہوا خبر اور بال چین اٹھایا۔ ”ہاں بتاؤ۔“
صائمہ کا بتایا ہوا نمبر اس نے اخبار کے حاشیے پر لکھ لیا۔ اور پھر دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے رکھ دیا۔ اب اسے اکل عامر کے فون کا بے چینی انتظار تھا۔

بالآخر انتظار نگ لے آیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد فون کی گھنٹی بھی تانیہ نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا
”ہیلو۔“

”ہاں تانیہ میں عامر بول رہا ہوں۔“

”آپ کماں سے بات کر رہے ہیں؟“

”میں ایک مخفی ٹبلج سے بات کر رہا ہوں۔ کوئی سے تو بات نہیں کر سکتا تھا۔“

”اکل عامر مجھے آپ سے ایک بہت انہم بات کرنا ہے۔“

”ہاں کو۔“

”کیا پولیس نے عبدال اور اس کی بیوی کو شامل تفہیش کیا ہے؟“

”ہاں، پولیس انپکٹرنے اس کا بیان لیا تھا میرے سامنے ہی بات ہوئی تھی، پولیس اس طر
معاملات میں سب سے پہلے گھر کے مال میں پرٹک کرتی ہے۔“

”اکل عامر ناکل ٹھیک کرتی ہے۔“

”میں عبدال کو ایک عرصے سے جانتا ہوں، وہ راؤ صاحب سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ ان کا تھا۔“

”اکل، میرا ول گواہی دیتا ہے کہ عبدال قاتل سے اچھی طرح واقف ہے۔“ تانیہ نے کیا۔

”یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو۔“ عامر الجھ گئے۔

”آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے طور پر یہ معلوم کرالیں کہ اس کی بیٹی کا ایک بیٹن ہوا۔“

نہیں۔“

”یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ میں ابھی دھرم پورے ایک آدمی بھیجی دیتا ہوں۔ وہ کسی بمانے سے معلوم کر آئے گا۔“

”جب یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی بیٹی کا کوئی ایکیڈیٹنٹ نہیں ہوا تو پھر عبدال کو چھوڑ دیئے گا نہیں۔ پولیس کے ذریعے ڈرائیکٹ روم کی سیر کروادیتے گا۔ پھر وہ خود ہی قاتل راؤ احمد علی کا نام بتا دے گا۔“

”تمہیں عبدال مجھے وفادار ملازم پر آخر کیوں شک ہوا؟“

”اس شک کی وجہ میں آپ کو بتا دی گی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔ بس میں نے آپ سے جو کما ہے اس پر عمل کر کے دیکھ لجھتے، جو بھی بات ہے سامنے آجائے گی۔“

”اچھی بات ہے، میں اپنے طور پر ایکیڈیٹنٹ کی تصدیق کروائے لیتا ہوں۔ ٹھیک ہے تم بے ٹکر ہو جاؤ میں پھر رات کو گھر سے بات کروں گا۔ اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ تانیہ نے ریسیور کھ کر ایک گمراہ اور ٹھنڈا سانس لیا اور سوچا۔ اب ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ اور واقعی کچھ نہ کچھ نہ گلے۔

اس ہونی کے لئے اسے رات دس بجے تک انتظار کرنا پڑا۔

رات دس بجے اکل عامر کا فون آیا۔ تانیہ خالہ فرزانہ کے کمرے میں بیٹھی تھی فون بھی اسی نے اٹھایا۔

”ہیلو۔“ تانیہ بولی۔

”ہاں، تانیہ میں عامر بات کر رہا ہوں۔“

”کیا ہوا اکل آپ نے معلوم کروایا تھا۔“

”تمہارا شک ٹھیک نہ کلا۔ عبدال کی بیٹی کا کوئی ایکیڈیٹنٹ نہیں ہوا، اس دن وہ گھر سے نکلی ہی نہیں تو ایکیڈیٹنٹ کام سے ہوتا۔“ انہوں نے بتایا۔

”یہ لوگ اپنی بیٹی کے پاس رہے بھی تھے یا وہاں سرے سے گئے ہی نہیں؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”نہیں، رات کو وہیں رہے تھے۔“

”اب بتائیں، اکل، میرا شہر ٹھیک تھا۔“ تانیہ نے داوجاہی۔

”تمہارا شہر بہت پاک کلا۔ میں جریان ہوں۔ کاش یہ بات میرے وماگ میں بھی آجائی۔“

”پھر آپ نے کیا کیا؟“

”تمہرے بعد میں نے قرآن خوانی رکھی تھی۔ ماشاء اللہ بہت لوگ شریک ہوئے۔ عصر سے پہلے سوم ختم ہو گیا۔ راؤ احمد علی تو ٹکل ہی اپنے خاندان کو لے جا چکے تھے۔ لیکن آج ان کا ایک بیٹا انتہار راؤ سوم میں ٹرکت کیلئے آیا تھا۔ وہ بھی اجنبیوں کی طرح بیٹھا رہا اور فاتحہ ہوتے ہی مجھ سے ملے بغیر نکل گیا۔

کر میں نے ریسیور کھاتو وہ لڑکے میں داخل ہوا وہ بے حد گہرا یا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائی ایزی ہوتی تھیں وہ بہشکل بولا سر وہ، کوارٹر جلدی چلتے۔ میں فوراً اس لڑکے کے ساتھ ہو لیا لڑکے کی حالت غیر ہورہی تھی۔ اس سے چلانیں جارہا تھا۔ میں نے اسے یئر ہیوں پر بیٹھنے کو کہا اور خود تیزی سے کوارٹر کا دروازہ پوچھ لہا تو۔ میں تیزی سے اندر گھستا چلا گیا اندر جا کر میں نے جو مظہر دیکھا ہے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ لڑکے کی حالت صحیح خراب ہو گئی تھی۔ وہ مظہر ہی ایسا تھا کہ مضبوط سے مضبوط دل کا انسان بھی کاپ کر رہا جائے۔ ”انکل عامرا تکہ کہ خاموش ہو گئے۔ شاید وہ مظہر ان کی لگا ہوں میں گھوم کیا تھا۔

”کیا ہوا انکل۔ کیا وہ دونوں اپنا سامان سمیٹ کر فرار ہو چکے تھے۔“ تانیہ نے پوچھا۔
”نمیں، تانیہ کمرے میں دونوں کی لاٹیں پڑی تھیں۔ تیز دھار آئے سے ان دونوں کی گرد نیں کاٹ دی گئی تھیں۔ فرش پر خون پھیلا تھا۔“
”اوہ، مالی گاؤ۔“ تانیہ دل تھام کر رہی تھی۔

”کیا ہوا تانیہ؟ خیر تو ہے۔“ غالہ فرزانہ نے گھبرا کر پوچھا۔
”ابھی بتائی ہوں غالہ۔“ تانیہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ پھر وہ ہاتھ ہٹا کر انکل عامر سے مخاطب ہوئی۔ ”انکل یہ تو بترا ہوا۔ لیکن جرت کی بات ہے کہ قاتل آنفنا تقہ کر کے نکل گئے اور آپ کو پڑتے بھی نہ چل سکا۔ جبکہ آپ کو تھی میں موجود تھے۔ کیا وہ لوگ چینچ چلائے بھی نہیں۔ ان کے کوارٹ سے کوئی آواز نہیں آئی۔“

”میں توڑا نگ روم میں بیٹھا لڑکے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دونوں کب اپنے کوارٹر چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاتل پسلے سے کوارٹر میں چھپ کر بیٹھنے کے تھے۔ یہ داروں ایک بندے کے بن کی بات نہیں کم از کم وہ دو تھے۔ عبدل اور رشیدہ جیسے ہی کوارٹر میں داخل ہوئے دونوں کو ریواور دکھا کر قابو میں کر لیا گیا۔ دونوں کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور کپڑا منہ میں ٹھنڈا ہوا تھا۔ میرا خاہی ہے کہ دونوں کے ہاتھ پیچھے باندھ کر اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے بعد کسی تیز دھار آئے سے دونوں کے گلے کاٹ دیئے گئے۔ اس طرح وہ حلقت سے کوئی آواز نہ نکال سکے اور جہاں قفلی سے کوچ کر گئے۔“

”پولیس کیا کہتی ہے؟“

”پولیس کے پاس فی الحال کچھ کرنے کو نہیں۔ بہر حال لاٹیں پوسٹ مارٹم کے لئے اپتال بھجوائی جا چکی ہیں۔ اسپرفاٹ کو میں نے اپنی تفتیش سے آگہ کر دیا ہے۔ میرے بیان کی روشنی میں اس نے اپنا شہر ٹاہر کیا کہ راؤ ششاو کا قتل عبدل نے کیا۔ اور جس کے اشارے پر اس نے قتل کیا اس نے راز فاش ہونے سے بچنے کے لئے اپنے بندوں سے عبدل اور اس کی بیوی کا قتل کروادیا۔“

”یہ سب بکواس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پولیس پس پسر کھاتی ہے اور حقائق سن کرنے کے لئے مدد میں مفروضے بیان کئے جا رہے ہیں۔ انکل میں آپ کو بکاؤں، میرے بیا کا قتل، میرے چارا کا

مغرب تک کوئی مسمانوں سے خالی ہو گئی۔ ساجده اور صائمہ کو بھی میں نے گھر بھیج دیا۔ بس کوئی میں اکیلا رہ گیا یا پھر عبدال اور اس کی بیوی موجود تھے جو کوئی کام سیئنے ہوئے پھر رہے تھے۔ ڈر انگ روم میں بیٹھا اس لڑکے کا انتظار کر رہا تھا جسے میں نے تحقیق کے لئے عبدال کی بیٹی کے گھر تھا۔“

”آپ نے لڑکے کو دیر سے بھیجا۔ آپ تو کہہ رہے تھے میں ابھی کسی کو بھیجے دتا ہوں۔“
”ہاں، میں نے دیر سے بھیجا، ایک تو سوم کی مصروفیت تھی دوسرے جس لڑکے کو میں اس مٹ روانہ کرنا چاہتا تھا اسے میں نے کئی کام سونپے ہوئے تھے۔ وہ فارغ ہوتے تھے۔ بھی ڈھرم پورے چلا اب اسے گئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب واپس آیا، اس نے آگر جاتا کہ وہ بھل پتھنگی ہے اس کے ہاتھ کی کوئی بڑی دوڑی نہیں ٹوٹی، نہیں اک ہاتھ پر کسی قسم کا بینڈج تھا۔ دستک دینے پر وہ خود ہی دروازے پر آئی تھی۔ لڑکے نے اسے بغور ہوئے پوچھا۔ تم زیدہ ہو، عبدال کی بیٹی، اس نے کہا۔ تب لڑکے نے جیب سے سورپے کا نکالا اور اس کی طرف بڑھا۔ یہ سورپے تمارے ابا نے بھیجے ہیں۔ کہا ہے کہ ان جکش خرید کر گلوالے ورنہ ہاتھ کی بڑی جڑنے میں دیر گئے۔ دیے یہ تو تباہیں کہ آپ کے کون سے ہاتھ کی بہنے ہے۔ وہ فوراً گھر کر گئی۔ اللہ نہ کرے کہ میرے ہاتھ کی بڑی ٹوٹی، تم یہ کیا بات کر رہے ہو۔ اسے پوچھا۔ کل تمہارا ایکیڈمی نہ نہیں ہوا؟ وہ سن کر پریشان ہو گئی۔ اللہ نہ کرے کہ میرا ایکیڈمی میں توکل گھر سے ہی نہیں نکلی۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ لڑکے نے پوچھا۔ تمارے ابا عبدال ہی ہے تا، وہ بولی۔ ہاں میرے ابا کا نام عبدل ہی ہے۔ وہ کل ہی تو ایک رات رہ کر یہاں پہنچا۔ لڑکے نے پوچھا۔ کیا تم نے فون کر کے انسیں بلا یا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ نہیں وہ خود تھا۔ انسیں میں یاد آ رہی تھی۔ مجھ سے ملنے آئے تھے لڑکے نے کہا۔ اچھا، پھر میں ان سورپل کروں واپس لے جاؤں؟ زبیدہ نے سادگی سے جواب دیا۔ جیسی تمہاری مرضی، لڑکے نے سونک جیب میں واپس ڈالا اور ہاں سے بھاگ ٹکلا۔ اس لڑکے نے کامیابی سے اپنا مشن پورا کر دیا تھا، میں سو کافیٹ اسے بخش دیا۔ اور اس سے کہا کہ فراغ عبدل کو بیلا دا۔ میں نے سوچا کہ ذرا اس سے؟ لوں، پھر تھانے فون کر کے انپکٹ کو ساری صورت حال بتاتا ہوں۔ ایک منٹ کے بعد وہ لڑکا واپس بولاسر۔ عبدل تو کوئی میں نہیں ہے اور اس کی بیوی۔ تین نے پوچھا۔ وہ بولا۔ وہ بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا وہ دونوں شاید اپنے کوارٹر میں ہوں گے۔ تم ذرا ہاں سے بیلا دا۔ لڑکے کے جانے میں نے سوچا کہ عبدل کے کوارٹر سے آگہ کر دیے گئے کیوں نہ تھانے فون کر کے انپکٹ کروں۔ میں ذرا نگ روم سے نکل کر لاروچ میں آیا۔ ہیاں فون تھا میں نے تھانے کے نبرڈاں انپکٹ افچار تھانے میں موجود تھا۔ میں نے اس سے اپنا تعارف کر اکر کہا کہ میرے ہاتھ ایک اہم ہے۔ اگر وہ فوری طور پر کوئی آجائے تو قاتل تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ میری بات سن کر کہا۔ نھیک ہے عامر صاحب میں فوری طور پر کوئی پہنچ رہا ہوں۔ آپ میرا انتقال بھیجے اور ہر سے

”میرا بیبا، کس قدر بد نصیب تھا۔ وہ اپنی اولاد کا سکھ نہ دیکھ سکا۔ ایک اولاد کو قدر یونے اس سے جدا کر دیا اور دوسرا اولاد کو اس نے خود تقدیر بن کر اپنے آپ سے الگ کر دیا اور پھر خود وقت کے ہاتھوں لفڑت کھا گیا۔ مقتول بن گیا۔ اور میں کوئی خوش نصیب ہوں۔ درد بھلک رہی ہوں اپنا باپ ہوتے ہوئے کسی اور کوباب پ کھتی رہی۔ اصل باپ ملا بھی تو اس کے ساتھ رہ نہ سکی۔ اس سے جی بھر کے بات نہ کر سکی۔ اسے جی بھر کے دیکھنے سکی۔ کیسی کم نصیب ہوں میں۔ کیسی بد نصیب ہوں میں۔“ یہ کہتے کہنے کیا ہوا کہ سمندر کے جذبات میں ہوار بھانسا آگیا۔ ضبط کا بند روٹ گیا۔

وہ بے چاری تو اپنے باپ کی لاش سے لپٹ کر رو بھی نہ سکی۔ باپ کی میت دیکھ کر اس کے ضبط کا بند ٹوٹا ہی تو اس خبیث نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا غم اچانک غصے میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا غم دل میں رہ گیا۔

اب جو باپ کا ذکر ہوا۔ اس کی محرومیوں کا تذکرہ آیا تو وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی، بے اختیار اس کے آنسو بہ نکلے۔ شدت جذبات سے اس کی چکیاں بندھ گئیں۔

خالہ فرزانہ نے اس کے ہاتھ سے رسیور لے لیا اور بولیں۔ ”عامر، اب پھر بات کر لینا۔ اب وہ اس قابل نہیں رہی کہ مزید بات کر سکے۔ میں اسے سنبھالتی ہوں۔“

”ہاں، فرزانہ اسے سمجھا، اسے سنبھالو، اسے ہتاو کہ جانے والا جا چکا برو نے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب زندگی کو حوصلے سے بھیتا ہے۔“

”اچھا نہیک ہے عامر۔ میں تانیہ کو سمجھاتی ہوں۔ آپ صحن فون کر لیں۔ اچھا اللہ حافظ۔“ خالہ فرزانہ نے عامر کے ہواب کا بھی انتظار نہیں کیا، فرو فون بند کر دیا۔

تانیہ بیڈ پر اونڈ ہی لیٹنے لیکنے میں مند دیے بے اختیار روئے چلی جا رہی تھی۔

خالہ فرزانہ نے اس کا سرستئے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور اس کے بالوں کو سلا نے لیں۔

خالہ فرزانہ نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ وہ بس اس کے سر پر ہاتھ پھر تی رہیں۔ اپنے دوپٹے سے اس کے آنزوں پر چھپتی رہیں اسے بھیخ بھیخ کر پیار کرتی رہیں اور وہ ان سے لپٹ لپٹ کر رو قی رہی۔ شاید وہ نہیں میں پہلی بار اتنا روئی تھی۔ خالہ فرزانہ نے اسے روئے دیا تھا۔ انہوں نے تسلی کا ایک لفظ بھی اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ جانتی تھیں کہ اس کی تسلی روئے میں ہے، تسلی آمیزیاں میں نہیں۔

دل پر جو غبار قابو، وہ آنسوؤں سے دھل گیا، اس طرح دل کو قرار آگیا۔ وہ روئے روتے خالہ فرزانہ اگوں میں سر رکھ کر سو گئی۔ خالہ فرزانہ اپنی انگلیوں سے اس کی ریشی زلفوں میں لکھنی کرتی رہیں۔

ایک تو تانیہ تھی ہی، بتت حسین لیکن سوتے ہوئے اس کا حسن اور لکھر گیا تھا۔ سو گوار حسن..... خالہ زان اس کے حسین چرے کو لکھ جا رہی تھیں۔ ان کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ تانیہ کے حسین شماروں کو چوم لیں۔ لیکن وہ اس کے اٹھ جانے کے خوف سے ایسا نہ کر سکیں۔

احمد علی نے کیا ہے اور اسی نے عبدال اور اس کی بیوی کو مروا یا ہے تاکہ وہ کچڑے جانے پر اس کے گواہی نہ دے سکیں۔ میں جانتی ہوں راؤ احمد علی کس قدر شاطر آدمی ہے۔ اس کا کوئی سکھ نہ ہا گا۔ وہ اس کیس کو ختم کرنے میں پیسے پانی کی طرح بھادے گا۔“

”کاش، عبدال زندہ رہتا۔“

”میرا جی چاہتا ہے کہ لاہور آکر راؤ احمد علی کے خلاف ایف آئی آر ورج کروادول۔ اخیر کہ قاتل کون ہے؟“

”ایف آئی آر تو کسی نہ کسی طرح درج ہو جائے گی لیکن پولیس اور عدالت میں کیا ثبوت جائے گا۔ کسی کو قاتل ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت یا چشم وید گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کماں سے فراہم کریں گے۔“

”بھی تو سارا مسئلہ ہے کہ راؤ احمد علی نے گواہی مٹا دی ہے۔ عدالت میں پیش کرنے کو ہمارے اب کوئی گواہ، کوئی ثبوت موجود نہیں۔“ تانیہ نے گراس اسنس لے کر کہا۔ ”خیر کوئی بات نہیں۔ وکیل رہا ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے وہ جب ظالم کو پکڑتا ہے تو پھر اس کو نیست وتابدا چھوڑتا ہے۔ اثناء اللہ راؤ احمد علی بھی ایک دن اپنے بھیانک انجام کو پہنچ گا اور اس انجمام کو وہی گی۔“

”تانیہ تم فکر مند نہ ہو، وہ وقت زیادہ وور نہیں جب راؤ احمد علی اپنے انجام کو پہنچے گا۔ واسطے جذبات میں بکر تم لاہور کا رخ نہ کر لینا۔ میری تم سے درخواست ہے کہ جب تک میں بلازوں اس وقت تک لاہور مبت آتا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔“ عامر نے فکر مند لمحہ میں انکل، میں سب سمجھتی ہوں۔“ تانیہ نے بڑے گھیر انداز میں کہا۔

”ویکھو، تانیہ تمہیں اپنی زندگی کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی ہے۔ تم نہ رہیں تو پھر اس فرعون کو دکھل کر خوش کون ہو گا۔“

”انکل، میں اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں۔ اگر میری بھی تو راؤ احمد علی کو ساتھ لے کر مراد بھی تو مجھے اپنے بھائی کو تلاش کرنا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے بھائی حسین راؤ زندہ ہیں۔ اثناء بہت بجلدان ان تک پہنچ جاؤں گی، اس بات کا مجھے کا پانچیں ہے۔“

”میری دعا ہے کہ اللہ تمہارے اس یقین کی تعمیر وے۔ کوئی ایسا میجرہ ہو جائے کہ حسین را آٹے۔“ انکل عامر نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”ویسے راؤ شمشاد بھی کہا کرتے تھے کہ مجھے بیدر ہوتا ہے جیسے میرا بیٹا زندہ ہے اور ایک دن اچانک میرے سامنے آجائے گا۔“

”میرے بابا کو تو مرتبے دم تک یقین تھا وہ سداون پور کی جانکاریان کے نام نہ کرتے تھے۔“ تسلی سے ایک دن پہلے، ریستوران میں بیٹھنے والے، بتت دیر تک حسین راؤ کی باشیں کرتے رہے اسی دن انہوں نے مجھے اپنی وصیت کی تفصیلات بتائی تھیں۔ شاید انہیں اپنے اس دنیا سے اٹھنے ہو گیا تھا۔“

نے اپنے تانیہ سر ہیاں چڑھ کر اور پچھی تو اس نے اپنے کمرے کے دروازے کو کھلا پایا تانیہ کی یہ عادت تھی کہ جب بھی اپنے کمرے سے نکلتی تھی تو دروازہ بیٹھ بند کر کے نکلتی تھی۔ دروازہ پر اکھلا دکھ کر اسے عجیب ہا ساس ہوا جیسے کوئی اس کے کمرے میں گیا ہو۔ پھر اس نے سوچا ہو سکتا ہے، وہی دروازہ کھلا چھوڑ گئی و کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔

جب وہ کمرے کے سامنے پچھی تو ایک لمحے کے لئے شہمک گئی۔ دروازے کے بالکل سامنے کری اسے اپنے بابا پیشے دکھائی دیئے۔ ان کے چہرے پر دلاؤیز مسکرا ہٹ تھی۔

”بaba، آپ کب آئے؟“ تانیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ تیزی سے ان کی طرف لیکن وہاں تو کچھ نہیں تھا، کرسی خالی پڑی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی یہ کیا تھا یہ محض اس کا وہم تھا فریب لرقا لیکن فریب نظر اور وہم تو اس صورت میں ہوتا ہے کہ آدی پلے سے سوچتا آیا ہو کہ وہ اور پیچے کا تو ان کی کوپائے گا، ایسی صورت میں خیال مجسم ہو سکتا ہے۔ لیکن تانیہ کے تصور میں، ایسی کوئی بات نہ لی۔

وہ تو دروازہ کھلانے پر تذبذب میں ہتلنا ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے کمرے کے دروازے سے جو کچھ بھاگا ہوا اس قدر حقیقی تھا کہ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی تھی۔ ”بابا آپ کب آئے؟“ یہ کہتے تھی، تانیہ کے بولنے ہی جیسے فوں نوٹ گیا تھا اور اس کے مسکراتے ہوئے بابا جیسے پانی پر نظر نے والی تصویر بن گئے تھے۔

”تینی سے جھاگی ہوئی کرسی کے نزدیک پچھی اس نے گدی پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ گدی م ہو رہی تھی جیسے اس پر سے ابھی ابھی کوئی اٹھ کر گیا ہو۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھ گئی اور کمرے میں اس نے ہر طرف نظریں گھمائیں کرے میں سناتا تھا۔ باہر کمیں جھیکروں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اب اس کمرے میں کچھ نہ تھا، اگر کوئی آیا بھی تھا جا چکا تھا۔

اس نے کرسی سے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ لائٹ جل چھوڑ دی۔ اور اپنے بیڈ پر آکر لیٹ گئی اور کمیں کچھ پڑھنے سوچنے لگی۔ آج وہ کس قدر روئی تھی۔ اپنے جلے نصیب پر اپنے بابا کی لصبوں پر کیا بابا سے میرا و نادر داشت نہیں ہوا تھا، وہ مجھے دیکھنے آگئے تھے ان کے چہرے پر کیسی دلاؤیز نہیں؟ اس پتھر کیا واقعی وہ میرے بابا ہی تھے کیا وہ میں اس طرح آکتی ہیں؟ اس طرح نظر آسکتی ہے۔

سوچتے سوچتے اس کی پتھرائی ہوئی آکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کا دماغ ماوف ہونے لگا جیسے وہ لی کے گا لوں میں دھنٹی چل جا رہی ہے اس کی آکھیوں میں نیز اتر آئی تھی چند یکنڈے کے بعد وہ بے خبر سو

کوئی آدمی سمجھنے کے بعد تانیہ کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ پسلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کمال۔ پھر خالہ کی گود میں اپنا سردیکھ کر اسے خیال آیا کہ شاید وہ بیمار ہے۔ جب حواس تحوڑے سے اور بیرا ہوئے تو اسے یاد آیا کہ وہ روتے روتے سو گئی تھی۔

اسے ایک دم شرمندگی کا حساس ہوا وہ جانے کتنی دیر تک سوئی ہے۔ بے پاری خالہ اس کی وجہ پیشی رہی ہیں ان کے تو گھنٹوں میں دیسے یہ تکلیف رہتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ ہڑا کر اٹھنے لگی تو خالہ فرزانے سے اٹھنے نہ دیا۔ وہ اس کی پیشانی پوچھتے ہوئے بولتی۔ ”کیا ہوا تانیہ؟ لیش رہ، مجھے اچھا لگتا ہے۔“

وہ اٹھنے اٹھنے دوبارہ ان کی گود میں لیٹ گئی۔ اسے خود خالہ فرزانہ کی گود میں لیٹنا اچھا لگتا۔

کوئی سماں ہے گیا رہ بجے کے قریب گھر کے باہر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ افضل آیا تھا۔ دروازے جا کر گیٹ کھولا افضل نے گاڑی اندر کھڑی کی اور اسے لاک کر کے دروازہ سے پوچھا۔ ”خالہ، گھنٹے کیا؟“

”نمیں جاگ رہی ہیں، تانیہ بی بی بھی انہی کے پاس ہیں۔“ ”اچھا۔“ پھر وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے سیدھا خالہ فرزانہ کے کمرے میں چلا گیا۔ تانیہ کو خالہ فرزانہ کی گود میں لیٹا دیکھ کر وہ ایک لمحے کو دروازے پر رکا اور بولا۔ ”خیر ہت تو ہے؟ آسکتا ہوں۔“

”ہاں آ جاؤ افضل۔“ خالہ فرزان نے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔ تانیہ فردا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک ایک حرمن پھیلا ہوا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے تانیہ کا چہرہ بغور دیکھنے ہوئے کہا۔ ”ایک اور بری خبر لاہور سے آئی ہے۔“

”تانیہ کے والد کے انتقال کے بعد اب اور کیا بری خبر ہو سکتی ہے۔؟“ ”راو صاحب کے گھر ملوا لازم عبدال اور شریہ کو کسی نے گلا کاٹ کر ہلاک کر دیا۔“ خالہ فرزانے خبر سنائی۔

”ارے یہ کیسے ہوا؟“ پوری بات تو خالہ فرزانہ کو بھی معلوم نہ تھی۔ انہوں نے تفصیل پوچھی ہی نہ تھی اور افضل مجھ کا اب گھر آیا تھا اسے بھی کچھ پہنچنے تھا تانیہ نے وہیں کو ساری بات پوری تفصیل کے ساتھ بتا دی۔

پوری تفصیل جان کر افضل کو بھی وہ کہ ہوا عبدال کی گرفتاری کے بعد قاتل تک پہنچا کوئی مشکل نہیں۔ لیکن قاتل نے گواہ ہی مٹا دیئے تھے۔ اب گواہ کون دیتا۔ وہ تقریباً ایک بیج تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ افضل نے کھانا بھی میں بیٹھ کر کھایا تھا۔ اب نیند آرہی تھی وہ اپنے کمرے میں جانے لگا تو تانیہ بھی اٹھ گئی۔ افضل نے اپنے کمرے کا رخ کیا اور

یہ خواب کیا ہیں تشنہ آرزوں کا دفینہ۔
لیکن آرزوں کے اس دفینے سے تو یہ برا بھائیک خواب برآمد ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی یہ کس قسم کا
واب تھا اس آلو کا اس بری طرح اس کے بباب پر حملہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے یہ پرندہ اس کے چیچے کیوں لگ
یا ہے۔ کیا یہ وہی آلو ہے جس کا خون ہوا تھا اور بعد میں وہ زخمی آلو انفلو کے ہاتھ سے یوں اڑ گیا ہے وہ
بھی ہی نہ ہو۔ یہ آلو کا لارچ گز نامی ایک پر اسرارِ شخص دے گیا تھا۔ پھر دوسرے دن وہ اسے واپس لینے
یا تھا۔ آلو تو اڑ چکا تھا، وہ خالی پنجھرہ ہی لے کر چلا گیا تھا اس نے کہا تھا۔ ”وہ آزاد ہو گیا ہے اور یہ کوئی
بی بات نہیں۔“
وہ کون؟

اور وہ آزاد کیسے ہو گیا؟ اور یہ بڑی بات کیوں تھی؟
لیکن وہ تو پانچ آزادی پر بہت خوش تھا۔ اس کام نہ نہیں۔ وہ خوش ہو کر اسے ایک ڈائری دے گیا تھا جو اس کی شدید خواہش پر اس کی زندگی کے راز کھول دیتی تھی۔
تب اس کی نظر کری پڑی تھی جو چیچے کی جانب الٹی ہوئی تھی اورے یہ کیسے الٹ گئی اگر وہ سب خواب تھا تو اس کو کون لانا گا اس کا مطلب ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا جائی آنکھوں سے دیکھا، وہ خواب نہ تھا حقیقت تھا جس تھا۔

کیاں کے بابا کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ وہ مرکر سکون نہیں پا سکے ہیں۔ اپنی بیٹی کے لئے ترب
ربے ہیں۔ اب ان کی راہ میں حائل ہونے والا کون ہے؟

۵۔ پیدا سے ابھی اس نے انھ کر کر سیدھی کی دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا دروازے کے اوپر دیوار کی گھری لگی ہوئی تھی اس میں دونوں کر بیس منٹ ہوئے تھے۔

وہ اس روم سے فارغ ہو کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی اب وہ مکمل طور پر جاگ چکی تھی۔ اپنے حواسوں میں تھیں اس نے سوچا، وہ نہ جانے کتنے زور سے چھیتی تھی اس کی آداز جانے کیماں تک گئی ہو گئی۔ اس کے کمرے کے بالکل سچے افضل کا کمرہ تھا اگر افضل تک اس کی چیخ کی آواز گئی ہوتی تو وہ کب کا اور آپ کا ہوتا۔

پہلے سے خیال آیا کہ وہ ڈائری نکال کر دیکھے شاید کوئی تحریر تمودار ہو گئی ہو۔ اس نے بیٹھ سے انھ کرکیشوں کے درمیان سے ڈائری کھینچنے اور اسے دیکھتی ہوئی اپنے بیڈ پر آگئی!

پھر وہ نمودار ہوئے۔
انہوں نے کرسی کا رخ خسوں ہوئی تائیکی کی طرف گھما�ا اور آرام سے کرسی پر بیٹھ گئے اور اسے بنت محبت سے دیکھنے لگے۔
وہ ان کی بہت پیاری بیٹھی تھی۔ اس بیٹی کی زندگی کی حفاظت کے لئے انہوں نے بڑے کشت بھوگی۔
تھے۔ وہ گھری نیند میں تھی اور ایسے پیارے انداز میں سوزی تھی کہ اس پر سے ان کی نظریں خیلی ہر سو
ری تھیں۔ آج وہ انہیں یاد کر کے کس قدر رومی تھی۔ ابھی تک اس کے چہرے پر اداوی چھائی تھی۔ ان
کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر اپنی بیٹی کی پیشانی چوم لیں۔ پھر یہ سوچ کر رک گئے کہ اگر وہ اٹھ گئی تو انہیں دیکھ کر
پیشان ہو جائے گی۔ وہ اس کی محبت سے مجبور ہو کر آگئے تھے ورنہ انہیں اس منحوس دنیا سے کوئی دلچسپی نہ
تھی۔

و جہاں پلے گئے تھے وہاں سکھ ہی سکھ تھا، وہ ہر غم سے آزاد ہو گئے تھے۔
 ابھی انہیں تانیہ کے کمرے میں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہ قریب کے درخت سے اڑا۔ پرول کا
 نیز پھر پڑا۔ اہٹ فضائیں ابھری۔ اس آٹونے اس گھر کے سات چکر لگائے تانیہ بے خبر سوری تھی اور ان
 کے ببابا کری پر بیٹھے اسے بڑی محبت سے ملے جا رہے تھے۔
 ساتویں چکر کے بعد وہ آٹونیہ کے کمرے کی چھت پر آبیٹھا۔ ایک دم تانیہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ
 بھاری پرندہ اس کے سینے پر آبیٹھا ہو۔ وہ بری طرح چونک گئی فوراً اس کی آنکھ کھل گئی اس کا دل بڑا
 طرح دھڑک رہا تھا ابھی وہ اس خوف سے نہ نکلی تھی کہ ایک پرندہ اس کے سینے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔
 اس نے کمرے میں عجیب منظر دیکھا اس مفترے نے اسے مزید دھلا دیا۔
 اس نے دیکھا کہ ایک برا ساپر نہ جو یقیناً آٹو تھا اس کے بابا پر چھپ رہا ہے۔ اس کے ببابا جو کسی پر بیٹھ
 تھے اور ان کا رخ تانیہ ہی کی طرف تھا اس اچانک افتاب سے گھبرا کر وہ ہاتھ پاؤں ہل رہے تھے اس آٹو کا اٹا
 اس قدر تندو تیز تھا کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے لوٹا زان برقرار نہ رکھ سکے ان کی کرسی بیٹھ
 طرف الٹ گئی۔

تب وہ گھبرا کر چینی۔ ”نمیں۔“
اس کی یہ ہزاریانی چیز پورے کمرے میں گونج گئی۔ اس کے ”نمیں“ کہتے ہی کمرے کا مظراً ایک
میں تبدیل ہو گیا دہان اب کچھ نہ تھا۔

نہ بیان کرے اور نہ وہ حملہ آور گلوخا۔
اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس نے کوئی بھی انک خواب دیکھا تھا یا حقیقت میں یہ سب کچھ
تھا وہ اب پوری طرح بیدار ہو چکی تھی اس نے سایدینٹیل میل سے جگ اٹھا کر پانی پیا اس کا حلقہ بری مل
خنک ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکن ابھی تک قابو میں نہ تھی۔
شاید وہ خواب دیکھ رہی تھی کیونکہ سونے سے پہلے اس نے اپنے بیبارا اور شمشاد علی کو کر کی ہے
محسوس، اسکا تھا اور وہ ان کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گئی تھی شاید اس لئے وہ اس کے خواب میں اُ

اطمینان سے بیٹھ کر وہ ایک ایک ورق کر کے، اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔
وہ ہر ورق اس امید پر پلٹ رہی تھی کہ شاید اگلے ورق پر اسے کچھ لکھا ہو انظر آجائے گا۔ ورق ای
الٹے جب وہ مایوس ہونے لگی اور صفات بھی چند ہی رہ گئے تو امید کی کرن اچانک چکی۔
وہ ورق ایسے الٹے رہ گئی۔ ایک صفحے پر محض چند سطرس لکھی تھیں۔ وہ پڑھنے لگی، لکھا تھا۔
دیکھو، اپنے بیبا کو سمجھاؤ۔ اس دنیا سے اب ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا ہے تو وہ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟

انہیں اب اس دنیا سے انہار بیٹہ توڑنا ہو گا اتنی چاہت اچھی نہیں ہوتی۔
اچھا ہم چلتے ہیں..... ہمیں گیا وقت نہ سمجھنا، ہم پھر آئیں گے۔
بس پھر فرائی لفظ دھنڈ لے ہونے لگے۔ ملنے کا عمل شروع ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لفظ صفحہ
سے مٹ گئے اس نے فائزی بند کر کے تکنے کے نیچر کھی اور لیٹ گئی۔
یہ کس قسم کی تنبیہ تھی۔ تنبیہ تھی یامشورہ تھا یا سے کیسی بہادیت کی گئی تھی وہ ایک ایسے آدمی کو کہ
سمجھا ہے جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو جن کا وجود عدم میں جاپکا ہو اور اب وہ محض روح رہ گیا ہو۔ اس فائز
کے یہ الفاظ اس بات کے مظہر تھے کہ اس کے بابراۓ شمشاد علی اس کی محبت میں بھلک رہے تھے۔
مرنے کے بعد بھی انہوں نے اس دنیا سے ربط نہیں توڑا تھا۔ وہ بار بار اس کے پاس آ رہے تھے۔
چاہت اب ان کے حق میں بہتر نہ تھی۔

سوال یہ تھا کہ وہ اپنے بیبا کو کیسے سمجھائے؟
وہ بہت دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی یہاں تک کہ صبح کے آغاز کھلائی دیتے گے۔ اس نے اٹھ کر
کی نماز پڑھی اور پھر قرآن شریف پڑھنے بیٹھ گئی۔ اور اس وقت تک پڑھتی رہی جب تک درداشت
کے بارے میں دریافت کرنے نہ آگئی۔
ناشہ اس نے خالہ فرزانہ کے ساتھ ہی کیا ناشتہ پر تانیہ نے روحوں کے بارے میں جاولہ خیال کیا
انہوں نے کہا۔ ”روحوں کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی لیکن کبھی کبھی یہ بات
میں آئی ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والے کو روح گھر کے مکبوتوں کو دکھائی دیتی ہے۔ میرا پا خیال ہے۔
کہ جن لوگوں کی دلچسپی دنیا یا دنیا والوں کے ساتھ بہت زیادہ ہوتی ہے ان کی روحلیں بھیکتی رہتی ہیں! ا
لوگ جو حادثاتی طور پر مر جاتے ہیں اور ان کی کوئی شدید آرزو، موت کی وجہ سے تشنہ رہ جاتی ہے ان
روحلیں دنیا کا طواف کرتی رہتی ہیں۔“

”خالہ، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے بیبا کی روح بھی ابھی یہیں پکر لگا رہی ہے۔“
”یہ احساس تمہیں کیسے ہوا؟ کیا تمہیں وہ خواب میں نظر آئے۔“
”خواب میں نظر آتے تو اچھا ہوتا، میں ان سے بات بھی کلتی۔ میں نے انہیں جاگتی آنکھوں
دیکھا ہے۔“
”ہائے وہ کب؟“
”اگر میں آپ کو بتاؤں تو آپ ڈریں گی تو نہیں۔“

”نمیں، ایسی باتوں سے میں کبھی نہیں ڈرتی۔“
جب اس نے رات کی رواداد خالہ فرزانہ کے گوش گزار کر دی لیکن اس نے اتنا ہی بتا یا جتنا غالہ فرزانہ
کو بتایا جا سکتا تھا۔
ساری بات سن کر خالہ فرزانہ نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تمہاری محبت انہیں در بدر کئے ہوئے
ہے۔“

”خالہ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ اس پر عمل کر کے بیبا کو اس دنیا میں آنے سے روکا جائے۔“
”ایسا میں کوئی وظیفہ نہیں جانتی۔ یہ بات کوئی عالم ہی بتا سکتا ہے۔“
”کاش! دادا! اعظم اس وقت زندہ ہوتے تو ان سے پوچھ لیتے۔“
”وکھوڑا درداشت کو آواز دے کر پوچھو کہ افضل ہے یا نہیں۔ ویسے وہ ہو گا، مجھ سے ملے بغیر وہ
کبھی دفتر نہیں جاتا۔“

”وردا نہ!“ تانیہ نے آواز دی۔

”جی بی بی۔“ وہ دوڑی ہوئی آئی۔

”بھائی کیا کر رہے ہیں؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”تمارے ہیں جی وہ..... میں ان کا ناشتہ تیار کر رہی ہوں۔“

”اچھا، وہ نہا کر لٹک لے تو اس سے کہنا کہ بڑی بی بی پورا ہیں۔“ خالہ فرزانہ نے حکم دیا۔

درداشت نے شاید اسے واش روم سے لکھتا دیکھ کر ہی خالہ فرزانہ کا حکم سا دیا اور وہ بھی ایک فربا بردار
بن کر تو کیہے سر پر پچھتا ہوا غالہ کے سامنے آکرنا ہوا۔ ”جی غالہ۔“

”اوہ، کیا غسل خانے سے سیدھے ادھر ہی پلے آ رہے ہو۔ ایسی تو کوئی ایکر ہنسی نہیں
تھی۔“

”میرے خیال میں، درداشت نے کچھ کہا ہی اس انداز میں ہو گا۔“ تانیہ نے کہا۔

”ایسا کوئی ارجمند کام نہیں ہے تم اطمینان سے بال وال بنا کر کپڑے تبدیل کر کے آؤ میں تمہارا
ناشہ اپنے کرے میں مگوئے لیتی ہوں۔“

”میں تھیک ہے غالہ..... میں وہ منٹ میں آیا۔“

اس کی آمد کے ساتھ ہی درداشت بھی ناشتہ لے آئی جب درداشت ناشتہ رکھ کر چلی گئی تو خالہ فرزانہ نے
بات چھیڑی۔ ”افضل، وہ روشن علی کہاں ہیں؟“

روشن علی کا کام سن کر افضل کے کان کھڑے ہوئے۔ اس کا پھر ایک دم فکر مند ہو گیا۔ ”غالہ خیر
تو ہے پھر کچھ ہوا کیا؟“

”نمیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ البتہ تانیہ کو ضرورت ہے ان کی۔“

”کس سلسلے میں؟“ افضل نے پوچھا۔

”تانیہ، بھائی کو پوری بات سمجھاؤ۔“

”تمہارے بارے میں ایک فون آیا تھا۔ فون صائمہ نے اٹھایا تو اس نے تمہارے بارے میں سوال کیا کہ تم کہاں ہو۔ صائمہ نے جواب دینے کے بجائے پلٹ کر اس سے سوال کیا کہ وہ کون بول رہا ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں ان کے وکیل کا اسنٹ بول رہا ہوں کچھ کاغذات پر ان کے دستخط کرنے ہیں۔ صائمہ نے جواب دیا کہ اس وقت تو تانیہ گھر پر نہیں ہیں وہ گلبرگ گئی ہوئی ہیں۔ ماموں آئیں گے تو ان کو بیادوں گی۔ صائمہ نے مجھے بتایا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ایسے کون سے کاغذات ہیں جن پر اتنے لبر جنی میں دستخط ہوئے ہیں۔ میں نے وکیل کو فون کیا اس نے کہا کہ اس کی طرف سے کوئی فون نہیں گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ کسی نے محض تمہارے بارے میں سراغ لگانے کے لئے فون کیا۔“

”کوئی بات نہیں انکل عامر..... آپ فکر مند نہ ہوں کسی کام مجھ تک پہنچانا تما آسان نہیں۔“

”پھر بھی اختیاط کی ضرورت ہے۔“ عامر نے کہا۔

”ٹھیک ہے انکل عامر، میں مختار رہوں گی۔“

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ مختار رہے گی لیکن اس لفظ سے اسے چڑھو گئی تھی جب سے وہ پیدا ہوئی تھی اس وقت سے یہ لفظ کسی جو نک کی طرح اس کی زندگی سے لپٹا ہوا تھا اور اس لفظ کو کسی سنت تو اس پر شدید روزگار ہو جاتا اس کا جی چاہتا کہ ساری اختیاط بالائے طاق رکھ کر میدان میں آجائے۔ اس کی زندگی بھیج بیغ غریب نجی پر گزر رہی تھی۔ جو وہ کرنا چاہتی تھی وہ نہیں کر پا رہی تھی اور جو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کرنے پر مجبور تھی۔ وہ قید میں نہیں تھی لیکن نامعلوم دیواریں ہر وقت اس کے گروہ کھڑی جھوسوں ہوتی تھیں۔ اسے کس قدر جھوٹی موقوں بنا دیا گیا تھا۔

پورے دن وہ اسی سوچ میں رہی تھی۔ رات کو بھی وہ الجھی الجھی رہی۔ سوتے سوتے اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اسے یوں جھوسو ہوتا ہے جیسے اس کے بیبا آس پاس ہی ہیں وہ اسے نظر تو نہیں آتے تھے لیکن ان کے ہونے کا حساس بدستور قائم رہتا تھا۔

اس طرح سوتے جا گئے وہ چار بجے کے قریب گھری نیند میں چلی گئی۔ تب اس نے واوا عظم کو خواب میں دیکھا تھاں کا پور، پرشیق اور پر سکون چھو دیکھ کر اس کے دل کو ایک وم قرار سا آگیا۔ واوا عظم کسی گھنے درخت کے نیچے بیٹھے تھے تانیہ پانی کی تلاش میں کئی گھنٹے سے صحرائیں بھیک رہی پیاس کی شدت سے اس کے حلق میں کائنے پڑ رہے تھے بھکتے بھکتے اچانک واوا عظم سامنے آگئے۔ واوا عظم نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا پاس رکھی صراحی سے مٹی کے پیالے میں پانی انڈیل کر اسے دیا وہ بڑا طیف اور بیٹھا پانی تھا۔ پانی پی کر اس کی روح تک سیراب ہو گئی۔ وہ خاموشی سے بہت موبہب ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

تب واوا عظم نے بڑے تلی آمیز لبچے میں کہا۔ ”لگبڑا مت۔ بہت حوصلے سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ آئندہ آنے والا وقت بہت سخت ہو گا۔“ اتنا کہہ کر واوا عظم نے اسے کچھ پڑھنے کو بتایا ہمہ بدلے۔ اسے پڑھتے ہی تمہارا بابا، تمہاری محبت کی گرفت سے آزاد ہو جائے گا اسے قرار آجائے گا۔“

تب تانیہ نے اپنے بیبا سے متعلق ضروری معلومات فراہم کر دیں۔ افضل ساری تفصیل سن کر سوچ میں پڑ گیا یہ بات اس کے گلے سے نہیں اتر رہی تھی کہ تانیہ نے اپنے بیبا کی روح کو دیکھا تھا وہ اس بات کو اس کا وہم سمجھ رہا تھا لیکن تانیہ نے سارا واقعہ کچھ اس لینین سے سایا تھا کہ وہ کسی طرح کی تزوید نہ کر سکتا اس نے بس اتنا ہی کہا۔ ”روشن علی تو اسلام آباد پلے گئے ہیں؟“

”ارے تو یہ ایسا نہ بڑے شر میں ایک روشن علی ہی رہ گئے ہیں کسی اور عالم کے بارے میں پتہ کرو۔“ خالہ فرزان نے اسے ڈائٹنے والے انداز میں کہا۔

اہمی افضل نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک میلیفون کی گھنٹی بھی تانیہ میلیفون کے زیادہ نزدیک تھی اس نے ہاتھ پر ہذا کر ریسیور اٹھا لیا۔ ”ہیلو۔“

”تانیہ، میں عامر بول رہا ہوں۔“ عامر نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

”انکل عامر آپ کیسے ہیں۔؟“

”میں ٹھیک ہوں..... رات کو میں نے خواب میں کئی مرتبہ تمہارے بیبا کو دیکھا۔“

”کیا کہہ رہے تھے۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”کہا تو انہوں نے کچھ نہیں..... جب نظر آئے بے چین اور بے قرار سے نظر آئے۔“

”آپ نے انہیں، بالکل صحیح دیکھا، وہ واقعی بہت بے قرار ہیں۔“

”کیا مطلب؟ کیا تم نے بھی انہیں خواب میں دیکھا۔“

”نہیں انکل..... وہ یہاں آئے تھے میں نے انہیں جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”جاگتی آنکھوں سے..... وہ کس طرح؟“ عامر کی سمجھ میں نہ آیا۔

تب تانیہ نے اپنے بیبا کو جس طرح دیکھا تھا اس کی رواداں ساوی ان پر اُلو کا جملہ اور ڈاٹری والی تحریر ذکر وہ گول کر گئی۔ یہ بات اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے لئے اب تک ملک گردندیں ہیں۔“

”کاش، میں ان کو کسی طرح سمجھا سکتی۔“ تانیہ نے بڑی ورومندی سے کہا۔ ”آپ ان کی قبر جا کر ان سے مخاطب تو ہوں، انہیں جا کر تسلی ویں انہیں بتائیں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”تمہارا خیال ہے کہ اس سے کچھ فرق پڑے گا؟“

”میں نہیں جانتی لیکن آپ ایسا کہ کتو ویکھیں۔؟“

”وہ واقعی اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ میلیفون پر بات کرتے کرتے اچانک ہی یہ خیال اس۔“

دل میں آگیکا تھا اور اس نے فراہمی انکل عامر کے گوش گزار کر دیا تھا۔

”اچھا، تانیہ میں عصر کے بعد قبرستان جاؤں گا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“

”تانیہ تم ذرا اپنا خیال رکھنا گھر سے اکیلی مت نکلنا۔“

”کیوں، خیریت؟ کوئی نیا مسئلہ۔“

جلائی بچ سے پانی نکال کر پیا تب اسے یاد آیا کہ وہ عمل کر کے سوئی تھی اور خواب میں اس نے اپنے باب کو دیکھا تھا پھر وہ پورا خواب اسے یاد آگیا۔
یہ ایک عجیب خواب تھا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر تشدیز ہے اپنے باب کی محبت کو اس قدر ترسی ہوئی اپنے باب کے لگے گل کر جو ایک آسودگی کا احساس ہوا تھا وہ احساس ابھی تک برقرار رکھایے خواب اس قدر جلد کیوں ٹوٹ گیا۔
وہ منہوس پر نہ کہاں سے آکر اس کے سینے پر بیٹھ گیا تھا۔

انھی چند روز پہلے بھی تو ایسا ہی ہوا تھا اس کے باوجود اس سے ملے آئے تھے اور وہ کری پر بیٹھے سوتی ہوئی تانیہ کو پیار بھری نظرلوں سے دیکھ رہے تھے تو وہ منہوس پر نہ کہیں سے اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سینے پر آبیجا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس نے اس منہوس پر نہ کو اپنے باب پر بچھتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر وہ مظہر بھاپ کی طرح غائب ہو گیا۔

یہ کون ہے جو باب بیٹھی کی محبت کے درمیان آئے کی کوشش کر رہا ہے۔
اس سوال کا جواب تانیہ کے پاس نہ تھا۔

کمرے میں کچھ جنس کا احساس ہوا تو اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا کھڑکی بند تھی اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی تاہم واکا جھونکا آیا کہ کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر لمبے سانس لینے لگی۔ اس وقت رات کے ڈینہ بیجے تھے سامنے دور تک رات اپنے بال کھولے سوری تھی۔ رات کا پانی ایک سحر ہوتا ہے۔ اس کا پانی فروں ہوتا ہے تھی اسے پراسرار کمرے میں ”لکڑے راجہ“ سے ملا تھا یاد آئی اس کی بات یاد آئی۔

”جب تم لوگ سوچاتے ہو تو ہم باہر آجائتے ہیں ہر سو ہمارا راج ہوتا ہے۔“

اس کی بات یاد کر کے ایک دم اسے خوف کا احساس ہوا کھڑکی بند کر کے وہاں سے ہٹ آئی اس نے سوچا کمرے کی لاش بند کر دے لیکن لاش بند کرنے کی ہمت نہ ہوئی وہ ایسے ہی بیٹھ پر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں کچھ عجیب سا شور ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے پر اس کے سامنے جو مظہر تھا اسے دیکھ کر وہ بے اختیار چینی۔ ”ایسا، مت کرو۔“

”وہ گول گول آنکھوں والا شاید تختیب کاری پر اڑا ہوا تھا۔ تانیہ کی آنکھ جس شور پر کھلی وہ پروں کی پھر پھڑا ہت تھی۔ پہلے تو تانیہ کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کس قسم کا شور ہے۔ کمرے کی لاش روشن تھی اور اس کے سامنے کچھ نہ تھا۔ پھر اس نے اپنے دمیں جانب کسی چیز کو اچھلے ہوئے دیکھا۔ جب اس نے کیسے سے رہا تھا کریچی پچ قالین پر دیکھا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ شور پروں کی پھر پھڑا ہت کا ہے۔“

”وہ گول گول آنکھوں والا پرندہ کیسٹوں کے ریک کے سامنے قالین پر کسی چیز پر اچھل کر جملہ کر رہا تھا اور وہ جس چیز پر جملہ کر رہا تھا وہ تھی ڈاری۔“

پھر فوراً ہی اس کی آنکھ کھل گئی دادا عظم کو خواب میں دیکھ کر جو ایک خونگوار تاڑ قائم ہوا تھا وہ تک قائم تھا اور انہوں نے جو پڑھنے کو بتایا تھا وہ بھی اس کے ذہن میں تازہ تھا وہ فوراً اٹھ کر گئی۔

وضو کر کے اس نے گھری دیکھی ابھی بھر کی اذان ہونے میں وقت تھا اس نے سوچا کہ تب تک قرآن شریف پڑھ لے۔

دادا عظم نے جو پڑھنے کے لئے بتایا تھا اسے عشاء کی نماز کے بعد تین دن تک پڑھنا تھا۔

تین دن کے عمل کے بعد تانیہ نے دادا عظم کے بتائے ہوئے طریقے پر ایک گلاس پانی پر ساتھ پھوکھیں ماریں اور اس پانی کو گلاس کے پودے کے گلے میں ڈال دیا اب اس کو کسی سے بات نہیں کرنا سیدھے اپنے بیٹھ پر لیٹ کر سوچانا تھا۔

تیرے دن کا عمل اس نے دیر سے شروع کیا تھا اسکے سونے کا وقت ہو جائے اور وہ کسی سے بات بنا سوچا جائے اگرچہ وہ دیر سے سونے کی عادی تھی اور نیند بھی اسے کروٹیں بدلت کر آتی تھی لیکن ایسا نہ ہوا، بستر پر لیٹنے کے بعد کوئی دس منٹ کے اندر اسے نیند نے اپنے آغوش میں لے لیا۔

اس رات اس نے اپنے بابا کو خواب میں دیکھا تھا ایک بہت اچھی سی کری پر برا جان تھا ان سامنے دس بارہ آدمی نیم دارزے کی ٹکل میں بیٹھے تھے اچانک انہیں سامنے سے تانیہ آتی ہوئی نظر ہے تو وہ ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ ”آپ لوگ اب جائیں، میں ذرا اپنی بیٹی سے کروں۔“

وہ لوگ فوراً ہی ادھر ادھر ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔ راؤ شمشاد علی اپنی کرسی سے نیچے اتر آتے اور آگے بڑھ کر تانیہ کو گلے سے لگایتے ہیں۔ تانیہ ان کے گلے سے لگ کر خلاف موقع روپیتی ہے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ”بیٹی رومت روؤگی تو مقابلہ کر کے کیں دیکھ رہا ہوں کہ تم شیطانوں میں گھری ہو، غیر انسانی تخلوق کی گرفت میں ہو۔ ڈرو مت اللہ پر“۔ یقین رکھنا چاہکہ ہے بس اللہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں تم دیکھو گی کہ یہ سب چیزیں پانی کا بلبلہ ثابت گی۔“

تانیہ روتے روتے بے اعتیار مسکرا پڑی اور کہا۔ ”انشاء اللہ، ایسا ہی ہو گا بابا۔“ پھر وہ اپنے بانہ کر بیوی۔ ”بابا، مجھے ایک مرتبہ اور اپنے گلے سے لگائیں میں آپ کی محبت کو بست تریا ہوں۔“

”ہاں کیوں نہیں، میری بیٹی آؤ۔“ راؤ شمشاد علی نے تانیہ کو اپنے سینے سے لگایا۔ ادھر تانیہ خواب دیکھ رہی تھی، ادھر وہ قریب کے درخت سے ازا۔ اس نے بست تیری سے اس کے سات چکر لگائے اور پھر تانیہ کے کمرے کی چھٹ پر اڑا گیا۔

تانیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھاری پرندہ اس کے سینے پر آبیجا ہو۔ وہ ہر بڑا کر اٹھ بیٹھی کر کے اندر ہر احاذہ ہن ماوف تھا کچھ دیر کے بعد جب اس کے حواس بجال ہوئے تو وہ بیٹھ سے اٹھی کر کے کیا

اے اپنا ہوش ہی نہ رہا تھا۔ آج اسے کچھ سکون محسوس ہوا تھا اس کی نظر اپنے دھو رپر جم گئی تھی۔ وہ اتنی ہی حسین تھی کہ کوئی اسے ایک نظر دیکھتا تو بار بار دیکھنے کی خواہش کرتا۔ سفید گلابی رنگت، سروق پکش آنکھیں، گھنی اور بی پلکیں، ترشے ہوئے خوبصورت ہونٹ، کتابی چڑھ، نبی حسین گردن، مناسب جسم، نرم و نازک ہاتھ، کومل پاؤں، چال ایسی کہ وقت اپنی رفتار بھول جائے۔ آواز ایسی کہ جو بنے سحر زدہ رہ جائے۔

اس وقت وہ خود کو اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ وہ اپنے آپ میں کھوئی گئی۔ برش ہاتھ سے چھٹا ہوش آیا جلدی اس نے اپنے بالوں میں برش پھیرا اور اپنے اتر گئی۔

ناشہ کے بعد وہ خالہ فرزانہ سے مخوگشتوں کی خواب سنایا۔ یہ بتایا کہ اس نے اپنے بیا کو سرخ خواب میں دیکھا۔ کس طرح انہوں نے گلے لگایا اور کیا کہا۔

ساری بات سن کر خالہ فرزانہ بولیں۔ ”یہ بات تمہارے بیانے عجیب کی کہ تم غیر انسانی مخلوق کی گرفت میں ہو؟“

”خالہ، یہ غیر انسانی مخلوق کیا ہوتی ہے؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”بو انسان نہ ہو۔“

”یعنی جن ہو۔“

”جن بھی ہو سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں اس دنیا میں انسانوں اور جنوں کے علاوہ ایک تیسرا مخلوق بھی ہوتی ہے۔“ خالہ فرزانہ نے انہمار خیال کیا۔

”وہ کونی؟“

”شیطانی مخلوق۔“

”شیطانی مخلوق؟“ تانیہ نے مضاحت طلب انداز میں دہرا یا۔

”عجیب رو میں، چیلیں، پچھلی پائیاں، سرکٹے، چھلاوے، بھوت اور نہ جانے کیا کیا؟ یہ سب شیطانی مخلوق ہیں۔“ خالہ فرزانہ نے سمجھا۔

”اور جانور؟“ تانیہ نے پوچھا۔ ”کیا جانور بھی پر اسرار ہو سکتے ہیں؟“

”کچھ جانور بھی بڑے پر اسرار ہوتے ہیں مثلاً می، کتا، الگ اور چگاڑوں اور۔“ خالہ فرزانہ نے بتایا۔ ”تکے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتا ہے جنہیں انسان نہیں دیکھ سکتا۔“

”خالہ کیا انسانوں میں غیر انسان نہیں پائے جاتے؟“ یہ عجیب سوال تھا۔

”ہاں، کیوں نہیں تم اپنے بچارا و احمد علی کو ہی لے لو، وہ کھر سے انسان لگتا ہے، وہ پکا شیطان کا چیلہ ہے۔“

”آپ نے بت سمجھ بات کی۔ یہ کہ کہ آپ نے میرا دل خوش کر دیا۔“ تانیہ نے مسکرا کر لیا۔

”خدا کا شکر ہے کہ میری کسی بات پر تمہارے بیوں پر مسکراہٹ تو آئی۔“ خالہ فرزانہ خوش ہو کر

یہ وہ ڈائری تھی جو اسے ”لگنے والے“ نے تھے میں دی تھی اور جو اس کی زندگی کے واقعات کو کہ آئینے کی طرح اس کے سامنے پیش کر دیتی تھی۔ وہ ڈائری اس کے لئے بے حد اہم تھی، بے حد قیمتی تھی اور وہ گول گول آنکھوں والا اس ڈائری کے صفات کو اپنے تین بیویوں سے نشانہ بنارہا تھا۔ وہ ڈائری درمیاں سے کھلی قالمی پر پڑی تھی۔

ایسی قیمتی شے کی پامالی دیکھ کر وہ دہل اٹھی تھی۔ تب ہی اس نے چیخ کر کہا۔ ”ایسا ملت کرو“ اس کی آواز سن کر گول گول آنکھوں والے نے بڑی غصیل نظروں سے اسے دیکھا تھا اور پھر وہ دیکھی دیکھنے فضایں تحلیل ہو گیا تھا۔ دھوان بن کر غائب ہو گیا تھا۔ تانیہ لپک کر ڈائری کے پاس پہنچی۔ ڈائری اٹھا کر اس کا جائزہ لیا۔ محض دو تین صفات کو نقصان پہنچا تھا۔ اس نے اپنے بیویوں سے صفات پہاڑنے کی کوشش کی تھی اس نے اس طرح پنج بارے تھے کہ صفات پھٹ کر الگ ہو جائیں لیکن ایسا نہیں سکا تھا۔ کوئی صفحہ کمل نہیں پہنچا تھا۔ اگر اس کی آنکھ نہ کھل جاتی تو شاید اس ڈائری کو نقصان پہنچا تھا۔

اس نے ڈائری اٹھا کر پھر کیسٹوں کی قطار میں رکھنا چاہی لیکن کچھ سوچ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ اسے الماری کے لاکر میں رکھ کر تالا بند کر دیا۔ اسے خیال آیا کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہ کیا اور ڈائری الماری کے لاکر میں ہوتی تو اس گول آنکھوں والے کے بیویوں کی دستبردار سے محفوظ رہتی۔ لیکن اسے اندازہ کب تھا کہ ڈائری کے ساتھ اس طرح کی تخریب کاری بھی ہو سکتی ہے۔

ڈائری کو محفوظ کر کے وہ بیڈ پر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد ہی اسے نیند سا آلیا۔

صحح دیرے سے اس کی آنکھ کھلی اور وہ بھی اس وقت جب دردانہ نے آکر دروازہ بھجا۔ گھری پر نلا ڈالتی ہوئی وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھولا تو دردانہ کا پریشان چڑھو نظر آیا۔ ”خیر تو ہے بی بی۔“ آج کیا اٹھنے کا ارادہ ہی نہیں تھا چارپاہی سے مارکھی ہوں۔ اب دروازہ کھلنے پر درداں نے دروازہ کھکھلانے کا حکم دے ہی دیا۔ چلے وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

”خالہ نے ناشہ تو کر لیا؟“ تانیہ نے گلہ مند ہو کر پوچھا۔

”ہاں، ناشہ تو کر لیا۔“ دردانہ نے بتایا۔ ”لیکن آپ کا کافی انتظار کر کے کیا۔“

”چل، شکر ہے۔“ تانیہ نے کہا۔ ”اچھا، دردانہ تم چلو میں تھس گئی۔ وہاں سے تو توانہ ہو کر لگی۔“ دردانہ کے جانے کے بعد وہ واش روم میں تھس گئی۔ اس کے باال گھرے سیاہ، انتہائی چکلے اور ریشیں سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے باال خلک کرنے لگی۔ اس کے باال گھرے سیاہ، انتہائی چکلے اور ریشیں تھے لبے اتنے کہ گھنٹوں سے چیخ آتے تھے۔ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے اس کی نظر اپنے چہرے پر نظر کی تھی جب سے پر اسرار واقعات کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

کافی دنوں کے بعد اس نے اپنے چہرے پر نظر کی تھی جب سے پر اسرار واقعات کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

بولیں۔

”خالہ، میں اب کیا کروں؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”تم نے کیا کرنا ہے؟“

”یہ غیر انسانی تخلق جو میرے گرد گھیرا ذال رہی ہے، ان سے کس طرح نہیں۔“

”دوا اعظم سے مدد لو۔“ خالہ فرزانہ نے مشورہ دیا۔

”دوا اعظم سے مدد لوں؟“ تانیہ نے جیرانہ ہو کر دھرا لیا۔ ”شاید آپ بھول گئیں کہ دادا

انتقال ہو چکا ہے۔“

”تمہارے خواب میں کون آیا تھا۔؟“ خالہ فرزانہ نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

”دوا اعظم۔“ تانیہ نے بتایا۔

”وہ دوبارہ پھر آئیں گے۔ اور وہی تمہیں راستہ دکھائیں گے۔ اس بات پر جانے مجھے کیوں!

”خالہ فرزانہ نے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو میں انتظار کروں گی بلکہ میں خواہ شکر کروں گی کہ وہ جلد میرے خواب میں آئے۔

انہیں خواب میں دیکھ کر جانے کیوں قرار سآ جاتا ہے۔“ تانیہ نے بڑے مطمئن لہجے میں کہا۔

پھر وہ خالہ فرزانہ سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کمرے میں

کیسٹوں کی قطار پر نظر جو پڑی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ڈائری موجود نہ تھی کیست کا کور خالی تھا۔

ہی اپنی بیوقوفی پر فہمی آئی۔ ڈائری توہہ الماری کے لاکر میں روکھ گئی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ ڈائری نکال کر اس کی ورق گردانی کرے۔ ڈائری کیسٹوں کے درمیان:

کی صورت میں وہ جب چاہتی، آتے جاتے نکال کر دیکھ لیتی تھی۔ اب اسے ڈائری دیکھنے کے لئے با

الماری تک جانا ہو گلا لکر کھول کر اسے دیکھا ہو گا۔ چلو کوئی بات نہیں وہ ایسا کر لے گی۔ کماز کما

وہاں گھفوڑا تو تھی۔

الماری کالا لکر کھول کر اس نے ڈائری نکالی۔ ایک لمحے کو جانے کیوں اس کے دل میں یہ خدا

تھا کہ ڈائری لاکر سے غائب ہو چکی ہو گی۔ ڈائری موجود تھی اسے دیکھ کر خوش ہوئی۔ وہ الماری بند

بیند کی طرف بڑھی۔ اس نے تیزی سے ڈائری کے صفحات کو پلانا ایک صفحے پر اسے کچھ سیاہی

آنی۔

اس نے جلدی جلدی ایک ایک ورق پلٹ کر بالآخر وہ صفحہ نکال لیا۔

اس صفحے پر اس پر اسرار کرے کی تصویر بینی ہوئی تھی جس کے بیندل میں کالا تھویڈ لکھا، و اتحاد دیکھے

وہ تصویر مدھم ہونے لگی اور مثی تصویر پر کوئی اور تصویر ابھرنے لگی۔ چند سینٹوں میں پر اسرار کم

تصویر غائب ہو گئی اور اس جھوپڑی کی تصویر سامنے آئی جس کی چھست پر گول گول آگ کھولنا

دروازے پر ایک سانپ کٹھلی مارے میٹھا تھا۔

جو پڑی کی تصویر واضح ہوتی ہے ایک مرد انی آواز اس کے ذہن میں گوچی۔ کوئی درد بھری آ۔

اے مدد کیلئے پکار رہا تھا۔

”زرموت..... آؤ جھوپڑی کے اندر آجائے۔“

”یہ آواز تھی جو خواب میں اسے متعدد بار سنائی دی تھی لیکن اس وقت یہ آدازنائی نہیں دی صرف

اس نے اپنے ذہن میں محسوس کی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تصویر دھنڈی ہونے لگی اور اس سے ایک اور تصویر ابھرنے لگی۔ وہ تصویر ابھر کر

کمل ہوئی تومعلوم ہوا کہ وہ پراسرار کرے کی ہے۔

ایسا تین بار ہوا پر اسرار کرے کے بعد جھوپڑی کی تصویر ابھری، دوستی رہی، تیسرا بار ایسی ڈوبی کہ پھر

ضفغ پر کچھ نہ رہا۔ وہ کوارہ گیا۔

اب وہ سوچنے لگی کہ ان دونوں تصویروں کا ایک ساتھ دکھائی دینے کا یہاں مطلب ہے۔ یہ عجیب اشارہ

تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا اگر ان تصویروں کے نیچے کوئی تحریر بھی آجائی تو تکنا اچھا ہوتا۔

ڈائری اس کے باہم میں تھی اور یونہی بے دھیانی میں اس کے درق پلٹتی جا رہی تھی کہ اچانک اس کے

سامنے ایک ایسا صفحہ آگیا، جس پر کچھ لکھا تھا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

یہ چند جملے تھے ان جملوں میں تانیہ کوہدایت کی گئی تھی چند لمحے پہلے اس کے ذہن میں ہوا بھن پیدا

ہوئی تھی اس تحریر سے رفغ ہو گئی تھی۔

اب اسے سفر کرنا تھا اس سفر کیلئے اس نے ایک بیگ تیار کر لیا جس میں انتہائی ضرورت کی چیزیں رکھی

تھیں۔ اشیاء کو جانے کے لیے بودھ، یہ بیک اتنا لہکا تھا کہ وہ اسے کنہ سے پر لٹکا کر بآسانی میں جمل سکتی

تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے کس قسم کا سفر درپیش ہو گا، اپنے طور پر اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اسے

پریل بھی چلانا پڑے تو اس کا بیگ اس کیلئے رکاوٹ نہ بنے۔

اپنے مشن پر جانے سے پہلے اس نے آج کی شام کھلی فضایں گزارنے کا پروگرام بنا یا پہلے اس نے

خالہ فرزانہ کو راضی کیا۔ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے کہاں باہر نکلی تھیں۔ خالہ فرزانہ اس کا اصرار دیکھ کر

جانے کیلئے راضی ہو گئی۔ پھر اس نے افضل کو بھی فون کر دیا کہ وہ آج جلدی گھر پر آجائے۔ افضل

نے جلد آئنے کا وعدہ کر لیا اور تجویز پیش کی کہ اتنے عرصے بعد گھر سے باہر نکل رہے ہیں تو پھر وہیں بیٹھ کر

رات کا کھانا کیوں نہ کھائیں۔

تجویز بھی تھی اس طرح وہ خالہ فرزانہ اندازہ افضل کے ساتھ دیر سیکر رہ کیتی تھی۔ اس نے اس تجویز کو

فردا منکور کر لیا اور دردانہ سے رات کا کھانا، تیار کرنے کا آرڈر دے دیا۔

”ارے بی بی، میں آپ کیلئے تمیں کی جگہ دس ڈشیں تیار کروں گی پر جانا کہاں ہے؟“

”کھونے اور کہاں؟“ تانیہ نے مسکرا کر کہا۔ ”پہلے ہم سمندر پر جائیں گے وہاں شام گزاریں گے

گیا۔ لہر بیجے نکل واپس گھر۔“

”واہ بی بی مزہ آگیا۔“ دردانہ خوش ہو کر بولی۔ ”ایسا زبردست پروگرام۔“

انہوں سے بھر گئیں، وہ تو اچھا ہوا کہ اس کا چڑھا ان کی طرف نہیں تھا، اس نے بڑی مہارت سے اپنی آہمیں صاف کر لیں اور پان کھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

چاربجے کے قریب وہ پنک منانے کیلئے لٹکے۔ افضل کے برابر والی سیٹ پر خالہ فرزانہ بیٹھے گئیں اور بھیجے تانیہ اور دروانہ نے نشستیں لے لیں۔ پلے سمندر کی طرف رخ کیا گیا، وہاں سورج غروب ہونے لگ رہے۔ کچھ کھایا پیا گیا، تصویر کشی کی گئی اس کے بعد چاروں نے ہل پارک کارخ کیا۔

خالہ فرزانہ کی طرف دیکھا تو انہیں بڑی محبت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔

خالہ کیا ہوا؟” تانیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بیں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا؟“ خالہ فرزانہ بدستور اس کی طرف دیکھ رہی تھیں پھر اس کا زنازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی اپنائیت سے بولیں۔ ”بچھے کیا ہوا ہے، میری جان ہتا؟“

”لو میں خود آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ آپ کو کیا ہوا ہے مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں، ہیں کہ الناجھ سے سوال کر رہی ہیں مجھے تو پچھے نہیں ہوا خالہ، بس آونک کا پروگرام بنایا ہے۔“

”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے تانیہ کے اس آونک کے پچھے کوئی بات ہے کوئی راز ہے۔“ خالہ

بنت محبت سے بولیں۔ ”کیا تو مجھے نہیں بتائے کی۔“

خالہ فرزانہ کی بات سن کر اس کے دل پر دھواں سا چھا گیا۔ وہ انہیں کیسے بتائے کہ آج کی ران کی آواز پر ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فراٹھ کر بیٹھے گئیں۔ واش روم میں جا کر وضو کیا نماز پڑھی، فوڑی دیر قرآن شریف کی تلاوت کی۔ پھر اپنے پینڈ پر لیٹ گئیں۔

جب سے اٹھی تھیں ان کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دل پر ایک گھبراہٹ طاری تھی ان کی سمجھ میں میں آبھا تھا کیا مسئلہ ہے۔ شاید رات کی آونک کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ رات کو انہوں نے کھانا بھی کچھ یاد ہی کھالیا تھا۔ ممکن ہے بلپر پر شر ہو گیا ہوئکیں یہ گھبراہٹ کچھ عجیب قسم کی تھی۔ ایک بے چینی سی تھی پیسے کوچھ ہونے والا ہو یا ہو گیا ہو گر اس کی اطلاع ابھی تک نہ پہنچ ہو۔

وہ کچھ دیر پینڈ پر بیٹھی رہیں، چین مثلا تو سائیڈ نیبل سے پانداں انھا کر چھوٹا سا ایک پان بنایا اور منہ میں کھلایا، سورج کی روشنی ہر سو پھیل گئی تھی۔ وہ با تھر روم کا دروازہ کھول کر پچھے لالا میں نکل گئیں۔

ہمال ان کی ایک کری پڑی تھی جس پر بیٹھ کر وہ ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتی تھیں۔ تھوڑا سا اٹھنے کے بعد پانی کری پر رہا جہاں ہو گئیں۔ کری پر بیٹھ کر آسمان کی طرف نظر کی، آسمان پر باد لوں کے چھوٹے نہ فرا نظریں پیچی کر لیں۔

ان کے دل کی ابھی وہی کیفیت تھی، طبیعت سنبھلنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ ابھی وہ سورج ہی رہی تھیں لہ دروانہ کے پاس ہگن میں چلی جائیں اس سے باتیں کر کے دل بھلاکیں کروہ انہیں ڈھونڈنی ہوئی خود ہی انہیں۔

”بیں، دیکھ لو۔“ تانیہ خوش دلی سے بولی۔

”ٹھیک ہے بی بی، میں ابھی سے شام کی تیاریاں شروع کر دیتی ہوں۔“

”ہاں ہاں، جاؤ بھاگو جلدی کرو۔“

تانیہ، دروانہ سے بات کر رہی تھی تو خالہ فرزانہ اس کا چڑھہ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آچانک اس طرح گھومنے کا پروگرام بنا لیا ان کے گلے سے نہیں اتر رہا تھا۔ دروانہ کے جانے کے بعد نے خالہ فرزانہ کی طرف دیکھا تو انہیں بڑی محبت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔

”خالہ کیا ہوا؟“ تانیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بیں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا؟“ خالہ فرزانہ بدستور اس کی طرف دیکھ رہی تھیں پھر اس کا زنازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی اپنائیت سے بولیں۔ ”بچھے کیا ہوا ہے، میری جان ہتا؟“

”لو میں خود آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ آپ کو کیا ہوا ہے مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں، ہیں کہ الناجھ سے سوال کر رہی ہیں مجھے تو پچھے نہیں ہوا خالہ، بس آونک کا پروگرام بنایا ہے۔“

”مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے تانیہ کے اس آونک کے پچھے کوئی بات ہے کوئی راز ہے۔“ خالہ

بنت محبت سے بولیں۔ ”کیا تو مجھے نہیں بتائے کی۔“

خالہ، کسی کی موت زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں ہے۔“ تانیہ نے خالہ فرزانہ کو الجھائی ایسے ہی جملہ کہ دیا۔

”اچھا، بھتی خدا کے واسطے اس طرح کی بکواس میرے سامنے نہ کرو۔ یہ آجکل کی لڑکیاں مڑنے کا ذکر تو ایسے کرتی ہیں جیسے آس کریم خریدے جا رہی ہوں۔“

”ہاں، خالہ اچھا یاد دلایا، فرایہ تو بتائیے کہ آپ آس کریم کون سی کھائیں گی۔“

”میں اتنی یقین نہیں ہوں، جتنی تم سمجھ رہی ہو۔ سمجھیں۔“ خالہ خنکی سے بولیں۔

”خالہ چھوڑیں بھتی علّمہ بنے میں کیا رکھا ہے بعض وقت یہ عقل بندے کو اسلام سے دے ہے۔“ وہ ان کی بات کو پھر لے اڑی۔

خالہ فرزانہ سمجھ گئیں کہ اگر کوئی بات بھی ہے تو تانیہ سے بتانے کے لئے تیار نہیں ہے لہذا ان پلٹ کر اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پانداں کھول کر اپنے لئے پان بنانے لگیں۔

”خالہ، پان میں بھی کھاؤں گی۔“ تانیہ بڑی چاہت سے بولی۔

”ہاں، ضرور کیوں نہیں؟“ انہوں نے اسے محبت سے دیکھا۔

”ہے، خالہ آپ کتنی اچھی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ان سے لپٹ گئی پھر جانے کیوں اس کا

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باہر بھی نہیں کہیں۔“ خالہ فرزانہ کا دل اب دھواں ہونے لگا۔ ”وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے، یخچے نہیں ہے، باہر نہیں گئی تو پھر وہ کماں گئی۔ ہائے دروانہ میرا دل بیٹھا جара ہے۔ جلدی سے جا کر افضل کو اٹھاؤ۔“

”بھی اچھا، بڑی بی بی۔“ وہ تینی سے باہر جاتے ہوئے بولی۔
افضل کو اخھانا آسان کام نہ تھا۔ وہ بڑی گھری نیند سوتا تھا۔ اس کے سر پر اگر ڈھول بھی بیٹھا جاتا تو وہ نی سے میں ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت جیسے مجھے ہی ہو گیا۔ اور دروانہ نے اس کے دروازے پر دستک دی اور اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

”کیا ہوا دروانہ؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ صاحب بھی، آپ کو بڑی بی بی نے بلا یا ہے فوراً۔“

”غیر تو ہے۔“ وہ اپنے پاؤں میں چپل ڈالتا ہوا بولا۔ ”طبیعت خراب ہو رہی ہے کیا؟“

”نہیں گئی، وہ تانیہ بی بی.....“ دروانہ جملہ پورا نہ کر سکی اس کے حلق میں گولا سا آگیا۔

”کیا ہوا، تانیہ کو؟“ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

”وہ گھر میں کہیں بھی نہیں ہیں۔“ دروانہ نے بمشکل کہا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ افضل ایک دم سائنس میں آگیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

خالہ فرزانہ پریشانی کے مارے زرد پرچکی تھی افضل نے خالہ کا چہہ دیکھا تو اور پریشان ہو گیا۔

”خالہ پریشان نہ ہوں، میں ابھی اپر جا کر دیکھتا ہوں تانیہ اور پریشان ہو گی۔“ اس نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”جاوہ جلدی جا کر دیکھو۔“ خالہ فرزانہ نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

افضل دو دو سڑھیاں چھلانگ تھا اور پانچا۔ تانیہ کمرے میں موجود نہ تھی۔ کمرے میں کسی قسم کی

بتر تینی کے آندر بھی نہ تھے۔ ہر جگہ اپنے ٹھکانے پر تھی۔ گلی بی کا دروازہ بند تھا،

بتر تریکھ تھکن، بھی نہ تھی لگاتا تھا جیسے بیٹھ پر کوئی سویاہی نہیں یا اگر سویاہ تو اس نے اٹھ کر چادر کی ٹکنیں دور کر دیں۔

افضل نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ کوئی ایسا راغل جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ وہ

کمال گئی۔ کیسی کچھ نہ نظر آیا سواسنے نکیے ہٹا کر دیکھا۔

نیکے کی چیخایک کا نذر کھاتا تھا، وہ تانیہ کا خط تھا خالہ فرزانہ کے نام۔

افضل اس خط کو پڑھتا ہوا یخچے اتر آیا اور اسے خالہ فرزانہ کے سامنے رکھ دیا۔

خالہ فرزانہ نے بے چین ہو کر اپنا چشمہ نیکے کے یخچے سے کلا اور جلدی سے آنکھوں پر لگا کر خط پڑھ لیں۔

لگاتا تھا۔

”بخاری خالہ! میں جارہی ہوں۔ کمال جارہی ہوں معلوم نہیں، کس کے ساتھ جارہی ہوں یہ بھی

”بڑی بی بی آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ اور آپ نے یہاں پان بھی کھالیا کیا بھجھے دیتے ہو گئی۔“ دروانہ نے خالہ فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کے لئے جوس لے آئی ہوں، اندر رکھا ہے کیا یہاں لے آؤں۔“

”نہیں دیں رہنے دو۔“ خالہ فرزانہ نے جواب دیا۔ ”دروانہ، جانے میرا دل کیوں گھبرا رہا۔ صح سے میری آنکھ پھڑک رہتی ہے۔ اب میں نے آسان پر اُتی ہوئی جیل بھی دیکھ لی اللہ رحم کر جانے کیا ہوئے والا ہے۔“

”کچھ نہیں ہو گا، بڑی بی بی، آپ اس طرح کی باتوں پر یقین کیوں رکھتی ہیں؟“

”اچھا، تم زیادہ ارسٹونہ بنو۔ جاؤ اپر جا کر دیکھو تانیہ بی بی اٹھ گئی ہیں کیا؟“ وہ اٹھتے ہو

بولیں۔

”اگر دروازہ بند ہو تو کیا کھکھتا ہوں؟“

”ایک تو تم سوال بہت کرتی ہو، اور جا کر دیکھ لو میرا خیال ہے کہ وہ اٹھ چکی ہوں گی۔“

فرزانہ واش روم میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

”جی اچھا، بڑی بی بی۔“ اس نے بڑی سعادت مندی سے کما اور پھر طرف سے ہی اپر

گئی۔

خالہ فرزانہ نے پان تھوک کر کلی کی، اور پھر اپنے بیٹھ پر آکر نیم دراز ہو گئیں۔ سائینے نیبل پر جو

گلاس رکھا تھا، ابھی وہ ہاتھ پر ڈھا کر اخھانا چاہ رہ تھیں کہ کمرے میں دروانہ داخل ہوئی۔

”بڑی بی بی۔“ دروانہ کے لجھے میں کوئی ایسی بات تھی کہ اپنا نام سن کر ہاتھ فرو دل پر اُ

آنکھیں اٹھا کر دروانہ کو دیکھا تو اس کے چہبے پر ہو ایسا اُتی ہوئی نظر آئیں۔

”کیا ہوا دروانہ؟“

”تانیہ بی بی کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے لیکن وہ کمرے میں نہیں ہیں؟“

”نہیں ہیں اس کا کیا مطلب ہے۔“ خالہ فرزانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بھی وہ واش روم میں

گی۔“

”واش روم بھی کھلا ہوا ہے۔“ دروانہ نے بتایا۔

”گلیری میں کھڑی ہوں گی۔“

”وہ اوپر کمیں نہیں ہیں۔“

”پھر باہر ہوں گی لان میں۔“

”وہ یخچے بھی کمیں نہیں ہیں۔ میں پورا گھر دیکھ آئی ہوں۔“ دروانہ نے فخر مندی سے کہا

”کیا گیٹ کھلا ہوا ہے؟“

”نہیں، بڑی بی بی گیٹ اندر سے بند ہے اور اس میں تالا بھی پڑا ہوا ہے۔“

پہنچی۔ اس کرے سے پہلے خالہ فرزانہ کا کمرہ پر تاخو بند تھا، دروازے کے نیچے اندر ہمراہ تھا، اس کا مطلب ہے کہ ان کے کمرے کی لائٹ بھی بند ہے، ظاہر ہے سورہ ہوں گی، ویسے جب کبھی وہ کوئی نادل پڑھنے پڑھ جاتی تو پھر دیر تک پڑھتی رہتیں۔

تانية کامی چلا کہ خالہ کا دروازہ بجا کر انیں اللہ حافظ کے اسے اپنے اس خیال پر خود ہی نہیں آگئی۔
یہ آئیں مجھے مارداںی بات تھی۔ اس نے غائبانہ ہاتھ بھاکر خالہ کا شدہ حافظ کیا۔

ٹھیک ڈھائی بجے اس نے دروازہ کھونے کے لئے بینڈ پر ہاتھ رکھنا چلا لیکن بینڈ پر ہاتھ نہ پڑا۔
روازہ خود بخوبی کھل گیا تھا جیسے دروازے کے پیچے کوئی اس کا منتظر تھا۔

سامنے اندر رہا تھا۔ وہ محض اندازے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ خود بخوبی بند ہو گیا۔ اندر گھپ اندر رہا۔ وہ دوچار قدم ہی اندر آئی تھی۔ اس کی سمجھیں نہ آیا لہو آگے بڑھے یاد ہیں کھڑی رہے۔ اگر آگے بڑھے تو کس جانب بڑھے، اندر ہم اور گھر رہا تھا کہ کچھ ٹھیک نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا، وہ جہاں کھڑی ہے وہیں کچھ دیر کھڑی رہے ہاکہ آنکھیں اندر ہیرے میں یکجتنے کی عادی ہو جائیں۔

وہ اندر ہیرے میں ایسے ہی آنکھیں چھاڑ کر دیکھ رہی تھی کہ کچھ نظر آجائے تب اس نے گھپ اندر ہیرے ن پھٹپت پر کوئی روشنی ٹھیک نہیں۔ ایسا گھیسے در آسان پر کوئی اکیلا ستارہ ٹھیکارہا ہو پھر دیکھتے ہی یکجتنے ایسے ستاروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ستاروں کی تعداد کے ساتھ مدمحم سا جالا بھی پھیلتا گیا۔
پھر یہ مدمحم روشنی دھیرے صاف ہوئے لگی اس کی نظریں اپر چھٹ کی طرف اٹھی ہوئیں۔ روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چھٹ اب آسان کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔
بے شمار ستارے ہمگما رہے تھے پھر یہ روشنی تیز ہو گئی کہ یوں لگا جیسے چاند نکل آیا ہو۔ ساتھ ہی تیز نہیں ہوا کا جھونکا اس کے ریشی پدن کو چھوتا چلا گیا۔

اچانک اسے اپنے پاؤں کسی نرم چیز میں دھنسے محوس ہوئے۔ اس نے فوراً اپنے چوریوں کی طرف لام پھر گھبرا کر دیکھا، باسیں دیکھا، اور دیکھا، اپنے دیکھا، تب اسے اپنے دل کی دھڑکن کرنے کی ہوئی دس ہوئی۔
وہ کسی سحر ایں تھی۔

پورے چاند کی رات تھی۔ مٹھنی ہوا چل رہی تھی، تاروں بھرا آسان تھا۔ چاند اپنے شباب پر تھا لہ مک نظر جاتی تھی جہاں تک وہ دیکھ سکتی تھی۔ ریت کے اوپنے نیچے میلے چھلے ہوئے تھے۔ کوئی لام کوئی آبادی دور تک نہ تھی۔ کھڑے ہی کھڑے چند سیندوں میں جانے کیا سے کیا ہو گیا تھا جانے اگلی اس مقام حریت پر کھڑی، اپنے ہوش و حواس درست کر رہی تھی کہ ایک سایہ سا اس کے سر پر پڑا آگے کل گیا پر دل کی پھر پھراہٹ کے ساتھ ہی ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ تانية نے ریت پر کسی تپنمنے کا سایہ دیکھا جیسا کہ سر سے گزر کر آگے گیا تھا۔ ریت پر اس سائے کا سائز کافی بڑا تھا۔

اگلی اس مقام حریت پر کھڑی، اپنے ہوش و حواس درست کر رہی تھی کہ ایک سایہ سا اس کے سر پر پڑا آگے کل گیا پر دل کی پھر پھراہٹ کے ساتھ ہی ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ تانية نے ریت پر کسی تپنمنے کا سایہ دیکھا جیسا کہ سر سے گزر کر آگے گیا تھا۔ ریت پر اس سائے کا سائز کافی بڑا تھا۔

معلوم نہیں۔ کب داپس آؤں گی، نہیں جانتی، لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں داپس آؤں گی۔
ساتھ میرا بھائی حسن راؤ ہو گا۔ آپ میرا انتظار کریں اور پریشان بالکل نہ ہوں۔ آپ کی تائیں۔
یہ ایک عجیب و غریب خط تھا، سب کو چکرا دینے والا۔
افضل اور خالہ فرزانہ سرپکڑ کر پیٹھ گئے تھے دروانہ بھی دیہے چھاڑے جیران نظریوں سے اس دیکھ رہی تھی۔

خبر یہ مسئلہ تو پانی جگہ اہم تھا کہ وہ اچانک کمال چلی گئی لیکن اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ وہ گم کس وقت اور کس طرح گئی، مگر کا گیٹ جوں کا توں بند تھا۔ بس ایک ہی راستہ ہو سکتا تھا کہ وہ گم احاطے کی دیوار جو چھوٹ سے اپنی تھی، اسے چھلانگ کر باہر چلی جائے لیکن تانیس جیسی نرم نداز کے لئے چھوٹ اپنی دیوار پر چڑھنا اور پھر گھر کے باہر کوئی آسان کام نہ تھا۔

وہ گھر کے اندر ہی سے کہیں گم ہو گئی تھی؟
وہ تو گھر کے اندر ہی سے کہیں گم ہو گئی تھی۔

اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ٹھیک ڈھائی بجے اس پر اسرار کرے کے دروازے پر پہنچ جائے؟
تعمید لکھا ہوا ہے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دہاں سے اس کا سفر شروع ہو گا۔ سفر کی خبر اس نے اپنا چھونٹا موٹا ضرورت کا سامان ایک بیگ میں بھر لیا تھا۔ اس نے ڈائری سمت احتیاط سے رکھ لی ہے اسے معلوم تھا کہ خالہ فرزانہ اس کی اچانک گشادگی سے بہت متاثر ہوں گی۔ اس لئے اس سوچ کر خالہ فرزانہ کے نام ایک خط لکھ دیا تھا مگر انیں اتنا اندازہ ہو جائے کہ وہ جمال گئی ہے، اپنی سے گئی ہے اور بڑے تیک عزم لے کر گئی ہے۔

اسے نیند آ رہی تھی۔ لیکن مناکر اسے اپنی خاصی تھکن ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر لیٹ گھری نیند سوچا گئی اس لئے اس نے سوچا کر وہ لیٹی گئی نہیں بلکہ پیٹھی رہے گی تاکہ نیند نہ آئے ایک کے قریب جب وہ نیند سے میحال ہونے لگی اور بار بار نیند میں جھومنے لگی تو اس نے سوچا کر کیوں نہ میں سواد دیجے کا الارم لگادے اور بیدی پر لیٹ جائے اور سوچا گئی پھر خیال آیا کہ الارم کی آواز کیں ایسا یا خالہ فرزانہ کے کانوں تک نہ پہنچ جائے اور اس کے اخنثے سے پلے وہ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ الارم کی کم کرنے کے لئے ایک تہ کی ہوئی چادر اس پر ڈال دی۔ کھڑکیاں اور دروازے پہلے ہی بند تھے ٹھیک سواد دیجے گھری کا الارم بجا۔ الارم بجھتے ہی تانیس نے ہاتھ پر چھٹا کر اس کا ٹھنڈا دبایا اور فو کر پیٹھ گئی۔ واش روم میں جا کر منہ پر چھینٹے مارے۔ اپنے بیگ کو چیک کیا، بستر درست کیا، کر چیز پر نظر دوڑائی سب چیزیں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

دون ہجہ کر پچھیں منٹ پر وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ پلٹ کر ایک الوداعی نظر ڈالی۔ ایک دم دل بری وہڑ کا۔ لائٹ بند کر کے بہت احتیاط سے نیند اترنے لگی۔ گھر پر ایک پر اسرار سناتا چھایا ہوا تھا۔ چاند کی رات تھی چاندنی کا سحر فضا پر چھایا ہوا تھا۔
وہ کمرہ سب سے آخر میں تھا، وہ بہت مقاطع انداز میں چلتی ہوئی اس پر اسرار کرہے کے دروازے

و صبح کے اس سحر میں کھوئی ہوئی تھی کہ اپنی بست پر اچانک اسے پروں کی تیز پھر پھر اہم نہیں دی۔ پھر پھر اہم کے ساتھ ایک تیز صحیح کی آواز تھی۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا آسمان پر کچھ نہ تھا لیکن زمین پر کسی اڑتے ہوئے پرندے کا سایہ پڑ رہا تھا۔ یہ عجیب مظہر تھا، اصل غائب تھی نقل و حکائی دے رہی تھی۔ اس نے اس سائے کو دور تک جاتے ہوئے دیکھا۔ ریت پر پڑتا سایہ اتنا برا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ پرندہ بت پنج پرواز کر رہا ہو۔ ابھی وہ اس سائے کو غائب ہوتا دیکھا ہی رہی تھی کہ پچھے ایک سایہ اور نمودار ہوا اور یہ دیوار پر اس سایہ کی انسان کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی چادر اوڑھئے ہوئے ہے سورج کیونکہ ابھی تک رہا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا۔ سورج کے سامنے تھا۔ اس نے اس کے سائے کی جامت غیر معمولی تھی۔

یہاں بھی وہی معاملہ تھا، صرف سایہ تھا، کس کا سایہ تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سایہ اس کی سیدھی میں، اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ سایے کا سرتانی کے قدموں میں آگیا۔ قدموں پر سائے کے آتے ہی تانیہ کو ایک عجیب ساحاس ہوا۔ سائے لگا جیسے اس کے پیروں میں اگ لگ گئی، وہ گھر اکار اس نے پچھے ہٹانا لیکن اب وقت گزر چاتا ایک لمحے میں وہ سایہ اس پر چھا گیا۔ بد تانیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے جلتے ہوئے تور میں ڈال دیا گیا ہو اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔

یہ احساس، یہ اذیت چند سینٹ سے زیادہ کی نہ تھی جب اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے دیکھا۔ اس سائے کا دور تک پہ نہیں پھر وہ جگد بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ سخت زمین پر کھڑی تھی۔ بن انگر چاہو ہمار تھی لیکن جانجا چھوٹے بڑے پوئے نظر آ رہے تھے۔

توہڑے سے فاصلے پر اسے ایک جھوپڑی دکھائی دی۔ اس جھوپڑی پر نظر پڑتے ہی اس کے دل کی رنگ تیز ہو گئی یہ تو وہی خواب والی جھوپڑی تھی وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی، قریب ہوئی ہنپڑی کی چھٹ پر اسے اُتو بیٹھا صاف دکھائی دے رہا تھا جب وہ اور نزدیک ہوئی تو اسے جھوپڑی کے داڑے پر سانپ بھی دکھائی دینے لگا وہ ابھی اندر سے لگتا تھا اور دروازے پر پھن انھائے اور کنٹلی مار کر گی تھا۔

خواب کا پورا منظر اب حقیقت کا رزب دھار گیا تھا۔

سانپ نے اسے اپنے سامنے دیکھ کر ایک زور دار پھکار ماری۔ پھکار مارتے ہی جھوپڑی کی چھٹ پر الٹا ڈالا۔ سانپ کی طرف بڑھا وہ خوفزدہ ہو کر پلٹ کر بھاگنا چاہتی تھی کہ جھوپڑی کے سے آواز آئی۔

”ڈومت..... آؤ جھوپڑی کے اندر آ جاؤ۔“

وہ درتی کیسے نہیں، وہ سانپ اس کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر ابھی چند قدم ہی پچھے ہٹی تھی کہ اس نے دیکھا کہ وہ سانپ اس کی طرف آنے کے درمیں طرف مزگ کیا اور گھوم کر جھوپڑی کے پچھے غائب ہو گیا۔ اب جھوپڑی کی چھٹ پر کوئی چیز نہ دروازے پر کچھ تھا۔

جیسے وہ پرندہ بالکل سر کو چھوٹا گزر رہا ہے۔ تائیں نے پروں کی بچپن پھر اہم تھا اور جیچ پر فوراً گھبرا کر اپر دیکھ لیکن آسمان پر کوئی چیز نہ تھی۔ چاندنی پرے شب پر تھی۔ دور تک ریت کا صمرا پھیلا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا تھی۔ یہ ماحول، یہ اس کے لئے آبیزیل تھی، اس طرح کے انوکھے ممتاز دیکھ کر وہ سحور ہو جاتی تھی۔ ایسے مناظر تو اس لکھن فلموں میں دیکھے تھے لیکن اب وہ خود کسی فلم کا حصہ بن گئی تھی، اسی فلم جس کا کوئی واٹر کیٹر کوئی فوٹو گرافر۔

پھر کہیں سے چھم چھم کی آواز آنے لگی جیسے کسی کے پاؤں میں گھنکرو بندھے ہوں اور دوڑا چلا ہو۔ آواز کی سمت پر اس نے نظر اٹھائی تو سامنے سے ایک ہیولا سآتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر ہیولے نے شکل و صورت اختیار کر لی۔ وہ ایک اونٹی تھی جس پر کوئی سوار نہیں تھا۔ وہ اونٹی کے نزدیک آکر ٹھہر گئی اور خود ہی ریت پر بیٹھ گئی۔

تائیہ تبدیل میں بنتا ہو گئی۔ جانے یہ اونٹی کماں سے آگئی ہے اور یہ یہاں کس لئے بیٹھ گئی۔ تب کہیں نزدیک سے ایک آواز آئی۔ اونٹی پر بیٹھ جاؤ، یہ تمہارے لئے بھیجنی گئی ہے۔ تائیہ نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا، آواز والا کہیں دکھائی نہ دیا وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور سوار ہو گئی تانیہ کے بیٹھتے ہی اونٹی کھڑی ہو گئی اگرچہ اونٹی بہت احتیاط سے اٹھی تھی پھر بھی تانیہ آگے جھوک کر رہ گئی۔

چاند کے رخ اونٹی نے چلانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اپنی فقار بڑھائی دیکھتے ہی دیکھ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ رات کا وقت، اونٹی کی سواری، چاندنی رات، لق و دق صمرا اور ایک حسین ترین لیکی، عجیب ماں کوئی انسان بھی اس منظر کو دیکھ لیتا تو دم بخوردہ جاتا لیکن یہاں تو دور تک کوئی انسان نہ تھا۔ آدم، نہ آدم زاد، ہو کا عالم تھا۔ یہ کوئی اور ہی دنیا تھی منظر پر منفرد لے جا رہے تھے۔ یوں ہو رہا تھا جیسے اونٹی اڑ رہی ہو، جانے کتنی ساخت نہ ہوئی۔

چاند بھی سامنے تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی تابانی کھوتا جا رہا تھا، بالآخر دوڑتے دوڑتے اور فقار کم ہو گئی یہاں تک کہ وہ ایک گلگ رک گئی۔ سفر کرتے ہوئے جانے کتنا وقت گز گیا تھا۔ جانے وہ کتنا فاصلہ طے کر آئی تھی۔ رات کا چکا تھا۔ سورج ایک لال توے کی طرح بہت دھیرے دھیرے نہ موادر ہو رہا تھا۔

اونٹی کے بیٹھتے تانیہ اس کی بیٹھتے سے اتر گئی اور کھڑے ہو کر نکلتے سورج کو دیکھنے لگی۔ یہ صمرا کی صبح تھی، یہ عجیب صبح تھی، ایسی خوبصورت اور انوکھی صبح اس نے کبھی نہیں دیکھی سامنے کچھ نہیں تھا۔ بن ریت کے میلے تھے اور زمین کے آخری سرے سے سراہمارت سورج تھا آسمان۔ ان تین چیزوں پر مشتمل یہ اللہ کا بنا یا ہوالینڈ اسکی پتحاں منظر کی وکاشی اور حسن کا کلنا نہ تھا۔

وہ کھڑی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے۔ جبکہ وہ آواز پھر آئی۔

”ڈرمٹ..... آج جھونپڑی کے اندر آجاو۔“

یہ آواز سن کر وہ جھونپڑی کے چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ دروازے میں ہونے کے لئے جگی ہی تھی کہ کسی نے اس کے کنٹھ پر ہاتھ رکھ کر اندر جانے سے روک دیا۔ اس نے چیچھے مرکر دیکھا تو کندھ پر ہاتھ رکھنے والے نے ہاتھ ہٹالیا۔ نہ صرف ہاتھ ہٹالی بلکہ، چیچھے ہٹ کر بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر راہ راست سورج کی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس کی رنگت چمک رہی تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباس میں تھا۔ کندھوں پر جھولتے لبے بال۔ کافرا چاندی کی بالیاں۔ لمبا چرو۔ اونچا بالاقد۔ ایک ہاتھ میں موٹا سا کڑا اور انگلی میں چاندی کی تھرگی انگو سیاہ چکلی آنکھیں۔ عجیب شخصیت تھی اس کی۔ اسے دیکھ کر خوف بھی محوس ہوتا ہوا اور اسے دیکھ بھی چاہتا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ باندھے، پرشوق نگاہوں سے تانیہ کو دیکھ رہا تھا۔

”کون ہو تم؟“ تانیہ نے وضاحت طلب انداز میں پوچھا۔

”میں کالا چراغ ہوں۔“ وہ بولا تو اس کے سفید چمدار دانت دکھائی دیئے جو بہت بھلے ہوئے۔

”اوہ، اچھا تو وہ آپ ہیں؟“ تانیہ کے لبجے میں شناسائی کی جھلک تھی۔ ”اب تک میں آپ کے میں سنتی رہی تھی۔ آج دیکھ بھی لیا۔“

”میں اس صحرائیں تمہیں خوش آمدی کرتا ہوں۔ میں ایک عرصے سے تمہاری آمد کا منتظر ہوں آخر؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”یہی بتانے کے لئے میں نے اندر جانے سے روکا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اندر کون ہے؟“

”اوندر ایک ایسا شخص موجود ہے جسے تمہاری مدد کی خفت ضرورت ہے۔“

”میں تو اندر جا رہی تھی، آپ ہی نے مجھے اندر جانے سے روک دیا۔“ تانیہ نے تاسف بھر میں کہا۔

”تم اسے دیکھو گی تو تمہیں شدید تکلیف ہو گی۔ میں جاہتا ہوں کہ تم دیکھنے سے پہلے میری ہو۔“

”اندر ہے کون؟ آخز کچھ پڑتے تو پڑے۔“

”تمہارا بھائی محسن راؤ۔“ اس نے بہت سادگی سے جواب دیا۔

”اندر میرا بھائی ہے، وہ مجھے مدد کے لئے پکار رہا ہے اور آپ مجھے اندر جانے سے روک رہے کیا ٹلم ہے۔ مجھے اندر جانے دیں۔ میں اپنے بھائی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔“ وہ بے ہمتی ہو کر بہا

”تمہارا بھائی اندر جس حالت میں ہے، اسے دیکھ کر تمہیں دکھ ہو گا۔“ کالا چراغ نے

میں کہا۔

”آپ مجھے اندر جانے دیں۔“ تانیہ نے خدکی۔

”تم اندر نہ جاؤ، میرے ساتھ آؤ۔“ وہ جانے کے لئے مڑا۔ ”وہ کسی کی قید میں ہے۔؟“

”قید میں؟“ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کس نے قید کیا ہے، میرے بھائی کو؟“

”باقا نے۔“ کالے چراغ نے قید کرنے والے کا نام بتایا۔

”باقا، یہ کس قسم کا نام ہے۔ کون ہے یہ باقا؟“

”سب میں کھڑے کھڑے معلوم کر لو گی، یا میرے ساتھ کہیں چل کر بیٹھو گی۔“

”مجھے کہاں جانا ہو گا؟“

”میرے ساتھ، میری بستی میں۔“ اس نے جھونپڑی کے ایک جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”تانیہ کا اگرچہ جانے کوئی تو تمیں چاہے رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کا نام سن کر بے کل ہو گئی تھی۔“ وہ

جھونپڑی میں گھس کر اپنے بھائی کو دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اپنے بھائی کی خاطری تو اس نے یہ اسرار سفر اعیانہ لیا تھا۔ لیکن کالے چراغ نے جس انداز میں گھنٹوگی تھی اس سے معاطلے کی عینی کا پتہ چلتا تھا۔ لہذا اس

نے سوچا کہ خد کر کے معاملے کو گھاٹنے سے بہتر ہے کہ وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ کالا چراغ

سے کچھ بیانا چاہتا تھا تو کیوں نہ اس کی بات سن لی جائے۔ آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

”وہ اس کے پچھے چل پڑی۔“

کالا چراغ جھونپڑی کی پشت پر پچھنچ کر، جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر جا کر رک گیا۔ کھڑے ہو کر اس نے

پہنچ دی تو دونوں ہاتھ پر ہو کی طرح پھیلائے۔ سورج کی طرف اس کی پشت تھی۔ زمین پر اس کا لباس سا سیاہ

ڈپ رہا تھا۔ ہاتھ پھیلایا کر اس نے تانیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ترش، میرے سامے میں آجائو۔“

تانیہ جیسے ہی اس کے زمین پر پڑتے سامے میں داخل ہوئی۔ اسے شدید حدت کا احساس ہوا۔ جیسے

ہ کبھی میں جھونک دی گئی ہو۔ یہ احساس چند یکنہوں کا تھا۔ جیسے ہی اس کے حواس بحال ہوئے تھے

لے نے خود کو ایک گھنٹر میں پایا۔ جہاں وہ کھڑی تھی، وہاں سے بیڑھیاں شروع ہو رہی تھیں۔ یہ

میں میں نیچے اتر رہی تھیں میڑھیوں کے آخر میں اسے ایک در ساقظر آ رہا تھا۔

کالا چراغ آہستہ آہستہ وہ بیڑھیاں اتر جا رہا تھا۔ چند بیڑھیاں اترنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا

تائیہ ابھی اپر ہی کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ دیا اور بولا۔ ”آؤ۔“

تانیہ اس کی تقیید میں بیڑھیاں اترنے لگی۔ یہ بیڑھیاں کافی گرائی میں پیچے تک چلی گئی تھیں۔

میں میں اتنی چوڑی تھیں کہ چار پانچ آدمی بیک وقت اتر سکتے تھے۔ بیڑھیوں کے دونوں طرف پھر ہوں کی

لے چڑا دار دکھائی دے رہا تھا۔

کالا چراغ اس در میں داخل ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ تانیہ اس سے آٹھ وس بیڑھیاں اپر تھی۔ جب

وہ کامنے پہنچی تو کالا چراغ اس کا غنٹھر تھا۔ جب وہ در میں داخل ہو گئی تو کالا چراغ پھر چل

پڑا۔

در میں داخل ہو کر تانیہ کو ایک خونگوار حیرت کا احساس ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ در میں داخل تو آگے گھب اندر ہوا ہو گا۔ اور وہ کسی غار نما پیز میں داخل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر ایک محربی دروازہ تھا اور دروازے کے دونوں بھاری پٹ کلٹے تھے۔

یہ کسی محل کا سادہ دروازہ تھا۔ کلٹے دروازے میں سے اسے ایک خوبصورت فوارہ اور پس منہ پھرولوں کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اور اس کے سامنے ایک خوبصورت باغ پھیلا ہوا تھا اور بت گرے رنگ کا آسمان نظر آ رہا تھا۔

جب تانیہ دروازے سے گزر کر اندر پہنچنی تو اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بڑے میدان میں آ گئی۔ سامنے ایک بڑی عمارت تھی۔ اس کے بعد وہی در تھے۔ یہ شاید گھروں کے دروازے تھے۔ ہا طرف اسی طرح کے گھر تھے اور در میان میں ایک بہت خوبصورت سرسبز باغ تھا۔ ابھی تک اسے ایک بھی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ کالا چراغ سامنے والی بڑی عمارت کی طرف تھا۔

"اتنی بڑی جگہ، اتنی خوبصورت جگہ اور ایسی دیران۔ آدمی تو اس تو کوئی پر نہ بھی نہیں دے رہا۔" تانیہ نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پر جنگل لجیں لجیں کہا۔

"دیکھا چاہتی ہو؟"

"ہاں، دیکھا چاہتی ہوں۔ یہاں کچھ ہے دیکھنے کو۔"

"بہت کچھ ہے۔" کالے چراغ نے مسکرا کر کہا۔ "اپنی آنکھیں بند کرو ذرا۔" یہ کہہ کے اپنے ہاتھ کا سایہ اس کے سرپر ڈالا۔ تانیہ نے اس کی ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کیں تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے گمراہ آنکھیں کھول دیں۔

اس نے بند آنکھوں سے ایک ہوش را مسکرا دیکھا۔ چاروں طرف بڑی چگادڑیں نظر آئیں۔ رہی تھیں اور کچھ ایسی لکھی ہوئی تھیں۔ ہمکی روشنی تھی۔ ایک بہت بڑا غار نما ہاں ساتھا۔ آنکھیں کھولیں تو پھر وہی خونگوار مظہر تھا۔ چمکیلی دھوپ، خوبصورت سا باغ۔ چاروں طرف در اور بالکل سناثر۔

"یہ کیا تھا؟" تانیہ نے جیران ہو کر پوچھا۔

"اپنی آنکھیں دوبارہ بند کرو۔" کالے چراغ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ہا اور اس مرتبہ اس نے اپنے ہاتھ کا سایہ اس کے سرپر ڈالا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ تانیہ نے اس کی ہدایت کے مطابق ڈرتے ڈرتے دوبارہ آنکھیں بند کیں تو اسے اندر ہرے کے نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور یوں۔ "اب تو کچھ نظر نہیں آیا۔"

"پھر دیکھا چاہتی ہو؟" کالے چراغ نے مسکرا کر پوچھا۔
"نہیں۔" تانیہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "لیکن یہ تھا کیا؟"
"آؤ، میرے ساتھ۔" کالا چراغ آگے بڑھنے لگا۔ "اور اس منظر کو فریب نظر سمجھ کر بھول جاؤ۔ آئندہ اس طرح کی فرماں ذر اسوق بھج کر کرنا۔ یہ ہماری بُتی ہے، ہماری دنیا ہے۔ یہاں وہ ہوتا ہے جو دہان نہیں ہوتا۔"

پڑھنی وہ کیا کہہ رہا تھا، اسے کیا سمجھانا چاہتا تھا۔ تانیہ نے اس سے الجھا اور خاموشی سے اس کے پیچے چلے گئی۔
فوارے سے گزر کر وہ لوگ بڑی عمارت کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ بڑے سرخ پتوہوں کی نیلت تھی۔ بالکل سیاہ چمکیلا دروازہ تھا اور اس پر جا بھائیں کی میخنگی ہوئی تھیں۔ اسی بڑے دروازے میں ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ کالے چراغ نے چھوٹے دروازے کو پیچے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ وہ اس دروازے میں داخل ہو گیا اور تانیہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے پیچے پیچھے دروازے میں داخل ہو گئی۔

اس عمارت میں بھی سناتھا تھا۔ ایک ٹھنڈی بھی اسے نظر نہیں آیا تھا لیکن اب اس میں کوئی سوال کرنے کی بہت نہیں تھی، جانے جواب میں چراغ اسے کیا دکھا دے۔ وہ خاموشی سے اس کی تکلید کرتی رہی یہاں تک کہ وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

ایک کمرے اس نے تاریخی ذر اموں میں دیکھے تھے۔ ایسا کمرہ کسی بادشاہ یا لکھ کا ہوتا تھا۔ اپنی اونچی مسینی سرسراتے ہوئے بڑے بڑے پر دے۔ جھاڑ فانوس، حسین قالین..... کمرے میں داخل ہو کر کالے چراغ نے اسے ایک مرصع کری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی وہ دوسرا کری پر بیٹھ گیا۔ "تم نے اونچی پر ایک تکادری نے والا طویل سفر کیا ہے۔ کچھ دیر آرام کرلو۔ میں تمارے ناشتے کا بندوست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ انھر گیا اور اس کا جواب نے بغیر کمرے کے اندر وہی دروازے سے باہر چلا گیا۔

وہ واقعی بہت تھک گئی تھی۔ اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ بھوک سے زیادہ اسے نیند ستاری تھی۔ وہ کری سے انھر کر ایک کوئی میں پڑے بڑے سے پھر کھٹکی طرف بڑھی۔ اور جب وہ اس پر لیٹی تو ایسا لکھیے گلاب کی پتیوں پر لیٹ گئی ہو۔ اس قدر نرم ملائم بستر تھا۔ اس کے تکٹے مٹک رہے تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں بند ہوئے گئیں۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی کیونکہ کالا چراغ ناشتے کا بندوست کرنے گیا تھا۔ وہ آتائی ہو گا۔ لیکن نیند نے اسے مزید کچھ سوچنے کی مدد نہ دی، اسے اپنے آنکوش میں لے لیا۔

کالا چراغ جب ناشتے کی کشٹی لے کر آیا تھا لیکن تانیہ گھری نیند سوچکی تھی۔ کالے چراغ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ سوئی ہوئی تانیہ کو دیکھا۔ کشٹی میز پر رکھی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر باہر کل کیا۔

کری پر بیٹھ گئی۔ اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اب اسے شدت کی بھوک لگ رہی تھی۔
”اب تم کیا کھاؤ گی؟“ کالا چاغ انھ کر میری طرف بڑھا۔ ”ناشیت اور دوپھر کے کھانے کا وقت تو
نکل چکا ہے۔ اب تو شام کی چائے کا وقت ہے۔“

”میز پر اتنا کچھ موجود ہے۔ کچھ بھی کھالوں گی۔ آپ فرم دندنہ ہوں۔“
”کھانا لائے ہوئے بھی کئی گھنٹے ہو گے۔ دیکھ لو، مختدا تو نہیں ہو گیا۔“

”کوئی بات نہیں، جیسا بھی ہے، میں کھالوں گی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ڈوکے کا ڈھکن اٹھایا تو
کھانے سے بھاپ انھ رہی تھی۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”ارے، یہ تو بالکل گرم ہے۔ کیا آپ دوبارہ
لائے ہیں۔“

”نہیں تو، دوپھر ہی کو لا یا تھا۔“ کالے چاغ نے مخصوصیت سے کہا۔

تانية نے اپنے مطلب کا کھانا طشتی میں نکالا اور کھانے لگی۔ کھانا ہست مزیدار تھا۔ اسے فوراً دردناہ
باد اگئی اس کے پکائے ہوئے کھانے بھی بہت مزیدار ہوتے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے چائے
پی۔ یہ چائے تو صبح کی تھی لیکن ابھی تک اس قدر گرم اور تازہ تھی جیسے ابھی دم دی گئی ہو۔ تانية نے
کالے چاغ کو چائے کی پیٹھکش کی لیکن اس نے یہ کہہ کر انھ کا رکر دیا۔ ”میں چائے نہیں پیتا۔“

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد کالے چاغ نے برتن اٹھائے۔ تانية نے چاہا بھی کہ وہ اُن
سے کہے۔ ”برتن میں رکھ آتی ہوں۔“ لیکن وہ یہ بات کہہ نہ سکی۔ کالے چاغ نے سارے برتن
ایک ساتھ اٹھائے اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس کی غیر موجودگی سے فائدہ انھ کرتانیہ نے اپنے سر سے تویہ کھولا اور اپنے بال سلجنے لگی۔ پھر
اس نے اپنے بال باندھے اور آرام سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

یہ کیا ظالم تھا۔ یہ کیسی ہوش ربا استان تھی۔ وہ کماں پہنچ گئی تھی۔ وہ گھر سے اپنے بھائی
محن را ذکر ملا۔ ملا کا عزم لے کر نکل تھی۔ ایک ہی رات میں، وہ اپنے بھائی کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ وہ
بھپنہی میں گھر کے ساتھ دیکھنا چاہتی تھی لیکن کالا چاغ وہاں ظالم سماج بن کر پہنچ گیا تھا۔ اسے ملنے سے
روک دیا تھا۔ جانے اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ شاید محن بھائی کے
بارے میں کچھ باتانا چاہتا تھا۔ ابھی تک تو اس نے کچھ بتایا ہی نہ تھا۔ پھر اسے اپنے اس خیال پر خود ہی نہیں
آئی۔ وہ بے چارہ کس وقت بات کرتا، وہ بھر تو وہ سوقی رہی تھی۔

اس وقت وہ بالکل چاق دچوپڑتھی۔ ذہن پر سکون تھا۔ اب وہ واپس آئے تو اس سے پوچھتے گی کہ
مالک کیا ہے؟ اس کا بھائی جھونپڑی میں کیوں ہے؟ وہاں ایسی کس حالت میں ہے کہ اسے ایک نظر دیکھنے
میں نہیں دیا گیا۔

”کوئی بھرپور اس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن وہ واپس پہنچ کر نہیں آیا۔ وہ انھی اس نے سوچا بہر نکل کر
بیچ گئے۔ باہر بہت خوبصورت باغ تھا۔ شام کا وقت ہے۔ ذرا وہاں جا کر شملے۔ اس نے دروازہ کھول کر
اپنے لئے کو شش کی لیکن دروازہ نہ تھا۔ شاید باہر سے بند تھا۔ پھرہو اندر ہوئی دروازے کی طرف بڑھی

تانية بہت تھکی ہوئی تھی۔ وہ سہ پر تک سوتی رہی۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آ
ایک غیر مانوس سے کمرے میں پا یا۔ اس کی نظر سب سے پہلے چھت پر لٹکے بڑے سے فانوس پر ہے
پھر اس نے چھپر کھٹ کو دیکھا۔ حواس بحال ہوئے تو اسے یاد آگیا کہ وہ کماں ہے۔

اسے سوتے ہوئے شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہڑدا کر انھی۔ سامنے میز پر کئی کھشیاں رکھی تھی
وہ میز کے نزدیک گئی تو اس نے دیکھا ایک کشٹی میں ناشتے کا سامان ہے۔ دوسری کشٹی میں کھلانا
تیری کشٹی میں کچھ بچل ہیں۔ ایک کشٹی میں پانی اور گلاس رکھے ہیں۔

تب اسے احساس ہوا کہ ناشتے اور دوپھر کے کھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ سونے سے اس
اعصاپ پر سکون ہو گئے تھے۔ اب وہ چاہ رہی تھی کہ باہر روم میں جا کر نہاد ہو لے۔ اور کپڑے ن
کر لے۔ اس نے اپنے بیگ سے کپڑے نکالے اور کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی کہ
روم کس طرف ہے۔

ابھی وہ اندازہ ہی لگا رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور کالا چاغ اندر داخل ہوا، وہ اسے کھڑا ہوا دیکھ کر
اور بولा۔ ”کماں جانا چاہتی ہو؟“

”وزارمنہ ہاتھ دھوکر تازہ ہوتا چاہتی ہوں۔“
”وہ سامنے چلی جاؤ۔ پردہ ہٹاؤ گی تو دروازہ نظر آجائے گا۔“ کالے چاغ نے ایک طرف
کیا۔

اس کے اشارے کے مطابق جب اس نے پردہ ہٹایا تو وہاں واقعی ایک دروازہ موجود تھا۔ وہ ”
کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

اندر داخل ہو کر جب اس نے دروازہ بند کیا اس کی آنکھوں میں جیت بھر گئی۔
ہر طرف وہ ہی وہ نظر آرہی تھی دائیں، بائیں، سامنے، پیچے، چھت پر، فرش پر کماں نہیں

وہ نظر کیسے نہ آتی۔ ہر طرف آئینے لگے ہوئے تھے۔ چھت اور فرش پر بھی آئینے تھے۔ غریب
دروازے کی پشت پر بھی آئینے تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد شیشے کی دیوار میں گم ہو گیا تھا۔ یہ ایک
خوبصورت حمام تھا۔ فرش پر ایک حوض تھا۔ جس کی لمبائی چھٹ فٹ اور جوڑا ایک چار فٹ بھر ہو گی۔
اس کی گمراہی بھی چار سے چھٹ فٹ تھی۔ اس حوض کی سطح میلے رنگ کی تھی، اس لئے حوض اور اس کا
نظر آرہا تھا۔ ورنہ آئینوں کی وجہ سے اتنے عکس دکھائی دے رہے تھے کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ
چیز کس جگہ ہے۔

جب وہ اس آئینہ حمام سے نہا کر باہر نکلی تو بالکل فرش ہو چکی تھی۔ کالا چاغ کمرے میں
تھا۔ تانية اس وقت اس ترو تازہ گلاب کی مانند لگ رہی تھی جس پر شنم کے قطرے پڑے ہوں۔
حسن مہوت کرنے والا تھا۔ کالا چاغ اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
تانية نے اپنے کھلے بالوں میں تویہ لپیٹا ہوا تھا۔ وہ اس کی پر شوق نگاہوں کو نظر انداز کرتے۔

”آپ مجھے اخواز دیتے۔“ تانیہ نے کہا۔

”تم بہت گھری نیند میں تھیں، جی نہ چالا کہ تمیں اخوازوں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔ کھانا کھایا۔ اور جو ہدایت کی ہے اس پر عمل کرنا۔ ویکھو پھر سمجھاتا ہوں۔ باہر مت جھا نکنا اور نہ باہر کی آوازوں پر دھیان دیتا۔ آف، روازہ اندر سے بند کر لو، اگر روازے پر دستک ہو تو ہرگز مت کھولنا۔ دستک و نینے والا میں نہیں ہوں گا۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔“ ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کہے کہ اندر ورنی روازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

تانیہ نے اس کے جاتے ہی روازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ روازہ بھی بند کر لیا جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔ پورے اچھی طرح گرانے۔ کالا چراغ اسے اچھا خاصاً سارا گیا تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب اسے بھوک محسوس ہوئی۔ وہ میرے نزدیک کریمیت کر بیٹھ گئی۔ کھانا بھی تسلی گرم تھا بلکل اس طرح جیسے ہات پاٹ میں رکھا ہو، کھانا بت مزیدار تھا، اس نے سیر ہو کر کھایا اور پھر کمرے میں چل تدی کرنے لگی۔ وہ بارہ بجے تک شملی رہی۔

شلٹے شلٹے اپاٹک اسے ڈائری کا خیال آیا۔ وہ گھر سے ڈائری لے کر چلی تھی۔ اس نے اپنے بیگ میں سے ڈائری نکال لی اور مرصع کری پر بیٹھ کر ایک ایک ورق اتنے لگتی۔ وہ ایک ایک صفحہ اتنی جاتی تھی اور اپنے بھائی کے بارے میں سوچتی جاتی۔ لیکن کچھ نہ ہوا، کوئی تحریر نہ دکھائی دی۔ ماہوس ہو کر اس نے ڈائری بیگ میں ڈال دی۔

اور پھر بستر پر بیٹھ گئی۔ کھانا اس نے خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔ کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ سوچنے کو بہت کچھ تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔

ابھی وہ اچھی طرح سوبھی نہ پائی تھی کہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے غواب دیکھا ہے یادہ سب کچھ اس نے جائی گئے میں دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ وہ کسی کھنڈر میں پھر پر لیتی ہے۔ چاند پورے شباب پر ہے۔ اور ہر طرف چگاڑیں اڑ رہی ہیں بڑی بڑی چگاڑیں۔ ایک دو چگاڑیں اس کی طرف بھی لپکیں۔ تجھی اس کی آنکھ کھل گئی۔

یہ کیا بھی انک خواب تھا۔ یہ ایسا بھی انک خواب تھا کہ وہ جب بھی سونے لگتی یہ خواب اسے نظر آئے لگتا۔ آنکھیں کھولتی تو باہر سے عجیب عجیب آوازوں آنے لگتیں۔ کبھی کہتے ہوئے رہتے ہوئے۔ کبھی بیان لڑائی ہوتی۔ کبھی الوبول رہتے ہوئے۔ کبھی گیدڑ کی آواز سنائی دیتی۔ یہ آوازوں کبھی بھکی ایک مصیبت تھی۔ وہ سوتی تو بھی انک خواب اس کی آنکھوں میں اتر آتا اور جاگ جاتی تو باہر کی ڈراؤنی آوازوں سنائی دیتے لگتیں۔

جس سے کالا چراغ اندر گیا تھا اور پھر واپس نہ پلٹا تھا۔ یہ دروازہ بھی بند تھا۔ یہ دروازے بند کیوں ہیں؟ کیا اسے قید کر دیا گیا ہے۔ اس تصور پر وہ نہیں۔ وہ کوئی شنزادی تھی ہے جسے کوئی جن یادیو اپنے محل میں قید کر لے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ شنزادی نہیں ہے لیکن یہ بھی میکس کہ وہ کسی شنزادی سے کم نہیں۔ اس کا صحن کہ قاف کی پیوں کو بھی مات دینے والا تھا۔ پھر کالا چراغ جن نہ سی لیکن جن جیسی چیز ضرور تھا۔ عجیب شخصیت تھی اس کی۔ کہیں وہ اس کو بند کر کے تو نہیں کیا۔

پھر اس نے پر وہ ہٹا کر ایک در تچے سے جھا لکا۔ یہ عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ اوپرچے درخت اور میان میں گھاس پچھی ہوئی۔ گھاس کے ساتھ کناروں پر پھولوں کی کیا ریاں تھیں۔ اور کچھ فائلے ایک درخت کے بعد وہ سراورخت تھا۔ یہاں بھی اسے کوئی جاندار نظر نہ آیا، نہ انسان، نہ چمند پرندہ تک سنا تھا۔ ایک عجیب طرح کی خاموشی تھی جیسے چند لوگوں بعد ہی کوئی بم پھٹ جائے گا۔ وہ اس کر کے میں، کالا چراغ کے انتظار میں یونہی گھومتی، میٹھچن اور شلتی رہی گروہ نہ آیا۔ یہاں تک کہ شام گھری ہونے لگی۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور کالا چراغ پر گھری اداسی لئے اندر داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں بڑی کشتی تھی جس میں کھانا کھا ہوا تھا۔ اس نے میز پر رکھ دی۔

تانیہ کھانا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ”اتھی جلدی کھانا؟“

”تم کھانا دیکھ کر پریشان مت ہو۔ جب تم راجی چاہے، کھانا۔ یہ اسی طرح گرم رہے گا۔“ ہے۔ کھانا میں اس لئے اس وقت لے آیا ہوں کہ میں اندر ہرا ہونے سے پہلے ہیاں سے چلا جاؤں! پھر میں صبح آؤں گا۔ جانا میری مجبوری ہے۔ تم بے فکر ہو۔ کھاؤ پیٹپا اور آرام کرو۔ صبح میں آؤں تھمارے بھائی سے متعلق ہر سوال کا جواب دوں گا۔ میں تمیں اس کی زندگی کی کمائی سناؤں گا!“ اب میں چتا ہوں۔ بس تم ایک بات کا خیال رکھنا۔ اس کر کے سے باہر نکلنے کی کوشش مت رکھو۔ پھر اسے ہٹا کر باہر جانا بھی مت۔ ہو سکتا ہے تمیں کئی ایسا منظر نظر آجائے جو تھمارے ہوش دھکم کر دے۔ باہر سے سنائی دینے والی آوازوں پر بھی دھیان مت دیتا۔ اب یہ ٹھاؤ کر کے میں شہر کروں یا قافوں۔ میں فانوس روشن کئے رہتا ہوں۔ شمع کی روشنی ہلکی رہے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے اشارہ کیا اور کر کے میں لکھے تینوں فانوس تیزی سے جل اٹھے۔ کہا اچھا خاصاً روشن ہو گیا۔

”آپ صبح کئے بے آئیں گے؟“ تانیہ نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

”سورج کی پہلی کرن کے ساتھ، میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ کاملے چراغ نے بتایا۔

”میں اپنے بھائی کے بارے میں جلد از جلد سب کچھ جانا چاہتی ہوں۔“ وہ بے جھٹا بولی۔

”بہن ایک رات کا انتظار اور۔ صبح میں سب کچھ جاؤں گا۔“ جاتا میں آج بھی دیتا گریتا۔ آیا، تمیں سوتا ہوا پایا۔“ کاملے چراغ نے وضاحت کی۔

نہیں۔ ناشتے کرو۔ ”کالے چراغ نے گول مول سا جواب دیا۔
”آپ سمجھ میں نہ آئے والی باتیں بہت کرتے ہیں۔ کیا آپ کو دسرے کو الجھا کر بہت مزہ آتا ہے۔“

”میں کسی کو کیا الجھاں گا۔ میں خود ایک طویل عرصے سے الجھا ہوا ہوں۔“
”آپ کو کس نے الجھایا ہے؟“ تانیہ نے ٹوٹ پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔
”بقال نے۔“

”یہ بقال آخر کیا بلا ہے؟ آپ نے کل بھی اس کا ذکر کیا تھا؟“
”اسے بلانہ کہو میں اس پر مرتا ہوں۔“
”مرتا ہوں؟“ تانیہ ذرا سبھل کر بیٹھ گئی۔
”ہاں، مرتا ہوں مگر افسوس وہ کسی اور پر منت ہے۔“
”کس پر۔“

”تمہارے بھائی حسن راؤ پر۔“

”یہ کیسا مرنا ہے کہ وہ ان پر منت بھی ہے اور انہیں قید بھی کر رکھا ہے۔“
”یہی تو الیہ ہے..... اور یہی سب بتانے کے لئے تمہیں یہاں لایا ہوں۔“
”تو پھر بتائیے۔ میں سننے کے لئے بے تاب ہوں۔“

”تم اپنے بھائی حسن راؤ کے بارے میں کتنا جانتی ہو؟“

”اتا جانتی ہوں کہ میرے بھائی حسن راؤ کو جب وہ بارہ، تیرہ یا تیرہ چودہ سال کے تھے تو میرے پچاراؤ ہجوم علی نے ٹھکار کیلئے ہوئے انہیں اغوا کروالا یا تھا اور انہیں جان سے مرداویا تھا۔ میرے والد کو قتل کرنے سے پہلے راؤ احمد علی نے یہی بتایا تھا کہ وہ حسن راؤ کو قتل کروچکا ہے۔ لیکن میرا بھائی تو آج تک زندہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ راؤ احمد علی کو کوئی غلط فہمی ہوئی۔“

”نہیں، غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اسے اس کے لوگوں نے یہی بتایا کہ وہ اس کے حکم کے مطابق قتل کر آئے ہیں۔ اس کے لوگوں نے حسن راؤ کی لاش کے ٹکڑے ویکھے تھے۔“

”میرے بھائی کی لاش کے ٹکڑے۔“ تانیہ نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں، تمہارے بھائی کی لاش کے ٹکڑے جو ایک ایک کر کے ان لوگوں کے سامنے گرے۔“
”پھر میرا بھائی زندہ کیسے ہے۔“ تانیہ فکر مند ہو گئی۔ ”کیا اس جھونپڑی میں میرے بھائی کے علاوہ کوئی اور ہے۔“

”کوئی اور نہیں، وہ تمہارا اپنا سماں بھائی حسن راؤ ہے۔“ ٹھہرو، میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔“
کالے چراغ نے گمراہ اس انسان سے کہا۔ ”تمہارا بھائی لاہور کے ایک بست اپنے اسکوں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس وقت وہ انٹھوں یا نینیں کلاس میں تھا۔ وہ ایک دین اور تیر طرار لڑ کر تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے بہت کچھ یکھ لیا تھا۔ گاؤں کی زندگی سے اسے عشق تھا۔ شکار کا سے جنون کی حد تک شوق

بس اسی طرح آنکھوں میں رات کث گئی۔ صبح ہوئی تو اسے نیند نے آب دوچا۔
اس وقت وہ گھری نیند میں تھی جب کوئی دروازے پر مسلسل دستک دے رہا تھا۔ دستک کی آواز بمشکل آنکھ کھلی۔ اس نے کلائی پر بندھی اپنی گھری پر نظر ڈالی۔ سات نج رہے تھے۔
وہ فوراً اٹھ کر گھری ہو گئی۔ دروازے پر یقیناً کالا چراغ ہو گا۔

دروازے پر کالا چراغ ہی تھا۔ وہ دن نکتے ہی اپنے وعدے کے مطابق اس کے کمرے میں آگیا تھا۔
تانیہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں لال لال ڈورے پڑے ہوئے تھے جو اس کو
آنکھوں کو بے حد پر کشش بنا رہے تھے۔ خوبصورت لشلی آنکھیں۔ وہ ان آنکھوں کو بغور دیکھنے لگا۔
اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر تانیہ نے بھائی لی اور بولی۔ ”رات میں ایک منٹ نہیں،
سکی۔“

”جانوروں کی آوازوں سے ڈلتی رہیں؟“ کالے چراغ نے پوچھا۔

”جانوروں کی آوازوں سے اتنا ڈر نہیں لگتا چنگا دڑوں سے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ایک دم چونک گیا۔

”محبے جب بھی نیند آتی ایک بھی ایک خواب ویکھنے لگتی جیسے میں کسی ہندریں پتھر پر لیٹی ہوں۔ او
بڑی بڑی چمگاڑیں اور ہرا ہرا اڑتی پھر رہی ہیں۔ ایک دوسری طرف بھی لپکنی محسوس ہوتی۔“ تانیہ
باتا یا۔

”اوہ۔“ کالے چراغ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”اصل میں غلطی مجھ سے ہو گئی۔“ مجھے اس بات کا خدا
ہی نہ رہا۔“

”کیسی غلطی؟ کس بات کا خیال؟“ تانیہ اس کی بات سمجھنے لگی۔

”بس ہو گئی ایک غلطی۔“ کالے چراغ نے بات کو تالئے ہوئے کہا۔ ”آج کی رات تمہیں
خواب ہرگز نہیں دکھائی ونے گا۔“

”چلیں، ٹھیک ہے۔“ تانیہ نے بھٹکنے مناسب نہ سمجھا۔

”اب تم جا کر منہ باٹھھ وھولو، میں تمہارے لئے ناشتے لے کر آتا ہوں۔“ پھر اطمینان سے پہنچ
بات کریں گے۔ ”یہ کہ کہ کالا چراغ انٹھ گیا اور اندر فونی دروازے سے باہر نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد تانیہ نے پردہ ٹھاکر باہر جھاٹکا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہ اندر حمام میں
گئی۔ اس نے اطمینان سے منہ باٹھھ وھولو اور باہر آگئی۔

اہمی وہ کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ کالا چراغ کشی اٹھائے اندر واخل ہوا۔ اس نے کھٹکی میز پر کم
ناشتے کے لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔

”مجھے بڑی شرم دیگی ہوئی ہے کہ آپ میرے لئے ٹرے اٹھا کر لاتے ہیں، کیا اس محل نما عمارت
ایک بھی ملازم نہیں؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”یہاں بہت لوگ ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو یہ کام کر سکے۔“ تمہیں شرم دنہ ہونے کی کلئی مزہ“

نہ کر کما۔
”میں نے تمہارا کیا بگڑا ہے۔ کیوں تم لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم بیری جان بخش دو، اس کے عوض تم جتنی رقم کو گے اپنے بیباے ولوادوں گا۔“
”رقم تو تم لے پکے ہیں۔“ ان میں سے ایک ڈاکوبولا۔ ”اور یہ رقم ہم نے تمہاری جان لینے کے لئے ہے۔ ہم اپنے کئے ہوئے سودے سے کبھی نہیں پھرتے۔ اب یہ تمہاری قسمت کہ جان لینے کا سروپا ہو گیا۔“

وہ چار تھے۔ چاروں کے چہرے پر ڈھائے بندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے وہ اس حق میں تھے کہ حسن راؤ کو فوراً گلویوں سے چھلکی کر دیا جائے۔ ایک کاخیال تھا کہ مارنے کے بجائے اسے یوں ہی بندھا ہوا چھوڑ دیا جائے۔ اس ویراں جنگل میں اس کی موت خوبخود ہو جائے گی۔ چوتھا انواع ڈول تھا۔ کبھی وہ سپنہ تک اسے فوراً مار دیا جائے۔ کبھی اسے اس کے بچے ہونے پر رحم آجاتا اور وہ اپنے اس ساتھی کا ہم زنا بن جاتا۔ جس کا خالی تھا کہ اسے بندھا ہوا چھوڑ کر چلا جائے۔

ابھی وہ چاروں اس مسئلے پر مشاورت کر رہے تھے کہ حسن راؤ زور سے بولا۔ ”بات سنو۔“
”وہ چاروں دور کھڑے تھے۔ اس کی آواز سن کر ایک اس کے نزدیک چلا گیا۔ ”ہاں، بولو۔“
”اب جبکہ تم مجھے قتل کیا ہی چاہتے ہو، کیا تم مرنے والے سے اس کی آخری خواہش نہیں پوچھو گے۔“

”ہاں، ہاں کیوں نہیں پوچھیں گے۔ بتاو، تمہاری آخری خواہش کیا ہے۔“
”میں اس شخص کا نام جانتا چاہتا ہوں جس نے تمیں اس کام پر لگایا ہے۔“ حسن راؤ نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، میں بتائے دیتا ہوں اس کا نام۔“ وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا نام راؤ احمد علی ہے۔“
”اے الله، میرا چچا۔“ حسن راؤ ٹھنڈی سائنس لے کر رہ گیا۔ ”اے الله، تو انصاف کرنے والا ہے۔“

وہ حسن راؤ کی بات سن کر مسکراتا ہوا اپنے ساتھیوں کے نزدیک آگیا۔
”کیا پوچھتا تھا۔“ ایک نے سوال کیا۔
”فائل کا نام پوچھ رہا تھا۔“ اس نے بتایا۔
”کیا تم نے بتا دیا؟“

”ہاں، میں نے بتا دیا۔ یہ اس کی آخری خواہش تھی۔ جو میں نے پوری کر دی۔“
”چلوپا اس کی آخری خواہش بھی پوری کر دی گئی۔ اب چھانی کی تیاری کرو۔“
”پلی گولی کوں چلاۓ گا۔“

تھا۔ اس کا نشانہ بست اچھا تھا۔ اس کے پاس اٹلی کی بنی ہوئی ایک دونالی بندوق تھی۔ اس بندوق لائن سن تو تمہارے والد کے نام تھا لیکن زیادہ تر استعمال محسن راؤ کر تھا۔ یہ بندوق، ساون پور کی جو میں ہی رہتی تھی۔ راؤ احمد علی کا چھوٹا نبیا اقبال راؤ اگرچہ اس سے عمر میں بڑا تھا لیکن اس کی دوستی، اسے زیادہ تھی۔ وہ دونوں ساون پور میں ہر جگہ ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

اس مرتبہ محسن راؤ، ساون پور آیا تو راؤ احمد علی نے اس کے لئے جال بن رکھا تھا۔ محسن راؤ، اس لئے خطرہ بنتا جا رہا تھا۔ بے چارے باپ نے تو اپنے بھائی سے کبھی حساب نہ مانا تھا لیکن بیٹا حساب ملے گا تھا۔ راؤ احمد علی نے سوچ لیا تھا کہ محسن راؤ کا اس مرتبہ مستقل حساب کروے گا۔ وہ جب ساون پور آتا تو اس کے ساتھ دو محافظ آتے تھے ان محافظوں کی موجودگی میں کوئی کھیل کھیلا آسان تھا۔ لہذا اس نے محسن راؤ کے لئے جنگل میں پھرستار کر دیا۔ شکار کا تو اسے شوق تھا ہی۔ اقبال راؤ۔ جب اسے یہ اطلاع دی کہ اس مرتبہ جنگل میں کچھ ہرن دیکھنے گئے ہیں تو یہ سن کر محسن راؤ دیوانہ ہو گیا۔ اس نے اب تک تیتر کا شکار کیا تھا۔ بڑے جانور کا شکار نہ کیا تھا۔ اس نے دوسرے ہی دن شکار پروگرام بنالیا۔ صبح سوریے ہی اقبال راؤ اور وہ، چند ملازمین کے ساتھ شکار پر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کام کے لئے دو جمپس مختبکی گئی تھیں۔ سب لوگ بیٹھے چکے تھے۔ محسن راؤ کے محافظوں کا انتقا تھا۔ پھر کسی نے آکر بتایا کہ وہ دونوں گھری نیند سور ہے ہیں۔ اٹھائے نہیں اٹھ رہے۔ دوسرے ملازمے نے بتایا کہ وہ جی رات بھر تاش کھلیتے رہے ہیں، صبح تر کے سوئے ہیں۔ اصل میں رات کو ان دونوں گوردووڑ میں انہوں نے ڈال کر دے دی گئی تھی۔ نینجے میں وہ اٹھنیلی ہوئے پڑے تھے۔ محسن راؤ کو جنگل میں ان کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ دونوں پر لعنت بھیج کر شکار پر نکل گیا۔

اقبال راؤ اپنے باپ کے ساتھ اس سازش میں شریک تھا۔ وہ محسن راؤ کو انہی راستوں پر لے گیا جائے راؤ احمد علی کے آدمی، ڈاکو کے بھیس میں چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ دونوں ان کی بھیخی میں آئے۔ ڈاکو گھوڑے دوڑاتے ہوئے باہر نکل آئے اور ایک ڈاکو نے اسے اٹھا کر گھوڑے پر لا دیا اور خود بھی ساہو گیا۔ پھر وہ چاروں ڈاکو محسن راؤ کو لے اڑے۔ اس طرح یہ انواع کا کھیل مکمل ہوا۔ بعد میں یہی ہے۔ لے کر آفتاب راؤ لاہور پہنچا، جسے سن کر تمہارے والد دیوانے ہو گئے تھے۔

جنگل میں کافی اندر جانے کے بعد وہ چاروں ڈاکو ایک جگہ ٹھرگئے۔ ایک ڈاکو نے محسن راؤ کو گھوڑے سے اتارا اور سامنے ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ محسن راؤ کی بھی گم تھی۔ اس کو معاٹے کی ٹکڑی کا حساس ہو چکا تھا۔ اب وہ پچھتارہ تھا کہ اس نے اپنے باپ کے کے پر عمل نہ کر کے کتنی غلطی کی۔ راؤ شمشاد علی نے اسے بدایت کی تھی کہ بغیر محافظوں کے نہیں نہ جانا۔ اگر شکار پر اس کے ساتھ اپنے عطا ہوتے تو اتنی آسانی سے اس کا انواع ممکن نہ تھا۔ خیراب جو ہوتا تھا ہو چکا تھا یا شاید ابھی نہیں ہوا تھا، ہوئے والا تھا۔ اسے درخت سے باندھ کر شاید وہ اسے شوٹ کرنا چاہتے تھے۔

”تم لوگ کون ہو؟ کیا جا چلتے ہو؟“ محسن راؤ نے گھبرا کر پوچھا۔
”هم لوگ تمہاری موت ہیں، تمہیں یہاں قتل کرنے کے لئے لائے ہیں۔“ ان میں سے ایک

”ہم اپنے جنادر سنگ جنگل پھر آئے ہیں۔ سب مارے کو راج مداری کھوئے ہیں۔“ اس نے اپنے بارے میں معلومات فراہم کیں۔

”اچھا مداری ہو۔ چلو پھر اوہر جو تماثا ہو رہا ہے۔ وہ ویکھ لو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔“

”اوی بھی کوئی کھیل ہوارے۔ دبوبک (بندوق) چلا کے مانس کی جان لے لی۔ کوتھم و کھائیں تماں۔“

”تم کیا تماشاد کھاؤ گے۔ کیا تم اس لڑکے کو بغیر ہاتھ لگائے ختم کر سکتے ہو۔“ ایک شخص نے مذاق کیا۔

”ہاں کر سکیں ہیں۔ ہاتھ لگائے ہوایا چھور اٹوئے ٹوئے ہو سکتا ہے۔“ راج مداری نے اس مذاق کو سمجھی گئی سے لیا۔

”ٹوئے ٹوئے ہاتھ لگائے بغیر..... یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ چاروں پریشان ہوئے۔

”تو پھر دکھاویں تماسا، سرو کریں کھیل۔“ راج مداری نے اپنے بندر کے سرپر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یا، اس کے چکر میں کماں آرہے ہو۔ اپنا کام کرو اور نکل لو۔“ ان چاروں میں سے ایک نے کہا۔ ”گولی مت چلانا۔“

”ایک جلدی کیا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ ہاتھ لگائے بغیر اس کے ٹوئے کر دے گا۔ فراہم بھی رکھ لیں اس تماشے کو۔ ہاں مداری اگر تم ناکام ہو گئے تو پھر کیا ہو گا۔“

”پھر کچھ نہ ہو گا۔ تمہاری دبوبک ہو گئی اور مارا سینہ۔“ راج مداری نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

”چلو، پھر ہو گئی بات۔ دکھاؤ اپنا جلوہ۔“

”اپنی لو۔“ راج مداری خوش ہو کر بولا پھر اس نے بندر کا ہاتھ پکڑ کر اسے زمین پر آتارا۔ بندر غاموشی سے ایک بجھے بیٹھ گیا۔

راج مداری نے اپنی لاٹھی سے ایک بڑا اور ایک کھینچا اور ان چاروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اس پکڑ کے اندر پیر مر رکھنا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ چاروں نے اقرار کر لیا۔

بڑھو راج مداری بڑے اور اسے کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ آتی پاتی مار کر اس نے سادھوؤں کی

ٹرح اکسن جیالی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے ان چاروں کوویکھا۔ اور پھر اپنی لاٹھی کو زمین پر پہنک دیا۔ وہ لاٹھی زمین پر گرتے ہی لبرگی۔ وہ لاٹھی موٹی رہی کی مشکل اختیار کر گئی تھی۔ اور وہ میرے دھرم سے اپر کی طرف بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ویکھتے ہی دیکھتے ہو اتنی بلند ہو گئی کہ اوپر کا سر انظروں سے غائب ہو گی۔

راج مداری کے اس تماشے ہی نے ان چاروں کو حیران کر دیا۔ آگے ابھی تو بت پکھہ ہونا تھا۔ راج

داری نے تباش اشارے سے کہا۔ ”چھوڑے کولاو۔“

”کیوں مارو ہو رے، اس چھوڑا کو۔“ اس کی آواز اس کی شخصیت کی طرح بھاری تھی۔

”تم کون ہو اور اس جنگل میں کیا کر رہے ہو۔؟“

”میں چلاوں گا۔“ پہلا بولا۔

”اور وہ سری گولی کون چلائے گا۔“

”دوسری میں چلاوں گا۔“ دوسرا بولا۔

”اور تیسری۔“ پہلے نے پوچھا۔

”یا، وہ گولیاں بہت ہیں، کیوں اپنی گولی ضائع کرتے ہو۔“ تیسرا نے رائے دی۔

”تم کیا کرتے ہو؟“

”یا، اس لڑکے پر مجھ سے گولی نہیں چلائی جائے گی۔“ چوتھے نے صاف جواب دیا۔ یہ چوتھا وہ جو اسے مارنے کے مجاہے بندھا ہوا چھوڑ کر پہلے جانے کے حق میں تھا۔

”اوے ہمی پر ہدو۔“ پہلے نے تیسرے اور چوتھے شخص کو اپنے سامنے سے ہٹایا اپنے کندھے سے بندوق اتاری تال کھول کر کارتوس چیک کیا۔ کارتوس موجود تھا، تال بند کر کے اس نے گھوڑا چڑھایا اور بندوق سیدھی کر کے اس نے محس راؤ کے ول کاشناہ لیا اور بولا۔ ”پہلی گولی میں چلا تھا۔ اور آخری بھی ہو گی۔ اسی گولی میں اس کا کام تمام ہو جائے گا۔“

نشانہ لے کر ابھی اس نے لبی پر انگلی و ہری ہی تھی، اور وہ اسے وباہی چاہتا تھا کہ کسی نے ایک دمبارہ لالہ کہا۔ ”گولی مت چلانا۔“

چاروں نے ایک ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔

آنے والا بڑا عجیب شخص تھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ سے اچاہک ہی باہر آیا تھا۔ جانے والا درخت کے پیچھے کب سے کھڑا تھا۔ وہ ایک کھایا پاہ موتا تازہ شخص تھا۔ اور کاوھر تھا۔ نیچے اسے ایک میالی سی وھوئی باندھ رکھی تھی۔ اس کے جسم پر بے پناہ بال تھے۔ گلے میں الو کا پنج، تعویزی کی طریکہ ہوا تھا۔ بڑی بڑی خوفناک موجیں سرمندا ہوا۔ اور پچھتا ہوا جیسے سرپر تیل چپڑ کھا ہو، کندھے پر بیٹھا۔ سرخ منہ والا بھجن، بندر بیٹھا ہوا تھا۔ بندر نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سرپر رکھے ہوئے تھے۔ اس میں ایک مضبوط لاٹھی۔ اسے ویکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کون ہے اور اس جنگل میں کیا کر رہے ہے۔

”یا، یہ بن مانس کماں سے آگیا ہے؟ کیا خیال ہے چلاوں اسی پر گولی؟“ پہلے شخص نے برا کھڑے اپنے دوسرے ساٹھی سے پوچھا۔

”بلوچہ اپنے سرخون لینے کا کیا فائدہ، اسے نزدیک آنے و پہنچنے تو طے یہ آخر کون ہے۔“ دوسرا

نے مشورہ دیا۔

اتھے وہ ان چاروں کے نزدیک آگیا۔ اس کے انداز میں ذرا اور خوف نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے ہوا اس شخص کے سامنے پہنچ گیا جو محس راؤ پر گولی چلانے والا تھا۔

”کیوں مارو ہو رے، اس چھوڑا کو۔“ اس کی آواز اس کی شخصیت کی طرح بھاری تھی۔

”تم کون ہو اور اس جنگل میں کیا کر رہے ہو۔؟“

”کچھ نہیں۔“ اپر سے محسن راؤ کی آواز آئی۔

”ٹھیک ہے۔“ راج مداری نے کہا۔ پھر وہ ان چاروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اب اصل تما
سر ہو دے ہے جراحت سے دیکھنا۔“

انہی دھوئی کا پتھ کھول کر اس میں لپٹا ہوا چاقو نکالا اور پھر دھوئی کس کر باندھ لی۔ چھانچ لبے پھل کا
چندار چاٹو کھول کر اس نے زمین پر کر دیا اور اپنے بندر کو اشارہ کیا۔ بندر چاقو اپنے منہ میں دبا کر ری پر
چڑھ گیا۔ واپس آیا تو اس کے منہ میں چاقو نہ تھا۔ وہ خاموشی سے راج مداری کے پاس بیٹھ گیا۔

راج مداری آنکھیں بند کر کے تینی سے کچھ پڑھنے لگ۔ کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو
اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خون اترنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اس قدر خوفناک نظر آرہی تھیں کہ ان
چاروں میں سے ایک کی بھی بہت نہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے۔

اب اس نے زمین پر اپنی الگی سے ایک لیکر کچھ پنچی اور بولا۔ ”سیدھا ہاتھ۔“

چند لمحوں میں سیدھا ہاتھ شانے سے الگ ہو کر زمین پر آگرا۔ ایسا لگتا تھا جیسے چاقو سے کاٹ کر نیچے
پینکا گیا۔ وہ خون آسودہ ہو رہا تھا۔

راج مداری نے زمین پر دوسرویں لیکر کچھ پنچی اور بولا۔ ”الٹاہا تھ۔“

چند لمحوں میں ہی الٹاہا تھ کٹ کر زمین پر آ رہا۔

پھر اس نے تیسرویں لیکر زمین پر کچھ پنچی اور حکم دیا۔ ”سیدھی ٹانگ۔“

سیدھی ٹانگ آنے میں چند سینڈنگ لگے۔

اس طرح چوتھی، پانچویں اور جھٹکی لیکر اپنی ٹانگ، سرادر پھر دھڑکت کر نیچے آگرا۔ وہ سراور جسم
کے اعتناء محسن راؤ کے ہی تھے۔ اس مظہر نے ان کی سی گم کر دی۔ وہ راج مداری کو محسن بندر کا تماثا
ملے والا سمجھ رہے تھے لیکن وہ تو ان سے برا قائل نکلا تھا۔ اس نے اپنے دعوے کے مطابق بغیر ہاتھ
کے محسن راؤ کے ٹوٹئے کر دیئے تھے جنہیں وہ چاروں اپنی آنکھ آنکھوں سے جیت زدہ ہو کر دیکھ رہے
تھے۔

”اب کھڑے کھڑے کا دیکھو ہو۔ جاؤ اپنارست پکڑو۔“ یہی صبح تاؤ دلا کر ہم سے خون کروادیا اور وہ
اچھوڑا کا۔ پہاڑا پکڑ کر وادیا بارے تم لوگوں نے۔ اب اپنی سخل گم کرو رے۔ مارے کو کہیں گستاخ
اچاؤ۔ پھر تم میں سے کوئی ادھر نوٹے نوٹے نہ جاؤ۔ جاؤ ہاگو۔“ یہ بات اس نے اتنے
زدہ کر کر دالے انداز میں کی کہ ان چاروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

دیے گئی وہ محسن راؤ کو قتل کرنے آئے تھے، وہ اسے گول مار کر قتل کرتے۔ اب وہ بغیر گولی کے ہی
ہو گیا تھا۔ قتل بھی ایسا کہ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ ایسی سفکی سے توہ بھی اسے نہیں مار
سکتے۔ اب یہاں رکنا فضول تھا۔ کیا پتہ یہ راج مداری واقعی غصے میں آجائے اور خواہ نجواہ ان میں سے
انوٹے نوٹے ہو جائے۔

چاروں نے ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں چلنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر وہ اپنے اپنے گھوڑوں کی

”اچھا۔“ پہلے شخص نے کہا۔ ”کیا اسے کھول کر لانا ہو گا۔“

راج مداری نے اشارے سے جواب دیا۔ ”ہاں، پھر تی وکھاؤ۔“

تب پہلے شخص نے اپنے دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ محسن راؤ کو کھول کر یہاں لے آئے
اس نے راج مداری کی طرف بندوق تان لی تاکہ کسی بھی گزیدگی صورت میں گولی چلا کر اس مداری
کیا جاسکے۔

راج مداری نے اس بات کی پرواہ کی کہ اسے نشانے پر لے لیا گیا ہے۔ وہ پورے آرام سے کہ
رہا۔ دائرے کے قریب جب محسن راؤ اور دوسرا شخص آگیا تو راج مداری نے محسن راؤ کو اندر آئے
کیا۔ محسن راؤ حیران پریشان دائرے میں آگیا۔ پھر راج مداری نے محسن کو قریب بلا کر آہستہ
سمجھایا اور واپس اپنی جگہ جانے کو کہا۔

”چھوڑے کا نام ہے تیرا۔“ راج مداری نے پوچھا۔

”محسن راؤ۔“

”اس رتی پر چڑھ کے ہے رے تو۔“

”ہاں، کیوں نہیں بنت آسانی سے۔“

”تو پھر چڑھ جا۔“

”راج مداری ایک بات یاد رکھنا، کوئی چالاکی دکھائی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔“ پہلے شخص۔

کی۔

راج مداری نے اس کی بات سنی ان سی کر دی اور محسن راؤ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چلو چھڑا
پکڑو اور اوپر چلو۔“

محسن راؤ نے اپنے جوختے اتارے اور رسی پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا۔

”چلو اور اوپر، اور اوپر۔“ راج مداری پڑا ہتھ دے رہا تھا۔

محسن راؤ رسی پکڑ کر تینی سے اوپر چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

”محسن اوپر پہنچ گیا رے۔“

”ہاں پہنچ گیا۔“ اور پس آواز آئی لیکن وہ دکھائی نہ دیا۔ وہ چاروں دم سادھے رسی کے

دکھ رہے تھے جس پر چڑھتے چڑھتے محسن اچانک غائب ہو گیا تھا۔

”اپنی کچھ اتار کر نیچے پھینک۔“ راج مداری نے حکم دیا۔

چند لمحوں بعد ایک قیس اور پس لرائی ہوئی زمین پر آگری۔ یہ محسن راؤ کی ہی قیس تھی۔

”پل اب بنیاں بھی اتار۔“

یہ حکم ملٹے ہی بنیاں بھی لرائی ہوئی نیچے زمین پر آگری۔ اس کے بعد راج مداری نے محسن

سلدے کپڑے ایک ایک کر کے نیچے ملگا لئے۔

”اب تیرے بدن پر کاہے رے چھوڑا۔“

لے گھن راؤ کو اپنا کیسے بنایا جائے۔ وہ چھوٹا ضرور تھا لیکن نادان نہ تھا۔ اب تو اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ س بیکار کی آڑ میں اس کے قتل کی سازش کی گئی تھی اور یہ سازش اس کے اپنے پچاراً او احمد علی نے کی ہے۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک ائمی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے پچا سے اس سازش کا بدلتے کر رہے گا۔

فی الحال تو اس جنگل سے نکل کر کسی طرح لاہور پہنچنے کا مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ اور راج مداری یہ سوچ رہا تھا کہ اس لڑکے کی روچ پر کس طرح بقدر کیا جائے کہ وہ سب کچھ بھول لے۔ اسے چھوڑ کر کہیں جانے کا نام ہی نہ لے۔

”چھورا تو کون ہے رے۔ یہ لوگ تو ہے کاں سے لائے۔“

جواب میں گھن راؤ نے غصہ را پنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ راؤ احمد علی اور ساون پور کے بارے میں کر راج مداری چوں گا۔ اس کا یہ نام کہیں سننا ہوا تھا۔ ساری کہانی میں کر راج مداری نے گھن راؤ کو لایا۔ اس نے کما کہ اب وہ بے فکر ہو گئے۔ اب اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ اس بیتی میں چلے۔ وہاں سے لاہور جانے کا بندوبست کرو یا جائے گا۔ راج مداری اگر اسے اپنے ساتھ لے جانے کی پیشکش نہ کرتا تو بھی اسی کے ساتھ جانا تھا۔ وہ اس جنگل سے اکیلا تو تکل نہیں سکتا تھا۔

یہ فوراً راج مداری کی پیشکش قبول کر لی اور اس کے ساتھ چل دیا۔

راج مداری نے وہاں سے تھوڑے سے تھوڑے سے فاصلے پر اپنا آسن جمایا ہوا تھا، وہاں بیٹھا وہ اپنے کسی عمل میں روک تھا۔ وہ گھن راؤ کو لے کر عمل والی جگہ پر پہنچا۔ رسیاں اس کے کنڈھے پر چڑھا ہوا تھا۔ وہاں زمین پہچکی کھالی پچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف جھوٹی رکھی تھی۔ کھال کے سامنے پانی سے بھری ایک چھوٹی باٹی دھری تھی۔ راج مداری نے گھن راؤ کو اس باٹی سے پانی پلایا۔ اور پھر پیچ کی کھال تھہ کر کے لیں ڈالی۔ جھوٹی اپنے لئھے پر لٹکائی۔ باٹی ہاتھ میں پکڑی۔ رسیاں کو کندھے پر چڑھا یا اور پھر تیز تیز سمت چل چڑا۔ گھن راؤ اس کے پیچے ہو لیا۔

کلی ڈیڑھ کھنکنے کی سرافت کے بعد جنگل سے نکل۔ جنگل سے نکل کر راج مداری نے اس سے ناہ۔ ”تھکا تو نہیں رے چھورا۔“

”نہیں، بالکل نہیں۔ میں تو اس سے زیادہ جنگل میں گھوم لیتا ہوں۔ شکار کے لئے تو بت چلتا پڑتا۔“

”بہت بڑھا۔“ راج مداری خوش ہو کر بولا۔ ”دیے ماری بستی اب جیا دہ دور ناہیں۔ وہ سامنے کاہل ہے پل اترتے ہی ماری بستی ہو دے۔“

راج مداری نے نمر کا پل وہ سامنے تھے اس طرح کہا تھا جیسے ایک ادھ فرلانگ کا فاصلہ ہو گا اس کا وہ نہ دو میل کے برابر ثابت ہوا تھا۔ خیر نمر کا پل پار کر کے گھن راؤ کو جھوپنے والوں پر مشتمل ایک بستی لگ دی۔ انہی جھوپنے والوں میں کچھ کچھ کے مکان بھی دکھلائی دے رہے تھے۔ راج مداری کامٹی کا بنا دو ہے۔ پھر جب انہوں نے گھن راؤ کے کلکڑے زمین پر گرتے دیکھے تو ان کے ہوش اڑکنے پھنس گئے۔ پھر جب انہوں نے گھن راؤ کے کلکڑے زمین پر گرتے دیکھے تو ان کے ہوش اڑکنے لوگ اپنے گھوڑے سریٹ دوڑاتے جنگل میں گم ہو گئے تھے۔ قاتل تو پڑے گئے تھے۔ لیکن اب

طرف بھاگے۔ کھلا کھٹ سوار ہوئے۔ اور انہیں ایز مر مار کر ہوا ہو گئے۔ جنگل میں کچھ دریا گھوڑوں کے تاپوں کی آواز گو نجتی رہی۔ پھر وہ محدود ہو گئی۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ چاروں دور جا چکے ہیں تو اس نے اپنی ران پر ہاتھ مار کر زور دار قہ اور پھر اپنے برابر بیٹھے بندر سے بولا۔ ”لارے رسیا چاکو۔“

وہ بے چارہ بندر بھی اتنی ویرے اپنے منہ میں چاقو ببابے پریشان ہو رہا تھا، اس نے فوراً سامنے آکر چاقو اپنے دانتوں سے چھوڑ دیا۔ راج مداری نے کھلا ہوا چاکٹا ہوا چاقو بند کیا اور اپنی دہ باندھ لیا۔ پھر اس نے زور سے آواز لگائی۔ ”آجارتے چھورا۔“

یہ آواز سن کر گھن راؤ جو ایک درخت کے پیچے چھپا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ ہشتاہو درخت کی او بہر نکل آیا۔ اور اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

اب نہ وہاں گھن کی لاش کے گلکوڑے تھے، نہ آسمان کی طرف جاتی رہی تھی۔ البتہ راج مداری زمین پر اسی طرح پڑی تھی جیسے اس نے بھیکی تھی۔

گھن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا طسم تھا۔ وہ جیران پریشان راج مداری کو دیکھ رہا تھا۔ اس بات کی خوشی تھی کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ کراچے کے قاتلوں سے راج مداری نے اسے پہا

بے تک جادو کے زور سے ہی سکی۔

راج مداری یہاں سے کچھ فاصلے پر بیٹھا آسن مارے عملیات میں مصروف تھا۔ اس کا بنا

درختوں پر اور حسرے اور ہر جھوٹا پھر رہا تھا۔ رسیا نے جب گھن راؤ کو درخت سے باندھتے ہوئے

فوراً راج مداری کے پاس پہنچا اور اپنے اشاروں سے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ راج مداری نے

اوھر کا تماشا دیکھا۔ اسے یہ سمجھنے میں ویرہ لگی کہ وہ لوگ کراچے کے قاتل ہیں اور اس لڑکے کو کوہ ہونے کا راہ رکھتے ہیں۔ راج مداری کو گھن راؤ چھاگا۔ اس کے کوئی بینانہ تھا۔ میں ایک لڑا

گھن راؤ سے ایک دوساری بڑی ہو گی۔ اس نے فوراً اسے اپنا بیٹا بنانے کا راہ دہ کر لیا۔

راج مداری نے بندر اور پیچھے ضرور پالے ہوئے تھے لیکن وہ گلی کچوں میں ریچھ بندر کا تماشا والوں میں سے نہ تھا۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ را جاؤں، تو بابوں، جاگیراں اور بڑے اوگوں کے

کیا کرتا تھا۔ جب کسی بڑے آدمی کو اپنے رشتے واروں، عزیزوں کو انوکھی تفریخ میا کرنا ہوتا

ہے مداری کو بلاؤ بھیجا۔ اس کا دوڑھائی گھنٹے کا تماشا لوگوں کو وہ بخوبی کر دیتا تھا۔

کافی عرصے سے وہ ایک دو گارکی تلاش میں تھا۔ اس کی لڑکی اب جوان ہو گئی تھی۔ راج ما ساتھ وہی جاتی تھی لیکن وہ اب چاہتا نہیں تھا کہ ان تماشوں میں اپنی بیٹی کو ساتھ رکھے، گھن راؤ اس کے دل کی کلی کھل گئی اور اس نے کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ ان چاروں قاتلوں سے جان کیسے چھڑانی ہے۔

ان سے جان پھر رانے میں اسے زیادہ محنت نہ کرنا پڑی۔ وہ چاروں احمق خوب جنود اس کے پھنس گئے۔ پھر جب انہوں نے گھن راؤ کے کلکڑے زمین پر گرتے دیکھے تو ان کے ہوش اڑکنے لوگ اپنے گھوڑے سریٹ دوڑاتے جنگل میں گم ہو گئے تھے۔ قاتل تو پڑے گئے تھے۔ لیکن اب

سے ایسی آوازیں نکالتا تھا کہ مطلوبہ جانور یا پرندہ اس کی آوازن کر اس کے سامنے آ جاتا تھا۔ محسن راؤ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ اس نے بہت جلد مختلف پرندوں اور چند ندوں کی آوازیں سیکھ لیں۔ اب یہ اس کا بہترین مشغله تھا کہ وہ صبح سوریے جنگل کا رخ کرتا۔ اسے تیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ جنگل میں جہاں کسی بھی اسے تیز نظر آتا، وہ جاں بچا کر ایک جگہ بیٹھ جاتا۔ اور اپنے منہ سے تیز کو بلانے کی آواز نکالتا دو چار آوازوں کے بعد یعنی تیزروں کا جواب آئے لگتا اور وہ اڑتے ہوئے، دوڑتے ہوئے اس کی طرف کھجھ چلے آتے جب وہ کھٹکا کہ آٹھ سالت تیز رمح ہو گئے ہیں تو وہ جھنگا کار کر جاں کھیج لیتا۔ چار پانچ تیزروں میں ضرور پھنس جاتے۔ وہ ان تیزروں کو جاں سے نکال کر بچرے میں منتقل کر لیتا اور بستی میں آ جاتا۔ راکھی ان تیزروں کو ذمہ کر کے پاکتی۔ محسن راؤ بڑے مرے سے یہ گوشت لھاتا۔

بستی کے تربیت ہی نہ تھی۔ محسن اپنی تیر کی کاوش نہر میں تیز کر پورا کرتا۔ وہ دھڑا دھڑپل سے پھانگ مار کر پانی میں گرتا اور غوطہ مار کر کہیں کا کہیں جائاتا۔

اب راج مداری سے اپنے کھیل تماشوں میں ساختہ ہی رکھنے لگتا تھا۔ وقت گزر آگیا ہماراں تک کہ محسن وان ہو گیا۔ ایک تو محسن خوبصورت تھا اور پر ساحر تھا۔ ان تیزروں چزوں نے آس پاس کے علاقوں میں اسے بے حد مغلوب بنادیا تھا۔

بستی کی لڑکیاں اس کی ایک نظر کو ترسی تھیں مگر وہ نظر اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ خود را کھی اگرچہ اس سے دو ن سال بڑی تھی لیکن پناول ہار بیٹھی تھی۔ اس پر ہر وقت اپنی جان پنجاور کرنے کو تیار رہتی تھی مگر محسن و اپنی دھن میں مگر نہ تھا۔ راج مداری اسے بیٹھوں کی طرح چاہتا تھا لذادہ بھی راکھی کو تقدس کی نظر دیکھتا تھا۔

ایک روز صبح ہی صبح راجہ بہرام گل کا کارندہ گھوڑے پر سوار راج مداری کے گھر پہنچا۔ راجہ بہرام گل ل تماشے کے بڑے شوق تھے۔ وہ راج مداری کو کھیل تماشاد کھانے کے لئے بلا ت رہتے تھے۔ آج ان کا کارندہ ان کا ہی پیغام لے کر آیا تھا۔

راجہ بہرام گل کی بیٹھی نادرہ کی دو دن بعد مغنتی تھی لہذا اس موقع پر اس کا کھیل تماшہ کھا گیا تھا۔ اور بعد اصرار بلا بیا گیا تھا۔ راج مداری کی بھلا کیا جمال تھی کہ وہ جانے سے انکار کر تاں نے فوراً ہی مل اور پوکرام طے کر لیا۔

و دون کے بعد دوپر کو راج صاحب کی گاڑی ائمیں آکر لے گئی۔ و دیگھنے کے سفر کے بعد وہ دونوں نزد مونا تھا۔ شام کے وقت مسمان آنا شروع ہو گئے۔ راج مداری کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سامنے گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ

نجلات تھے اور بیٹھتے جاتے تھے۔ راج مداری اور محسن راؤ اسی ساتھ پر موجود تھے اور اپنے کھیل کی تیاریوں کو معرفت تھے۔ وہ دونوں آپس میں طے کر رہے تھے کہ کون تماشا کر اور کیسے وکھایا جائے گا۔

بھودر کے بعد سامنے کی مرصع کر سیوں پر نادرہ اور اس کا ہوٹے والا شورہ وقار بیٹھ گئے۔ نادرہ کی

یہ ایک چھوٹی سی بستی تھی زیادہ تر یہاں کھیل تماشے دکھانے والے ماری آباد تھے۔ ہر کمر سامنے ریچہ، بندز، بکرے اور کتے بندھے ہوئے تھے۔ راج مداری کا مکان سب سے اچھا اور بڑا صاف سترہ اور لپاہتا۔ وہ اس بستی کا سردار تھا اور کھیابی کملاتا تھا۔ راج مداری کی بیٹی کا نام یوسف آر کھی تھا لیکن وہ اسے راکھی کہ کر پکارتا تھا۔ راکھی چودہ پندرہ سال کی ایک پرکشش لڑکی تھی۔ وہ اپنی پر گنی تھی۔ اس کی ماں کو مرے دو سال ہوئے تھے۔ دونوں کی موت گروں توڑا بخاری و جو ہوئی تھی۔ اسے بیٹی کی شدید خواہش تھی۔ یہ خواہش حادثاتی طور پر تسلیم پا گئی تھی۔ اسے محسن راؤ روپ میں پلاپلا یا بیٹھا مل گیا تھا۔ وہ راستے بھر سچتا آیا تھا کہ محسن راؤ پر ایسا کیا جادو ڈونا کرے کہ وہ اس طبع اور فرمابندر اور بن کر بستی میں رہ جائے۔ یہاں سے جانے کا نام ہی نہ لے۔

اور راج مداری کے لئے یہ کوئی اتنا مشکل کام نہ تھا۔ کسی کے دل پر قبضہ جانے کے اسے بہت عمل آتے تھے۔ ”رات کے شنشاہ“ کا پنجہ اس کے لئے میں پڑا ہوا تھا۔ جس کے لگے میں آؤ کا پنجہ ہو، اس کے لئے کسی کو آؤ کا بنا کیا جائے مشکل تھا۔ اس نے گھر بیچنے کو سب سے پہلا کام میں کیا۔ ایک چھوڑے سا وادہ کاغذ پر اٹوکے پنج سے کچھ پراسرار سے نشان بنانے کے دوران وہ کچھ بڑا ہوا تھا۔ رہا۔ پھر اس نے راکھی سے ایک گلاں شربت لانے کو کہا۔ راکھی نے شربت سے بھرا گلاں باپ۔ سامنے رکھا تو اس نے کاغذ کو شربت میں ڈال کر اسے تھوڑا جھگما کر نکال لیا اور راکھی سے کہا کہ ”وہ راؤ کو شربت دے آئے۔ محسن راؤ دوسرے کمرے میں چار پانی پر شیم دراز تھا، وہ لمبی مسافت طے کر آیا تھا، تھک گیا تھا۔

راکھی کمرے میں داخل ہوئی تو محسن نے نظر اٹھا کر راکھی کو دیکھا۔ اگرچہ راکھی نے اسے اپنے گھر آتے ہوئے پسلے ہی وکیچ لیا تھا لیکن وہ اس کے سامنے اب آئی تھی۔ اس نے بھی اسے غور سے دیکھا وہ دوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بیک وقت مسکرائے۔ راکھی نے گلاں آگے بڑھایا۔ ”لوہ

لو۔“ محسن راؤ نے گلاں اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ بورا کا شربت تھا، مختنہ اور مٹھا۔ اسے بے حدیں گل تھی وہ غٹ غٹ کر کے ایک ہی سانس میں سبڑا چڑھا گیا۔ اس شربت نے اپنا کام کر دکھایا۔ اس نے اس کا باضی تو نہیں چھینا۔ اسے یہ تو یاد رہا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے لیکن وہ اپنے مختنے سے بیگانہ ہو گیا۔ راج مداری کے اس کچھ گھر کی الفت اس کے دل میں سا گئی۔ کبھی اندر سے کہل لگتا تھا یا وہ لامکا اسے اپنے گھر لا ہو رہا جاتا ہے۔ اندر کی اس آواز پر کبھی وہ اٹھ کھڑا بھی ہوتا۔

باد جو کو شش کے اس بستی کی حدود سے وہ نکل نہ پاتا۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ راج مداری نے آہستہ آہستہ اسے اپنا فن بخشنہ شروع کیا۔ اب چھوٹے موٹے تماشے کر کے لوگوں کو جیزان کر دیتا تھا۔ راج مداری نے چھوٹے موٹے تماشیں ساتھ جنگل کا علم بھی اسے سکھانا شروع کیا تھا۔ راج مداری جاؤڑوں کی آوازوں کا مامہر تھا۔ وہ اپنے

کے دراں کوئی ایک لفظ نہ بولے اور اپنے ہاتھ بھی ایک دوسرے سے الگ رکھے۔ یہ تینیہ سن کر سب لوگ مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔ کوئی شخص اگر ہاتھ باندھے بیٹھا تھا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ الگ کرنے اور خاموش ہو کر پوری وجہ سے تماشہ کو دیکھنے لگا۔

راج ماری نے اب بانسری اور ڈگلزی بجا کر حسن کے گرد چکر لگانے شروع کئے۔ تین چکر کے بعد حسن راؤ کا جسم زمین سے اٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اٹھتے اٹھتے چار فٹ بلند ہو گیا۔ وہ کسی اکڑی ہوئی لاش کی طرح دھکائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم کے ساتھ چادر بھی اٹھی تھی۔ چادر بہت بڑی تھی اس لئے اس کے کنارے اٹیچ کو چھوڑ رہے تھے۔

یہ ایک دم بخوبی کرنے والا منظر تھا۔ کچھ دیر کے بعد راج ماری نے اٹیچ پھیرے لینے شروع کئے۔ اس طرح حسن راؤ کا جسم آہستہ آہستہ زمین سے لگ گیا۔ اور جب راج ماری نے چادر اس کے اوپر سے اٹھائی تو وہ مکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں۔

تب اچانک ہی نادرہ کو اپنی انگوٹھی یاد آئی۔ اس نے راج صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ ”بابا جانی میری انگوٹھی؟“

”بیٹا۔ وہ تو اللہ کو پیاری ہو گئی۔“ انسوں نے خس کر کما۔

”ہائے۔ نہیں۔“ نادرہ افسرہ ہو کر بولی۔

تب راج بہرام گزرنے راج ماری کو اشارہ کیا۔ ”بھی ہماری بیٹی کی انگوٹھی کا کچھ کرو۔“ راج ماری کے بولنے سے پہلے حسن راؤ بڑے شاستہ لمحے میں مخاطب ہوا۔ ”سر، وہ انگوٹھی ہمارے پاس تو نہیں ہے۔“

”پھر کیا گئی؟“ اس مرتبہ نادرہ کا مغتیر وقار بولا۔ اس کا لجدہ ذرا سخت تھا۔

”سر، آپ اپنی جیسیں دیکھیں، کہیں آپ کے پاس تو نہیں۔“

”یہ کیا کوئی اسے۔“ اس مرتبہ اسے سچھ غصہ آئی۔

”بھی وقار، اس میں اس قدر غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکا کہہ رہا ہے تو اپنی جیسیں دیکھے اپنے سر کے انداز پر وقار الجھ سا گیا۔“ اور اس نے کوٹ کی جیسیں دیکھنے کے بعد بھی ہی پینٹشکی جیب میں ہاتھ ڈالا ایک انگوٹھی اس کے ہاتھ میں آئی۔ گھبرا کر اس نے ہاتھ باہر کھینچا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ یہ وہی انگوٹھی تھی جو اس نے نادرہ کو پہنائی تھی۔

حسن راؤ اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر فوراً وقار کی طرف لپکا۔ اور اس کے ہاتھ سے انگوٹھی لے کر تمام لوگوں کو دھکائی۔ لوگوں نے ایک فرمائی قسمہ لگایا۔ حسن راؤ نے وہ انگوٹھی ٹکریتے کے ساتھ نادرہ کی ملکی پر رکھ دی۔

جبانے کیلئے اس وقت نادرہ کا جی چاہا کہ کاش حسن راؤ نے یہ انگوٹھی اس کے ہاتھ پر رکھنے کے جباۓ اس کی انگوٹھی میں پہنچا دی ہوتی۔ اس خواہش پر وہ اندر ہی اندر مکرا دی۔

طرف اس کے ہونے والے سرتھے اور ہونے والے شہر کے ساتھ راج بہرام گزر شریف فرمائے گئے۔ اس کے بعد ادھر ادھر اور دوسرے اہم لوگ بیٹھ گئے۔

تب راج بہرام گزر نے راج ماری کو مکمل شروع کرنے کا اشارہ کیا۔

راج ماری نے اپنے گلے میں پڑے ”رات کے شمناہ“ کا پنجہ چوما اور ایک نعمہ متنانہ لکھ کر راج بہرام گزر کو جھک کر سلام کیا۔ سلام کے بعد اس نے بانسری اپنے ہونوں سے لگائی اور دوائیں ہاتھ ڈگلی لے کر دونوں کو ایک ساتھ بجا شروع کیا۔ بانسری کی لے اور ڈگلی کی تال پر حسن راؤ نے شروع کیا۔ دونوں نے مل کر ایک سام ساباندھ دیا۔

حسن راؤ کا کیلی پیٹھ اور سرخ ٹیپس پہنے ہوئے تھا۔ سرخ سفید رنگت، گھنگھڑا لے بال، کانوں پڑے بالے۔ پکش مقاطی آئکھیں۔ اس پر ایک خاص انداز کارقص۔ لوگوں کی اس پر اس طریقہ میں اگریزی میں بولا۔ ”جنتاب مجھے ملکنی کی انگوٹھی در کار ہے۔“

اسے الکش بولتا دیکھ کر نادرہ کو ایک خونگوار جیرت ہوئی اور اس سے پہلے کہ راج بہرام گزر انہا سے ملکنی کی انگوٹھی اترنے کو کہتے، نادرہ نے جلدی سے انگوٹھی اپنی انگلی سے نکال کر حسن راؤ کے جواہر ناچاہی حسن راؤ نے اشارے سے اسے روکا۔ پھر اس نے ایک چوڑے منہ کی شیشے کی بوتل کا ذہنہ کھولا اور اس میں انگوٹھی ڈالنے کا اشارہ کیا۔

نادرہ نے اپنی انگوٹھی اس میں ڈال دی۔ حسن راؤ نے وہیں کھڑے کھڑے بوتل کا ذہن بن دیا اگلے رومیں بیٹھے ہوئے لوگوں کو ایک ایک کر کے شیشے کی بوتل میں بندہ ہیرے کی انگوٹھی دھکائی۔ اس بعد وہ بوتل کو لے کر اٹیچ پر چکنچ گیا اور ایک اسٹول پر بوتل کو رکھ دیا۔

بوتل میں بندہ انگوٹھی سب کو دھکائی دے رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی بینٹ کی جیب سے ایک سیاہ رہا کلا روماں میں لہرا کر بوتل پر ڈال دیا۔ بوتل رومال سے چھپ گئی۔ راج ماری بانسری اور ڈگلی بجا تھے ہوئے اسٹول کے گرد ایک پکڑ لگایا۔ چکر ختم ہوتے ہی حسن راؤ نے رومال سے کھینچ لیا۔

تب لوگوں نے دیکھا کہ بوتل سے انگوٹھی غائب تھی۔ نادرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے ہونے والے شہر وقار کی طرف دیکھا۔ ”جیرت اگیز۔“

”راجہ صاحب، مارے چھوڑے سے سمجھلی ہو گئی۔“ بی بی کی انگوٹھی ملنااب مسلک ہے۔

”ارے، یہ کیا کہہ رہا ہے۔“ نادرہ کا مغتیر وقار پریشان ہو کر بولا۔ اس کے برابر راج صاحب ہوئے تھے وہ آرام سے بیٹھے مکراتے رہے۔ انسوں نے کوئی تصریح نہ کیا۔

یہ کہہ کر راج ماری دوسرا تماثل دکھانے میں مگن ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے حسن راؤ کا اٹیچ پڑھ کما جب وہ لیٹ گیا تو راج ماری نے اس کے اوپر ایک بہت بڑی سفید چادر ڈال دی اور لوگوں درخاست کی کہہ بہت نازک مکمل ہے۔ اس میں نوکے کی جان بھی جا سکتی ہے۔ اس نے اس نا۔

تھی۔ اگرچہ وہ سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہ ساتھا کہ وہ راجہ براہم گھر کی بیٹی نادرہ ہے۔

جب وہ نادرہ کے قریب پہنچا تو سورج اپنا سفر نام کرچکا تھا۔ شام گھری ہو رہی تھی۔ انہیں اتنی سے پہلیا جا رہا تھا۔ وہ اس کے نزدیک پہنچ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ نادرہ نے اپنے چہرے سے چادر ہٹائی اور مدھم نہروں میں بولی۔ ”میں ہوں نادرہ۔“

”جانتا ہوں۔“
”جی تباہ، کیا تمہیں میرے یہاں آنے کی توقع تھی۔“
”نہیں بالکل نہیں۔“ محسن راؤ نے بہت سچائی سے کہا۔
”لیکن میں تو آگئی ہوں، تمہاری توقع کے خلاف۔“ نادرہ کی آنکھوں میں ڈوبتے سورج کی سرفی تھی۔ ”کیا تمہیں میرا آنا گوار گزرا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ محسن راؤ نے پھر سچائی سے کہا۔
”تمہیں تو لڑکی ہونا چاہئے تھا۔“

”وہ کیسی؟“ وہ حیران ہوا۔
”کوئی بات کھل کر کتھی ہی نہیں۔“ وہ بہتی میں بڑا سحر تھا۔
”آپ کیا کہلوانا چاہتی ہیں؟“

”میں نے تمہارا نام نہیں پوچھا، میں تمہارا نام جانتی ہوں۔“
”پھر کیا معلوم کرنا چاہتی ہیں۔“

”تم اس پس مظہر میں بالکل مس فٹ نظر آتے ہو۔ جیسے ثاث میں محفل کا پورہ۔“
”میں اگر یہ کہوں کہ آپ ٹھیک کہتی ہیں تو کیا مان لیں گی۔“
”ہاں، ہاں کہوں نہیں۔“

”میں ایک فریب میں جاتا ہوں۔“ محسن راؤ نے بڑی ادا سے کہا۔ ”جانتا ہوں کہ فریب میں جلا ہوں۔“ پھر بھی اس سحر سے نکلتے کوئی نہیں چاہتا۔ جیسے قیدی ہوں کسی کا۔
”کس کے قیدی ہو راجہ مداری کے؟“
”ہاں، یوں ہی سمجھو۔“

”بے فکر ہو جا، میں اس کی قید سے نکال لوں گی۔“ تمہیں اپنا قیدی بنا لوں گی۔ بول میرے قیدی بنو گے؟“ نادرہ کے لمحے میں بڑا رس تھا۔
”ہاں، خوشی سے۔“ محسن راؤ نے بے اختیار کہا۔
”اپنی جلدی اقرار نہ کرو۔ اچھی طرح سرفج سمجھ لو۔ میں تینی دن کے بعد آؤں گی۔ اسی نہر کے پل

کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ شاید محبت کا جذبہ، ایک دوسرے کو پسند کرنے کا روایہ اسی زمرے میں آتا ہے۔ نادرہ کی متعینی ہو چکی تھی۔ متعینی کی انگوٹھی اس کی انگلی میں تھی۔ مغتیر اس کے برابر بیٹھا تھا۔ ایک سال بعد شادی ہونے والی تھی۔ اس کے باوجود اچانک دل میں اس خواہش کا پیدا ہوا کہ کاش! وہ انگوٹھی ہاتھ پر رکھنے کے جانے انگلی میں پسند دتا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ کیسی عجیب سوچ تھی اور یہ بات اس کے دل میں کیوں آئی تھی، وہ نہیں بتا سکتی تھی۔

انگوٹھی واپسی لوٹاتے وقت خود محسن راؤ بھی بسک گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ کاش! وہ یہ انگوٹھی بیوہ کے لئے غائب کر سکتا۔ اپنی اس سوچ پر اسے اندر ہی اندر ہنسی آئی۔ راکھی نادرہ کے مقابلے میں نہیں خوبصورت تھی۔ اور وہ محسن سے پیار بھی بہت کرتی تھی لیکن محسن نے اس پر کبھی وجہ دی تھی۔ نادرہ کو دیکھ کر جانے اس کے دل کو کیا ہوا تھا۔ اپنے اس رویے پر وہ بار بار غور کر رہا تھا مگر سمجھ میں پکھ نہیں آیا تھا۔

کھیل کے سلسلے میں اس کا انہماک ٹوٹ گیا تھا۔ ارٹکار کھر گیا تھا۔ وہ بار بار غلطی کر رہا تھا اور اس مداری سے ڈاٹ کھارہ بھاگا۔ ”او، محنا، ہوس کر، کا کرہے رے۔“
راج مداری کے بار بار ٹوکنے پر اسے ”ہوس“ کرنا پڑا یہ جادو کے کھیل کے کھیل کے تھا، اس میں توجہ کا بیٹھا آؤ کو خاص انقصان پہنچا سکتا تھا۔ بالآخر یہ کھیل تماشا اختتام کو پہنچا۔ راج مداری نے راجہ براہم گھر سے انعام اکرام ہٹور اور واپسی کے لئے رخت سفر باندھا۔

رات کو وہ دنوں اپنی بستی میں بچنے لگئے۔ راج صاحب کی گاڑی انہیں اپنے ٹھکانے پر چھوڑ گئی۔ لیکن محسن راؤ کا دل اپنے ٹھکانے پر نہیں رہا تھا، وہ کہیں دور براہم گھر میں رہ گیا تھا۔ اور ایک چہرہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں محمد ہو گیا تھا۔ وہ تصویر اس کی نگاہوں سے بہت ہی نہ تھی۔
پھر وہ ہوا جس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ایک شام راجہ براہم گھر کی گاڑی راج مداری کے گھر نزدیک آکر کھڑی ہو گئی۔ گاڑی میں ڈرائیور کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ وہ محسن راؤ کی تلاش میں یہاں تھا۔

محسن راؤ گھر پر موجود تھا۔ اس نے راجہ صاحب کے ڈرائیور کو اپنے دروازے پر دیکھا تو اس چہرے پر اہل سے چھوٹنے لگے۔ ڈرائیور نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کے کان کے نزدیک بڑی رازدراز سے کہا۔ ”بی بی جی آئی ہیں؟“
”کون بی بی؟“ محسن راؤ نے اسی رازداری سے اس سے پوچھا۔

”نادرہ بی بی۔“
”کہاں پہن وہ؟“
”وہ نہر کے پل پر کھڑی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“
”میرا انتظار۔“ محسن راؤ الجھن میں پڑ گیا۔ ”او، چلو۔“
راج صاحب کی گاڑی بستی سے باہر کھڑی تھی۔ محسن راؤ اس میں بیٹھ کر پل پر پہنچا۔ ڈرائیور گھازی روک لی۔ محسن راؤ اتر کر تیری سے بھاگا۔ پل کے اس کنارے چادر میں لپی نادرہ اسے نظر

پر اسی وقت میرا انتظار کرنا۔ کرو گے؟
”ہاں، کیوں نہیں۔“ وہ سکرا کر بولا۔
”تو پھر جاؤ۔“

”جاوں کیسے، جانے کوچی نہیں چاہتا۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہوا ہے کہ میں ہوں۔“
”یہ بڑی اچھی ابتداء ہے۔ آج تمہیں اپنے ہونے کا احساس ہوا ہے۔ پھر وہ دن زیادہ دور نہیں
جب تمہیں میرے ہونے کا یقین ہو جائے گا۔“

”تم بھی تو قید میں ہو کسی کی۔؟“
”ہاں، ایک اگوٹھی کی قید میں۔“ نادورہ نے بڑے عجیب لمحے میں کہا۔ ”تم نے وہ اگوٹھی میرے
ہاتھ پر کھی تھی۔ وہ اگوٹھی ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے آج تک پہنچنی نہیں۔“
”لا، وکھا ہاتھ۔“ میں راوی بولا۔ ”کہاں ہے وہ اگوٹھی۔؟“

نادورہ نے اپنی چادر سے ہاتھ نکالا اور اس کے سامنے کر کے مٹھی کھول دی۔ لیکن اس کے ہاتھ میں
کچھ نہ تھا۔ ہاتھ خالی تھا۔ اپنا ہاتھ خالی وکھے کر نادورہ پر شان ہو گئی۔

بات بھی پر شان ہونے والی تھی، اس نے تجھ کما تھا جس وون میں راوی نے وہ اگوٹھی اس کی ہتھی پر کی
تھی تو اس نے پسند کے بجائے مگیت وقار کے کوٹ کی جیب میں ڈال دی تھی، جاتے ہوئے جب وقار نے
اسے اگوٹھی واپس کی تو اس نے اسے اپنے پرس میں ڈال لی۔ اس وقت سے آج تک وہ اگوٹھی اس کے
پرس میں تھی، گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے اگوٹھی اپنی مٹھی میں دبای تھی۔ اور چند لمحے پہلے تک وہ
اگوٹھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ بس مٹھی کھولتے ہی وہ اگوٹھی غائب ہو گئی تھی۔

”کہاں ہے وہ اگوٹھی؟“ میں راوی نے سکرا کر پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہاں گئی، ابھی تو میرے ہاتھ میں تھی۔“ نادورہ نے خفت سے کہا۔
تب میں راوی نے اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کی اور مٹھی کھول کر بولا۔ ”یہ ا
نہیں۔؟“

میں راوی کی ہتھی پر اس کی اگوٹھی موجود تھی۔ نادورہ نے خوشی سے نہرہ لگایا۔ ”یہ تو ہے یہ تمہارے
ہاتھ میں کیسے آگئی۔؟“ ادا، جادو، تم کتنے بڑے جادو گر ہو۔؟“

”یہ اگوٹھی تم نے اب تک پہنچی کیوں نہیں۔؟“
”جب تم نے مجھے یہ اگوٹھی واپس کی تھی تو میرے ول میں یہ خواہش اٹھی تھی کہ تم مجھے یہ اگوٹھی پہن
ویتے۔“

”اس وقت میرے ول میں بھی ایک خواہش جائی تھی۔“ میں راوی نے انہمار تمنا کیا۔
”وہ کیا؟“ نادورہ نے اسے پر شوق نگاہوں سے دیکھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ کاش یہ اگوٹھی میں یہیش کے لئے غائب کر سکتا۔“
”ایسا ہو سکتا ہے۔“ نادورہ نے بڑے انداز سے کہا۔ ”یہ اگوٹھی یہیش کے لئے غائب ہو گز۔“

”وہ کیسے؟“ میں راوی نے پوچھا۔

”وہ ایسے..... ویکھو، یوں.....“ یہ کہہ کر اس نے اگوٹھی نمر کے بتتے پانی میں اچھاں وی
جو فراہمی ڈوب گئی۔

”یہ تم نے کیا کیا۔؟“ میں راوی پر شان ہو گیا۔

”کچھ نہیں۔! میں اس اگوٹھی کی قید سے آزاد ہو گئی ہوں۔“

”کہیں تم نے عجلت سے کام تو نہیں لیا۔؟“ میں راوی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”مجھے نہیں معلوم.....“ نادورہ نے بڑی مخصوصیت سے کہا۔ ”جو ہوا بے اختیار ہوا ہے، یہ دل کا
معاملہ ہے دل ہی جانے۔“

”نادورہ، یہ دل بھی کتنی عجیب چیز ہے، کون جانے کب کہاں کس پر آجائے۔؟“ میں راوی
بولा۔

”ہائے.....! تم نے میرا نام لیا۔“ ذرا پھر لیتا۔

”نادورہ۔“ میں راوی نے اس کا نام وہرایا۔

”میں، میرے میں.....“ نادورہ نے جواب میں اس کا نام اس قدر چاہت سے لیا کہ پہلی بار
اسے اپنے نام پر فرموا۔

”اچھا..... نادورہ یہ بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں سے آرہی ہو۔؟“

”بہرام نگر سے اور لاہور جا رہی ہوں۔ تین دن کے بعد وابس آؤں گی۔ اسی وقت۔ اس نمر کے
پل پر میرا انتظار کرنا میرا انتظار کرو گے تا میں.....؟“ نادورہ نے بے قراری سے پوچھا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔ میں تمہارا انتظار ضرور کروں گا۔“ لاہور کا نام سن کر میں راوی عجیب کیفیت ہو گئی
اسے نہیں لگائی ہے کہیں کہیں کہاں اچانک گرو گلو آئیں کہ جھاڑ کر اس کے سامنے کرو یا ہو، لاہور۔ جہاں وہ پیدا
ہوا، جہاں اس کا گھر تھا جہاں اس کے بلاستے، اس کی پیاری سی ای تھیں۔

”یہ تو اس کی زندگی کے سارے ہی زخم ہرے ہو گئے تھے، اس کے دل میں نیسیں سی اٹھنے لگی
خیس۔“

”کیا ہوا میں.....؟ یہ تمہیں اچانک کیا ہوا۔؟“ میں راوی کی حالت بدلتے وکھے کر نادورہ نے
پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ جب تم لاہور سے واپس آؤ گی تو میں تمہیں اپنے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔“
”اپنی وہ باشکن ہی کر رہے تھے کہ امیں ڈرائیور بہایت اللہ اپنی طرف آتا ہوا کھالی ویا۔“

”وہ آئتا ہے، اب تم جاؤ، میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

نادورہ تین دن کے بعد ملاقات کا وعدہ کر کے چل گئی، تین دن کے بعد جب وہ واپس ہوئی اور نمر کے
مل پر پہنچی تو میں راوی اس کا نتھر تھا اس وون میں بلکہ لاہور کی مشور خصیت راوی شماشو علی کا

فرزند ہے اور راوی احمد علی کا حصہ تھا جو تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، اسے جیت تھی کہ اتنے بڑے باب

ہاں ملائی رہتا، لہور جانے کا ارادہ بننے لیتا تھا میں کچھ ہی وہ راوی شہزاد علی کا بیٹا بننے کے بجائے راج ماری کا بیٹا بن جاتا۔ ایک طرح سے وہ راج ماری کا قیدی تھا تھا میں ایسا قیدی جس کے پاؤں میں پڑی بیڑی کی کو نظر نہ آئی تھی۔ نادرہ اب اس کے سلسلے میں خاصی بیجہ ہو گئی تھی وہ اس پر مر منی تھی اور اس کی خاطر سب کو مٹا دنا چاہتی تھی۔

تب اس نے اپنے رازدار ڈرائیور ہدایت اللہ سے بات کی، اس نے ایک دن بہرام گفر جاتے ہوئے راستے میں اس سے پوچھا۔ ”ہدایت اللہ کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا آدمی ہے جو جادو کا توڑ جانتے ہو.....؟“

ہدایت اللہ اس کی بات سن کر کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ہاں ایک ہے تو ایسا بندہ پر اس سے بات کرنا ہو گی، آپ یہ تھائیں کس پر ہوا ہے جادو.....؟“

”وہ اپنے محنت کی صاحب ہیں نا ان پر۔“ نادرہ نے بتایا۔

محنت کا نام سن کر ہدایت اللہ بے اختیار نہ پڑا۔ ”آپ بھی کیا بات کر دیں ہیں بی بی.....؟“

”کیوں.....؟ ایسا میں نے کیا کہہ دیا.....؟“

”اُرے بی بی آپ بھی کمال کرتی ہیں، محنت کی صاحب تو خود اتنے بڑے جادوگر ہیں ان پر بھلا کس کا جادو چلے گا.....؟“

”بلی، ہدایت اللہ کی تو سارے اسئلہ ہے، بے شک وہ بڑے جادوگر ہیں لیکن ان پر ان سے بھی بڑے جادوگر نے جادو کر رکھا ہے، اس نے انہیں قید کر رکھا ہے، تمہیں یاد نہیں جب وہ ایک دن ہمارے ساتھ بہرام گفر آ رہے تھے تو راستے میں ان کی کس قدر طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ مجھے میری بیتی میں والپس لے چلو، میرا دل کوئی مٹھی میں جائز رہا ہے۔ تمہیں یاد آیا تا پھر ہمیں مجبوڑا انہیں ان کی بیتی چھوڑ کر آپنا پڑا تھا۔ نادرہ نے بتایا اور اپنی بیتی کے قریب بیجھ کر وہ بالکل بھلے پچھے ہو گئے تھے۔“

”اچھا اچھا تو اس دن یہ بات تھی لیکن انہیں کس نے قید کر رکھا ہے.....؟“ ہدایت اللہ نے پوچھا۔

”راج ماری نے.....!“ نادرہ نے جواب دیا۔

”لیا وہ ان کے بیٹے نہیں ہیں؟“ ہدایت اللہ کو حیرت نے آگھرا۔

”نہیں..... وہ ایک بہت ایمر باب کے بیٹے ہیں بس کسی طرح وہ اس کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔“

”اچھا بھر تو ان کے لئے کچھ کرنا پڑے گا.....! میں ایسا کرتا ہوں کہ کل ہی جو گیرام پال سے بات کرتا ہوں۔“

”لیکن ہدایت اللہ وہ تو سپیرا ہے وہ جادو کے بارے میں کیا کر سکے گا.....؟“

کا بیٹا اپنا گہر بار چھوڑے اس چنگل میں کس طرح زندگی گزار رہا ہے۔

وہ اصل میں جادو ٹونے کے اثرات سے تاثر فہمی۔ اسی لئے حیرت زدہ تھی، جادو تو اچھے بھلے آؤ کی مت مار دتا ہے، محنت تو اس وقت پچھے تھا۔

کہتے ہیں کہ جس طرح لو ہے کو لوہا کا نٹا ہے، زہر کو زہر مارتا ہے، اسی طرح سحر کا علاج بھی سحر ہی ذریعے ہو سکتا ہے۔ راج ماری کے سحر کا توڑ نادرہ کے سحر سے کیا جاسکتا تھا، نادرہ بڑی پریقین تھی کہ بر جلد اپنا سحر پھوک کر وہ اسے اپنا قیدی بنالے گی۔ محنت خود بھی بڑی خوشی سے اس کا قیدی بننے کے لیے تیار تھا۔

وقت گزر تارہا..... ان ملاقتوں کو تین ماہ ہو گئے تین ماہ کی معاملے کو سمجھانے یا الجھانے لئے بہت ہوتے ہیں، معاملہ آہست آہست سمجھتا رہا تھا، نادرہ کی محبت کی طاقت اس کی کشش، اس کا سحر بدن اسے اپنی گرفت میں لئے جاتا تھا۔

اس کی محبت میں وہ سب کچھ بھولتا رہا تھا، راج ماری نے اپنے سحر سے اس کے گھروالوں کو اس کے دل سے نکال دیا تھا، محنت راوی اس بیتی کا ہو کرہ گیا تھا وہ اکیلا کہیں نکل بھی جاتا تو بندش کی وجہ سے کیسی دوسرے جا سکتا تھا اس کا دل گھبرا نے لگتا اس کا بھی چاہتا کہ وہ جلد از جلد بستی والیں بیجھ جائے۔ راج ماری اور راج ماری کو دیکھ لے۔

اب نادرہ نے اس پر جادو کر دیا تھا اس کی محبت میں کھو کر وہ اپنا آپ بھولتا رہا تھا۔ نادرہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ محنت، راج ماری کے جادو کے زیر اثر ہے اور اس جادو نے اسے اس قدر جکڑا ہوا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھی بھول گیا، ان کی محبت اس کے دل سے نکل گئی، راوی احمد علی کو دشمنی بھی اس کے دل میں نہ رہی، بس راج ماری یاد رہ گیا تھا۔

اب نادرہ جب بھی اس سے ملتی ہے اس سے اس کے شرکی بات کرتی اس سے اس کے والدین اُنکرہ کرتی راوی احمد علی کا ذکر کرتی جس نے اس کے قتل کی سزا شکی اور اس کے حصے کی زمینیں پر فوج کر لیا تھا۔ وہ ان باتوں کو بھولا نہیں تھا لیکن ہر یہ بات اس کے دل سے محظی ہو گئی تھی۔ اسے اپنے گھر کی، اپنے گھروالوں کی، کسی کی کوئی پرواہ نہیں رہی تھی لیکن نادرہ نے جب سے اس کے آئینہ دل سے گرد صاف کہا شروع کی تھی محنت کو اپنا چڑھ دھنڈ لادھنڈ لانظر آنے لگا تھا لیکن یہ دھنڈا ہٹ بھی عارضی ہوتی جب تک نادرہ کے سامنے رہتا، اس کی ہاں میں ہاں ملائیں بھر اس سے جیسے ہی دور ہوتا اور راج ماری کا چڑھ دیکھتا تو سب کچھ بھول جاتا۔ راج ماری کا جادو اس کے سر پر چڑھ کر بولنے لگتا اور جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے۔

راج ماری جب بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ پوچھ لیتا کہ کیسا ہے رے تو محنت تو ہے کہ تکلیف پھر تو نا ہے رے، تو محنت کے ذمہ میں اٹھنے والے یادوں کے بھنور جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے۔ کوئی معمولی جادو نہ تھا، رات کے شمنشاہ کے پنجے سے بنا یا ہوا نقش راج ماری نے اسے پلا یا تھا اس جادو کے پاس نہ تھا۔

نادرہ اب اسے یاد دلا دلا کر اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی، محنت اس کے سامنے ہوتا تو اس کی ہاں مٹا

”ہاں، بابا۔“
”پر جوگی تھی مدارج وہ یہاں نہیں آسکتا۔“
”وہ کیوں بابا۔“

”جادو کے ذریعے اسے باندھ دیا گیا ہے۔ وہ بادجو دو کوشش کے اپنے علاقوں سے کل نہیں سکتا۔“
”تھا ہے تو اس کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ فوراً طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“ ہدایت اللہ نے بتایا۔
”پھر تو کوئی زبردست بندہ ہے اس کے پیچھے۔ کوئی بکٹ جادو گر۔“ جوگی رام پال بولا۔
”بس ڈر گئے جوگی مدارج۔“

”جوگی رام پال نے ڈرنا نہیں سیکھا بابا۔ ہم جلیں گے تمہارے ساتھ۔ پرجانا کہاں ہو گا۔؟“
”یہاں سے تین چار گھنٹے کا سفر ہے۔ وہ دماریوں کی بیتی کملاتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، ہم چلیں گے۔ وہ مداری، ہم جوگی۔ خوب مقابلہ ہو گا۔“
ڈر ایور ہدایت اللہ نے جب ساری بات، نادرہ کے گوش گزار کی تو اس نے دوسرے ہی دن اسے
اریوں کی بیتی لے جانے کی ہدایت کی۔ ہدایت اللہ نے حکم کی تعییں کی اور جوگی رام پال کو نمر کے پل کے
ریپٹھاکر خود محسن راؤ کو بلانے بیتی میں چلا گیا۔

”محسن راؤ گھر پر موجود تھا۔ دروازے پر ہدایت اللہ کو دیکھ کر راکھی کا تھاٹھاٹھا۔ وہ دو تین ماہ کے اندر
لما چکر بیتی کے لگا چکا تھا۔ جب وہ اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوا تو راکھی نے اسے ٹوکا۔
”کہاں جا رہے ہو؟“

”راجہ صاحب کا ذریعہ ایور آیا ہے، شاید وہ راجہ صاحب کا کوئی پیغام لا یا ہے۔ اس کے ساتھ جارہا
لے۔“ ”محسن راؤ نے بے نیازی سے کہا۔

”یہ ڈر ایور، کچھ جیادہ نہیں آئے گا۔“ راکھی نک کر بولی۔
”وہ اصل میں میرادوست بن گیا ہے۔ لاہور آتے جاتے مجھ سے مل کر چلا جاتا ہے۔“ محسن راؤ
بات بیان کی۔

”اچھا، پر جلدی آجائنا۔ میں کہیں راہ ہی نہ دیکھتی رہوں۔“
”راکھی، تجھے مجھ سے کیا کام ہے۔“

”مجھے تم سے کوئی کام نہیں ہے۔؟ راکھی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔“ بس تم جلدی
بات بیان کی۔

”اچھا! یہ کہہ کر گھر سے باہر نکل آیا۔
”لا دلوں ساتھ ساتھ چلتے گے۔ ابھی بستی میں کوئی بات کرنا مناسب نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں
تھے ماسنے پکے کے مکان بنے ہوئے تھے۔ ان کی بات کوئی بھی سن سکتا تھا۔
جب بدوں دلوں بستی سے باہر نکل آئے تو اس نے محسن راؤ سے کہا۔ ”میں اپنے ساتھ ایک جوگی کو
کر آیا ہوں۔“ ”تو یہی کو“ محسن راؤ کو کہجھ ملے۔ ”آؤ۔“ ”کہا۔“ ”کہا۔“

”یہ لوگ بھی جادو جانتے ہیں یہ سب لوگ ایک ہی تھیں کے پیچے بے ہوئے ہیں، شیطان
پیلے۔!“ ہدایت اللہ نے پہنچتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس کے بس کی بات نہ ہوئی تو پھر اسی سے کسی اور
منزوں لے کاپتے کروں گا۔“
”ٹھیک ہے پھر شام کو آکر مجھے بتانا اور دیکھو ایک بات کا خیال رکھنا راجہ صاحب کو اس بات کا پڑے۔“

”آپ بے فکر رہیں لی بی۔“ ہدایت اللہ نے بڑے لیقین سے کہا۔
ہدایت اللہ بڑے کام کا اور بڑے اعتقاد کا آدمی تھا اسی کی بہت تھی کہ اس نے جان ہتھی پر کوئی
نادرہ کو محسن راؤ سے ملا دیا تھا، وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جس دن بھی راجہ صاحب کو یہ معلوم ہو
کہ ان کی بیٹی کو اس نے مداریوں کی بھتی پرخدا دیا ہے تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔
جب پہلی بار نادرہ نے محسن راؤ سے ملاقات کی خواہش کی تھی تو ہدایت اللہ نے دبے لفظوں میں
سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی وہ بھلا کمان مانے والی تھی، اس۔
بڑے لیقین سے اس سے کام تھا کہ اگر وہ نہ گیا تو وہ ایکی اس سے ملنے چلی جائے گی اور پھر لوٹ کر بھی نہیں
آئے گی، اس کی اس دھمکی پر وہ اس کا ساتھ دیئے پر جبور ہو گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہو گی تو اس
صاحب زندہ درگور ہو جائیں گے۔ نادرہ ان کی الکوئی اولاد تھی جس طرح کسی دیوکی جان کی طوطی
ہوتی ہے ویسے ہی راجہ صاحب کی جان نادرہ میں تھی۔

دوسرے دن ہدایت اللہ نے جوگی رام پال سے ملاقات کی، وہ ہدایت اللہ کو اچھی طرح جانتا تھا کہ
کئی بار راجہ ہرام گمراہ اپنی گڑھی میں ملا پکے تھے۔ راجہ صاحب کھیل تھا شے کے بہت شوقیں تھیں
ان کا بس چلتا تو اپنی گڑھی کے سامنے ہی میلے گوا لیتے، کھیل تھا شے کے سارے انتظامات ہدایت اللہ
کرتا تھا جب بھی راجہ صاحب کو سانپ اور نینوے کی لڑائی و کھانا ہوتی تو بوجی رام پال کو بلوچتے۔
آج صبح یہی صبح جوگی رام پال نے ہدایت اللہ کو اپنے دروازے پر دیکھا تو اس کی بچھیں کھل گئیں
سمجھا کہ راجہ صاحب کا بلادا آگیا اس نے بڑی عزت سے ہدایت اللہ کو اپنے گھر میں بٹھایا اور پہا
”سب خیر ہے بابا.....؟“

”ہاں سب خیر ہے جوگی..... ایک کام ہے تم سے۔“ ہدایت اللہ برہا راست مطلب پر آیا۔
”ہاں بولو!...! ہاں بولو بابا!“ وہ ہمسہ تن گوش ہو گیا۔
”تم جادو کا توڑ جانتے ہو یا زرے سپیرے ہی ہو.....؟“

”ارے بابا سپرے تو ہم خاندانی ہیں پر جادو بھی جانتے ہیں۔ جادو ہم نے ایک بہت بڑے شیکا۔
سیکھا ہے۔ بولو کرنا کیا ہے۔“

”جادو کا توڑ کرنا ہے اور کچھ نہیں کرنا جو بولو گے وہ مل جائے گا۔ فرج کی بالکل گفر
کرنا۔“

”ٹھیک ہے بابا۔ کس پر سوار ہے جادو.....؟“
”کیا اس بندے کو یہاں لانا ہو گا؟“ ہدایت اللہ نے پوچھا۔

"اے نادرہ بی بی نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ کو جو گئی کی ہدایت پر عمل کرنا ہو گا؟"
"کہاں ہے وہ جو گی؟"

"میں اسے پل سے ذرا آگے ایک درخت کے نیچے بٹھا کر آیا ہوں۔"
پھر جب وہ دونوں پل کے اس پار ڈھلان اتر کر پہنچ تو جو گی رام پال ان دونوں کا منتظر تھا،
ایسی تھی کہ یہاں کسی کی نظر پڑنی مشکل تھی۔

جو گی رام پال نے اسے بغور دیکھا اور پھر اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھ گیا،
رام پال نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ چند منٹ اس نے کوئی منتظر پڑھا اور پھر
اپنے دل میں کسی پرندے کا نام سوچ لوا۔

"سوچ لیا۔" "محسن راؤ نے فرو کہا۔

"اپنی آنکھیں بند کر لوا۔" "جو گی رام پال بولا۔

"کر لیں۔" "محسن راؤ نے کہا۔

جو گی رام پال نے پھر محسن راؤ کی آنکھوں کے سامنے اپنی ایک ہتھیلی کی اور بولا۔ "آنکھیں
کھولنا۔ آنکھیں کھولے بغیر میری بات کا جواب دنا۔ کیا تمیں میرا ہاتھ نظر آ رہا ہے۔"
"نمیں۔" "محسن راؤ نے جواب دیا۔

جو گی رام پال نے پھر کوئی منتظر پڑھا اور بولا۔ "اب کچھ نظر آ رہا ہے؟"

"جو پرندہ میں نے سوچا تھا، وہ سامنے بیٹھا ہوا نظر آ رہا ہے۔" "محسن راؤ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ابھی آنکھیں مت کھولنا۔ ابھی تمیں میرا ہاتھ بھی نظر آئے گا۔"

پھر رام پال نے کوئی منتظر پڑھا اور پوچھا۔ "اب دیکھو۔"

"وہ پرندہ غائب ہو گیا۔ اب اندر ہیرا ہے۔ اندر ہیرا چھٹے لگا۔ اوہ۔ اب میں تمہارا ہاتھ کا
ہوں۔"

"شکر ہے بابا۔ اب میری ہتھیلی میں غور سے دیکھو۔"

محسن راؤ کی آنکھیں بند تھیں۔ بند آنکھوں سے وہ جو گی رام پال کی ہتھیلی کو غور سے دیکھ رہا تھا
تو اس میں ہاتھ کی لکڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ لیکن پھر فروائی وہ لکیرس دھنڈ لائیں اور ایک
تصویر سامنے آگئی۔

یہ ایک جیتے جا گئے سانپ کی تصویر تھی۔ وہ کنڈی مارے اور پھر پھیلائے جھوم رہا تھا۔

"بابا۔ کچھ نظر آ رہا یا؟" جو گی رام پال نے پوچھا۔

"ایک سانپ نظر آ رہا ہے جو پھر پھیلائے لے رہا ہے۔" "محسن راؤ نے جو دیکھا، وہ بتایا۔

"کس رنگ کا سانپ ہے؟" جو گی رام پال نے پوچھا۔

"ایک دم کالا ہے اور جنکیلا۔" "محسن راؤ نے جواب دیا۔

"اس کے پھن کو غور سے دیکھو۔"

"جس کے سارے کردار ہے، میرا ہوں۔"

اس کے پھن پر کسی تم کا کوئی نشان ہے کیا بابا۔"
"ایں۔ ہاں، ایک دائرہ سا ہے۔" "محسن راؤ نے جواب دیا۔
"غور سے دیکھو۔ یہ دائرة کسی پرندے کی آنکھ جیسا ہے۔؟"
"ہاں ہے تو۔" "محسن راؤ بولا۔
"بالکل اسی پرندے کی آنکھ جیسا جو تم نے سوچتا۔"
"ہاں بالکل۔"
"کیا اس پرندے کا نام اُلو ہے؟"
"ہاڑ، جو گی۔"
"کیا تمیں اب بھی، وہ سانپ نظر آ رہا ہے۔"
"نمیں۔"
"میرا ہاتھ دکھائی دے رہا ہے۔"
"وہ بھی نمیں۔"
"ٹھیک ہے، اب تم اپنی آنکھیں کھول لو۔"
محسن راؤ نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اسے کچھ دیر تک کچھ نظر نہ آیا۔ تھوڑی ویرتنک وہ آنکھیں کھولتا۔
اور بند کر تاہم اب جا کر اس کی آنکھوں کی روشنی بحال ہوئی۔
"جاو، بیلا۔ اب تم جاؤ۔" اس نے محسن راؤ سے کہا۔
محسن راؤ فوراً کھڑا ہو گیا۔ وہ کھڑا ہوا تو اسے چکر سے آگئے۔ اس نے فوراً ہدایت اللہ کا ہاتھ پڑا
لیا۔ "کیا ہوا؟" ہدایت اللہ نے کفرمندی سے پوچھا۔
"کچھ نمیں۔ ایسے ہی سر گھوم گیا تھا۔" "محسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھا، جو گی مباراک، آپ اور ہری۔ میٹھیں۔ میں انہیں بھتی تک چھوڑ کر آتا ہوں۔" ہدایت اللہ
نے کہا۔
"ٹھیک ہے جاؤ پر جلدی آتا بابا۔ ابھی واپس بھی جانا ہے۔" جو گی رام پال نے کہا۔ وہ دونوں جانے
گئے تو اپنے کر رام پال کو کچھ یاد آیا۔
"سنوبیا۔" جو گی رام پال نے پکارا۔
"ہاں، کیا ہوا جو گی مباراک۔" ہدایت اللہ نے پلٹ کر پوچھا۔
"اس سے پوچھو، یہ یہاں سے نکلنا بھی چاہتا ہے کہ نمیں۔"
"کیوں محسن صاحب، آپ کیا کہتے ہیں۔"
"ہاں جو گی، میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ فرار ہونا چاہتا ہوں۔" محسن راؤ نے بے
زاری سے کہا۔
"ہدایت اللہ تم نے بتایا تھا کہ وہ راجح مداری اپنے گلے میں کوئی چیز لٹکا رہتا ہے۔ کسی جائز کا پنج

وغیرہ؟ جوگی رام پال نے سوالیہ انداز میں تذکرہ کیا۔
”ہاں جوگی جی۔ راج ماری کے گلے میں آلو کا پنجھ ہوتا ہے؟“ ہدایت اللہ کے بجائے محن راؤ
جواب دیا۔

”بaba، کیا تم وہ پنجھ اس کے گلے میں سے نکال سکتے ہو؟“ جوگی نے پوچھا۔
”کام ہے تو مشکل پھر بھی کوشش کروں گا۔“ محن راؤ نے کہا۔
”شاباش۔ اگر تم نے اس کے گلے سے پنجھ کاٹ لیا تو میرا کام آدھارہ جائے گا۔ اس کی طرز
آدمی رہ جائے گی۔ مجھے اسے پچھاڑنے میں آسانی رہے گی۔“ جوگی رام پال بولا۔
”دیکھو، میں کرتا ہوں کوشش۔“ محن راؤ نے کہا۔ ”آؤ، ہدایت اللہ پلو۔“
پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پل پر آئے راستے میں اس نے بتایا۔ ”نادرہ بی بی کل لہ
جاتے ہوئے تم سے ملنے آئیں گی۔ اس نہر کے پل پر کل ہمارا انتظار کرنا۔“
”کس وقت؟“ محن راؤ نے پوچھا۔

”شام تو ہو ہی جائے گی۔“ ہدایت اللہ نے بتایا۔
”ٹھیک ہے، میں پل پر آجائوں گا۔“ محن راؤ نے وعدہ کر لیا۔
ہدایت اللہ نے محن راؤ کے جانے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کی اور جوگی رام پال کو بھاکر بہرام گهر کا
کیا۔ بہرام گهر پنجھ کر اس نے جوگی رام پال کو اس کی بستی کے نزدیک ایک اور گڑھی کی جانب را
ہو گیا۔ نادرہ اس کی بے چینی سے منظر تھی۔ اس نے جوگی رام پال اور محن راؤ کی ملاقات کا آنکھ
دیکھا حال کہ سنایا اور جو کچھ وہاں پیش آیا، وہ بھی بتادیا۔

ساری باتیں سن کر نادرہ نے پوچھا۔ ”اب جوگی رام پال کا کیا پروگرام ہے۔؟“
”بی بی، کیسا پروگرام؟“ ہدایت اللہ نے وضاحت چاہی۔
”محن کو جادو کے اثر سے نکالنے کا پروگرام اور کیسا پروگرام۔“
”وہ چارہ تھا کہ جادو کے توڑ کے لئے سخت محنت کرنا ہوگی۔ اسے کئی راتیں جنگل میں رہ کر جاپ
ہو گا۔ اس کے بعد سانپ اپنا کام دکھائے گا۔ یہ سانپ وہی ہو گا جو محن صاحب کو جوگی کے ہاتھ میں
آیا تھا۔ جوگی رام پال کے عمل کے بعد وہ جنگل سے برآمد ہو گا۔ جوگی رام پال اسے کپڑوں پر پانی پانداز
بند کرے گا اور پھر وہ راج ماری کے گھر کی طرف رو انہے ہو جائے گا۔ وہ سانپ وہاں کیا کرے گا
جوگی سماں نے نہیں بتایا، بس اتنا ہی کہا کہ اس کے بعد محن صاحب آزاد ہو جائیں گے۔
”اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔“ نادرہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”کتنی رقم مانگتا ہے۔“

”وہ کہتا ہے کہ جوں جائے گا لے گا۔“
”تم نے اے یہ تو نہیں بتایا کہ یہ کام کون کروانا چاہتا ہے۔“
”بی بی، آپ کیا بات کرتی ہیں۔ میں بھلا آپ کا نام لوں گا کیا؟ ویسے اے اس سے غرض نہیں
کہ کون محن صاحب کے اوپر سے جادو شرم کرنا چاہتا ہے۔ اے تو بس پیسے مطلب ہے۔“
”تے کمک قدم۔“

آؤ۔“

”ہاں بی بی، کچھ رقم پیشگی دے دی جائے تو اچھا ہے۔ اس کی دلچسپی بڑھ جائے گی۔“

”چلو، ٹھیک ہے۔“ نادرہ نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ ”یہ لو۔“

وہ سوسو کے دس نوٹ تھے۔ ہدایت اللہ وہ رقم جوگی رام پال کو دے آیا۔ ایک ہزار روپے دیکھ کر جوگی رام پال کے چہرے پر رنگ آگیا۔ پھر جب ہدایت اللہ نے اسے بتایا کہ کام ہونے پر اسے مزید رقم لئے گی تو اس کی خوشی کی کوئی اختیار رہی۔ وہ بہت دیر تک ہدایت اللہ سے اس جادو کے توڑ کے بارے میں باہم کرتا رہا۔

دوسرے دن حسب وعدہ نادرہ شام ڈھلنے پل پر پنجھ گئی۔ وہاں محن راؤ پسلے سے موجود تھا۔ پھر وہ دونوں پل کے دوسرے کنارے پر پنجھ کر ڈھلان اتر گئے اور درختیں میں غائب ہو گئے۔ ہدایت اللہ پل پر کراہو کر بیٹھنے پانی میں ڈوبتے سورج کا ناظرہ کرنے لگا۔ اتنا کہ صورتیں بھی ٹھیک ابھی شام گھری نہیں ہوئی تھیں لیکن درختوں میں خاص اندر ہیرا اچھل چکا تھا۔ اتنا کہ صورتیں بھی ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ تب نادرہ نے محن کا ہاتھ تھام لیا اور بہت پیار سے بوی۔ ”کیسے ہو محن؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ محن راؤ نے رسما کہا۔

”میں نے تمہاری نجات کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ جوگی رام پال چار دن کے بعد ادھر آئے گا۔“
یہاں جنگل میں رہے گا۔ عمل کرے گا۔ اور پھر امادوں کی رات تمہیں اس سحر سے آزادی مل جائے گی۔ محن سوچو وہ صح کس قدر حسین ہو گی۔ جب تم کمیں بھی جانے کے لئے آزاد ہو گے۔“
”میں تمہارے اس احسان کو زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“

”مجھے بھول جاؤ گے۔“ نادرہ نے پس کر کہا۔

”لیکا بات کرتی ہو؟“ وہ پریشان ہو کر بولا۔

”آزادی ایسی ہی چیز ہے۔“

”میں آزاد کہاں ہوں گا۔ ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں چلا جاؤں گا۔“

”کس کی قید میں؟“

”ارے بھول گئیں، تم نے پہلی ملاقات میں کیا کہا تھا۔“

”کیا کہا تھا۔“

”بے گل ہو گا، میں اس کی قید سے نکال کر تمہیں اپنا قیدی بنالوں گی۔ یہی کہا تھا۔“ محن راؤ
نے کہا۔

”لیکا تم سہرے قیدی بننے کے لئے تیار ہو۔“ نادرہ نے پوچھا۔

”پہلے بھی اقرار کیا تھا، اب بھی اقرار کرتا ہوں۔ تمہارا قیدی بن کر مجھے خوش ہو گی۔“

”لیکا تم اس قید سے نکل کر میرے ساتھ بہرام گھر چلو گے۔“

”فرور چلوں گا مگر یہ جاؤ کہ گڑھی بہرام گھر کے دروازے مجھ پر کھل جائیں گے۔؟“ محن راؤ نے

پوچھا۔

”اے میں نے بتایا کہ تم پل پر ہو گے۔ تم یہاں شام کو آکر کھڑے ہو جاتے ہوں۔“
 ”اس نے کیوں بتایا ہے؟“ محسن راؤ نے فوراً موضوع بدل دیا، وہ ڈر اکیس کوئی اور بات نہ اس کے
 نہ سے نکل جائے۔
 ”مجھے نہیں معلوم چل کر پوچھ لو۔“

”چلو۔“

راکھی نے اس کا ہاتھ تھام کر چلانا چلا لیکن محسن راؤ نے بت زمی سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑالیا اور
 تیر بیٹھنے لگا۔ اگرچہ کمل انڈھیرا تھا لیکن اسے بستی کا راستہ از بر تھا، وہ جانتا تھا کہ راستے میں کہاں کچھ زیادتی ہے اور کہاں گڑھا ہے۔ برسوں ہو گئے تھے ان راستوں پر چلتے ہوئے۔

”محسن۔“ راکھی جو پیچھے رہ گئی تھی اس نے زور سے آواز دی۔
 ”ہاں، کیا ہوا؟“ محسن چلتے چڑ رک گیا۔

”محسن، ایک بات پوچھوں تو چجھتاوے گے۔“ وہ اس کے برابر آگئی۔ اس کے لبھے میں جانے کیا
 بات تھی۔

”راکھی، کوئی ایسی وسی بات نہ پوچھ لینا، کیا پتہ میں چج کہہ سکوں یا نہیں۔“ محسن راؤ ایک انجانے
 خوف میں مبتلا ہو کر بولا۔ ”اگر تم کچھ جانتی ہو تو بتہ ہو گا کہ اسے ڈر اکیس خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔“

”تم کتنے کھوڑ ہو محسن۔“ راکھی جیسے سک کر بولی۔

محسن راؤ نے جواب میں کچھ نہ کہا، بس اس کا ہاتھ چھڑ لیا۔ اور اسے بستی میں لے آیا۔ وہ اس کے
 جذبات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اب اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ نادرہ کے ساتھ ملاقاتوں سے غافل
 نہیں ہے۔ جب کوئی کسی سے پیار کرتا ہے تو وہ اس سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ
 خود کو غافل ظاہر کر کے۔

راکھی نے آج تک اس سے کھل کر بات نہیں کی تھی۔ بس اشاروں اشاروں میں ہی اپنی پسندیدگی کا
 اندر ہار کیا تھا۔ محسن راؤ نے اس کے اشارے سمجھتے ہوئے بھی اس کے کسی اشارے کا جواب نہیں دیا تھا۔
 محسن راؤ نے راستے میں سوچا ہو سکتا ہے کہ وہ نادرہ کے بارے میں کچھ جانتی ہو۔ اور اپنے جو اے
 کوئی آج گلوانا چاہتی ہو، کسی نتیجے پر پہنچا چاہتی ہو۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بات ادھوری رہ گئی
 تھی۔ اور اسے فی الحال کمل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ محسن میں داخل ہوا تھا تو راج مداری سامنے ہی موڑھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر دو
 پالیں پر رچکھ بیٹھا ہوا تھا اور بائیں ہاتھ پر بندر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ دونوں جانوروں کے سرپر رکھے
 ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے دیوار میں گڑھی ہوئی کیل میں لاثین لٹکی ہوئی تھی۔ پیچھے سے پڑتی ہوئی روشنی
 میں وہ تینوں عجیب و غریب دکھائی دے رہے تھے۔ بعد پر اسرار اور خوف میں جلا کر دیئے
 والے۔

”راکھی، یہ تو ہے کاں (کہاں) مٹا رے۔“ راج مداری نے بڑے پر اسرار لبھے میں پوچھا۔
 ”وہیں پاپ، جہاں میں نے بتایا تھا۔“ راکھی نے سادگی سے جواب دیا۔

”میرے ہوتے ہوئے کون وہاں کے دروازے بند کر سکتا ہے۔ میرا نام نادرہ ہے۔ میں کوئی بزرل
 لڑکی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے بابا جان کو بتایا ہے کہ میں وقار سے شادی نہیں کروں گی۔“ نادرہ میں
 اکشاف کیا۔

”پھر انہوں نے کیا کہا۔؟“

”میرے بابا جان مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہیں میرے انکار کا فوس تو ہوا لیکن انہوں نے
 روایتی پاپ کی طرح میرے انکار کو اپنی اندازہ نہیں بنایا۔ انہوں نے کہا کہ جس کی وجہ سے تم اپنے
 کھڑا کر دوں گی اور کہہ دوں گی کہ یہ ہے وہ وجہ۔“ نادرہ نے بتایا۔

”پھر جانتی ہو، اس کے بعد کیا ہو گا۔“

”کیا ہو گا محسن جی۔“

”وحاصیں دھائیں، دو گولیاں چلیں گی اور محسن راؤ خون میں لت پت زمین پر لوٹ لگا رہے ہوں
 گے۔“

”اگر ایسا ہوا تو پہلی گولی میں اپنے سینے پر کھاؤں گی۔“ نادرہ نے وعوی کیا۔

”سچ کرتی ہو۔“ محسن راؤ کو یقین نہ آیا۔

”جموٹ اور جج کا پتہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ اب اس وقت میں کیا کہوں۔“
 نادرہ کو لاہور جانے کے لئے دیر ہو رہی تھی، وہ اگلی ملاقات کا پروگرام طے کر کے مستقبل کے سال
 خواب دیکھتی لاہور چلی گئی۔ محسن راؤ دیر تک کھڑا اس کی گاڑی کی سرخ تی کو دیکھتا رہا، جونہ جانے کب کا
 دکھائی دینا بند ہو گئی تھی لیکن وہ اسی فرضی نقطے پر نظریں جھائے دیکھے جا رہا تھا۔

اندھیرا گمراہ چکا تھا۔ دور بستی میں کہیں کہیں روشنی نظر آری تھی۔ باقی تینی اطراف میں سنا طالرانی
 تھا۔ محسن راؤ بھی سوچ ہی رہا تھا کہ واپس بستی میں چلے کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ
 کا باؤ محسوس کرتے ہی محسن راؤ ایک دم سم گیا۔ یہ ایک نرم ملامم دباو تھا۔ وہ اپنے آپ میں کمال تھا۔
 وہ تو نادرہ کی باتوں میں کھویا ہوا تھا۔ سندر سپنے دیکھا تھا اچانک اسے کسی نے ہلا دیا۔
 وہ سمجھ گیا کہ آنے والا کون ہے لیکن اس کی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آنے والا یہاں کیوں آتا

ہے۔

”یہاں، کیوں کھڑے ہو، محسن؟“ آنے والے نے پوچھا۔

”بس ایسے ہی کھڑا ہو گیا تھا، نمر کے بستے پانی کو دیکھ رہا تھا۔“

”ایسے اندر ہرے میں۔“

”اندھیرا تواب ہوا ہے۔“ محسن نے صفائی پیش کی۔ ”تم کیوں آئیں ہو را کہی؟“

”تمہیں پاپ نے پلایا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں پل پر ہوں۔“

خون نکل آیا۔ اس نے اپنے گلے سے الٹو کا پنج بخرا۔ اور کوئی متز پڑھتے ہوئے اس پنج کی ایک ایک انگلی پر خون لگایا پھر اس خون آلو دینچے کو اس کی پیشانی پر بیسرا، اس کی پیشانی پر خون کی لیکر بن گئیں۔

”بس جامسنا، اندر کمرے میں جا۔ اب تو نے کمرے سے سورج نکلنے سے پلے نہیں لکھتا ہے رے۔ سمجھ گیا نہ میری بات۔ چاہے تو ہے کوئی کتنا ہی پکارے۔ دیکھ اگر اس کی پکار پر باہر نکل گیا تو تباہ جان لے کر انہا ہو جائے گارے۔“

”ٹھیک ہے، بپا، میں اندر جا رہا ہوں۔ اب صبح ہی باہر نکلوں گا۔“ محسن راؤ نے اسے یقین دلایا۔

راج مداری بہت عیار آدمی تھا، یہ سارا چکر اس نے محسن راؤ کو جادو سکھانے کے لئے نہیں چلا یا تھا۔ یہ چکر اس نے محسن راؤ کو مکمل طور پر اپنا مطیع بنانے کے لئے چلا یا تھا۔ نادرہ سے طبلے ہوئے راکھی نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے راج مداری کو بتا دیا تھا۔ راج مداری زمانہ شناس آدمی تھا، اس نے اندازہ لگایا کہ چند دنوں میں طوطا اڑنے کے قابل ہو جائے گا لہذا اس نے نہ صرف اس کے پر کاشتے بلکہ ایک بڑے بھرے میں بند کرنے کا بندروست کر لیا۔

اور راج مداری، محسن راؤ کو مزید قید میں جکڑتے کی کوشش کر رہا تھا تو ادھرام پال جو گی نے اسے آزاد کرنے کا مغل شروع کر دیا تھا۔

جو گی رام پال نے بازار سے ایک گز کالا کپڑا، ایک نیا استر اور ایک کوری مٹی کی ہٹڈیا خریدی۔ رات کو اس نے بھتی سے نکل کر ایک پیلی کی جھیں جھوٹا سا گڑھا کھودا ہٹڈیا کو اس میں رکھ کر دیکھا۔ ہٹڈیا اس میں پوری طرح نہیں آئی۔ اس نے گڑھے کو تھوڑا سا اور کشاہد کیا۔ جب ہٹڈیا پوری طرح اس گڑھے میں یتھے گئی تو وہ گڑھے کو یوں ہی کھلا پھوڑ کر ہٹڈیا کو اپنے ساتھ لے آیا۔

گھر میں اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ جلتی لاٹیں کو نہیں پر رکھا۔ پھر ہٹڈیا، استر اور کام کڑے کو لے کر وہ زمین پر آس جا کر بیٹھ گیا۔ ہٹڈیا کو اونڈھا کر کے اس نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ودق و دق نے وہ استر سے کوہ ہٹڈیا پر مارتا جاتا تھا۔ پھر اس نے ہٹڈیا کو سیدھا کیا، کام لے کر چڑے کو اپنے نکھلے پر ڈالا۔ استر ہاتھ میں پکڑا۔ اور پھر دوسرے ہاتھ سے لاٹیں کی چمنی اٹھا کر اس میں پھونک دیں۔ جلتی لاٹیں بھڑک کر بجھ گئی۔ کمرے میں مکمل تاریکی چاہی۔

جو گی رام پال نے اپنے کنھے سے کالا کپڑا اتارا اور تیر استر سے کاٹ کر اس کے تین نکلوے کر دیئے۔ پھر کام لے کر چڑے کے دو ٹکڑوں اور استر سے کوہ ہٹڈیا میں ڈال دیا اور تیر سے نکلوے کے نہیں پہنچنے دیا۔ اور اندر ہیسے میں ہی ہٹڈیا کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر گھر سے نکل پڑا۔

غیرہ یتھے گی جاں اور ہٹڈیا پر چھوٹکا جاتا تھا۔ یہاں نکل کر دیکھ کے باہر اس پیلی کے درخت کے پلے اپنے پیسیں ہاتھ سے گڑھے کو مٹالا۔ گڑھے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی سے گڑھا بھرا ہوا محسوس کر کے اسے بیٹی خوشی، ہوئی۔ اس کا عمل کامیابی کی طرف گامزن تھا۔ جو گی رام پال نے وہ بند ہٹڈیا اس گڑھے

”نہ روا لے پل پر؟“ راج مداری نے تصدیق چاہی۔

”ہاں، بپا۔“ راکھی نے ابیات میں گردن ہلائی۔

”او، رسیا۔“ راج مداری اپنے بندر سے مخاطب ہوا۔ بندر اپنا نام سنتے ہی اس کی گود میں آبیو ری پچھے اپنے دو پاؤں پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ارے، میری گود میں کیوں چڑھ گیا رے رسیا۔ جامیرا چاقو کا نام سن کر محسن راؤ کی سی گم ہو گئی۔

راج مداری کا حکم سنتے ہی رسیا اس کی گود سے کودا اور چھلانگیں لگاتا ہوا اندر کمرے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے منہ میں چاقو دباؤ تھا۔ نزویک آکر وہ دو پاؤں پر کمز نکال لیا۔ اسے کھولا تو پھر اچھے لمبا چھل لاثین کی دھنڈی روشنی کے باوجود یکبارگی چک اٹھا۔ محسن کھلے ہوئے چاقو کو دیکھ کر سسم گیا۔ اسے یوں لگا جیسے راج مداری یہ چاقو پھیک کر اس کا دے گا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر فوراً راکھی کی آڑ میں ہو گیا۔

”ادھر آرے چورا۔“ راج مداری نے اسے اپنے نزویک آنے کا اشارہ کیا۔ راکھی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ مجرما آگے بڑھا۔ اور اس کے نزویک پہنچ کر خاموشی کھدا ہو گیا۔

”ویکھ مختنا، ما (میں) نے تجھے بہت سے کام سکھا دیئے ہیں رے۔ اب تجھے وہ کھیل سکھانا رے جس کی وجہ سے تمی جان بیگی۔“ راج مداری نے کہا۔

یہ سن کر محسن راؤ کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ نادرہ سے ملاقاتوں کا راز کھل گیا ہے اب اسے سزا ملے والی ہے۔ محسن راؤ نے گمراہ ٹھنڈا سانس لیا اور بولा۔ ”ہاں، بپا، سکھا۔“ سات دن کے بعد اماوس کی رات آنے والی ہے۔ یہ عمل آج سے سرو (شروع) ہو گا اور الہ کی رات کو پورا ہو گا۔ اماوس کی رات کو توجھکل میں ہو گا، ذرمت، میں تیرے ساتھ چلوں گارے۔ بارہ بجے ایک کھاس عمل کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد تو ایک برا جادو گر بن جائے گارے۔ پر محنتا بات تباہ، برا جادو گر بن کر تو موبہ ہے چھوڑ کر تو نہیں چلا جائے گارے۔“ راج مداری نے پوچھا۔

”کیسی بات کرتے ہو بپا۔ میں جھیں چھوڑ کر کیوں جاؤں گا بھلا۔“

”تمہارا کیا بھروسہ ہے محسن۔“ راکھی نے اس کے نزویک آکر آہستہ سے کہا۔ اتنی آہستہ کہ مداری نہ سن پا یا۔

”لاپتا ہاتھ آگے بڑھا۔“ راج مداری نے کہا۔ پھر راکھی سے مخاطب ہو کر بولा۔ ”راکھی ہٹ۔“

”یہ لے بپا۔“ راکھی پیچھے پہنچتے ہوئے بولی۔ ”ہر کوئی مجھے پیچھے ہٹاتا ہے۔“ راج مداری نے راکھی کی بات پر کوئی توجہ نہ دی لیکن محسن راؤ نے اسے مزکر ضرور دیکھا۔ راج مداری کا ہاتھ کپڑلیا۔ اور چاقو سے اس کے انگوٹھے پر ہلکا سا چرچا گیا۔ چاقو کی دھار بہت تیز تھی۔ فہ

تھا کہ وہ جنگل میں ایک ہفتہ بھی رہتا تو سامان ختم نہ ہوتا۔ ایک گھنے ورخت کے نیچے اس نے پنا ایک سماں یہ لگای تھا۔ سانپوں کی کمی پناریاں وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ ان پناریوں میں مختلف سانپ بندر ان میں ایک سانپ بہت خطرناک تھا اتنا خطرناک کہ اگر محض پھنکار مار دے تو گھاس جل جاتی تھی اماوس کی رات ہنسنے اور انوار کی درمیانی شب کو تھی۔ ہنسنے کو محسن راوی، جنگل کا چکر لگا گیا تھا۔ اس جوگی رام پال کو ہدا یا تھا کہ وہ راج مداری کے گلے سے اٹو کا پنج نکالنے نے ناکام رہا ہے۔ جوگی رام نے اسے تل ولی کہ وہ فکر نہ کرے۔ راج مداری اب اس کا پچھنہ نہ بگاؤ شکے گا۔ جوگی رام پال نے مداری کا استعمال شدہ کپڑا منگوایا تھا، محسن راوی اس کی ایک وحشی اخلاقی تھا۔ جو اس نے جوگی رام پال کو حوالے کروی۔

محسن راوی نے اسے یہ بھی ہدا یا تھا کہ اماوس کی رات وہ بھی اسی جنگل میں ہوں گے، یہ سن کر خوش ہو گیا تھا۔ اور اس نے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین و لا یا تھا۔ اوہ رناورہ ایک ایک ون گن کر گزار رہی تھی۔ اسے محسن راوی کی آزاوی کا شدت سے انتقالرا طے یہ ہوا تھا کہ وہ انوار کی شام کو محسن راوی کو لینے کے لیے آئے گی۔ اس نے کملوایا تھا کہ اپنا اس سامان باندھ کر رکھے۔ اور مقررہ وقت پہلے پل کے نزدیک مقررہ جگہ پر پہنچ جائے۔ وہ اسے فراہرا لے جائے گی۔

پھر ایک نئی اور خوشبو بھری زندگی کا آغاز ہو گا۔ اوہ رناکھی کو اماوس کی رات کا شدت سے انتقالرا طے کر جو گھر بن کر رج جائے گا۔ پھر ایک پر بھار اور لکھن سفر کی ابتداء ہو گی۔ ہر شخص اپنے اپنے داؤ پر لگا ہوا تھا۔ امیدیں اور آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ وقت کا دھارا ہے تھا۔

آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ آدمی جو سوچے وہ ہو جائے تو پھر تقدیر اپنے کیبل و کھائے۔ یہ لوگ اپنے اپنے کھیلوں میں لگے ہوئے تھے اور تقدیر وور پیٹھی اپنا ہی جال بن رہی تو اماوس کی رات۔ تاریک اور سیاہ۔ جنگل کا پر بیہت سناٹا۔ جوگی رام پال اور راج مداری ایک دو سے بیگانہ اپنے اپنے منتروں میں مصروف۔

جوگی رام پال نے وقت مقررہ پر ہندیا کامنہ کھولا۔ اندر سے سیاہ کپڑے کے دونوں گلڑے نکلے۔ انیں زمین پر اس طرح رکھ کر صلیب کی شکل اختیار کر گئے یا یوں سمجھ لو کہ آدمی کا ڈھانچہ بن گی۔ جوگی رام پال نے استرا کھول کر کپڑے کو چیز کر اسی جگہ زمین میں گاڑ دیا اور پھر استرے پر ہندیا وی۔

اس کے بعد اس نے وہ کالانگ پناری سے نکلا جس کی ایک پھنکار سے گھاس جل جاتی تھی۔ ناگ پناری سے نکلتے ہی پھنپھیلا کر جوگی رام پال کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جوگی رام پال نے رانہ کی وحشی اپنے ہاتھ میں کپڑہ کر اس کے سامنے لہائی۔ کالانگ نے وحشی ویکھتے ہی اس پر پھنپھن مارا، وحشی پر فراہی سیاہ وہبہ پڑ گیا۔ جوگی رام پال کا لے ناگ نے وحشی ویکھتے ہی اس پر پھنپھن مارا، وحشی پر فراہی سیاہ وہبہ پڑ گیا۔

کوئی متز پڑھ کر یہ عمل تین بار دہرا یا اور پھر وہ وحشی سامنے کی طرف اچھا ہو۔ وہ کالانگ فرا اس کوئی کی طرف پکا اور پھر جنگل کی زمین پر بڑی سرعت سے پھنس لے گا۔

کالانگ ابھی طرح جانتا تھا کہ اس نے کیا کرتا ہے اور کہ رج جاتا ہے۔ خیریہ بات تو راج مداری بھی ابھی طرح جانتا تھا کہ اسے کیا کرتا ہے۔ اس نے محسن راوی پر اپنا مکمل قبضہ جانے کے لئے چھوپ دن پلے جو علی شروع کیا تھا، اسے آج کی رات مکمل ہو جانا تھا۔

راج مداری رپچھ کی کھال پر بیٹھا دیوانی متز کا جاپ کر رہا تھا۔ محسن راوی اس سے پانچ قدم کے فاصلے پر چڑے ایک بڑے پھر پر بیٹھا تھا۔ ہر سو اندر ہوا۔ محسن راوی اس تصویر سے خوش تھا کہ آج کی رات، اس کے قریبی اخزی رات ہے۔ آئے والی صبح ان ویکھی بیڑوں کے لئے کھلے خبر لے کر آئے گی۔ ایک طرف وہ آزاد ہو جائے گا تو دوسری طرف راج مداری اپنی زندگی کا سب سے قیمتی جادو اسے سکھاوے گا۔ اسے بتتے ہے جادو آتے تھے لیکن اس جادو کی ہیبت پکھ اور ہی تھی۔ اور پسے کٹ کر گرتے اعضا و پیکھ کر لوگ دم بخود ہو جایا کرتے تھے۔ اور اس کھیل کے بعد ان پر نوٹوں کی بارش ہو جاتی تھی۔ خیر اسے پیسے کی بالکل تنشیہ تھی۔ وہ کروڑ کی جانکار کا مالک تھا۔ البتہ شعبدے بازی اپنی زندگی کو لوچپ بنانے کے کام آئے گی۔ پھر جب وہ راج مداری کو اپنے ساتھ لے کر لاہور اپنے گھر پہنچ گا تو اس کے مابین بپ کی حالت قابل دیدہ ہو گی۔

اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ آئندہ اس کی اپنی ہی حالت قابل دیدہ ہو جائے گی۔ جس قید سے نجات کے وہ خواب ویکھ رہا ہے، اس سے کہیں بدتر قید میں چلا جائے گا۔ پھر پہنچے بیٹھے اور سامنے پہنچنے ویکھنے اسے اوں گھر سی آگئی۔

ایک لئے کچھ ہوا۔ اور جو کچھ ہوا، وہ اس کے ہوش اڑاویںے کے لئے کافی تھا۔

راج مداری اچانک ہی کسی جانور کی طرح ذکر کرایا تھا جیسے کسی نے اس کی گروں پر چھری پھیر دی ہو۔ کن را دلے آنکھیں جھاڑ کر راج مداری کی طرف دیکھا گمراہے پکھ نظر نہ آیا۔ رپچھ کی کھال، پھر اس پر پیٹھے خود رپچھ جیسا۔ پیچھے کا لے ورخت مکمل اندر ہرا بھلا کیا نظر آتا۔

”کیا ہوا پاپ؟“ وہ پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”خنا، جلدی کر، میرے پاس آرے چھوڑا۔“ وہ شدت ورد سے کراہی ہوئے بولا۔ کچھ میں فیس آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ شاید مترا لٹا ہو گیا ہے۔ بھر حال جب وہ اندازے کے راج مداری کے نزدیک پہنچا تو اس کے پاؤں کی شکوڑ اس کے سر کو گلی۔ راج مداری نے فوٹھی اس کا ذلیل گھیٹ کر اسے اپنے اوپر گرا لیا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھٹکل بولا۔ ”ویاہ مدد،

”یاہا ہوا پاپ، کچھ بولو تو؟“ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا کر راج مداری کے جسم کو نٹول کر دیکھا چاہا لیکن راج مداری کی گرفت مضبوط تھی، اس نے محسن کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ ”لیاہا مدد، دیواہ آ۔“ اے، دیواہ کہنا شیش، ۴۱

جوگی رام پال کا خیمہ یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ جوگی رام پال کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اس کے چھوٹے سے خیے کا پردہ گراہا تھا اور اندر سے مدھم مدھم روشنی باہر نکل رہی تھی۔ خیے کے اندر سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اندر کوئی نہیں ہے۔

محن راؤ نے بھک کر خیے کا پردہ ہٹایا تو اسے اندر جوگی رام پال دھونی رہا۔ بیٹھا نظر آیا۔ اس کے سامنے کا لے کپڑے کا ایک تپلا سماں ہوا تھا جس کے درمیان میں ایک استراپوست تھا اور اس سے پر ایک ہٹڑا اور مدھم روشنی تھی۔ دائیں طرف ایک کھلی پتاری رکھی تھی۔ جوگی رام پال کی گود میں ایک بین پری تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

جیسے ہی محن راؤ نے خیے کا پردہ ہٹایا، اسی وقت جوگی رام پال نے آنکھیں کھول دیں۔
و دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

”کوئی کیا خبر لائے ہو۔“ جوگی رام پال نے پوچھا۔

”راج ماری..... چل بسا۔“ محن راؤ نے خبر سنائی۔

”بدھائی ہو۔..... آڑاوی مبارک ہو۔“ جوگی رام پال خوش ہو کر بولا۔

”کیا میں آزاد ہو گیا.....؟ میں جہاں چاہے جائیں ہوں۔ اب تو کوئی میرا کلیج نہیں پکڑے گا۔“
محن راؤ نے تمدنی چاہی۔

”ہاں..... تم آزاد ہو گئے۔ تم سارے اوپر سے جادو کا اثر ختم ہو گیا۔ اس کام کے لئے مجھے بت مخت کرنا پڑی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے ایک فیتنگ ناگ سے ہاتھ و حوتا پڑا ہے۔“

”دی کیسے؟“
”راج ماری کو ٹھکانے لگانے کی قیمت چکانا پڑی۔“

”کیا مطلب؟“
”اس کام کے بدلتے اس نے آزادی طلب کی جو مجھے دینا پڑی۔— مجبوری تھی راج ماری کو ٹھکانے لگانے کا کام کوئی اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس ناگ کے علاوہ۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میرا خیال صحیح نکلا۔ واقعی اسے کسی ناگ نے ڈساختا۔“
”ہاں اور ناگ بھی کیسا جس کا کاتا پانی مانگنا تو وورکی بات ہے خود پانی پانی ہو جائے۔ تم نے اس کی لاش تو دیکھ لی ہو گی۔“

”بہت بڑی حالت تھی لاش کی، مجھ سے تو دیکھی نہیں گئی۔“ محن راؤ نے کاپ کر کرنا۔
”اس نے ظلم کیا تھا..... ایک ماں پر زبردستی قبضہ جمایا تھا۔ اسے اس کی سزاوت ملنی تھی۔“ ”جوگی رام پال نے کہا۔

”جوگی مہارا ج۔ میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔“
تباہ۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے اس کام کا معقول مختنانہ لیا ہے۔“ ”جوگی رام پال نے

”بابو اور بابو، کچھ چتا تو؟“

”اب کا ٹیکا دوں رے لوہی کے پچے۔ تو نے کھوب دھو کا دیا رے۔“

”بابو، کیا کہہ رہے ہو، میں تمہیں بھلا کیوں دھو کا دوں گا۔ تم ہی تو مجھے یہاں لائے ہوں گا میں۔“ ”محن راؤ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”اور وہ جو تمہریا پا اور ہر بیٹھا ہے رے، اسے کون لایا رے یہاں۔ موہے اب سب پتہ لگ گیا۔“ رے۔ دیواہ کی تم سب پتہ لگ گیا۔ پر یا در کھ ک، تو ہے میں آ جاؤ نہیں ہونے دوں گا رے۔ دیواہ دو۔“ راج ماری نے کسی کو مدھ کو پکارتے ہوئے کہا۔

راج ماری نے اس کا ہاتھ بست مضمومی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور ایک ہی بات کے جارہا تھا۔ ”دیواہ آ۔ دیواہ دو۔“

راج ماری کا ہاتھ کافی بڑا تھا۔ بت سخت تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ احساس ہوتا تھا جیسے پتھر کا ٹکڑا پکڑ لیا ہے۔ اس وقت جیسے جیسے وہ دیواہ کو مدھ کے لئے پکارتا جاتا تھا، اس کا ہاتھ زرم ڈرامہ تھا۔

”دیواہ کاکی واہ..... دیواہ دو..... دیواہ آ۔“ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں بلا کاکا،“ تھا۔ بلا کا سوز تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہی محن راؤ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔“ انتہائی زرم نازک ہاتھ تھا۔ گداز اور ریشیں۔

راج ماری کی آواز آرہی تھی۔ ”دیواہ، اب یہ تمیرے حوالے میں جاتا ہوں، میں باہوں۔“

راج ماری کی آواز آہست آہست دور ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل محدود ہو گئی۔ پھر ایک جھنکا سا لگا۔ وہ زرم ملام اور گداز ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ راج ماری اپنے ماہ لاثین لایا تھا۔ اس نے کام تھا کہ جب جا پ ختم ہو جائے گا اور محن راؤ کو جادو آجائے گا تو پھر وہ دلف مل کر کھانا کھائیں گے۔ اور کھانا کھا کر سیدھے گھر چلیں گے۔ لاثین راستہ کھانے کے کام آگئی۔

محن راؤ نے آنکھیں پھاڑ کر اور ہاتھوں سے ٹھوٹ کر لاثین تلاش کی۔ جیب سے دیساںی کالا لاثین جلائی۔ پھر اس نے لاثین اپنے ہاتھ میں پکڑ کر جو ذرا اپنچی کی اور لاثین کی مدھم روشنی میں جو کچھ نظر آیا۔ وہ اس کے ہوش اُڑا دینے کے لئے کافی تھا۔

راج ماری کی لاش پکھل چکی تھی۔ لاش کے گرو سیاہ خون پھیلا ہوا تھا۔ محن راؤ کو اندازہ ہوا کہ لاس کی بے حد خطر ناک سانپ نے کاٹا ہے۔ سانپ کا خیال آتے ہی وہ فوراً اس کی لاش سے پیچے ہے۔ اور لاثین کی مدھم روشنی میں اوہ راہر نظر س دوڑا نہ لگا۔ آس پاس کسی سانپ کا وجود نہ تھا۔ اب اس نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا، وہ لاثین اپنے ساتھ لے کر جوگی رام پال کے نیچے کی طرف پڑا۔

میں مطمئن ہو چکا ہو گا کہ اب اس کی راہ میں کوئی کانٹا نہیں رہا۔ وہ خوب چین کی بانسری بجارتا ہو گا۔ پھر اس نے اس کی گشادگی کے بارے میں اس کے والدین کو جانے کی تائید ہو گا۔ بابا اور عمی تو پریشان ہو کر رہے ہیں گئی تھی۔ خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ اب پچھے نہیں رہا ہے۔ زیادہ مضبوط، زیادہ طاقتور اور زیادہ تجربہ کا، ہو چکا ہے، وہ ایک ایک کو دیکھ لے گا۔

فی الحال نادرہ اس کے سامنے کھڑی تھی، ابھی تو اسے دیکھنا تھا۔

جب ہدایت اللہ، محسن راؤ کو ساتھ لے کر گڑھی کے گیٹ میں داخل ہوا تو نادرہ نے فوراً ہی اس کو دیکھ لی تھا۔ وہ سامنے اپنے اپر واپس کر کے کی کھڑی میں کھڑی تھی۔ جیب کے اندر داخل ہوتے ہی چیز ہی اس کی نظر محسن راؤ پر چڑی تو وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ وہ تیری سے نیچے اتر کر گڑھی کے اندر وہی دروازے پر چکھ گئی۔

تمہی ہدایت اللہ، محسن راؤ کے ساتھ گڑھی کے اندر وہی دروازے پر پہنچا۔

نادرہ نے محسن کو دیکھا۔ محسن نے نادرہ کو دیکھا۔ آنکھوں سے آنکھیں لمبیں۔ ہوننوں پر تبسم آیا۔ آنکھوں میں شوق دصال جا گا۔ دونوں بے اختیار ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ ہدایت اللہ کی موجودگی میں جاپ مانع آیا۔ دونوں ترس کر رہے گئے۔

”کمال ہے محسن آپ آگئے!“ نادرہ کے لبجے میں بے پناہ صرفت تھی۔ ”ہم تو شام کو آپ کی طرف آئنے کا پروگرام بنانے پڑھتے تھے۔ بس ہدایت اللہ کے آئے کا انتظار تھا۔“

”تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ نسروالے پل پر پہنچ کر آپ کا انتظار کروں گا۔“ محسن نے ہنس کر کہل۔

”بائی۔ اب آپ کو کون جانے دے گا۔“ نادرہ نے بہت خلوص سے کہا۔ ”میں اس گڑھی میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ لیکن یہ تو تھا یہ، یہ آپ نے اپنا علیہ کیا بہار کھا ہے۔“

”صاحب ہم جگل سے آرہے ہیں۔“ محسن راؤ نے نادرہ کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہل۔ ”اس نے جنگل بننے ہوئے ہیں۔“

”چھا۔۔۔ ہاں..... وہ راجح مداری کے جادو کا کیا بنا؟“ نادرہ نے پوچھا۔

”لبی بی، اس کا حرج روٹ گیا، تمہی تو محسن صاحب آپ کے سامنے موجود ہیں۔“ ہدایت اللہ نے کہل۔

”بال واقعی..... ان کا یہاں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے۔ پر یہ سب ہوا کیسے؟“ نادرہ نے ہاتھ کے شارے سے اندر چلے کو کہا۔ وہ محسن راؤ کو گڑھی کے عالیشان ڈر انگر روم میں لے آئی۔ محسن راؤ ایک صوف پر پہنچ گیا۔ ہدایت اللہ ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔

کرتکیں رام پال کام کا آدمی نکلا۔ میں تو اسے محض سپیرا سمجھ رہی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے“ نہیں۔ وہ محض سپیرا نہیں ہے۔ وہ جادو جانتا ہے، اس نے راجح مداری کے جادو کا توڑ کر کے اسے

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو گی رام پال نے یہ کام معقول معاوضے پر کیا تھا اور اس کی یہ محنت را یہ نہیں گئی تھی۔ ذرا سی غفلت سے یہ معاملہ الٹا ہی ہو سکتا تھا۔ اگر راجح مداری کو سانپ کے آئے کی الٹلنے چند منٹ قبل مل جاتی تو راجح مداری کی جگہ خیز میں جو گی رام پال کی لاش پڑی ہوتی۔

راجح مداری کوئی معمولی چیز نہ تھا۔ وہ اپنے سکبر میں مارا گیا۔ اس کے دماغ میں یہ بات آگئی تھی کہ اس وقت دور دور تک اس سے بڑا جادو گر کوئی نہیں..... کوئی نہیں جو اس کے مقابلے پر آسکے۔ اس کے کھوئے سحر کو توڑ سکے۔ لیکن بعض اوقات یہو بھی ہوتا ہے کہ ہاتھی کو چیزوں کی خوبی پر چھاپ جاتی ہے۔

راجح مداری اس دنیا سے چلا چکا تھا لیکن جاتے جاتے جاتے ایک کرت دھماکا گیا تھا وہ مداری جو تھا۔ اس نے ”دیواہ کالی وادا“ کو پکار لیا تھا۔ اس طرح محسن راؤ آسمان سے گر کر کھجور میں نہیں انکا تھا بلکہ سیر ہوا پاتال میں چلا گیا تھا اور یہ بات اسے معلوم تھی، نہ جو گی رام پال کو۔

وہ رات محسن راؤ نے جو گی رام پال کے ساتھ اس کے خیمے میں گزاری۔ صبح کو یہاں ہدایت اللہ کو آتا تھا۔ اور شام کو نادرہ کو محسن راؤ سے ملنے کے لئے نہر کے پل پر آتا تھا۔ نادرہ نے کام تھا کہ وہ لپا سالانہ لے کر اس بستی کو خیر باد کہہ کر آئے کیونکہ وہ اسے اپنے ساتھ بہرام گفر لے جانا چاہتی تھی۔ صبح کو وقت مقررہ پر ہدایت اللہ آپنے خیم۔ اس نے جو دونوں کو اکٹھا دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھا اسے محسن راؤ کے یہاں ملنے کی توقع نہیں تھی۔

”صاحب جی، آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کا مطلب ہے کہ جو گی مہاراج لے لے چلتا رکھتا دیا ہے۔“ ہدایت اللہ نے جو گی رام پال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہدایت اللہ اس خالم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔“ محسن راؤ نے بتایا۔

”وہ ہے کمال؟“

”جگل میں پڑا ہے۔“

”پھر تو آپ کو یہاں رکنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ اسی وقت میرے ساتھ چلے۔“ مہاراج کو ان کی بستی میں چھوڑ کر ہم گڑھی بہرام گفر چلے جائیں گے۔ نی بی دہاں منتظر بیٹھی ہیں۔ آپ ساتھ دیکھیں گی تو وہ پھر ہر گلر سے آزاد ہو جائیں گی۔“ ہدایت اللہ نے تجویز بیٹھی ہیے محسن راؤ نے مان لی۔

اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ اس علاقے سے اب فوراً نکل جانا چاہتا تھا۔ جو گی رام پال اور ہدایت اللہ نے جلدی جلدی سماں کیٹیا، اسے نزدیک ہی کھڑی جیب میں لادا پھر وہ تینوں بہرام گفر کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ پہر تک وہ بہرام گفر پہنچ گئے۔ جو گی رام پال کو اس کی بستی میں چھوڑا، اور پھر ہدایت اللہ، محسن کو لے کر گڑھی بہرام گفر پہنچا۔ اس گڑھی کو دیکھ کر محسن راؤ کو اپنی سادون پر وادی جویلی یاد آگئی۔ اس نے یادو اشت کے آئینے پر جادو کی جو گرد جم گئی تھی، وہ اب بالکل صاف ہو چکی تھی۔ گزر اہواز اقتدار اگرما لے کر اٹھ بیٹھا تھا۔ سادون پور کی جویلی کے ساتھ اسے فوراً ہی اپنے چچاراؤ احمد علی کا خیال آیا۔

نے اس نے قاتا کے نکل کر تھا۔ اسے باقاعدہ کرنے کے لئے اسے گھٹکے۔

ہدایت اللہ اسے کمرے میں پہنچا کر چلا گیا۔ محسن راؤ خوبصورت بیٹھ پر نیم دراز ہو کر کپڑوں کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد ایک ملازمہ راجہ براہم گنگے کے دو تین جوڑے میزپر رکھ کر چل گئی۔ محسن راؤ ایک جوڑا لے کر غسل خانے میں گھس گیا۔ یہ ایک پر آسانی غسل خانہ تھا۔ نماکر جب وہ آدم قیمتی سانپ بھی گنوادیا۔ اس کے بارے میں جوگی رام پال نے ایک پر اسراری بات کی جو کم از کمی تو سمجھ میں آئی نہیں۔ ”محسن راؤ نے بتایا۔

راجہ ماری کے گھر میں ایک چھوٹا سا آئینہ تھا، اور وہ بھی چٹھا ہوا۔ اس میں پورا چہہ بھی نظر نہ آتا۔ اسے اپنا چہہ بھی نکلوں گلروں میں دیکھا پڑتا تھا۔ آج ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے اپنے دھوکو نے دیکھا تو وہ اپنے آپ میں کھو گیا۔

اس آئینے میں، بھی وہ تیرہ چودہ سالہ محسن کو دیکھا کرتا تھا۔ آج وہ اخبارہ اُنہیں سال کا تھا۔ اس کی غمان تو پچن سے ہی ابھی تھی۔ جوانی نے تو قیامت ڈھا دی۔ وہ اس پر ٹوٹ کر بری تھی۔

محسن کا لڑکن غائب ہو چکا تھا۔ نوجوان محسن اس کے سامنے تھا۔ وہ ایک بہت پر کش نوجوان، جن گیا نہ کتنی سندھل حسم۔ سینے پر کالے اور گھنے بال، چوڑا سینہ، اونچا مالاقد، سفید رنگت، کتابی چہہ، ناطقی آنکھیں۔ وہ آئینے میں خود کو ہر زاویے سے دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

”یہ تو جانتا تھا کہ وہ خوبصورت ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس قدر خوبصورت ہے۔ آج اسے اپنے منانے چیز ہوئے کا یقین ہوا۔

خود کو آئینے میں دیکھتے دیکھتے اچانک اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ غسل خانے میں اکیلانیں ہے۔ اس سماں کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدموں میں پڑے تو یہ کو انداخت فرو رہا اپنے گرد پیٹ لیا، اور وروازے کی رفتہ رفتہ دیکھا۔

دروانہ بن چکا۔ پھر اس نے غسل خانے میں چاروں طرف نظریں گھمایں۔ غسل خانے میں اس کے الگ اندھے تھے۔ لیکن یہ احساس اب بھی قائم تھا کہ غسل خانے میں اس کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ اس خیال، اس کے دل میں خوف سایپا ہوا۔ وہ مزید وہاں نہیں شہر سکا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور کل آیا۔

ہبہ! ایک ملازمہ اس کی منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر وہ بولی۔ ”لبی، آپ کا کھانے کی میزپر انتظار تھا۔ میں کیا۔؟“

”لیکن ہے چلو۔“ محسن نے کہا اور اس ملازمہ کے ساتھ چل دیا۔

کھانے کے کرسے میں، کھانا جائے نادرہ اس کی منتظر تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ راجہ براہم گنگے کی بولی میں وہ بالکل راجحکار لگ رہا تھا۔ نادرہ نے اسے تھیں آمیز نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولی

”یہ بولا میں مسکراہی ہیں۔ براہم لگ رہا ہوں نا۔ بھئی ماں لگ کے کپڑوں میں بنہ ایسا ہی لگ سکتا

ٹکانے لگا دیا۔ راستے میں جوگی رام پال نے بتایا کہ راجہ ماری کی موت ہی اس جادو کا توزع تھا۔ راجہ ماری کی زندگی میں مجھے بڑے سے بڑا جادو گر اس کے چنگل سے نہیں چھڑا سکتا تھا۔ جوگی رام پال نے مجھے اس کے چنگل سے چھڑا نے کے لئے کئی عمل کئے۔ اس نے بہت محنت کی۔ پھر اس پچھر میں اس نے ایک قیمتی سانپ بھی گنوادیا۔ اس کے بارے میں جوگی رام پال نے ایک پر اسراری بات کی جو کم از کمی تو سمجھ میں آئی نہیں۔ ”محسن راؤ نے بتایا۔

”ایسا کیا کہا؟“ نادرہ نے پوچھا۔

”اس نے بتایا کہ اس سانپ نے راجہ ماری کا کام تمام کرنے کے لئے آزادی طلب کی تھی۔“ جوگی رام پال کو دینا پڑی کیونکہ بقول اس کے اس کام کو کوئی اور ناگ نہیں کر سکتا تھا۔“

”یہ سپیروں اور سانپوں کی دنیا بھی بڑی عجیب ہے۔ آپ نے جوگی رام پال سے وضاحت طلب نہیں کی۔“ نادرہ نے پوچھا۔

”ہاں، میں نے اس سے بات کی تھی لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔ وہ بات ٹال گیا۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ سانپ جوگی رام پال کی قید میں ہو گا۔“ اس نے اسے آزادی دے کر یہ کہا کروالیا۔ ”نادرہ نے بات کی تھے تک پچھنچ کی کوشش کی۔ ”اچھا خیر چھوڑیں اس مسئلے کو۔ آپ جا کر دھولیں۔ میں آپ کے لئے کپڑے بھجواتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے؟“ ”محسن راؤ فوراً کھڑا ہو گیا۔“

”وکھو، ہدایت اللہ..... محسن صاحب کو مہمانوں والے کمرے میں لے جاؤ۔ فی الحال میں بیان کے کپڑے بھجوائے ویتی ہوں۔ پھر ایک دو دن میں نئے کپڑے سل جائیں گے ماشر رزاق سے کہا شام کو آگر کناب لے جائے۔“ نادرہ نے کہا۔

”جی بھتر۔ بی بی، میں ماشر رزاق کو بلا لاوں گا۔“

”ٹھیک ہے محسن اپنے کمرے میں چلیں۔ نہیں دھوئیں۔ کپڑے تبدیل کریں۔ آپ شدت کی بھوک گئی ہو گی۔ میں کھانا لگوائی ہوں۔ ساتھ کھانا کھائیں گے۔“ نادرہ نے کہا اور روزہ روم کے اندر ونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

محسن راؤ، ہدایت اللہ کی رہنمائی میں مہمان خانے کی طرف چلا۔ یہ ایک شاندار کمرہ تھا۔ ایک عرصے کے بعد محسن راؤ کو اس پر آسائش کرو نصیب ہوا تھا۔ اب اسے ہر لمحے بات پر اپنا گھر، اپنا بیان بارہ آرہی تھی۔ اپنے والدین یاد آرہے تھے۔ محسن راؤ کو جیت ہو رہی تھی کہ اتنے سال اس نے مال باب کے بغیر کیے گزارے۔ راجہ ماری کے علی نے اس کا دل و دماغ مغلظ کر دیا تھا۔ وہ اپنام بھول گیا تھا۔ اس کے دل میں راجہ ماری کے کچھ مکان کی جگہ بھر گئی تھی۔ وہ اس سبقتی سے نہیں چاہتا تھا۔ اور اب حیرثوئتی وہ بارہ تیرہ سالہ محسن بن گیا تھا۔ خکار پر نکلنے اور قتل کی سازشو واقعات بار بار اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

یہ گھن راؤ نے پہنچے ہوئے ایک کری کھپنی اور بڑے مذہبائی طریقے سے بیٹھ گیا۔
”آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں جناب..... بالکل راجحکار۔“ نادرہ نے اس کی تعریف کی
”راجحکار نہ سی، چھوٹا موناڑ میندار ضرور ہوں یہ اور بات ہے کہ فی الحال بے زین ہوں۔
کھانا نکالتے ہوئے کما۔

”مجن راؤ تم نجھ گئے؟“ نادرہ نے تمثیلا سانس بھرا۔
”اہ، واقعی۔“ مجن نے کہا۔

”میرا کہی کی بات کر رہی تھی۔ سناء ہے وہ تمیں بست چاہتی تھی۔“ نادرہ نے اس کی طرف ترجیح
پڑی سے دیکھا۔

”یہ چھ ہے؟“ مجن راؤ نے صدق دل سے کہا۔

”تباہ، وہ ہے بھی بہت خوبصورت۔“

”یہ بھی چھ ہے۔“ مجن راؤ نے اقرار کیا، پھر پوچھا۔ ”لیکن یہ بات تمیں کس نے بتائی۔ تم نے تو
تمیں دیکھا ہے۔“

”اہ، میں نے تو اسے نہیں دیکھا، دیکھنے کی تمنا تھی رہی۔ یہ بات مجھہ برایت اللہ نے بتائی۔ اس نے
لی کو دیکھا تھا۔“ نادرہ نے بتایا۔

”تم را کھی کا ذکر کیوں لے پڑھی ہو۔“ مجن راؤ کو تشویش ہوئی۔

”ایسے ہی، تمیں بڑا لگ رہا ہے۔“

”ایسے، غیر ضروری لگ رہا ہے۔“

”پھر کس کی بات کروں؟“

”پنی..... صرف اپنی۔“ مجن راؤ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”میں کیا ہوں؟“ یہ عجیب سوال تھا۔

”تم سارے ہو؟“

”اگر میں سارے ہوں تو کم تم بھی نہیں، تم جادو گر ہو، بست بڑے جادو گر جس نے نادرہ جیسی
لینے لئی کا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔“

”نادرہ، اگر میں مجن ایک مداری کا بیٹھا ہو تو کیا تم پھر بھی اسی قدر چاہتیں؟“ مجن نے پوچھا۔

”واہ، تم نے یہ کیا سوال کیا؟“ نادرہ نے کھانا کھاتے کھاتے اپنا ہاتھ کھپخ لیا۔

”کھانا تو کھاؤ۔“ مجن راؤ نے اسے ٹوکا۔

”اہ، کھاتی ہوں، پہلے تمہارے سوال کا جواب دئے دوں۔“ نادرہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”تم نے میرے ہاتھ پر اگنوٹھی رکھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوئی۔ اور جب

تم سے مٹے تمہاری بھتی پھٹکی تو یہ وہ لمحہ تھا کہ میری روح بھی، میری ندی رہی تھی، کسی اور کے قبضے میں

نہ کرو گی۔ ان دونوں لمحوں میں مجھے یہ کب معلوم تھا کہ تم کسی بڑے زمیندار کے بیٹے ہو۔ یا

معلوم تھا؟“ وہ مجھ پر مکمل قبضہ چاہتا تھا۔ اس نے ایسا عمل شروع کیا تھا کہ اگر وہ مکمل ہو جاتا تو میری

”میں کیا جاؤں؟“ مجن راؤ نے معصومیت سے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ، کیا تمیں را کھی یاد نہیں آتی۔“ نادرہ نے اسے گری نگاہوں سے دیکھا۔

”وہ بے چاری، میرے جنگل سے لوٹنے کا انتظار کر رہی ہوگی۔ تم جانتی ہو نادرہ کہ ران جہا
جنگل میں جادو سکھانے نہیں لے گیا تھا۔“ مجن راؤ نے اکشاف کیا۔

”تو پھر؟“ نادرہ نے پوچھا۔

”وہ مجھ پر مکمل قبضہ چاہتا تھا۔ اس نے ایسا عمل شروع کیا تھا کہ اگر وہ مکمل ہو جاتا تو میری

کرے میں کچھ نہ تھا۔ وہ غسل خانے میں جا پہلی تھی۔ محسن راؤ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کی کیفیت تھی۔ آیا اس نے خواب دیکھا ہے یا یہ سب جائے میں ہوا ہے، اس کے ہاتھ پر کسی نازک ہاتھ کا لمس اب بھی موجود تھا۔ اور پاؤں کے انگوٹھے سے سینے تک ایک لگھاتی چھانے کی کیفیت اس کا لا جوں پڑھنا اور نادره کو مد کے لئے پکارنا۔ ہربات اس کے ذہن میں اچھی طرح نقش تھی۔ شاید وہ لیٹھتی ہی سو گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ اس نے خواب سمجھ کر اپنے ذہن کو جھنکا اور پھر کروٹ لے کر گویا۔

شام کو بُداشت اللہ نے اسے آکر اٹھایا، ملازم دوبارہ ویکھ کر جا پہلی تھی۔ وہ گھری نیند سویا ہوا تھا۔ تب نادره نے بُداشت اللہ کو بھیجا تھا۔ اس نے محسن راؤ کا بازو چھو کر آواز دی۔ ”صاحب جی، صاحب جی۔“

محسن راؤ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اس سے پوچھا۔ ”ہاں، کیا ہوا۔“ ”صاحب جی، شام ہو گئی ہے۔ آپ کب تک سوئں گے، چائے پی لیں۔ بی بی آپ کا انتقال کر رہی ہیں۔“ بُداشت اللہ نے بُرے مودو بانہ انداز میں کہا۔ ”اچھا۔“ محسن راؤ یہ کہہ کر فوراً اٹھ گیا۔ اور غسل خانے میں داخل ہونے سے پہلے بولا۔ ”بُداشت اللہ، میرا پائی منٹ انتظار کرو، میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔“ ”جی ٹھیک ہے صاحب جی۔“ بُداشت اللہ نے کہا۔

محسن راؤ غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر پانی کے خوب چھپا کے مارے۔ منہ دھوتے دھوتے اپنک اسے احساں ہوا جیسے غسل خانے میں اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے، اس خیال کے ساتھ ہی ایک اور احساں ابھرا۔ یکدم اس کے دل میں نمانے کی خواہش جاتی۔ اس خواہش پر اسے ہلی چیز ہوں کیونکہ وہ چند گھنٹے پہلے ہی تو نمایا تھا۔

بھروس کا دل اسے نمانے پر کیوں اکسارا تھا۔ اس کے پیچھے کیا عالم تھے۔ کسی کے اندر ہونے کا احساں بدستور قائم تھا۔ اسے خوف سامنوس ہونے لگا۔ وہ منہ و ہوچکا تھا۔ وہ فوراً ہی غسل خانے سے باہر آیا۔

کرے میں بُداشت اللہ موجود تھا۔ اسے ویکھ کر محسن راؤ نے سکون کا سانس لیا۔ محسن راؤ نے سوچا کہ بُداشت اللہ کو غسل خانے میں بھیج کر دیکھے، اندازہ ہو جائے گا کہ یہ محض اس کا وہم ہے یا پھر واقعی اندر کلکھنے ہے۔ ”بُداشت اللہ زدرا ہاتھِ روم میں تو جاؤ۔“

”صاحب جی، ہاتھِ روم میں کیا ہے؟“ وہ محسن راؤ کی بات سنتے ہی کا پنچے لگا۔ ”اوہ بھائی ڈرو مرت، ہباں کوئی بھوت پرست نہیں ہے، تم اندر جاؤ۔ وروازہ بند کرو اور دو منٹ آنکھ کے سامنے کھڑے ہو کر باہر آجائو۔“ محسن راؤ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

محسن راؤ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسے مسکرا کر دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ ہو گی نادرہ اس کے سوال پر خفا ہو گئی ہے۔ اس کے لجھی خلکی اس نے صاف محسوس کر لی تھی۔ یہ سوال نے بر سیل تذکرہ کر دیا تھا جیسے اس نے راکھی کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے بھی ایک سوال تھا۔ حلا نکہ اس دوران اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ نادرہ کس قدر دیوانی لڑکی ہے، اس قدر کہ آگ میں کوڈ کر نیچجے کے بارے میں بھی نہیں سوچتی تھی، ایسی لڑکی سے اس طرح کا سوال اس غرض محبت کا مناق اڑانے کے متراوف تھا۔

محسن راؤ نے ایک چھوٹا سانوالہ بنایا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لوہ کعا خوبصورت لوگوں کو ناراض نہیں ہوتا چاہئے۔ وہ بڑے لگتے ہیں۔“ اس چھوٹے سے نوالے کے لئے نادرہ نے فراہم سامنہ پھاڑ دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر نوالہ میں لے لیا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں ناراض تو نہیں ہوں۔“

کھانا کھانے کے بعد محسن راؤ مسماں خانے میں چلا آیا۔ یہاں بیٹھے کران دوں نے کافی پانی رات بھر کا جا گا ہوا تھا۔ اسے زبردست نیند آرہی تھی۔ نادرہ اسے آرام کرنے کا کہہ کر اس کے سے چل گئی۔ اور جاتے جاتے کمرے کا وروازہ بند کر گئی۔ محسن نے اٹھ کر کھڑکیوں کے پر دے کرے میں ایک خوٹگوار ساندھیرا چھا گیا۔

وہ بید پر لیٹا تو فوراً ہی اس کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ تب وہ غسل خانے سے نکلی۔ محسن راؤ کے بید کے نزدیک آکر اس نے اسے بخورد کھلا، محسن ولکش مردو تھا جس پر کوئی بھی جنس مخالف اپناوا ہار بیٹھے سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہر سکون چھایا ہوا تھا۔ وہ سوتا ہوا تنہیں لگ رہا تھا کہ وہ بے قرار ہوا تھی۔ اس نے محسن راؤ کے پیروں کی طرف آکر اس کے دونوں انگوٹھے پکڑ لئے، اور پھر وہ دھیرے اس کے جسم میں سراہیت کرنے لگی۔ انگوٹھوں سے پیروں میں، پیروں سے پنڈلوں میں، اور اپر بیساں تک کہ سینے میں۔

محسن راؤ اس وقت پوری طرح سو نہیں پایا تھا۔ شم غنوگی کی سی کیفیت تھی۔ اسے یہاں جیسے پاؤں کے انگوٹھوں سے اس کے جسم میں دھواں سا بھر رہا ہے۔ اس پر لگھاتی چماری ہے۔ خلش ایک سرشاری کی کیفیت اس پر طاری ہو رہی ہے۔ پھر یہ دھواں سا، یہ باول سے اس کے کرتے اس کے سینے تک پہنچ گئے۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ تب اسے چھوا۔ ایک ریشمیں ہاتھ کا سا احساں اسے اپنے ہاتھ پر ہوا۔ اب اس نے لاحل پڑھنا کی۔ اس کے جسم نے مراحت کا آغاز کیا۔ اس نے چھنچا ہا۔ وہ نادرہ کو چیخ چیخ کر اپنی مدد کے تھا۔ تبھی ایک جھنکا سا لگا۔ اور محسن راؤ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گروں گھما کر کمرے کا جانزا

محن راؤ کو اچانک ہی محسوس ہوا جیسے وہ کسی کی گرفت میں ہے۔ کوئی اس پر چھایا ہوا ہے، اس کے ہوش دھاس بحال نہ تھے۔ وہ تم غدوگی کے عالم میں تھا۔ چاہتا تھا کہ پوری طرح جاگ جائے لیکن اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک سرشاری کی کیفیت اس پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔ ایک ریشیں سے لمس کا احساس تھا۔ وہ جو بھی تھا، اس پر پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ اس کے اعصاب مل طور پر اس کی گرفت میں تھے۔ ایک نہ ساتھ جو بڑھتا جا رہا تھا۔ کیف آگئیں لمحے دراز ہوتے جا رہے تھے۔ اور اس کے ہوش اڑتے جا رہے تھے۔

میں جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے بے حد فہمت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندر ہر اس اچانک گیا۔ وہ فروٹی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ دیر بیٹھ کر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا عسل نانے میں پچھا۔

عسل خانے میں پیچ کر جب اس کی نظر آئئی پر پڑی تو وہ اپنا چڑھ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ کسی چھپکی کی لرج ایک دم زرد ہو رہا تھا۔

وہ مند ہاتھ و ہو کر باہر نکلا تو دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے یہ سوچ کر کہ کوئی ملازما یا ایت اللہ ہو گا، کری پر بیٹھتے ہوئے زور سے آواز لگائی۔
”دروازہ ٹھلا ہے۔“

تب ہی تھوڑا سارہ دروازہ کھلا۔ ٹرے میں رکھ کر تن بج اٹھے۔ اس کی ٹرے پر نظر پڑی، پھر ٹرے جس ہاتھوں میں تھی، اس پر نظر پڑی۔ ارے! وہ چونک کر اٹھ گیا۔

”ارے آپ..... آپ نے یہ زحمت کیوں کی۔ ناشتہ کسی ملازما کے ہاتھ بھجوادیتیں۔“
”ہاں، ایسا بھی ہو سکتا تھا۔“ نادرہ نے اندر آکر مسکراتے ہوئے ٹرے میں پڑ کر اٹھ گیا۔
”تو پھر ایسا کیوں نہیں کیا؟“ محسن راؤ نے شکایتی انداز میں کہا۔

”جب آپ کو معلوم ہے کہ یہ ناشتہ میں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ پھر سوچا کہ جب ناشتہ زانی ہے تو سو بھی خود کیوں نہ کیا جائے؟ بس یہ سوچ کر خود ہی ٹرے اٹھا کر لے آئی۔ آپ کو کوئی زانی تو فرمائیے۔“ نادرہ نے اسے توجھی نظر وہی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بلایج زحمت ہوئی۔“ محسن راؤ نے کہا۔
”ہاں کی بات کا کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ ایک دم گھبرا گئی۔
رسے، یہ کیا ہوا آپ کو؟“

”لکھن و کھارہ ہوں۔“ محسن راؤ نے پوچھا۔
”ارے نہیں بابا۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”آپ پلیے کیوں ہو رہے ہیں؟ یہ آپ کو کیا مل ایسے ہی لال پیلا ہوتا رہتا ہوں۔“ اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”اچھا، صاحب جی جاتا ہوں۔“ وہ پا دل نخاستہ عسل خانے کی طرف بڑھا۔

دو منٹ کے بعد جب وہ باہر آیا تو مسکرا رہا تھا۔ ”صاحب جی، آپ نے تو مجھے ڈرای ڈیا تھا۔ انہوں کچھ نہیں ہے۔“

”میں نے تم سے کب کہا تھا کہ اندر کچھ ہے۔“ محسن راؤ نے ہنس کر کہا۔

”ہاں، آپ نے کچھ کہا تو نہیں تھا پر آپ کے انداز سے پتہ چلا جیسے اندر کچھ ہے۔“ ہدایت اڑ بولا۔

ہدایت اللہ کے اندر جانے اور مسکراتے ہوئے باہر آئے سے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ احساس انہوں کچھ ہے، محسن اس کا وہم ہے۔ اگر اندر کچھ ہوتا تو ہدایت اللہ بھی اس کو محسوس کرتا۔

کہا نے کی میز پر چائے کے ساتھ بہت کچھ تھا۔ نادرہ بھروسہ اصرار اسے ایک ایک کر کے تمام جیزیں کھلانے رہی۔ چائے سے فارغ ہوئے تو ٹیلی ماسٹر راز اس کا ناٹ لینے آگیا۔ اس نے کل صبح ایک پینٹ شرمن کی کردینے کا وعدہ کیا۔ بقیہ اور جوڑے رات تک پہنچانے کا یقین دلایا۔

محسن راؤ اپنے گھر لاہور جانے کے لئے بے قرار تھا۔ اس نے اس سلسلے میں نادرہ سے تذکرہ کیا۔ ”نادرہ، میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔“

”جاو۔“ نادرہ نے یک لفظی جواب دیا، اس مختصر سے جواب سے وہ اس کے لمحے کا اندازہ نہ لگا کہ اس نے ناراض ہو کر کہا ہے یا غوشی سے۔

”کیسے جاؤ؟“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”تمہیں ہدایت اللہ چھوڑ آئے گا۔ اگر کو تو میں بھی ساتھ چلوں۔“

”نہیں ابھی نہیں۔“ محسن راؤ فوڑا بولا۔

”پریشان مت ہو۔ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر نہیں جاؤں گی، گلبرگ میں، میرے بچارہ بیہن۔ میں دیاں جاتی رہتی ہوں۔ میں دیاں چل جاؤں گی۔“ نادرہ ہنس کر بولی۔

”خیر ایسی کوئی بات نہیں، تم میرے ساتھ، میرے گھر چل سکتی ہو لیں میں چاہتا ہوں کہ پہلے نما اپنے والدین کے ساتھ یہاں آؤں..... تب تک راجہ صاحب بھی والبیں آجائیں گے۔“

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرمنی۔“ نادرہ نے اس کی بات سے اتفاق کر لیا۔
رات کا کھانا کھا کر وہ دونوں بہت دیر تک گھر میں شہرتے رہے۔ خوبصورت رومانی ہاتھا مستقبل کے خواب، چھیٹ چھاڑ، ہنی مذاق، شعرو شاعری۔

جب وہ دونوں باتیں کر کے اور مل مل کر تھک گئے تو نادرہ اسے اس کے کمرے تک پہنچا کر اسہ گھر میں چل گئی۔ اور وہ کمرے میں آگیا۔ اندر آکر اس نے دروازہ بند کر لیا لیکن چیختی نہ کھلا۔

کپڑے تبدیل کر کے اس نے لاث بچائی اور پیڑ پریٹ کر ٹالکیں پھیلایں۔ اور لاہور جانے کے بعد میں سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ پھر جلد ہی وہ نیند کے آغوش میں ٹال گیا۔
تب وہ مسکراتی ہوئی عسل خانے سے برآمد ہوئی اور اس کے پیروں کے دونوں انگوٹھے پکڑتے

”اے، کچھ نہیں ہوا، مجھے۔“ محسن راؤ نے بے نیازی سے کہا۔
”لیکن جوگی رام پال کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ بالکل اچھا نہیں ہوا۔ بہت برا ہوا ہے۔ بہت بھی
بڑا۔“ بدایت اللہ نے افسروہ لجھ میں کہا۔

”کیا ہوا ہدایت اللہ۔“ وونوں نے بیک وقت پوچھا۔

”صحیح صبح میں جوگی رام پال کے گھر گیا تھا۔ بی بی، نے مجھے پانچ ہزار روپے دینے تھے جوگی رام
پال کو دینے کے لئے۔ اس کے گھر کا دروازہ ٹکڑا ہوا تھا۔ میں بلا خوف و خطر اندر چلا گیا کیونکہ میں یہ جانتا
تھا کہ وہ گھر میں اکیارہ تھا ہے۔ جب میں اس کے کمرے میں واخن ہوا تو وہ مجھے زین پر لیٹا ہوا نظر آیا۔
اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور آنکھ سے آنسو سہ کر کان میں جا رہے تھے۔ اس کا پورا جسم مفلون ہو چکا
تھا۔ زبان بند تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کو گردش دینے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے جھک کر اس
سے پوچھنا چاہا کہ یہ سب کیسے ہوا، تمہیں اس کی آنکھوں میں زندگی کے ٹھنڈتے چراغ بھج گئے۔ اس کی
آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہڑک بند ہو گئی۔ بخش رک گئی۔ آنسو منجد ہو گئے۔ میں نے اس کی
آنکھیں بند کرنا چاہیں مگر وہ با جو وہ کوش کے بند نہ ہو سکیں۔ اس کے سینے پر کسی پرندے کا ایک پنجہ پڑا
ہوا تھا۔ ” بدایت اللہ نے بتایا۔ ”ایسا ہی پنجہ میں نے راج مراری کے گلے میں پا ہوا کھا ہے۔“
اٹو کے پنجے کا ذکر سن کر محسن راؤ چونکہ پڑا، وہ بولا۔ ”کہاں ہے وہ پنجہ؟“

”میرے پاس ہے صاحب جی۔..... میں آپ کو دکھانے کے لئے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔“
بدایت اللہ نے کہا۔

پھر اس نے اپنی قیص کی جیب سے وہ پنجہ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسے ایک نظر و یکتھے ہی
اندازہ ہو گی کہ وہ راج مراری کے گلے کا پنجہ ہے۔ سوال یہ امتحاتا کہ یہ پنجہ جوگی رام پال کے سینے پر کیسے
پہنچا اور اسے مفلون کرنے کیا۔ اور ایسا مفلون کہ وہ زندگی سے ہاتھ و ہوبیٹا۔ کیا فالج کا حملہ تھا، اگر
فالم کا حملہ تھا تو ”رات کے شہنشاہ“ کا پنجہ کہاں سے آیا؟
آخر یہ حملہ کس نے کیا؟ کیا راج مراری کی بے چین روح نے اس سے انتقام لیا ہے۔

اگر ایسا ہوا ہے تو یہ چونکے کا مقام تھا۔ خطرے کی گھنٹی بجھنے گی تھی۔
خود اس کے ساتھ بھی کچھ کم نہیں ہوا تھا۔ رات ہی رات میں وہ ہلدی کی طرح چلا ہو گیا تھا۔ اور
کورڈی کس قدر ہو گئی تھی۔ کیا یہ ایک ہی زنجیر کی ووکڑیاں تھیں۔
جوگی رام پال کے بعد کیا اگلا شانہ راج مراری کا ہدھ خود ہو گا۔ محسن راؤ جوں جوں غور کر تا جا رہا تھا۔
پریشان ہوتا جا رہا تھا۔

”ناورہ، یہ جو کچھ ہوا ہے، اچھا نہیں ہوا۔“ محسن نے بدایت اللہ کے چائے کے برتن اٹھائے جانے
کے بعد تشویش بھرے لجھ میں کہا۔ ”جوگی رام پال کو یقین طور پر راج مراری نے مارا ہے۔“
”بہت تم تین سے کیسے کہ سکتے ہو؟“ ناورہ نے پوچھا۔

”نہیں، محسن میں مذاق نہیں کر رہی۔ جا کر آئینہ دیکھو۔“

”آئینہ دیکھ کر ہی آرہا ہوں، وہ کبخت مجھے منہ چڑا رہا تھا۔“

”محسن میں سنجیدہ ہوں۔“

”سنجیدہ ہو تو ناشیتے کی بات کرو۔“

”ہاں، ٹھیک ہے ناشیتے کرو..... میں ابھی ڈاکٹر کو ملا تی ہوں۔“

”وکھر، خواہ مخواہ ڈاکٹر کو نہ بدلایت۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جادوگر ہوں تا، اس لئے گرگٹ کیا
رنگ بدلتا رہتا ہوں۔“ محسن راؤ نے ہن کر کہا۔

”اگر یہ سچ ہے پھر تو تم روز مجھے ڈرایا کرو گے۔“

”نہیں زیادہ نہیں۔“ محسن راؤ نے مخصوص صورت بنانے کر کہا۔ ”اچھا لاؤ چائے وو۔“ یہ کہ
اس نے کیتی کو جھوٹا، پھر بولا۔ ”جب تا یہ تو بالکل ٹھنڈی ہے، اس میں چائے بھی ہے؟“

”بہیں۔“ ناورہ نے جلدی سے کیتی کا وکھن اٹھایا تو اس میں چائے نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

”محسن، یہ کیا؟ چائے کہاں گئی؟“ ناورہ جیران ہو کر بولی۔

”چائے کہاں جائے گی کیتی میں ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔“ محسن راؤ نے کیتی چھو کر کہا
ناورہ نے جلدی سے کیتی کا وکھن اٹھایا تو اس میں واقعی چائے موجود تھی۔

”کمال ہے.....! لیکن یہ کس طرح ہوا، ابھی کیتی خالی تھی، ابھی چائے سے بھر گئی۔ اس کا:
کہاں پلی گئی تھی۔“ ناورہ نے پوچھا۔

”چائے تو کہیں نہیں گئی۔ یہ محسن نظر بندی کا کھیل تھا۔ میں جو دکھارہ تھا، وہ تم وکھر ہی تھی
محسن راؤ نے اپنے شعبدے کی وضاحت کی۔

ناشیتے کر کے محسن راؤ نے اپنے بدن میں تھوڑی سی جان محسوس کی۔ یہ ایک ہی رات میں اس
افتو پڑی تھی کہ نہ صرف اس کے بدن کا خون پخڑ گیا بلکہ بے حد کمزوری بھی ہو گئی۔ نادرہ کو تو اس
مذاق میں ناول و یاتھا لیکن اس کا ذہن اسی گستاخی کو سمجھا تھا میں لگا ہوا تھا۔ پھر اسے رات کا فوجہ
آیا۔ عجیب خواب تھا وہ۔ اس خواب کے بارے میں سوچ کر اس کے جسم میں جھر جھری اسی آگی

اٹھی وہ ناشیتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ بدایت اللہ، ماسٹر رزاق کے ساتھ آپجا۔ محسن راؤ نے
شرٹ پہن کر دیکھی۔ وونوں کپڑے اس نے بہت اچھے سیئے تھے۔ محسن راؤ انہیں پہن کر بہت اس
لگ رہا تھا۔ ماسٹر رزاق کے جانے کے بعد سب سے پہلی بات جو ہدایت اللہ نے کی، وہ محسن راؤ کی
سے متعلق تھی۔

”صاحب جی..... آپ اس قدر پلے کیوں ہو رہے ہیں؟“

”من لیا، محسن بدایت اللہ نے کیا کہا ہے، آپ میری بات مذاق میں ازارہ ہے تھے۔“ نادرہ نے
کیا۔

”تمیں نہیں ہو گئی لیکن مجھے ہے۔ میں تمہارے والدین کے سامنے شرمندہ نہیں ہوتا چاہتی۔“ ابھی محسن راؤ نے جواب دینے کے لئے منہ گھوڑا ہی تھا کہ اس کا گھوڑا ایک دم بھڑک اٹھا۔ انفاناس نے رفتار پکڑ لی۔ چشم زدن میں، وہ ہوا سے باشیں کرنے لگا۔ محسن راؤ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا؟ وہ گھر سواری میں ماہر نہ ہوتا تو گھوڑے کے اچانک بے قابو ہونے پر زین میں بوس ہوتا۔ محسن راؤ کو بس یوں محوس ہوا جیسے کسی نے اچانک پیچھے سے زور دار چاپک مار دیا ہو۔ محسن راؤ نے اس کی پیچھے پر سنبھل کر اسے ہر مکن روکنے کی کوشش کی۔ لیکن رکنا تو در کی بات ہے۔ گھوڑے نے اپنی رفتار بھی کم نہ کی۔ محسن راؤ کی لگان کھینچنے کی ساری کوشش رایگان گئی۔

سامنے جنگل تھا۔ گھوڑا دیکھتے ہی دیکھتے جنگل میں داخل ہو گیا۔

محسن راؤ کے گھوڑے نے بھڑک کر جیسے ہی رفتار پکڑی تو نادرہ نے فوراً اپنے گھوڑے کو ایڈ لگائی لیکن اس کا گھوڑا ایزال ٹھوٹن گیا۔ وہ چل کر ہی نہ دیا۔ اس نے جب بہت غصے میں ایڈ ماری تو گھوڑا پلٹ کر دوڑنے لگا۔ نادرہ نے بڑی مشکل سے اسے روکا۔ پھر اس نے گھوڑے کا رخ موڑ کر دوبارہ ایڈ لگائی تو اس مرتبہ اس کا گھوڑا جگل کی طرف چل پڑا۔ نادرہ آہستہ آہستہ اس کی رفتار بڑھاتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ جگل میں داخل ہو گئی۔

جنگل میں داخل ہو کر اس نے اپنے گھوڑے کو روکا۔ اور جنگل کا باجائزہ لینے لگی۔ جنگل میں شانما طاری تھا۔ محسن راؤ کا دور تک پتہ نہ تھا۔

گھوڑے کی تاپوں کے تازہ نشانات موجود تھے۔ وہ ان نشانات کو بغور دیکھتی ہوئی، ان نشانوں پر اپنا گھوڑا دوڑانے لگی، تھوڑا اندر جا کر یہ نشانات غائب ہو گئے تھے کیونکہ سخت زمین شروع ہو گئی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اب کیا کرے۔ گھوڑے کے سموں کے نشان غائب تھے۔ جنگل میں کوئی راستہ یا پلڈنی تھم کی چیز نہ تھی کہ وہ اس پر چل پڑتی۔ اب محض اندازے سے ہی آگے بڑھنا تھا۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے آگے جا کر کوئی سراغ مل جائے۔ پھر وہ سموں کے نشانات کا اندازہ کر کے ایک طرف چل دی۔ کافی دور تک جانے کے باوجود وہ سے کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ پھر واپس آئی۔ اس کے بعد اس نے ایک اور سست سفر شروع کیا۔ اس مرتبہ وہ وقفہ و قٹے سے اسے آوازیں بھی ویتی جا رہی تھی۔ لیکن جنگل میں چالزوں اور پرندوں کی آواز کے علاوہ کچھ سنائی نہیں وے رہا تھا۔ کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

نادرہ حیران تھی کہ محسن راؤ کمال چلا گیا۔ اگر اس کا گھوڑا کسی وجہ سے بے قابو ہو گیا تھا تو اب تک اس نے اس پر قابو پالیا ہو گا۔ اسے واپس آ جانا پاہنچنے تھا۔ نادرہ کو اس کی گھر سواری کے اندازے پکا یقین تھا کہ وہ کوئی اندازی گھر سوار نہیں۔ اسے اپنے گھوڑے پر بھی جیت تھی کہ وہ اس طرح اچانک کیوں بھاگ لے گا تھا۔ اس کی اس حرکت پر اسے بہت غصہ تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ اس گھوڑے کو گولی مروادے گی۔ اس نے اسے محسن راؤ کے سامنے شرمندہ کر کے رکھ دیا تھا۔ خراب جو ہوتا تھا، ہو گیا تھا۔ اسے اب محسن راؤ کی فکر تھی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ کیس کی نہ رہے۔

”یہ الو کا پنجہ۔“ محسن نے کالے دھانگے میں تعویذ کی طرح بندھا ہوا اُتو کا پنجہ اس کی آنکھوں کے سامنے لے رہا۔ ”یہ وہی پنجہ ہے جو راج مداری کے لگے میں پڑا رہتا تھا۔ اسے میں اچھی طرح پہچانتے ہوں۔“

”اب کیا ہو گا محسن؟“ نادرہ نے سُم کر کہا۔

”خطرہ کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا ہے۔ بت مختار رہنا ہو گا۔“ محسن نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

”اللہ مالک ہے۔ دیکھا جائے گا۔“ نادرہ میں اچانک جانے کمال سے ہمت آگئی۔ ”آج، چلو

تمہیں براہم گنگ کی سیر کراؤ۔“

”چلو۔“ محسن فوراً راضی ہو گیا۔ ”کیسے چلیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”چاہو تو جیپ سے چلتے ہیں اور اگر گھر سواری کاموڑہ ہو تو گھوڑوں پر۔“ نادرہ نے کہا۔

”برسول ہو گئے گھر سواری کئے۔ چلو گھوڑوں پر چلتے ہیں۔“ محسن راؤ نے خوش بھرے بھجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں گھوڑے کسواتی ہوں۔ تم اتنی ویر میں ڈریں چیخ کرلو۔“ یہ کہہ کر نادرہ بہر نکل آگئی۔

محسن راؤ اٹھا۔ اس نے نئے کپڑے پہنے اور کمرے میں شلنے لگا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ہدایت اللہ اسے لینے آگئی۔ گڑھی کے دروازے پر دو خوبصورت گھوڑے موجود تھے۔ محسن راؤ نے اپنی سواری کے لئے مشکی گھوڑا اپنید کیا۔ نادرہ سفید گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ اس نے گھوڑے کو ایڈ لگائی اور گڑھی کے بڑے دروازے کی طرف بڑھی۔ محسن راؤ نے اپنا گھوڑا اس کے تعاقب میں لگایا۔

یہ ایک سرسری علاقہ تھا۔ وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے کافی دور نکل آئے تھے براہم گنگ کیسی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ نادرہ کو اندازہ نہیں تھا کہ محسن راؤ اتنا اچھا شے سوار ہے۔ خود محسن راؤ کو بھی معلوم نہ تھا کہ نادرہ اتنی اپنی گھر سواری کسلتی ہے۔ جب دونوں نے گھوڑے دوڑاتے اور در تک جانے کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ نکتے زر دوست گھر سوار ہیں۔ محسن راؤ نے اس گھر سواری سے خاص الطف لیا۔

اب وہ دونوں آہستہ آہستہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دونوں باشیں کرنے جا رہے تھے۔ محسن راؤ کو لاہور جانے کی فکر تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”ہاں تو نادرہ، میں شام کو لاہور چلا جاؤ۔“

”شام کو نہیں، میں صبح جاتا۔ ایک دن تو اور کو میرے پاس..... پھر آج تمہارے دو گھوڑے اور مسل کر آ جائیں گے۔“

”کچھوں کی کوئی فکر نہیں ہے۔“ محسن راؤ نے کہا۔

گی۔ برباد ہو جائے گی۔ وہ پاگلوں کی طرح جنگل میں اپنا گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ گاہے گاہے وہ آواز بھی دیتی جاتی تھی۔

”محسن!“

آواز دینے والی تھی اور گھوڑا دوڑا تے دوڑا تے اچانک وہ ایک جگہ رک گئی۔ سامنے درخت کی جنگل میں ایک چھوٹے سے پتھر پر محسن راؤ کی قیص پڑی تھی۔

نادرہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ فوراً گھوڑے سے کوڈی اور بھاگتی ہوئی درخت کے نیچے پہنچی۔ اس نے بے قراری سے اس کی قیص اٹھا کر دیکھی۔ وہ بالکل صاف سترھی تھی۔ اس پر کسی قسم کا کوئی داغ دھبہ نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ قیص خود محسن راؤ نے اتار کر پتھر پڑا ہے۔ لیکن محسن کہاں گماں گیا؟

گھوڑا بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا نادرہ نے آس پاس کا علاقہ چھان مارا لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔

نادرہ نے محسن راؤ کی قیص گلے میں باندھ لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اسے پھر ڈھونڈنے لگی۔ ساتھ ہی آواز دینے کا عمل بھی جاری تھا۔

نادرہ نے چلتے چلتے اپنی کلامی کی گھری پر نظر ڈالی۔ اسے جنگل میں بھکتے ہوئے تقریباً دو گھنے ہو گئے تھے۔ محسن کا دور تک پہنچنے تھا۔

پھر چلتے چلتے وہ چونک پڑی۔ اسے اپنے سامنے چار فٹ اونچا ایک چبوترہ نظر آیا۔ اسے پتھروں سے بنایا گیا تھا اور اندازہ وہ چھ فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ اس چبوترے کے آس پاس کا علاقہ صاف تھا۔ جنگل میں اس چبوترے کی تعمیر کیا تھا متصدہ ہو سکتا تھا، یہ سمجھ میں نہ آیا۔ چبوترہ بالکل صاف سترھ تھا اور محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی اس پر جھاڑو دی گئی ہو۔

چبوترے پر کھڑے ہو کر اس نے محسن کو زور زور سے آوازیں دیں، مگر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ پھر اس نے چبوترے سے اتار کر چبوترے کا آس پاس کا علاقہ چھان مارا۔

محسن تو نہ ملا، البتہ اس کا گھوڑا مل گیا، وہ ایک درخت کے نیچے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اب صور تھاں تکین ہو گئی تھی۔ محسن راؤ کا گھوڑا موجود تھا اگر اس کے وجود کا کہیں پہنچنے تھا۔ اسے چاری کوکیا معلوم تھا کہ محسن راؤ پر کیا بیسیت گئی۔ اس نے تو آخری وقت میں اس کے گھوڑے کو سبھ دوڑتے اور جنگل میں داخل ہوتے ہی دیکھا تھا۔

جنگل میں داخل ہونے سے پہلے محسن راؤ نے بہتری کو شش کی تھی کہ کسی طرح وہ اس ملکی گھوڑے پر قابو پا لے۔ اسے شہ سواری کے جتنے گر آتے تھے وہ اس نے آزمائا لے تھے۔ لیکن گھوڑا تھا کہ قابو میں نہیں آہما تھا۔ وہ بے لگام ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے مند میں لگام ہے۔ اس نے کم مرتب اٹی زور سے لگام کھینچی تھی کہ گھوڑے کا مند بھی لو لمان ہو گیا ہو گا لیکن گھوڑے نے ہارنہ مانی۔ وہ سوٹ دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ جنگل میں داخل ہو گیا۔

محسن راؤ نے فوراً اس کی لگام ڈھلی چھوڑ دی کیونکہ جنگل شروع ہو گیا تھا۔ اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ

گھوڑا اپنے آپے میں نہیں ہے۔ اس نے لگام ڈھلی چھوڑ دی کہ وہ جہاں جانا چاہے جاسکے۔ وہ پانچا تھا کہ نادرہ اس کے پیچھے آ رہی ہو گی۔ لہذا اس نے اس کی نشاندہی کے لئے اپنی قیص اتار کر پھینک دی۔

آجے گا جا کر اچانک ہی اس کا گھوڑا کر گیا۔ پھر وہ اگلے دو پاکیں پر کھڑا ہو گیا۔ اور پانچا تو اس نے برقرار نہ رکھ سکا۔ گر پڑا، اگر محسن راؤ فوراً ہی اس کی پیٹھ سے نہ اتر جاتا تو وہ گھوڑے کے نیچے ضرور دب گیا ہوا۔

گھوڑے سے اتر کر جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اس نے اپنے سامنے ایک چبوترہ دیکھا۔ اس چبوترے پر ایک سرخ قالین بچا ہوا تھا۔ اور قالین کے درمیان اس پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ اور محسن کی طرف اس کی پیٹھ قیص۔

اس جنگل میں یہ سنگی چبوترہ، اس پر سرخ قالین اور قالین پر چادر میں لپٹا وجد۔ عجیب پر اسرار منظر تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چبوترے کے نزدیک پہنچا اور چادر لپٹے وجود سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”کون ہو نم؟“

انسانی آواز سن کر اس وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ چادر اوڑھے اوڑھے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کی طرف گھما اور چادر اپنے سر سے سر کا دی۔ ریشیں چادر اس کے ریشیں بدن سے پھسل کر زینہ پر اگری۔

”وہ ایک انتہائی حسین عورت تھی اور اب اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔“

محسن راؤ اس قیمت خیز منظر کی تاب نہ لاسکا، اس نے فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”اے، یہ کیا کرتے ہو؟“ وہ بنس کر بولی۔ اس کی آواز اور اس کی ہنسی غضب کی تھی۔ ”میری ٹوک دیکھو میرے پاس آؤ۔“

”یہ کیا تماشا ہے؟“ محسن راؤ نے اس کی طرف غصے سے دیکھا۔

”تماشے تو تم دکھاتے رہے ہو میرے چادوگر، میں نے تو کوئی تماشا نہیں دکھایا۔“ وہ ایک ادائے فانہ سے لمراہی پھر اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ”آؤ، اپر آ جاؤ۔“

اس کا خوبصورت اور نازک ہاتھ بڑھا کا بڑھا رہ گیا، محسن راؤ نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس کا دامغ پھر لایا ہوا تھا۔ یہ بات اس کے تصور میں بھی نہ تھی کہ اس طرح بھرے جنگل میں، کوئی قیامت اس کے

سماں نہ آ جائے گی۔ اور قیامت بھی ایسی جو اس پر ثوٹ پڑنے کے لئے تیار تھی۔ وہ بھلا کیسے جاہ بولتا۔

”لیکاہ ملکن نہیں کہ تم پیروں میں پڑی چادر کو اپنے سر پر رکھ لو۔“ محسن راؤ نے کہا۔

”چند۔“ یہ کہ کر وہ قیامت بھی، پیروں میں پڑی چادر اخہائی اور سر سے پاؤں تک اپنا قیامت بن ہوا تھا۔ پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”چلو، اب اپر آ جاؤ۔“

تھا۔ میں راج مداری کو نہیں بچا سکی۔ مرتے ہوئے اس کی خواہش تھی کہ اس کی موت کا انقام لیا جائے۔ اس کے ساتھ دھوکا کرنے والوں کو نہ بخشا جائے۔ سوت نے سن لیا کہ میں نے جوگی رام پال کی کیا درگت بنائی۔ وہ اپنی جان سے گیا۔ اب تماری باری ہے۔ میں تمیں ماروں گی نہیں۔ اس لئے کہ میں خود تم پر مرگی ہوں۔ اب تم صرف میرے لئے زندہ رہو گے۔ میرے ہو کر رہو گے۔ میری قیدیں رہو گے۔

”اور اگر میں تماری قید میں نہ رہنا چاہوں تو۔“

”بات تمارے چاہنے کی نہیں، میرے چاہنے کی ہے۔“ وہ نہیں، اس کی نہیں میں زبردست۔ ”لیکن میں کسی اور چاہتا ہوں، اس کی قید میں نہ رہنا چاہتا ہوں۔“ محسن راؤ نے بتایا۔

”اب بھول جاؤ اس کو۔“ وہ محسن کو گمراہ نظر سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں جانتی ہوں، وہ آرہی ہے۔ تم نے اسے راستہ دھلانے کے لئے اپنی قیمت راہ میں پھینک دی ہے۔ بالآخر وہ ڈھونڈتی ہوئی اس پھرترے تک پہنچ جائے گی۔ لیکن اس کے آنے تک یہاں کچھ نہیں رہے گا۔“ ”اپھا ہوا تماری زبانی معلوم ہو گیا کہ بالآخر نادرہ یہاں تک پہنچ جائے گی۔ اب میں یہاں سے نہیں ہوں گا۔ میں بیٹھا رہوں گا۔ اس کے آنے کا انتظار کروں گا۔“ محسن راؤ نے فیصلہ کرنے لجھے میں کہا۔

”کیا چاہتے ہو، تماری نادرہ کو انداھا کروں..... تاکہ وہ یہاں کبھی پہنچتی نہ سکے۔“ اس نے یہ بات تیور بھاڑ کر انتہائی سفائلی سے کہا۔

”کوئی خاص عمل جانتی ہو کیا؟“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”اس جنگل میں، ایک نرم دیز قالین پر بیٹھے ہو، اس کے بعد بھی تمیں کسی عمل کا ثبوت چاہئے۔“

”میں تمارا نام جان سکتا ہوں؟“ محسن راؤ نے پوچھا۔

””میرا نام بقال ہے۔“

””بقال؟..... یہ کیا نام ہوا بھلا۔“ محسن نے الجھتے ہوئے کہا۔

”بقال کا مطلب ہوتا ہے، صحرائی شہزادی۔“ اس نے مکراتے ہوئے بتایا۔ ”لیکن تمیں بقال میں دکھائی دیتی۔ صحرائی شہزادی نہیں معلوم دیتی۔“

”محسن راؤ اس کی بات کا کیا جواب دتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ایک بے حد پرکشش عورت تھی۔ اس پر اٹھنے والی نظر مشکل ہی سے جھکتی تھی۔ اب وہ صحرائی شہزادی تھی یا پاہڑوں کی ملکہ تھی، یہ محسن راؤ کا سلسلہ تھا۔ اس کا منہ صرف یہ تھا کہ نادرہ کسی طرح یہاں پہنچ جائے اور وہ اس کو لے کر لٹل جائے۔“

”اور بقال یہ بات بچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی موجودگی میں نادرہ یہاں پہنچ سکے گی اور نہ ہی محسن راؤ

”محسن راؤ قالین بچھے چوتھے پر چڑھ گیا۔ اور بولا۔“ ”ہاں، اب کو۔“ ”بیٹھو۔“ یہ کہہ کر وہ خود بھی بیٹھ گئی۔

”کون ہو تم؟“ محسن راؤ نے قالین پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، اپنے آپ کو۔ بہت خوبصورت ہو، جس کا دل چاہو گے تو زکر گزر جاؤ گے۔“ ایک دم بگز گئی۔

”میں نے کسی کا دل نہیں توڑا۔“ محسن راؤ نے بڑے دشوق سے کہا۔

”رکھی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“ اس نے اشارة دیا۔

”تم را کھی کو کیسے جانتی ہو؟ اپنے بارے میں بتائی کیوں نہیں، کون ہو تم؟“

”میں تو راج مداری کے بارے میں بھی جانتی ہوں۔ اس کا قاتل کون ہے۔ بتائیتے ہو؟“

”میں نہیں ہوں۔“ محسن راؤ نے کمزور لیج میں کہا۔

”تم نہیں ہو تو اور کون ہے؟“ اس کے لیج میں سختی آگئی تھی۔ ”راج مداری نے تمہیں اپنے گھر میں کس قدر پیار سے رکھا۔ کس قدر محبت دی۔ تمہیں اپنا کام سکھایا۔ تمہاری زندگی بچائی۔ اور تم نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ اس کی بیٹی کی توہین کی، اس کا دل توڑا۔ اس کی محبت کو محبت نہ سمجھا۔ پھر رانی مداری کے اعتماد کو تمہیں پہنچائی۔ دھوکے سے اسے قتل کر دیا۔ راج مداری تمہارا محسن تھا، تم نے اپنے محسن کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ بولو کیوں؟“

”اس نے مجھ پر قفسہ کر لیا تھا۔“ ”محسن راؤ نے شکوہ کیا۔

”یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اس نے تمہاری جان بچائی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج تم کمال ہوتے؟“

”اس سلسلے میں، میں اس کا شکر گزار تھا۔ میں نے اس کی بہت خدمت کی۔“ ”محسن راؤ نے الہ صفائی میں کہا۔

”اسے قتل کرو کے؟“ وہ زبردی لیج میں بولی۔ ”واہ، کیا خوب خدمت کی تم نے۔“

”آخر تم کون ہو؟“

”میرے جادو گر، میں تمہاری سزا ہوں، ایک خوبصورت سزا۔“ اس نے عجب انداز اختیار کیا۔

”کہاں سے آئی ہو؟“

”مجھے دیواہ کا لی نے بھیجا ہے۔“

”کون دیواہ کا لی نے بھیجا ہے؟“

”وہی دیواہ کا لی جسے راج مداری نے مد کے لئے پکارا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”جب راج مداری کے لئے پکار رہا تھا تو اس وقت میں، دیواہ کا لی کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ راج مداری کی پکار سن کر کا لی نے مجھے اشارہ کیا۔ اس کے حکم کی تعییں میں، میں فوراً راج مداری کی مد کو آگئی۔ لیکن وقت گز

بھائی ہوں کہ تم زندگی بھریا د کرو گے۔ بن میں جیسا کہوں، ویسے کرتے جاؤ۔ ”
”پل، تھیک ہے، بتاؤ کیا کرنا ہے۔“ وہ فوراً راضی ہو گیا۔

”پلے میں تمہارے ہاتھ پیچھے کر کے اس بال سے باندھوں گی۔ پھر تمہارے پاؤں اور اس کے بعد تمہارے پرے سُکم پر اس بال کو لپیٹ دوں گی۔“

”بقال تم بھول رہی ہو کہ یہ گھوڑے کا بال ہے، کوئی رسی نہیں۔ اس سے تم میرے ہاتھ ہی باندھ دو تو یہی بہت ہے۔“ محسن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب تم میرا کمال دیکھتے جاؤ، مجھے داو دیئے جاؤ۔ لاڈا پنے ہاتھ لاڈ۔“
”لو۔“ محسن راؤ نے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کر دیئے۔

”اپنے ہاتھ پیچھے کرو۔“ بقال نے کما اور اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے ایک خاص انداز سے باندھ دیئے۔ پھر اس نے کہا۔ ”بینٹھ جاؤ۔“

”بینٹھ گیا تو اس کے دونوں ہاتھ گھوڑے کے بال سے باندھ دیئے۔“ محسن راؤ جیران ہو کر دیکھنے لگا کہ یہ بال اتنا بڑا کیسے ہو گیا۔ اور پھر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد اس نے اس کے دونوں انگوٹھے ملا کر بال پیشنا شروع کیا۔ اور پھر اس نے اتنے سے بال کو اتنا لمبا کیا کہ اس کے جنم کے گرد لپیٹ دیا۔ اس نے بال کے ذریعے اسے کچھ اس طرح جکڑ دیا کہ وہ اب اپنے جنم کو لایا گئی نہیں سکتا تھا۔

پھر بقال نے اسے کروٹ سے لٹا دیا ہے اور قفہ مار کر ہٹنے لگی۔
”کیا ہوا؟ پاگلوں کی طرح کیوں نہ رہی ہو۔“ محسن راؤ نے لیٹے لیٹے اور بندھے بندھے چھا۔

”نہیں نہ تو اور کیا کروں۔ مجھے امید نہ تھی کہ تم اس آسانی سے میرے جال میں پھنس جاؤ کے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ پریشان ہوا۔

”تم نے میکھا کہ ایک چھوٹا سا گھوڑے کا بال میرے ہاتھوں میں کس قدر لمبا ہو گیا۔“
”اہل، واقعی تم نے کمال کیا۔“

”میں جو کمال کیا ہے..... اس کا تمہیں ابھی اندازہ نہیں ہے۔“
”کچھ بتاؤ تو سمجھ میں آئے۔“ محسن راؤ نے کہا۔

”یہ گھوڑے کا بال، کس مضبوط رہی سے کم نہیں بلکہ کافی دار تھی کہنا چاہئے۔ اب تم میری مرضی کی خیر اس رہی سے آزاد نہیں ہے۔“ اس نے پر اسرار لجھ میں کہا۔

”کسی دوسری بات سن کر لیا۔
کسی دوسری بات سن کر لیا۔“

اس کی گرفت سے نکل سکے گا۔

بقال نے اب مرد وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جلد سے جلد اپنی کارروائی مکمل کر دی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ نادرہ کو ہمارا تک مکنخے میں کافی دیر گے۔ پھر بھی وہ کسی تم کا غصہ لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے محسن کو مخون نگاہوں سے دیکھا، بڑے دربانداز میں مسکرا دی۔ اور میٹھے میں بولی۔ ”محسن، میرا ایک کام کر دو۔“
”ہاں، بولو۔“

”تمہارا گھوڑا کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”قریب ہی ہے..... وہ اوہ درختوں کے جنڈیں میں۔“ محسن راؤ نے بتایا۔

”جاو، اس کی دم کا ایک بال لے آؤ۔“ بقال نے ایک عجیب فرماش کی۔

”بال؟..... کیا کرو گی؟“ محسن راؤ نے جیران ہو کر پوچھا۔

”تم تو بڑے جادوگر ہو، تمہیں تو معلوم ہو گا۔“ اس نے فس کر کہا۔

”نہیں، میں نہیں جانتا۔ میں نے آج تک گھوڑے کے بال سے کوئی کرتب نہیں دکھایا۔“
”اچھا، پھر جا جا لے کر آؤ۔ میں تمہیں آج ایک زبردست تماشا شاد کھالی ہوں۔ اگر تمہیں پسند اور تم یہ کھننا چاہو تو سکھا بھی دوں گی۔“ بقال نے اسے اپنی چکتی آنکھوں سے دیکھا۔
”ٹھیک ہے۔ میں لے کر آتا ہوں۔“ محسن راؤ یہ کہ کر چھوڑتے سے اتر گیا اور اس طرف ہا۔

جدھر اس کا گھوڑا کھڑا تھا۔ گھوڑے کے پاس پہنچ کر اس کے دماغ میں ایک چھننا کاسا ہوا، اس نے ہر کیوں نہ گھوڑے پر بیٹھ کر نکل جائے۔ یہ بقال اس کا پکھنہ کر سکے گی۔ میں دیکھتی رہ جائے گی۔ مگر مسئلہ تھا، اگر وہ ہمارا سے نکل گیا تو نادرہ کو کیسے پائے گا۔ جب تک وہ جگل سے باہر نکلے گا، تب نادرہ ہمارا پہنچ جائے گی۔ تب بقال اسے بھلا کماں چھوڑے گی۔ وہ جانے اس کا کیا حشر کرے۔“
ہے، وہ اسے اندر ہای کر دے۔ ابھی کچھ دیر صبر کرنا چاہئے دیکھنا چاہئے کہ وہ گھوڑے کے بال کا کیا ہے۔ کیا تماشا شاد کھانا چاہتی ہے۔ ہو سکتا ہے، تماشا ختم ہونے تک نادرہ اس کو ملاش کرتی ہوئی ہمارا پہنچ جائے۔ پھر دونوں مل کر ہی اس بقال کی بچی کو ٹھکانے لگائیں گے۔

بقال کوئی بچی نہ تھی۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اسے بھیجا تھا۔ وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں تھا۔

محسن راؤ نے اس کی خواہش کے مطابق گھوڑے کی دم سے ایک بال توڑا۔ اور بقال کے سامنے لرا بولا۔ ”یہ لو۔“

بقال نے وہ بال احتیاط سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کھینچ کر دیکھا، وہ کافی لمبا اور مضبوط بال تھا۔

تب وہ بال پکڑ کر اس کی طرف بڑھی۔ اور مسکرا کر بولی۔ ”میرے جادوگر، آج میں تمہیں ایسا ہا۔“

بیان چبوترے سے بیچ اتر آئی۔ اس نے محنت کی ناگزین گھیٹ کر اسے سیدھا کیا۔ اور پھر اس کے دوں پیروں کے انگوٹھے قام لئے۔ انگوٹھے پکڑتے ہی اس پر خمار کی کیفیت چھانے لگی اس کی رگوں میں نشہ سا ترنے لگا۔ یہ کیفیت اسے جانی پچالی سی لگی۔ تب اسے اچانک خیال آیا کہ گڑھی سرام مگر میں اس پر اس قسم کی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہاں بقال موجود تھی۔ آخر یہ کب سے اس کے تعاقب میں ہے۔ ڈپاٹھا تھا کہ اس سلسلے میں بقال سے بات کرے۔ چند سوالات کرے لیکن اس میں اب بولنے کی سخت نہ رہی تھی۔ وہ اس پر چھاتی جلی جاری تھی۔ پاؤں کے انگوٹھوں سے پنڈلیوں پر وہاں سے اوپر اور اپر۔ اس کی آنکھیں بند ہوئے لگیں۔ اس کے جسم میں لرسی اٹھ رہی تھیں۔ جذبات کا جوار بھائیا چوتھا جبار تھا۔ دھواں سا بھر رہا تھا۔ ایک گھٹائی چماری تھی۔ ایک سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ وہ فور کوڑھا توہاں محسوس کر رہا تھا۔ دماغ تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ کانوں میں ہواں کا سا شور تھا۔ سکیاں یہ سنائی دے رہی تھیں۔ پھر سنایا سا طاری ہو گیا۔

محنت راؤ اپنے ہوش گوا بیٹھا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس پر بری طرح نقاہت طاری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نکال لیا ہو۔ اس نے بھگل اپنی آنکھیں کھولیں۔ اوپر نگاہ کی تو نہ آسان نظر آیا اور نہ بڑھت۔ اسے اپر کسی جھونپڑی کی چھٹ نظر آرہی تھی۔ وہ قالینی پر لیٹا تھا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں پیدا نہ تھے۔ یہ بات اس نے محسوس کی۔ کیونکہ وہ چلتی ہوا تھا اور اس کے ہاتھ کر کے بیچے نہیں دیجئے ہوئے تھے۔ بلکہ پلاؤ میں رکھے تھے۔ پاؤں کی بندش بھی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا جسم بھی آزاد تھا۔ لپا جنم آزاد محسوس کر کے اسے خوش ہوئی کیونکہ اسے گھوڑے کے بال سے جس طرح جکڑ دیا گیا تھا۔ وہ ایک انتہائی تکلیف دے عمل تھا۔ وہ اپنے جسم کو ذرا سی بھی جیش نہیں دے سکتا تھا۔ ”آزاد ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن اب نہ وہ چبورہ تھا۔ نہ وہ جنگل۔ نہ وہ ہوش رہا بقال۔ کچھ نہ تھا۔ اب فناہت سے بند ہوئی آنکھیں تھیں۔ وہ ایک چھوٹی سی گل جھونپڑی میں تھا۔ جس کا چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ اسے باہر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنے کی اس میں تاب نہ تھا۔ وہ یونہی بے حس و حرکت لیا رہا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ بقال نے اس کی ناگزین گھیٹ کر اس کے دوں پیروں کے انگوٹھے پکڑ لئے تھے۔ اور اس پر ایک عجیب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسی گھیٹ میں اس کے ہوش جاتے رہے تھے۔ جانے یہ کون سی جگہ تھی؟

ٹھانیہ بقال اسے اپنے علاقے، اپنی آبادی میں لے آئی تھی۔ کسی نئے جان میں۔ اس نے سوچا بہر نکل کر دیکھ کر وہ کماں آگیا ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہاتھ پنہ کا دم لکھا ہوا تھا۔ اس قدر نقاہت تھی، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔ وہ محض اپنی

”یہ کیا نماق ہے؟“ وہ پریشان ہو کر بولا۔

”یہ نماق نہیں، نعین حقیقت ہے۔ ذرا آزاد ہو کر ویکھو؟“ بقال نے بنتے ہوئے کمال وہ گھوڑے سے لیٹا تھا۔ اس کے ہاتھ چچپے بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ گھوڑے کا بال اس کے پورے جسم پر لپیٹا ہوا تھا۔ اس نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہیں ہاتھوں کو گھما یا زور لگایا جھکتا۔ تب اسے ایک دم تکلیف کا حساس ہوا، اسے یوں محسوس ہوا۔ وہ گھوڑے کا بال استرے کی دھار بن کر اس کے گوشت میں اتر گیا ہو۔

پھر اس نے اپنے پیروں کو جبڑ دی۔ وہ بال تیز دھار کی طرح اس کے گوشت میں اتر گیا۔ وہ جسم کے جس حصے کو بھی حرکت دیتا۔ گھوڑے کا بال جسا بھی تھا، وہ نوٹھے کے بجائے کسی تھا۔ آسے کی طرح گوشت میں گھس جاتا۔ اور خون چکلنے لگتا۔

بقال نے صحیح کاما تھا، وہ گھوڑے کا بال، لوہے کا بہت باریک تار بن گیا تھا۔ ایسا تار جونہ نوٹھ کا اور نہ کھل سکتا تھا۔ البتہ زور آزمائی کے وقت جسم کو کسی بلیڈ کی طرح کاٹ سکتا تھا۔

”یہ کیا کام نے؟“ اس نے غصے سے کمال۔

”کچھ نہیں اپنی گرفت میں لیا ہے؟“ وہ ہلکتی ہوئی آواز میں بولی۔

”ویکھو، مجھے آزاد کر دو، مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ اپنے والدین سے ملتا ہے۔“

”اب تم کسی سے نہیں مل سکتے۔ تمہاری ساری ملا قاتیں بند۔“

”تم کیا کرنا چاہتی ہو۔ اس طرح تو میں مر جاؤں گا۔“

”یہ ذمہ داری میری تھیں مرنے نہیں بولنے گی۔ تم مر گئے تو پھر سزا کوں بیٹھے گا۔“

”اچھا میرا جنم تو آزاد کر دو، بے شک ہاتھ پاؤں بندھے رہنے دو۔“

”فی الحال یہ بھی ممکن نہیں۔“ بقال نے بڑی روکھائی سے کمال۔

”پھر کیا ممکن ہے۔ کچھ بناو تو کسی۔“

”میں تھیں، تمہاری آبادی سے دور لئے جاتی ہوں۔“

”آخر کمال؟“

”اپنے علاقے میں، اپنی آبادی میں، ایک نئے جان میں۔“

”وہاں مجھے کیا کرنا ہو گا۔“

”ایک قیدی کو بھلا کیا کرنا ہوتا ہے۔ تم قید کاٹو گے، قید تھا۔“

”مجھے نادرہ سے تو مل لینے دو..... بقول تمہارے وہ یہاں اپنے پنچھے ہی والی ہو گی۔“

”بس اب اپاٹھنہ بند کر لو۔ بست من لی میں نے تمہاری بک بک۔“ وہ ایک دم طیش میں اس کی آنکھیں ایک دم ویران اور سفاک نظر آئے لگیں۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

محنت راؤ اپنے پہنچی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ وہ اب نہ جانے کیا کرنے جارہی تھی۔

دھیرے دھیرے سارے اگور کھا گیا، یہاں تک کہ اگور ختم ہو گئے۔ اگوروں نے اس کے کمزور جسم کو کہنی تو انہی بخشی۔

اب وہ میزکی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ اس نے کھانا کھایا۔ پھر وہ پانی پی کر لیٹ گیا۔ کہاں اس نے خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔ اس پر کھانے کا خمار چڑھنے لگ۔ وہ جلدی نیند کے آنکھ میں چلا گیا۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج غروب ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔ اس وقت اس کی حالت کافی بہتر نہیں۔ وہ ہمت کر کے دھیرے دھیرے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے اندر ہمرا فرور آیا۔ مگر وہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالے رہا۔ پھر وہ ایک ایک قدم جما کر امضا ہوا جھونپڑی کے دروازے کی جانب چلا۔

جھونپڑی کا دروازہ جھوٹا تھا۔ اسے جھونپڑی سے نکلنے کے لئے خاصا جملنا پڑا جب وہ دروازے سے نکل کر سیدھا کھڑا ہوا۔ تو باہر کا ماحول دیکھ کر جیت زدہ رہ گیا۔

سامنے لق دن صراحی تھا۔ رہت کے اوپنے نیچے میلے دور تک چھپلے ہوئے تھے۔ سامنے سورج کی بڑی سی لگی لال انگارہ بنی ہوئی تھی۔ دور تک کوئی درخت تھا، نہ آدم نہ آدم زاد۔ اتنے بڑے صحرائیں بس اس کی جھونپڑی تھیں۔

جانے اسے کہاں لا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

یہ بڑے انوکھے روز کی قید تھی۔ اس جھونپڑی کو چھوڑ کر اگر وہ فرار ہو نا بھی چاہے تو کہاں جائے گا۔ لہاسے مزا کے طور پر محض صحرائیں ہی چھوڑ دیا جاتا تو وہ کتنے دن زندہ رہتا۔ صحرائیں ہرست راست و نکلے کا باد ہودا سے راستہ نہ ملتا، وہ بھٹک بھٹک کر بھوک پیاس سے دم توڑتا۔ یہاں تو اسے نہ صرف لامیا یا گیا تھا لیکہ کھانا، پینا اور سونے کے لئے قالین بھی موجود تھا۔ گویا اسے اعلیٰ درجے کی قیدی گئی۔

ہرست تو اس کا مسئلہ اپنی توانائی بحال کرنا تھا۔ توانائی بحال ہونے کے بعد اگر یہاں سے نکلنے کا کوئی سر دھکلائی دیا تو وہ ضرور فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔

انہیں وہ ڈوبتے سورج کو دیکھتا ہوا، یہ سب سورج ہی رہا تھا کہ اچاک فضائیں سننا ہٹتی ہوئی۔ ہوا کا ستر جھوٹکا سامسوس ہوا اور کوئی اس کے سر پر سے گزرتا ہوا، آگے چلا گیا۔

انہی اندر ہر انیں پھیلایا تھا۔ اس کے سر پر سے جو پرندہ گزر اتھا، وہ الو تھا۔ آگے جا کر وہ اپنی پلان۔ یہ وہ سیدھا گھسن راؤ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ محض اسے بڑے سے ہوئے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ نزو دیکھاں اس اٹوانے اپنے پچھے نکال کر اس پر جھپٹنے کی کوشش کی تو نہ جانے اچاک اس میں کہاں سے نکل کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ڈھکی ہوئی ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ اس ٹرے میں اس کے لئے کھانا اور انگوڑ تھے۔ وہ فرو جھک کر جھونپڑی کے اندر داخل ہو گیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کا زخمی ہو جاتا تھیں۔

گردن اٹھا کر رہ گیا۔ اس طرح گردن اٹھانے میں بھی اس پر ایک قیامت بیت گئی۔ اس کی آنکھوں سامنے اندر ہجا چھا گیا۔ اور سر میں ایک ایسی نیس اٹھی کہ وہ ترپ کر رہ گیا۔ وہ اپنی گردن گر بری طرح ہاپنے لگا۔ انہی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ وہ انہیں سال کا ایک کڑیل جوان تھا۔ لیکن وقت اس کی حالت دیکھ کر کوئی اسے جوان ہرگز نہ کہتا۔

وہ بے حس و حرکت پڑا، بہت دیر تک لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ تب کہیں جا کر اس کا سانس قابو آیا۔ لیکن جان اب بھی نہ آئی تھی۔ اس نے جھونپڑی کے اندر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس جھونپڑی

ایک طرف ایک چھوٹی سی میز تھی، اس پر کچھ ڈھکا ہوا کر رہا تھا۔ میز کے پیچے بنے پائیں ان پر کوئی کالا کپڑا کیا ہوا رہا تھا۔ غالباً کوئی چادر وغیرہ تھی۔ میز کے برابر ایک صراحی تھی جس پر ایک کٹورا ڈھکا ہوا تھا۔ اس میز اور صراحی کے علاوہ اس جھونپڑی میں کوئی اور چیز نہ تھی۔ البتہ قالین ضرور چھا ہوا تھا۔

وہ اٹھ کر باہر جانا چاہتا تھا۔ لیکن کئی گھنٹے گزر جانے کے باوجود اس میں تو نامی نہیں آئی تھی۔ اس حلق خشک ہو رہا تھا۔ کاشنے سے پر رہے تھے۔ وہ اٹھ کر صراحی سے پانی پینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ہ نہیں ہو رہی تھی۔ جب دو تین گھنٹے گزر جانے کے باوجود اس سے اٹھا نہیں گیا تو اس نے سوچا کہ مرا تک اٹھ کر جانے کے بجائے وہ آہستہ آہستہ کروٹ کے بل لڑھلتا ہوا کیوں نہ صراحی تک پہنچ جائے صراحی زیادہ دور نہیں تھی۔ مشکل سے پانچ چھٹ کے فاصلے پر ہو گی۔

اس نے اپنی قوت ارادی کو مضبوط کر کے اپنا بایاں ہاتھ گھما کر قالین پر رکھا پھر آہستہ آہستہ کروٹ لی۔ ایک کروٹ لینے ہی میں اس کی جان نکل گئی۔

پھر اسی طرح وہ کروٹ میں بدل کر لڑھلتا ہوا، کسی نہ کسی طرح صراحی تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے تھوڑا اٹھ کر صراحی کے اوپر ڈھکا ہوا کٹورا اتارا، اور اسے قالین پر رکھ کر ایک ہاتھ سے صراحی جھکائی۔ صراحی پانی سے بھری ہوئی تھی ذرا ساجھکا نے پرہی اس میں سے پانی چھلک اٹھا۔ پھر قل قل، کی آوازوں کے ساتھ پانی کٹورے میں گرنے لگا۔

کٹورا ہرنے کے قریب ہوا تو اس نے صراحی سیدھی کر دی۔ اور ہانپ کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب کچھ سانس درست ہوا تو اس نے پھر فراساٹھ کر، کٹورا اٹھایا اور منہ سے لگایا۔

پانی کا پسلانگونٹ کی چھری کی طرح اس کے حلق میں اتنا چلا گیا۔ وہ جلدی جلدی پانی پینے لگا۔ پانی مھٹدا تھا اور مٹھا بھی تھا۔

پانی پی کر اسے خاصا سکون محسوس ہوا۔ کچھ تو نامی بھی بحال ہوتی وکھائی دی۔ کچھ دیر کے آنکھیں موندے ناموشی سے لیٹا رہا۔ پھر اس نے میز کا سارا لے کر اٹھنا شروع کیا۔ کوشش کر کے وہ میز سے کٹکار بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ڈھکی ہوئی ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ اس ٹرے میں اس کے لئے کھانا اور انگوڑ تھے۔

اس نے اگور کے گچھے سے دو چار اگور توڑ کر کھائے۔ اگور بہت رس بھرے اور میٹھے تھے۔

بیفت میں بالکی کش تھی۔ راکھی اور نادرہ اسی کش کا شکار ہوئی تھیں اور اب بقا اے دیکھتے ہی اپنا دل ہار بینچی تھی۔

وہ اے اپنے ساتھ اڑالائی تھی۔ اور اے ایسی جگہ قید کر دیا تھا جہاں سے کسی کا گزرنہ تھا۔ راجہ مباری نے اپر جاتے ہوئے محض راڈ کا ہاتھ بقا کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا، اسے محض کی پچان کروادی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ”دیواہ کالی“ نے جس کسی کو بھی مد کئے لئے بھیجا ہے، وہ ہر قیمت پر محض راؤ سے اس کا مقام لے کر رہے گا۔ اے کیا معلوم تھا کہ خود صیادی شکار ہو جائے گا۔ اگر اے یہ معلوم ہوتا تو ”کسی قیمت پر محض راؤ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دتا۔

ویسے بقا کا پیار بھی کسی سزا سے کم نہ تھا۔ وہ اس کی جان نکال لیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے سارے بدن کا خون، خود اپنے جسم میں جذب کر لیتی ہے۔ بعد میں اس کی جو حالت فتح ہو، وہ اپنی جگہ لیکن اس عمل سے اس پر جو بے خودی، کیف اور سرشاری چھاتی تھی، اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب اے جو بقا نظر آئی تو اے ویکھ کر وہ مقضا دیکھیت کا شکار ہو گیا۔ اے ویکھ کر خوش بھی ہوئی اور رعنی بھی ہوا۔

جب بقا ایک ادائے خاص سے چلتی ہوئی جھونپڑی کے دروازے پر رکی اور پھر جھک کر جھونپڑی کے دروازے میں داخل ہوئی تو اس کی نظروں کے سامنے بجیاں سی کونڈ گئی۔ بقا مکرا کر سیدھی کھڑی ہوئی۔ اس نے محض راؤ کو قالیں پر چاق و چوبند بیٹھا دیکھا تو اس کی آنکھوں کی چک بڑھ گئی۔ وہ اے صحت مند دیکھ کر اندر ہی اندر بست خوش ہوئی۔ یہ خوش ولی ہی تھی جیسی کسی چوہے کو دیکھ کر ایک بیلی کو ہوتی ہے۔

بقا اس کے سامنے دو اونو ہو کر بیٹھ گئی۔ جیسے کسی دیوتا کے چرنوں میں کوئی داسی بیٹھ جائے۔ محض راؤ کاے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

”کیسے ہو، میرے جادوگر؟“ بقا نے تمسم فرمایا۔ ”میں بست براؤ ہوں، بقا۔“ ”محض راؤ نے پڑے عجب انداز میں کہا۔“ ”مجھے وہ کمی دے رہے ہو؟“ ”وہ کمی نہیں..... میں اپنا حال بتا رہا ہوں۔“ ”وہ فوراً سنبھل گیا۔“

”میں سب سمجھتی ہوں..... تم برے ہو یا اچھے..... اچھی طرح جاتی ہوں۔“ ”وہ مکرل۔“

”تم مجھے کمال لے آئی ہو بیتال۔“ ”تمہاری دنیا سے بہت دور، اتنی دور کہ تمہارے لوگوں کا گزر یہاں کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ کوئی تمہاری مد کے لئے آنا بھی چاہے تو نہیں آسکتا۔“ ”اور اگر میں خود یہاں سے فرار ہو جاؤں تو۔“ ”محض راؤ نے تھیے لبھجے میں کہا۔“

اپنے شکار کو جھونپڑی میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ اپر اٹھا اور جھونپڑی کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا دروازہ گیا۔ پھر ایک پکڑ لگا کر واپس جھونپڑی کی پچھت پر آبیٹھا۔

اٹھ کے اس محلے سے اے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ اس جھونپڑی کا دروازہ بننہ ہوئے کسی محافظت کی غیر موجودگی کے باوجود وہ جھونپڑی سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہاں کچھ نادیرہ محافظت ہے ہیں۔

دو تین دن گزر گئے۔

ان دو تین دنوں میں جھونپڑی میں کوئی نہیں آیا تھا۔ لیکن کھانے پینے کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی کھانا ختم ہونے پر کپڑے کے نیچے دوسرا کھانا آ جاتا۔ پانی کم ہونے پر صراحی خود بخوبی پانی سے بھر جائے کپڑے کے نیچے کھانا اور صراحی میں پانی ڈال کر جانے والا سے باوجود کوشش کے نظر نہیں آیا تھا۔ تین دنوں میں کسی سے بات کرنے، کسی کی شکل دیکھنے کے لئے ترس گیا تھا۔

لئن دفعہ صحراء کیلی جھونپڑی اور اس جھونپڑی میں تما آدمی۔

شاید یہ قید تھا تھی۔ سات دن گزر گئے۔ ان سات دنوں میں، وہ کھاپی کر خاصا بھلا پکھا ہے تھا۔ اس کی طاقت بحال ہو گئی تھی۔ ہاتھ پیروں کی رنگت سرخی مائل ہو گئی تھی۔ تب وہ آئی۔ ساتویں رات تھی۔ چاندنی چکنی ہوئی تھی۔ مٹھنڈی ہوا پبل روی ہوئی تھی۔ جھونپڑی کے ملگبا جالا پھیلا ہوا تھا۔

وہ دروازے کی طرف منہ کئے لیٹا تھا۔ بہر چاندنی بر سر رہی تھی۔ چودھویں کا چاند، ریت میں چکلیے ذروں کو نزدیک چکارا تھا بہر سو جالا پھیلا ہوا تھا۔ بڑی محور کن فضا تھی۔

تب ہی محض راؤ کی نظر کھلے دروازے پر پڑی۔ سامنے سے اے وہ قابلہ عالم آتی نظر آئی جس۔ اس کی بنتی مکراتی زندگی اجڑوی تھی۔ اس نے اس سے اس کی محبوبیت چھین لی تھی۔ والدین کے مم طرف جاتا راستہ گم کر دیا تھا۔ پھر وہ نہ جانے اس پر کیا عمل کرتی تھی کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ برسوں کا مریض بن جاتا تھا۔ اس عمل کے ذریعے شاید وہ اس کے جسم کا تمام خون اپے اندر جذب کر تھی۔

وہ اے آتا دیکھ کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سات دن کے بعد اے کسی کی شکل دکھائی دی تھی۔ ”نا لباس میں تھی۔ اور آتی ہوئی کسی بھکلی ہوئی روح کی طرح لگ رہی تھی۔ محض راؤ کی جوانی نے اسے بھکارا یا تھا۔ یوں تو وہ دیواہ کے روچ تونہ تھی لیکن بھکلی ہوئی ضرور تھی۔“

”کھم پر اے سزادیے آتی تھی۔ اس نے جو گل رام پال کو سزادے بھی دی تھی۔ محض راؤ کو بھی“ دیسے کی تیاری مکمل کر بچی تھی، لیکن جب اس نے محض راؤ کو سزادہ کھاتو وہ اے دیکھ کر سزادہ نا تو دروکی“ ہے۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ وہ اس کے تعاقب میں کیوں آتی تھی۔

”محض راؤ ایسا ہی صیمین مرد تھا۔ اس کی موجودگی خواتین کے دلوں میں آگ لگا دیتی تھی۔ اس اے

”ایسا سوچنا بھی مت۔ تم کسی اور کے قیدی نہیں ہو، بقال کے قیدی ہو۔“ اس نے دمک دی۔ ”کیا ہو گا..... جب تک تم میرے پاس لوٹ کر آؤ گی، میں جانے کمال سے کمال جاپا کہوں گا۔“

”ایک دن تم نے نکل کر دیکھا تو تھا، پھر دوبارہ نکل کر دیکھ لینا۔ تمیں معلوم ہو جائے گا۔ جب اس جھونپڑی کی جھست پر بھاگی اسخاف اپنے خونوار پیچوں سے تم پر حملہ کرے گا تو تمیں اس جھنپڑی کے اندر داخل ہوتے ہی بنے گی۔ ویسے میں جاتے ہوئے مزید ایک محافظ کو مقرر کرتی جاؤں گی۔“ اس نے بتایا۔

”میں یہاں کب تک قیدرہوں گا۔“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”یہ تماری عمر قید ہے۔“ بقال نے اسے گھری لگا ہوں سے دیکھا۔ ”تمیں کوئی پرشانی ہے یہاں، میرے جادو گر؟“

”نمیں، مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے بھلا۔ میں یہاں بست آرام میں ہوں۔“ محسن نے خدا کہا۔

”اچھا، ایسا کرو، مجھ سے ایک جادو کیکہ لو، اس کے ذریعے تم اپنی مرمنی کی کھانے پیئے کی اشیاء مغلی سکتے ہو۔ چھوٹی موٹی اور بھی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔“

محسن راؤ نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی کیونکہ کھانے پینے کو جو کچھ مل رہا تھا، وہ اس کی مرمنی کا نکاح تھا۔ ایک مقررہ وقت کے بعد ملتا تھا۔ یہ جادو سیکھنے کے بعد کم از کم اسے کھانے پینے کی آسانی تو وہ جانے لگا۔

بقال نے اسے تین لفظ بتایا۔ ان لفظوں کو کتنی بار اور کس ترتیب سے دہراتا ہے اور درہ اکر کر جو بجا کرنا ہے۔ یہ سب اس نے بقال سے سیکھ لیا۔ اور اسی کے سامنے اس جادو کو آزمائی ہی لیا۔

اب وہ اس جادو کے ذریعے اپنی پسند کے کھانے مٹکوا سکتا تھا۔ وہ خوش تھا۔

”بقال، ایک بات پوچھوں بتاؤ گی۔“

”ہاں، بتاؤں گی، پوچھو۔“

”کچھ نادرہ کے بارے میں بتا سکتی ہو۔؟“

”تماری نادرہ، تماری قیص باتوں میں لئے میٹھی ہے۔ کبھی اسے آنکھوں سے لگاتی ہے۔“

”اوہ جو تھی۔ کنی باروہ جنگل کا چکر بھی لٹاپکی ہے کہ شاید تم کیس میں مل جاؤ۔“ اس نے بتایا۔

”اور راکھی کا کیا ہوا؟“

”راکھی کا اب کوئی سارا نہیں رہا۔ اس کا باب پچل سا اور جسے اس نے اپنے من مدد نہیں تھا۔ اس کی کوئی خبر نہیں۔ اس کے قبیلے نے کچھ لوگ شر جا رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے رپکھ اور بدر۔“

ساتھ شر جانے نتیجی کر رہی ہے۔ دن میں کمی بازوہ نمر کے پل کا پکر مار جاتی ہے۔ اور تمارے نہ لئے اپنی بھیگل آنکھوں کے ساتھ اپنی بستی میں لوٹ جاتی ہے۔“ بقال نے بتایا۔ پھر بنس کر بولی۔ ”تم کس قدر ظام ہو میرے جادوگر، دو لڑکوں کو اپنی محبت کے فریب میں بنتا۔ رکے صحر میں آپنے

”ہاں تم صحیح کہتی ہو۔“ محسن راؤ نے ادائی سے کہا۔ ”اب تیسری لڑکی میرے ذیب میں بنتا ہو گئی ہے۔ میں جلدی اسے بھی چھوڑ جاؤں گا۔“

”کسی بھول میں نہ رہتا، میرے جادوگر..... میں راکھی یا نادرہ نہیں ہوں۔ بقال ہوں بقال۔ صحرائی شزادی..... اس صحر کا ایک ایک ذرہ مجھے سلام کرتا ہے۔ یہ تماری دنیا نہیں۔ یہ میرا جان ہے۔ مجھے پھوڑ کر جانے سے پلے تھیں اپنی جان چھوڑنا ہوں۔ کیا سمجھے؟“

”بھی ایسا وقت آیا تو یہ بھی کر گزروں گا۔“ محسن راؤ نے اپنے اطمینان سے کہا۔

”ممتضدی ہو؟“ بقال نے اپنک اپنی تیز چکلی آنکھیں اس کے چڑے پر گاڑ دیں۔ محسن کو ایسا محسوس ہوا جیسے حرمیں اچانک طوفان آگیا ہو۔

”لگبڑا کر بولا۔“ تیک کیا کرنے جاری ہو۔“

”کچھ نہیں۔“ بقال نے بڑی ساوگی سے کما گمراہ اپنی تیز چکلی آنکھیں بدستور اس کے چہرے پر رکھ رہی۔

اس کی آنکھوں میں ضرور کچھ تھا۔ محسن راؤ کے دماغ میں آندھی چلنے لگی۔ ہوا کا شور اور اڑتے ہوئے بت کے بگولے۔ وہ گھبرا کر لیٹ گیا۔

بقال اسی لمحے کی منتظر تھا۔ اس نے اس کے پیروں کے دونوں انگوٹھے پکڑ لئے۔ بس پھر کیا تھا۔ اس فورگی طاری ہونے لگی۔ بقال کسی صحرائی بگوئے کی طرح اس پر چھاتی چل گئی۔ محسن راؤ پر سرشاری کی لیفت طاری ہونے لگی۔ وہ بے خود ہوتا گیا، یہاں تک کہ اسے اپنا ہوش نہ رہا۔

بقال سے ہوش آیا تو وہ ہوش ربا جا بھی تھی۔

اس کی وہی کیفیت ہو گئی تھی۔ جیسے برسوں کامریض، ہاتھوں پیروں میں جان نہیں۔ دماغ کی رگیں نہ ہوئیں۔ سر اٹھا تو چکر آجائے، انڈھیرا چھا جائے۔

ایسا تھا۔ وہ صحرائی جوک اس کے بدن کا سارا خون پی گئی تھی۔

”وچاروں اس پر تقاضت طاری رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے جسم میں توہاٹی بحال ہونے لگی۔ اس

اپنے کالکلی کر خود کو تندروت سرت کر لیا۔ اس دوران بقال کی صورت دکھائی نہ دی۔ شاید وہ اس کی صحت نہ بخوبی کا انتظار کر رہی تھی۔

نہ اٹھ دن میں محسن راؤ پھر سے بھلا چنگا ہو گیا۔ کنی بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ یہاں

تائیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ایسی المانگ کمانی سن کر کون میں اپنے آنسوؤں کو روک سکتی ہے۔ یہ ایک طویل داستان تھی۔ اپنے بھائی کی رواداد سننے ہوئے وہ بالکل دم سادھے پیٹھی رہی تھی۔ اس نے کوئی بد اختلت نہیں کی تھی۔ مبارادر میان میں سلسلہ ٹوٹ جائے۔ کالے چراغ نے بتا چھمے انداز میں محسن کی کمانی سنائی تھی۔ اتنے اچھے انداز میں کہ وہ دم بخود پیٹھی سنتی رہی تھی۔ کئی جگہ اس نے اپنے آنسو ضبط کئے تھے۔ لیکن آخر میں وہ ضبط شدہ آنسو اندر نہ رہ سکے تھے، ابل کر باہر آگئے تھے۔

تائیہ نے اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کئے۔ کالا چراغ اسے روٹے ہوئے بڑی محیت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان آنسوؤں پر ٹوکار کا نہیں تھا، نہ ہی تسلی دی تھی۔ وہ بس گم صدم بیٹھا رہا تھا۔

پکھ دیر کے بعد جب تائیہ کے دل کو قرار آیا تو وہ بڑی اداسی سے مسکراتی اور کالے چراغ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”میرے بھائی نے چھوٹی سی عمر ہی سے بست وکھ جھیلے ہیں۔ پسلاوکھ انہیں میرے پچار او احمد علی نے دیا۔ اگر وہ ان کے قتل کی سازش نہ کرتا تو میرا بھائی آج ان اذتوں سے کیوں گرفتار تھا۔ میرے بھائی کی زندگی تو مستقل تین بن کر رہ گئی ہے۔ ان کی یہ قید تو عمر قید سے بھی بڑی ہو گئی۔ عمر قید کا مجرم چودہ سال ب بعد جل سے رہا تو ہو جاتا ہے۔ میرے بھائی کو تو سزا بھکتی میں پائیں سال ہو گئے ہیں اور ان کا کوئی پرمان حال نہیں۔ وہ بھی کیا قسم تکھا کر لائے ہیں۔ اتنے بڑے باب کا یہاں، ایک معمولی ماری کے گھر پل کر جوان ہوا۔ راج ماری سے جان چھٹی تو وہ بقال کی قید میں چلا گیا۔ جواب ان کی زندگی کی لاگوئی ہوئی ہے۔ کماں ہے وہ بقال، میرے سامنے آجائے تو میں اس کا خون پی جاؤں۔“

کالے چراغ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ تائیہ کا غصہ بجا رہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی موتا، اس کا یہی رو عمل ہوتا۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟“ تائیہ نے پکھ دیر کے بعد کہا۔
”بولو۔ کوئی بات!“ کالے چراغ نے دریافت کیا۔

”یہ بات میں خواب میں بھی دیکھتی تھی اور جب حقیقت میں جھوپڑی کے سامنے پہنچی، تب بھی مجھے وہ اداز سنائی دی۔ خواب میں، میں دیکھا کرتی تھی کہ جب جھوپڑی کے نزدیک پہنچتی ہوں تو اندر سے آواز آئی ہے۔ ذرومت..... آواز اندر آجاؤ، جب میں حقیقت میں جھوپڑی کے سامنے پہنچی۔ تب بھی یہ آواز سنائی دی۔ سوال یہ ہے کہ کیا میرے بھائی کو، میری آمد کا انتظار تھا۔ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ میں ہمارا ضرور آؤں گی۔“

”بالکل۔“ کالے چراغ نے یقین سے کہا۔

”آخر کیسے.....؟ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ جھوپڑی کے دروازے پر آئے والی میں ہوں۔“

”یہ میں نے اسے چتایا۔“
”لیکن آپ تو اس وقت میرے پہنچے تھے۔ میں اس وقت کی بات کر رہی ہوں جب آپ نے مجھے اندر جانے سے روکا تھا۔“

سے فرار ہونے کی کوشش کرے۔ لیکن پھر رک جاتا تھا۔ ایک تو اسے راستے کا پتہ نہ تھا کہ کہ مر جائے بالفرض محال اگر وہ کسی سمت چل ہی پڑے تو بقال کے محافظوں سے جان چھڑانا آسان نہ تھا۔ وہ اُلوا ایک دم مستعد جھوپڑی کی چھت پر بیٹھا رہتا تھا۔ پھر دوسرا محافظ دروازے کے نزدیک بھر اٹھا کئے کھڑا رہتا تھا کہ محسن نے صحرائی طرف قدم اٹھا کر اور وہ لگا پہنچے۔ ایک بار اسے خیال آیا کہ کہ نہ وہ دن کی روشنی کے بجائے رات کے اندر ہیرے میں جھوپڑی سے نکل کر صحرائی مگم ہو جائے۔ اُم منصوبے پر عمل کرنا آسان نہ تھا کیونکہ اُتو اور سانپ دونوں ہی رات کے اندر ہیرے میں دور تک دیکھ سکتے تھے۔

آخر بقال کوئی بے وقوف حلقون نہ تھی۔ اس نے محسن کو سلاخوں کے پہنچے تالے میں بند نہیں کیا تو اس کچھ سوچ کر ہی کیا ہو گا۔

کوئی چھ ماہ بعد تھا اُکر محسن راوے نے بقال کی گرفت سے نکلنے اور اس اذیت ناک صورت سے پہنچ کے لئے فرار کی کوشش کی۔ اس نے جھوپڑی سے نکلنے ہی تیزی سے ایک سمت بھاگنا شروع کر دیا۔ لیکن ریت پر بھاگنا آسان کام تونہ تھا۔ اس کے پیور ریت میں دھن رہے تھے۔ بھاگنا دو ہمراہ رہا تھا۔ پھر جب اس نے اپنے شکار کو فرار ہوتے ہوئے دھن رہا تو اسکے نزدیک پہنچتا تھا اُکر ازا اور چند سیکنڈ میں اسے جالی۔ اس نے محسن کے چہرے پر ایسا پچھہ مارا کہ اس کی آنکھ زخمی ہوتے ہوئے رہ گئی۔ بہر حال اس کے رخسار کو اس نے زخمی کر دیا تھا۔

اس دن کے بعد سے اس نے فرار ہونے کا منصوبہ ترک کر دیا۔ وہ دراصل اپنی صورت بگاہنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی صورت خود بخود بگزینی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اب مستقل پیلاہٹ رہنے لگی تھی۔ وہ بدن اس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ شروع میں وہ ہفتے عشرے میں کہاں پی کر اپنی جان بنا لیتا تھا۔ لیکن پھر یہ وقفہ بروختا گیا۔ اور وقت کے ساتھ اس کی صحت کی بحالی میں پا گئی۔ ماہ لگنے لگے۔

لیکن بقال نے ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کا پیچھانہ چھوڑا۔

آج تک وہ اس کی جان کو آئی ہوئی ہے۔ اس کو چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ محسن راوی کی ان سولہ سترہ برسوں میں جو حالت ہو گئی ہے۔ اگر تم اسے اس وقت دیکھ لیتیں تو شاید ہوش ہو جاتیں۔ تمیں شدید اذیت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی لئے میں نے تمیں جھوپڑی میں داخل ہوا سے روک لیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم اپنے بھائی کو دیکھنے سے پہلے سارے حالات جان لو ماکہ تم میں پیدا ہو جائے اور تم اس کی صورت دیکھ سکو۔ میرا خیال ہے کہ میں نے محسن راوے سے متعلق ہوا وہ سے بتا دی ہے جس کی تمیں ضرورت تھی۔ پھر بھی کہیں کوئی تقاضی رہ گئی ہو تو سوال کر سکتی ہو۔“

کر کالا چراغ نامہ دش ہو گیا۔
کر کرے میں ہی خاموشی چاہی گئی۔ یہ موت کی سی خاموشی تھی۔

”آپ نے اسے کیا پایا۔“
 ”میں نے ابھی تمہیں بتایا تاکہ وہ ایک خبیث مخلوق ہے۔“ کالے چراغ کی پیشانی پر بل آگئے۔
 ”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“
 ”پہلے اپنے بھائی سے تو مل لو۔“
 ”اہ، ٹھیک ہے..... چلنے پڑے مجھے میرے بھائی سے نلا دیجئے۔“
 ”تم دیہر کھانا کھالو، کچھ دیر آرام کرو۔ پھر میں محسن حسن راؤ کے پاس لے چلوں گا۔“
 کمانے کا وقت قریب تھا۔ تانیہ نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اسے اپنے بھائی کے مل جانے کی بہت خوشی تھت نے بہت صحیح وقت پر اسے اپنے بھائی کی مدد کے لئے بھیج دیا تھا۔
 کلئی چار بجے کے قریب کالا چراغ کر کرے میں آیا۔ اس اثناء میں تانیہ تمہری دیر آرام کر کے، منہ تو دھوکہ تیار ہو گئی تھی۔ اس نے کالے چراغ کو اندر آتے دیکھ کر پوچھا۔ ”چلیں۔“
 ”اہ، بالکل۔“ کالے چراغ نے فراہم جواب دیا۔ جب وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو کالے چراغ نے دیکھا کہ اس نے اپنا سامان کمرے میں ہی چھوڑ دیا ہے تو اس نے تانیہ سے کہا۔ ”کیا آپ اپنا مال ساقھ نہیں لیں گی۔“

”ایسا یہاں بعد میں واپس نہیں آتا۔“ تانیہ نے پوچھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ ضرورت نہیں پڑے گی۔ اگر ضرورت پڑی تو آجائیں گے۔“
 ”میں ہی۔“ یہ کہہ کر تانیہ نے اپنا سامان سمیٹ لیا۔
 اس کا سامان ہی کیا تھا، ایک یگ ہی تو تھا، اس نے اس میں اپنی تمام چیزیں بھر کر بیک کندھے پر ڈالا۔ اور بولی۔ ”آئیے، چلیں۔“
 جب تانیہ اس محل نمائمارت سے باہر نکلی تو دھوپ ڈھل رہی تھی۔ باہر کی وہی فضائی۔ ان دونوں ٹیواروں نکل کوئی نہ تھا۔ درمیان میں حسین فوارہ۔ چاروں طرف درہی در تھے۔ ایک خوبصورت بزرگ تھا فوارہ کے نزدیک سے گزر کر جب اس نے ایسے ہی پلٹ کر سرخ پتھروں والی عمارت پر الوداعی نظرِ الذاچاہی توہاں کوئی عمارت نہ تھی۔

اور جب فوارے سے آگے محرباً دروازے میں داخل ہوئی تو پیچھے سر بریزاغ، فوراً اور چاروں طرف نہ در عائب ہو گئے۔ پھر وہ محرباً دروازے سے گزر کر اپر جاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی تو اس میں ہمت ملما کہ پیچے ملکر دیکھئے۔ لیکن جب وہ ہنڈر کی سیڑھیاں چڑھ کر اپر پہنچی اور اس کے پیچسے نے اسے پیڑھ کر دیکھا کہ سیڑھیاں بھی عائب ہیں اور ان سیڑھیوں کی جگہ ایک ڈھلان عمالاً دے رہی تھی۔ اور نیچے گڑھ میں پانی بھرا ہوا تھا۔
 کالا پرچاراغ اس کے آگے چل رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس سے پوچھئے کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ باغ، وہ سب کیا ہوت۔ اب چاروں طرف ریگستان تھا۔ اڑتی ہوئی ریت تھی۔ اور دور کیس چند چیزوں نہ سے رہی تھیں، پھر وہ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غیر انسانی مخلوق کی گرفت

”یہ بات میں، تمہارے یہاں پہنچنے سے پہلے بتاچا ہوں کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب تمہاری بڑی ترکش ہماری نجات وہندہ بن کر آئے گی۔“ کالے چراغ نے بتایا۔
 ”نجات وہندہ؟“ تانیہ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

”ہاں، تم وہ واحد ہستی ہو جو اپنے بھائی کو اس عذاب سے بچا سکتی ہو ورنہ کچھ عرصے کے بعد اس موت یقینی ہے۔“ کالے چراغ نے اکشاف کیا۔

”میں، میں اپنے بھائی کو مرنے نہیں دوں گی۔ اگر اپنی زندگی دے کر بھی ان کی زندگی بچانی پڑے؛ بچالوں کی؟“ تانیہ نے بڑی محبت اور بڑے یقین سے کہا۔
 ”میں جانتا ہوں۔“ کالے چراغ نے کہا۔ ”اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو تمہیں میں مل کر لاتا کیوں؟“

”آپ لائے ہیں مجھے یہاں؟“ تانیہ نے جیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں، یہی سمجھو۔“ کالے چراغ نے گول مول جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کالے کمرے میں، میری ایک راجہ جیسے شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔“ ”آپ ہی کا کوئی روپ تھا۔“

”میں، وہ میں نہیں تھا، وہ راکل ہے۔“

”راکل۔“ تانیہ نے اس کا نام دہرایا۔ ”انہوں نے مجھے ایک ڈائری دی تھی، میری زندگی کا خالہ بتانے والی۔ وہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ یہ ڈائری انہوں نے تحفہ دی تھی۔ ان کا خیال تھا میں نے انہیں آزاد کروایا ہے۔ لیکن میں نے تو ان کی آزادی کے لئے کچھ نہیں کیا۔“

”یہ سن رہ کالے چراغ نے ایک زور دار قسم لگایا۔ پھر بولا۔ ”وہ بہت فتنہ شخص ہے۔“

”ہو گا۔“ تانیہ نے لاپرواٹی سے کہا۔ ”مجھے تو اس نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”آنے والے کل کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔“

”راکل کون ہے؟“

”ہماری دنیا کا ایک طاقتور شخص..... جو بڑا شو قین مراجع واقع ہوا ہے۔“

”اور یہ بقاں کون ہے؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”بچاں، راکل کی بمن ہے۔“

”اوہ، اچھا۔“ تانیہ طے نہ کر پائی کہ اس اکشاف پر وہ خوش ہو یا حیرت کا اظہار کرے۔ اس کچھ سوچ کر کالے چراغ سے کہا۔ ”پھر تو محسن بھائی کے سلسلے میں راکل سے مدد لی جائیں گے۔“

”وہ بمن کے خلاف تمہاری کیوں مدد کرے گا۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے۔“

”تمہاری اس سے صرف ایک ملاقات ہے، میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔“

بچھے نہ تھا۔ کچھ فاصلے پر اسے جھوپڑی نظر آری تھی۔ جس کی چھت پر ایک اٹو بیٹھا تھا اور ایک پر دروازے پر کنٹلی مارے پڑے دے رہا تھا۔

انہی نے جھوپڑی کو دیکھ کر ایک گمراہ سن لیا۔

”کوئی تمہارا دم تو نہیں گھٹا۔“ کالے چراغ نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں بالکل نہیں..... بلکہ مجھے تو یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں ریت کے نیلے میں سے گزر رہی ہے۔“

”آئیں نے بتایا۔“

”اب تم اندر جاؤ۔۔۔ اپنے بھائی سے مل آؤ۔“

”آپ اندر نہیں جائیں گے۔“

”نہیں، میں باہر بیٹھوں گا۔“

”کوئی خاص بات ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، ایک خاص بات ہے۔ تمہاری حفاظت کے لئے مجھے یہاں رکنا پڑے گا۔“ کالے چراغ بتایا۔

”لیکن میں اندر جاؤں گی کیسے، وہ سانپ تو دروازے پر کنٹلی مارے بیٹھا ہے۔“

”سکی لگر نہ کرو، میں جیسے ہی جھوپڑی کے نزدیک پہنچوں گا، وہ فوراً غائب ہو جائے گا۔“

”ایسا ہو جائے تو بت اچھا ہو۔“

”ایسا ہو گا۔“ اس نے بڑے یقین سے کہا۔

ار پھر ایسا ہوا، جوں ہی وہ جھوپڑی کے نزدیک پہنچا۔ سانپ فوراً گنوم کر جھوپڑی کے پیچھے کمیں بو گیا۔ سانپ کے جاتے ہی الٹا بھی پیچھے کی جانب تیر پھر پھر اہست کے ساتھ اڑ گیا۔ کالا چانپ دروازے کے نزدیک پہنچ کر رک گیا اور ہاتھ کے اشارے سے اس نے تانیہ کو اندر جانے لیتی۔ تانیہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

جو گھنے دروازے سے گزر کر جب وہ جھوپڑی میں سیدھی کھڑی ہوئی تو اس نے جھوپڑی کے ایک قائم پر ایک شخص کو لیٹا ہوا دیکھا، اس نے کالی چادر اپنے اوپر اوڑھ رکھی تھی، منہ تک ڈھکا ہوا بٹھی ہوئی محسن کے نزدیک پہنچ گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً اس کے چہرے سے چادر پر اپنے چہرے سے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ذرا سا جھک کر بڑے پیار بھرے لہجے میں آواز ”مُنِّیْنِ بَحَلَلٍ۔“

ذمہ دکا آواز نہستے ہی چادر میں حرکت ہوئی۔ محسن نے دھیرے دھیرے اپنے چہرے سے چادر ہٹائی۔ اپنے چہرے سے چادر ہٹاتے ہٹاتے رک گیا۔ وہ چادر منہ پر لئے لئے آہستہ سے اٹھ گیا۔

میں ہے اور غیر انسانی مخلوق سے اسی کے کاموں کی توقع کی جاسکتی تھی۔

وہ اپنے کندھے پر بیگ لٹکائے خاموشی سے کالے چراغ کے نقش قدم پر چلتی رہی۔ وہ کافی تیز پڑھ تھا۔ تانیہ رفتار سے کہ تانیہ کو اس کے ساتھ چلانا دشوار ہو رہا تھا۔

”وزرا آہستہ چلے ہے۔“ بالآخر اس نے پکار کر کہا۔

کالے چراغ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ سنی ان سنی کر گیا۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ رکو آگے ایک ریت کا اوپنچالیہ تھا۔ وہ گھوم کر اس میلے کے پیچھے چلا گیا۔ تانیہ نے فرما دوڑ لگائی۔ اخشد شہ ہوا کہ کمیں وہ اس لق و قصر میں تھماں رہ جائے۔ لیکن جب وہ گھوم کر میلے کے پیچھے پہنچا تو کچھ نہ تھا۔ کالا چراغ غائب ہو چکا تھا۔ اس کو غائب پا کر اس کا دل وحک سے رہ گیا۔

یا اللہ..... اب وہ کیا کرے گی۔ کس طرح اپنے بھائی کی جھوپڑی تک پہنچے گی۔ جانے وہ جنم کہاں تھی۔ یہاں سے کتنی دور تھی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی نظر کا لالے چراغ پر پڑی۔ ریت کے میلے کے اندر سے اس طرح کلک رہا تھا جیسے پانی کی دیوار کے اندر سے نکل رہا ہو چکرہ رہتے اندر سے مکھیں میں بال کی طرح کلک آیا۔ اس کے چہرے پر اسرار مسکراہٹ تھی۔ اس کی مسکراہٹ جانے کیا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم بدل جاتا تھا۔ اور پھر یہ وہ وقت ہوتا تھا جب اس کے چہرے میں پیدا ہو جاتی تھی۔

”کیا ہوا مجھے غائب دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔“ اس نے سوال کیا۔

”ہاں، واقعی۔“ تانیہ نے جواب دیا۔

”آؤ، میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر کالے چراغ نے اس کا نازک ہاتھ تھام لیا، اور اسے زین میلے کی طرف لے کر چلا۔

”کہاں لے جا رہے ہیں مجھے۔“ تانیہ گھبرا کر بولی۔

سامنے خاصاً اوپنچاریت کاٹیلہ تھا۔ اور وہ ہاتھ پکڑ کے اس میلے میں داخل ہوا چاہتا تھا۔

”آؤ، اندر چلتے ہیں۔“ اس نے بڑے مزے سے کہا۔

”میلے کے اندر، ریت میں..... ہائے میرا تو دم گھٹ جائے گا۔“ تانیہ پریشان ہو گئی۔ اس کا ابھی سے رکنے لگا۔

وہ ایک قدم آگے تھا۔ اور ریت کے میلے میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اس طرح داخل ہو رہا تھا جیسے گا لوں میں گھس رہا ہو۔ اس نے تانیہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ وہ ریت میں غائب اور تانیہ کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ تانیہ کا ہاتھ ریت میں داخل ہوتا جا رہا تھا۔

تانیہ کے سامنے ایک دم اندر ہر اسچا گیا۔ اس نے اپنک ریت اپنے منہ پر محسوس کی۔ احسان چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہا۔ جب اس نے خوف سے بند ہوئی آنکھیں کھولیں تو ریت

لئے میرا نام بھی تبدیل کر دیا گیا۔ بابا نے میرے لئے بڑی قیمتی دی۔ ”

”کیسے ہیں میرے بابا اور ممی کا کیا حال ہے، وہ تو میری گندگی کی وجہ سے رورو کر پا گل ہو گئی ہوں گے۔“

تائی کے جی میں آئی کہ فروختا دے کہ وہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں، لیکن پھر یہ سوچ کر فخر گئی کہ ابھی یہ خبر محسن راؤ کے لئے شدید صدمے کا باعث ہو گی۔ وہ پسلے ہی سوکھ کر بہیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے۔ والدین کے انتقال کی اطلاع اسے مٹی کا ذہیر بنا دے گی۔

”وہ دونوں بھیک ہیں محسن بھائی اور آپ کو یاد کرتے ہیں۔“ اس نے سفید جھوٹ بولا۔

”اور وہ کمیتہ شخص؟“ محسن راؤ کے لمحے میں ختنی آگئی۔

”کون.....؟ وہ راؤ احمد علی؟“

”ہاں، اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”وہ ہمارے انتقام کا انتظار کر رہا ہے۔“

”ٹکرنا کر دو، تائی میں اس سے ایسا انقام لوں گا کہ اس کی روح تک کاپ جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے محسن کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔

تائی غور سے محسن کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک کامل چادر اور ڈھانچہ بیٹھا تھا۔ لیکن اس کی ایک آنکھ نزد کھائی دے رہی تھی۔ تائی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے اپنا چہرہ چادر میں کیوں چھپا رکھا ہے، اس نے فروزانہ محسن سے سوال کیا۔ ”بھائی ایک بات پوچھو۔“

”ہاں، پوچھو۔“ محسن نے کہا۔

”آپ مرا تو نہیں بانیں گے۔“ وہ بولی۔

”نفس ہر گز نہیں۔“

”یہ آپ نے اپنا چہرہ چادر میں کیوں چھپایا ہوا ہے۔“

”وہاں گئے تھے، اس سے بینے کے لئے۔“ محسن راؤ نے ہوا میں ایک تیر چھوڑا۔

لیکن اس جھونپڑی میں تو اس وقت خاصی گرمی ہو رہی ہے اور آپ ہیں کہ نہ صرف چادر اور ڈھانچہ نہیں بلکہ اپنا منہ بھی ٹوٹکر رکھا ہے۔ بھائی ہٹائیں تاپنے منہ سے چادر..... کیا اپنی مسن کو چہرہ بھی نہیں رہیں گے۔“ تائی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

تائی کی اس خواہش پر محسن راؤ اندر کاپ اٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی بن کو کس طرح سنگر اب اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل نہیں رہا، ایک وقت تھا کہ لڑکیاں اس کا چہرہ دیکھتی تھیں تو نظریں انہیں جانی تھیں اور اب وہ وقت آگیا تھا کہ اگر آج کوئی لڑکی اس کا چہرہ دیکھتی تو پھر زندگی بھر اس کا نہ دیکھنے کی قسم کامیابی۔ ایسا ہی ہو گیا تھا اس کا چہرہ۔

”تائی اگر تم میرا چہرہ نہ دیکھو تو اچھا ہے۔“ محسن راؤ نے دکھ بھرے لمحے میں کہا۔

اس نے چادر سر سے نہ اتاری بلکہ اس طرح اوڑھ کے کہ اس کا پورا چہرہ دکھائی نہ دے سکے۔“ گردن اٹھا کر ایک آنکھ سے تائی کی طرف دیکھا در خوش بھرے لمحے میں بولا۔ ”ترکش تم آنکھ۔“ بن تھم آنکھ۔“

”ہاں، بھائی میں آگئی ہوں۔ میں آپ کو لینے آئی ہوں۔“

تب محسن راؤ نے چادر سے ایک ہاتھ نکالا۔ سوکھا ہوا ہاتھ، جیسے بہیوں کا ڈھانچہ۔ اس نے اس اشارے سے اسے قلین پر بیٹھنے کو کہا۔

تائی نے فوراً اس کے سامنے قلین پر بیٹھ گئی۔ اور اپنے خوبصورت ہاتھوں کے درمیان اس کا ہاتھ لے لیا۔

”بھائی، آپ کی یہ کیا حالت ہو گئی۔“

”میری بن، میری یہ حالت بقا نے کی ہے، اس خبیث عورت نے میری زندگی جاہا۔“

”میں جانتی ہوں، مجھے کا لے چاہنے سب کچھ بتا دیا ہے۔ پوری کمانی سادی ہے آپ کی۔“

”کالا چاراغ بہت اچھا آؤ گی ہے، وہ کمی بار مجھ سے ملنے آچکا ہے۔ اسی نے مجھے تمہارے آر نویدی تھی۔ اور اس سے پسلے جب تم یہاں آئی تھیں اور اندر آئنے کی بجائے واپس پلٹ گئی تھیں تمیں اندر سے دیکھ رہا تھا۔ اسی لئے میں نے تمیں دیکھ کر کہا تھا کہ ڈر و موت..... اندر آ جاؤ، لیکن تم نہیں آئی تھیں۔ شاید کالا چاراغ نے تمیں اندر آنے سے روک دیا۔ اور تمیں اپنے سماں تھے لے گا۔“

میں جانتا ہوں کہ اس نے تمیں اندر آنے سے کیوں روک رکھا تھا۔ ”محسن بہت دھیرے دھیرے بہل جیسے وہ برسوں کا مریض ہوا اور اس سے بولا شہ جارہا ہو۔

”جی بتاؤں بھائی، مجھے اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آگیا تھا۔ لیکن اب سوچتی ہوں، اس کی سماں تھے لے جا کر اچھا کیا تھا، اگر میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانے بغیر آپ کو دیکھ لیں تو مجھے ذہنی صدمہ پہنچتا، خوش خیر میں، اب بھی نہیں ہو کی ہوں، آپ کا یہ سوکھا ہاتھ آپ کی سخت کاڑ رہا ہے، خیر کوئی بات نہیں، اب آپ کو اپنے سماں تھے لے جاؤں گی۔“

”ترکش، ایک بات بتاؤ، یہ تمہارا نام کس نے رکھا۔ دادا کی خواہش پر رکھا گیا ہو گا۔ بیا،“ حوالے سے اس نام کا ذکر اکٹھر کیا کرتے تھے۔“

”ہاں، بھائی میرا نام اپنی کی خواہش پر رکھا گیا تھا۔ لیکن اب میرا نام ترکش نہیں، تائی ہے۔“ ترکش کوئی نہیں کرتا، خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میرا نام ترکش ہے۔ ”تائی نے وضاحت کی دیکھا، حیرت ہے۔“ وہ بولا۔

”میں جب اپنی کمانی ساڑوں گی تو آپ مزید حیران رہ جائیں گے۔ آپ کے غائب ہو جائے۔“ ایک دم سم گئے تھے، انہوں نے چپا کے ذر سے مجھے کہی اپنی بیٹی نہیں کہا، میں غیروں میں پلے پڑے۔

”کیوں آخر..... میں اپنے بھائی کا چہرہ کیوں نہ دیکھوں۔“

”پچھاؤ گی۔“ محسن راوی نے دکھ بھرے لبجے میں کہا۔

”بھائی اب تو میں ضرور دیکھوں گی، کیا ہوا ہے آپ کے چہرے کو۔ لا میں ہٹائیں چادر۔“ پرکر تانیہ نے اس کی چادر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اچھا ٹھہرو، میں خود اتارتا ہوں چادر اپنے سر سے۔“ محسن راوی نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر تانیہ نے اپنے ہاتھ نیچے گرا لئے۔

تب محسن راوی نے اپنے دونوں ہاتھ چادر سے نکالے اور پھر اپنے چہرے سے گھونکھٹ اخاڑا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر تانیہ کی حیثیت نکل گئی۔

محسن راوی نے اپنا چہرہ فوراً دوبارہ ڈھانپ لیا اور لرزتے ہوئے لبجے میں بولا۔ ”میں نے تم سے کافی کہ میرا چہرہ مت دیکھو۔ مگر تم نہیں مانیں۔“

”بھائی، یہ سب کیا ہے۔ یہ آپ کے چہرے کو کیا ہوا ہے۔“ تانیہ کی آنکھوں میں آنسو پڑا۔

”میں ڈرتا ہوں، تانیہ کیسیں تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔“ محسن راوی گلر مند ہو کر بولا۔

”محسن، اگر تمیں بھاں کے چکل سے کوئی بچا سکتا ہے تو وہ صرف تمہاری بہن ہے۔ ورنہ وہ دن زیادہ دور نہیں، جب تمہارے چہرے کی دیکھ پورے جسم پر پھیل جائے۔“ کاملے چاغ نے

”ہمیں کچھ نہیں معلوم تانیہ..... میں تو بس زندگی کا عذاب کاٹ رہا ہوں۔“ اس کے لبجے میں پناہ دکھتا۔

”میرا بی جا چاہ رہا ہے، اس کیمین بھاں کو قتل کر دوں۔“ تانیہ اپنے آنسو صاف کرتے۔

”اسے قتل کرنا، اتنا آسان نہیں ہے۔ پھر میں اسے قتل کرنے بھی نہیں دوں گا۔“ یہ کا چاغ کی آواز تھی۔ تانیہ نے پیچھے مڑکر دیکھا تو وہ اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اندر آتے۔

”تانیہ لی بات سن لی ہی۔“

”آپ ذرا دیکھیں تو اس نے میرے بھائی کا کیا حشر کر دیا ہے۔ وہ واجب انتقال ہے کہ نہیں۔ اس نے شکایت بھرے لبجے میں کہا۔

”تم صحیح کہتی ہو اس کا جرم واقعی ہست بڑا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔“ بھروسی یہ ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اوزجو کسی سے محبت کرتا ہے، وہ آسے نقصان نہیں۔

”کاملے چاغ نے بڑے سنجیدہ لبجے میں کہا۔“

”پکھ دیکھ کر تو محبت کی ہوتی، ایسی بڑی عورت سے محبت کر بیٹھ۔“ تانیہ نے جھنجکار کر کہا۔

”محبت دیکھ کر کب کی جاتی ہے۔ محبت تو ہوجاتی ہے۔“ کاملے چاغ کا جواب تھا۔

”آپ لوگوں کے بیان بھی محبت کا یہی فلسفہ رائج ہے۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”بھارے تمہارے بیان کیا۔ یہ تو محبت کا عالمی فلسفہ ہے۔“ کاملے چاغ نے ٹھہرے ہوئے لبجے میں جواب دیا۔

”اب بھاں کا کیا کریں، اس نے میرے بھائی کو کہیں کامیں چھوڑا ہے۔“ تانیہ پریشان تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو چکل آتے تھے۔

”بھری، میں تم پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ محسن راوی نے اسے جھوٹی تسلی دی۔

”آپ بیٹھ جائیں۔“ تانیہ نے کاملے چاغ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اب بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔“ کاملے چاغ نے تانیہ کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب کچھ کر لے کر کاوت ہے۔“

”بھائی..... کیا کیا جائے۔ میں اپنے بھائی کی آزادی کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”میں ڈرتا ہوں، تانیہ کیسیں تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔“ محسن راوی گلر مند ہو کر بولا۔

”محسن، اگر تمیں بھاں کے چکل سے کوئی بچا سکتا ہے تو وہ صرف تمہاری بہن ہے۔ ورنہ وہ دن زیادہ دور نہیں، جب تمہارے چہرے کی دیکھ پورے جسم پر پھیل جائے۔“ کاملے چاغ نے

”زیاد۔“

”ہمیں کچھ نہیں معلوم تانیہ..... میں تو بس زندگی کا عذاب کاٹ رہا ہوں۔“ اس کے لبجے میں پناہ دکھتا۔

”میں اپنی صحت، اپنی آزادی، اپنی زندگی کے لئے اپنی بہن کو کسی جنم میں نہیں جھوک سکتا۔“

”میں راوی نے کہا۔ پھر وہ تانیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔“ تانیہ تم واپس چل جاؤ، تم ایک سیدھی سادی لڑکی ہو۔ تم ان لوگوں کا مقابلہ نہ کر سکو گی میں جادو گر ہو کر بھاں کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تم تو ہمیں پھریتی نہیں ہو۔ تم

”یہاں تک آگئیں۔ میں نے تمیں دیکھ لیا میرے دل کو سکون ہو گیا، یقینہ زندگی میں اسی ملاقات کے تصور

”میں کاٹ دوں گا۔“ میری بہن، میرا کہماں اوپر میں چل جاؤ۔ تم بھاں سے واقف نہیں ہو۔ وہ ایک انتہائی

”غافل اور عیار عورت ہے۔ اس کا مقابلہ آسان نہیں۔“ پھر تم اس بات سے بھاں کے زبردست ہونے کا

”خواہ دلکش کیا ہے کاملاً چاغ آج تک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ اس سے مقابلہ کے لئے یہ تمیں تو تمہاری

”ناتا ہے اسے ایسے ہیں میں اپنی دنیا لی خلوق کا خود کوئی بندوبست نہ کر سکے۔ ہے تا، یہ لئی حریت اگریز اسے جگہ نہیں بھاں سے محبت کے بھی دعوے دار ہیں۔“

”وکھو میری محبت کا مذاق نہ اڑاؤ۔“ کاملے چاغ نے تنبیہ لبجے میں کہا۔ ”جبات تم نہیں بھائی۔ اس کے بارے میں اس یقین سے بات کرنا خود اپنے آپ کو فریب رہتا ہے۔ میں بھاں سے محبت رہا۔ یہ اب بھی دعوے سے کہتا ہوں اور یہ بات اسی قدر پچی ہے جیسے سورج۔ رہ گئی یہ بات کہ میں

”بھاں کا خود مقابلہ کیوں نہ کیا، اس کے مقابلے کے لئے تمہاری بہن کو کیوں لے کر آیا ہوں۔ تو محسن

اب کیا ہو گا؟" تانیہ ایک دم گھبرا گئی۔

"پوت برا ہوا۔" محسن راؤ نے افرادہ لمحے میں کما۔

"میں دیکھا ہوں، کیا معاملہ ہے۔" کالا چراغ اٹھتا ہوا بولا۔ "اگر بقال آئی ہے تو وہ ابھی تک اندر نہیں آئی۔" وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔

نہیں اور محسن راؤ نے پر جنس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

یونہی دروازے کے سامنے پہنچ کر باہر نکلنے کے لئے جھکتا ایک لمحے کے لئے جھکا کا جھکارہ گیا۔ پھر

ذوزدہ ہو کر پہنچے ہٹا اور تینی سے ان دونوں کے نزدیک آگیا۔

"مارے گئے۔" کالے چراغ نے مٹھڈا سانس لے کر کما۔

"کیا ہوا؟" کون ہے باہر۔ "تانیہ نے پوچھا۔

"ہم گیر لئے گئے ہیں۔ باہر بقال کے کارندے موجود ہیں۔؟"

"اور بقال؟" محسن راؤ نے پوچھا۔

"وہ مجھے سامنے نہیں وکھائی دی۔ بہر حال وہ بھی آس پاس ہی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ آیا ہی

تھا یہ اچھا نہیں ہوا، اس نے میرے جال چینکے سے پسلے ہی اپنا جال پھینک دیا۔" کالے چراغ

نہتھکھے ہوئے لمحے میں کما۔

اگلی عنکوچھ سوال کرنے ہی والا تھا کہ جھونپڑی کے باہر سے آواز آئی۔ یہ آواز سونیصد بقال کی

"جھونپڑی میں بیٹھ کر میرے خلاف سازش کرنے والو، سنو میں آگئی ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، تم

اوور آؤ دی مجھے زیر دام لے آؤ گے۔" یہ تم لوگوں کی بھول ہے، میں تماری یہ سازش کبھی کامیاب

ہونے دیں گی۔ اور سن لوچ گاڑ کے پیچے، اب تو باہر آ جا تھے گر فنڈ کیا جاتا ہے۔" بقال نے ایک

یعنی کیا پھر اس کی آواز آئی۔ "چل جلدی کر، فوراً باہر آ جا۔"

کالے چراغ نے یہ اعلان سن کر مایوسی سے تانیہ اور محسن راؤ کی طرف دیکھا۔ اور دیہرے سے بولا۔

اپنامیں چلتا ہوں۔ میرے پر کٹ گئے ہیں۔ اب نہ اپنے لئے کچھ کر سکتا ہوں اور نہ تمارے لئے۔

بس لئے دعا کرنا۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

"بلدی کر اوچ گاڑ کے پیچے۔" باہر سے پھنکارتی ہوئی آواز آئی۔

ٹھپٹھا گان دنوں سے رخصت ہو کر جیسے ہی جھونپڑی کے دروازے سے باہر آیا تو اس نے بقال کو

لے کر پسوارا پسے سامنے پایا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کسی شزادی کی طرح لگ رہی تھی۔ کالے چراغ کو

لے کر اس نے قفسہ لگایا اور پھر طنز بھرے انداز میں بولی۔ "آگیا تو..... میری جان کے

کمزوری جان کا دشن نہیں ہوں بقال۔" کالے چراغ نے عاجزی سے کما۔

سن لو مہینوں اس نے مجھے یہ پتہ ہی نہ چلے دیا کہ وہ تمیں جنگل سے اٹھا لائی ہے اور تماری محبت میں

گرفتار ہو گئی ہے۔ جب مجھے شب ہوا اور میں اس کے تعاقب میں بیہاں تک پہنچا تو حقیقت میرے سامنے آئی۔ جب میں نے اس مسئلے پر بقال کی گرفت کی تو اس نے دیواہ کاٹی کا نام لیا اور راج مداری کا قاترہ سنایا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ دیواہ کاٹی کے حکم کے مطابق راج مداری کی خواہش پر اسے سزا دے رہی

ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بقال تمارے ساتھ جس طرح پیش آرہی ہے، وہ کسی عذاب سے کم

نہیں۔ لیکن اس سزا میں اس کے لئے تیکنیں ہیں تیکنیں ہے۔ اس نے اپنی غرض کے لئے جیسیں زندہ رکھا کرنا ہوا ہے۔ جو سگین جرم ہے، حماری دنیا کا قانون اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر میرے لئے تمیں ختم کرنا کوئی مشکل کام نہیں اب بھی ختم کر سکتا ہوں اور کل بھی ختم کر سکتا ہے۔ تمارے خاتے کے بعد بقال

کا کھیل ختم ہو جاتا۔ لیکن تمارا قتل اس سے نہ چھپتا، وہ جان جاتی۔ نتیجے میں وہ میری دشمن ہو جاتی۔ اور

یوں میری محبت خاک میں مل جاتی۔ اس لئے میں نے یہ راست اختیار نہیں کیا۔ سوچتا رہا کہ کیا کرنا

چاہیے۔ وقت گزر تارہ۔ ایک بات تمیں اور بتا دوں۔ حماری دنیا کے وقت میں اور تماری دنیا کے وقت

میں بہت فرق ہے۔ تمارے حساب سے بقال کی قید میں تڑہ اٹھا رہا ہو گئے ہیں لیکن میرے حساب سے صرف سات آٹھ ماہ۔ خیر جب میں نے تماری دنیا میں جا کر تمارے خاندان کی کھوج لائی تو مجھے

تانیہ نظر آئی۔ میں نے فوراً پوری منصوبہ بندی کر لی اور اسے بیہاں لے آیا۔ کیونکہ تانیہ ہی واحد رہیوں

ہے تماری نجات کا۔ تماری نجات میں، میری نجات بھی ہے۔ یہ جو تمارے پھرے میں دیکھ لگ گئی

ہے یہ آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی تمارے پاؤں کے انگوٹھے تک پہنچ جائے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر دنیا کی

کوئی طاقت تمیں اس عذاب سے نجات نہیں دلا سکے گی۔ تمہارا روپ بدل جائے گا۔ تم بیٹھے بیٹھ کے

لئے اس کے ہو جاؤ گے اور یوں میرے عشق کی موت ہو جائے گی۔ میں کسی کی موت نہیں چاہتا۔ نہ اپنی

ہے تماری۔ میں چاہتا ہوں کہ تانیہ کو اس کا بھائی مل جائے اور مجھے میری بقال۔"

"میں معافی چاہتا ہوں، جناب کہ میری بات سے آپ کو کہ پہنچا۔" محسن راؤ رہمنہ تھا۔

"کوئی بات نہیں، مجھے اب افسوس اس بات کا ہے کہ مجھے اپنی دنیا کے کچھ راز کھولنے پرے۔"

کالے چراغ نے کہا۔

"پھر اب کیا کرنا ہے۔ ہیا یہے۔ آپ جو کہیں گے وہ کروں گی، میں مجھے اپنا بھائی چاہئے، زندہ سلامت۔" تانیہ بے قراری سے بولی۔

"میری تو یہی کوشش ہے۔" کالے چراغ نے مٹھڈا سانس لے کر کما۔ "اب ہمیں....."

کالا چراغ کچھ کہتے کہنے اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کے چھرے پر ہوانیاں اڑنے لگیں۔

"کیا ہوا؟" تانیہ اسے پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گئی۔

اس اثناء میں پرول کی پھر پھر اہم سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی پر نہہ جھونپڑی کی چھت پر آئیٹھا ہو۔

"گلتا ہے، بقال آگئی۔" کالا چراغ بمشکل بولا۔

بقال اس منظر کو بڑے پر غور انداز میں دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ کالا جراغ اذتی ریت کے درمیان گاتب ہو گیا۔

جب بقال اپنا گھوڑا بڑھا کر جھونپڑی کے دروازے پر پہنچی۔ تانیہ جو جھونپڑی کے اندر بیٹھی، دروازے کے باہر ہونے والی کارروائی کو بغور دیکھ اور سن رہی تھی۔ بقال کو دروازے کے نزدیک پہنچنے دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کر محنت کے قریب چل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بقال کا کس طرح مقابلہ کرے۔ محنت را اونے اپنا سوکھا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر آہستہ سے وبا یا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ پریشان ہے ہو۔ بقال کو اندر آنے دے جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔

بقال اندر آئی تو اس نے بغور تانیہ کو دیکھا۔ تانیہ نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

”بہت خوبصورت ہو۔؟“ بقال نے بات کرنے میں پسل کی۔ پتہ نہیں یہ سوال تھا یا جواب۔ ”کم کچھ تم بھی نہیں ہو۔“ تانیہ نے تینکھے لبجھ میں کہا۔

”تم میرے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتیں۔“ وہ نہیں۔

”میں اپنے بھائی کا حال دیکھ رہی ہوں۔ اس سے زیادہ جاننے کی خنا بھی نہیں۔“ تانیہ نے دکھ کے کمل۔

”تمہارا بھائی مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“ وہ نہیں کر بولی۔

”جو اچھا لگتا ہو، اس کا یہ حشر کر دینا، شاید تمہاری دنیا کی ریت ہے۔“

”بُن کچھ رہ سے کی بات ہے۔ اس کے بعد تمہارا بھائی ہر دو کھے سے آزاد ہو جائے گا۔ اس کے چرے پر گمن لگ چکا ہے۔ بن..... بن.....“

”ہاں، چاند کو گن لگ چکا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔“ تانیہ نے اس کی بات کاٹی۔

”تمہاری دنیا میں اسے برآ جھا جاتا ہو گا۔ میرے لئے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے میں نے بہت محنت کی ہے۔ اب مجھے اس کا پسل ملنے ہی والا ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”بھجل جاؤ۔“ تانیہ نے بڑی روکھائی سے کہا۔

”یہ کس بات کو؟“ بقال جیران ہوئی۔

”محنت کے اس پسل کو..... اب تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“ تانیہ نے بڑے یقین سے کہا۔

”وہ کیوں؟“ بقال نے پوچھا۔

”اب میں جو آگئی ہوں۔“

”تم آئی نہیں ہو، لائی گئی ہو۔“

”جانشی ہوں، کالا جراغ مجھے لے کر آئے ہیں۔“ تانیہ نے بتایا۔ ”وہ بہت اچھے ہیں۔“

”بھر تو اندر بیٹھا کیا میری سلامتی کی دعا مانگ رہا تھا۔؟“ بقال نے طڑپوچھا۔

”ہاں، یہی سمجھ، میں چاہتا تھا کہ تو اس مخصوص انسان کو چھوڑ دے اور میری ہو جائے۔“ کامیاب بولا۔

”تیری ہو جاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ بہت زور سے نہیں۔ ”چگاڈڑ کے پچے تو ہے کیا، کہی تو اس اوقات پر غور کیا۔“

”میں جو کچھ بھی ہوں، میں تیرا ہوں، تجھ سے محبت کرتا ہوں۔“ ”میں تیری محبت کو اپنے گھوڑے کے سامنے لے رکھتی ہوں۔“

”بقال تو میری چاہے حصی تسلیم کر لے، پر میری محبت کی توہین نہ کر۔“ وہ ترپ اٹھا۔ ”نمیں تو کیا ہو گا۔“ وہ پھٹکاری۔

”میں دیویا کالی کے دربار میں جاؤں گا۔“ کاملے چراغ نے سر اٹھایا۔

”وربار میں؟“ جیسے وہ یہ بات سن کر پاگل ہو گئی۔ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی اور پہنچتے ہوئے ایسا۔

”تو جائے گا دیویا کالی کے دربار میں۔ تو دیویا کالی کے عسل خانے میں تو جا سکتا ہے۔ پر تیردار باریں آسان نہیں۔ چگاڈڑ کے پچے۔ اپنی اوقات نہ بھول، اپنی ذات نہ بھول۔“

”محبت کی کوئی ذات نہیں ہوتی، کوئی نسل نہیں ہوتی۔ محبت تانیہ ہوتی ہے۔“ وہ اپنے آپ نہ تھا۔

”غفران کر، میں تجھے تیری محبت کی طرح اندرھا کر دوں گی۔“ پھر اس نے ہاتھ الحمار کر اٹھا کر ”گرفتار کر لو اسے؟“

آنافانا حکم کی تعلیم ہوئی۔ دو قوی یہیکل کر خفت صورت بندے آگے بڑھے۔ انہوں نے دیکھ دیکھتے اسے لوہے کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اور پھر اس کو کھینچنے ہوئے بقال کے سامنے لے جائا کر دیا۔

”میں جانتی ہوں کہ تو اندر بیٹھا کیا کر رہا تھا تو محسن کی بہن کو لے کر دیویا کالی کے دربار میں مقدمہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے سزا دلوانا چاہتا تھا۔ اور محسن کو اس کی دنیا میں بھجوانا چاہتا تھا کہ تمہارا صاف ہو جائے۔ اور میں تجھ سے محبت کرنے لگوں۔ تیری طرف راغب ہو جاؤں۔ او کاملے چاہی تو نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ نہیں ویکھی تو کسی گندے جو ہڑ کے کنارے کھڑے ہو کر پانی دیکھ دیکھ..... پھر مجھ پر عاشق ہوتا۔ جاؤ اسے لے جاؤ۔“

پھر وہ دونوں قوی یہیکل بندے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ دونوں کے ہاتھ میں زنجیر کا اڑ دنوں نے ایک عجیب سی آواز نکال کر ایک ساتھ اپنے گھوڑوں کو ایڈ لگانی۔ گھوڑے دیکھنے کی سرپت دوڑنے لگے۔

کالا جراغ زنجیروں میں بندھا ریت پر گھشتا چلا جا رہا تھا۔

”اس چگادڑ کے بچے کا اتنی عزت سے نام نہ لو..... وہ تمہیں تمہاری دنیا سے نہیں لایا۔“ بقال غیر میں آگئی۔

”اچھا، پھر کون لایا ہے۔؟“ تانیہ نے پوچھا،

”میرا بھائی لایا ہے۔“ بقال نے بتایا۔

”کون بھائی۔؟“ تانیہ کی سمجھ میں نہ آیا۔

”وہ بھائی جس نے تمہیں تھنے میں ڈائری دی تھی۔“

”تمہارے بھائی کا نام راکل تو نہیں۔“

”ہاں، میرے بھائی کا نام راکل ہے۔ اور یہ نام تمہیں اس چگادڑ کے بچے نے بتایا ہو گا۔“

”آنسو نے نام ہی نہیں، تمہارے بھائی کی خصوصیات بھی بتائی تھیں۔“ تانیہ نے کہا۔

”وہ کیا۔؟“ بقال نے پوچھا۔

”ایک طاقتوں، شوقین مراج، خبیث مخلوق۔“ تانیہ نے کالے چراغ کے کے ہوئے کلمات دہرا دیئے۔

”زیادہ بکواس نہ کرو۔“ بقال اچانک بپھر گئی،

”یہ میں نے نہیں کیا، میں تو ان کی بہت احسان مند ہوں۔ ان کی وی ہوئی ڈائری سے مجھے اپنی زندگی کے گشیدہ اور اپنے کاپتہ چلا۔“ تانیہ نے ہوشیاری سے بات کا رخ تبدیل کیا۔

”کمال ہے وہ ڈائری۔؟“ بقال کا الجھ پچھے نرم ہوا۔

”یہاں ہے، میرے پاس، میرے بیگ میں۔“ اس نے بتایا۔

”نکالو۔“ بقال نے حکم دیا۔

”محسن راؤ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بقال اب تک اس سے مخاطب نہیں ہوئی تھی۔ تانیہ ڈائری نکالنے کے لئے اٹھی تو اس کی توجہ محسن کی طرف ہوئی۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر، وہ بڑے دلبا اندراز میں مسکرائی۔ اور بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ”کیسے ہو محسن۔؟“

”ٹھیک ہوں۔“ محسن راؤ نے آہستہ سے کہا۔

”یہ لو۔“ تانیہ نے ڈائری اپنے بیگ سے نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ”تم اسے واپس لیا جاہتی ہو تو لے لو۔“

بقال نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ڈائری کے درق پلتی رہی۔ درق پلتے ہوئے اس کے پھرے پر مسکراہٹ بھیلنی جا رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے ڈائری بند کی اور تانیہ سے مغلب ہو کر بولی۔ ”یہ ڈائری اب تمہیں واپس نہیں مل سکتی۔“

”تحفہ دے کر واپس لینا، کیا یہ بھی تمہاری دنیا کا رواج ہے۔“ تانیہ نے طڑا کما۔

”اب یہ ڈائری تمہارے لئے بیکار ہے۔ تم اس سے جو فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں، وہ اٹھالیا۔ اب اس

”بھائی تو برباد کر دیا ہے۔ پر میری بہن پر رحم کرو۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔“ محسن راؤ

”ڈائری بھلا کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔“ اس مرتبہ تانیہ کے مجاہے محسن راؤ بولا۔

”ارے، کچھ نہیں بھیا، یہ ڈائری واپس لینا چاہتی تھیں، سو لے لی۔ دراصل بات یہ ہے کہ یہ چاہتی بن جیتا کہ ڈائری کی وجہ سے ہمیں آئندہ کوئی فائدہ پہنچے۔“

”پھر نے تانیہ کو گھوڑ کر دیکھا لیکن بولی، کچھ نہیں۔ پھر اس نے وہ ڈائری جھوپڑی کی جھٹت کی طرف

۔۔۔۔۔ ”ڈائری دیکھتے ہی دیکھتے طوطاب بن گئی۔ اور وہ طوطا جھوپڑی کا ایک چکر لگا کر دردازے سے باہر نکل

۔۔۔۔۔ ”چلو اٹھو۔“ بقال نے طوطے کے جانے کے بعد کہا۔

”کمال چلو؟“ تانیہ نے پوچھا،

”تینی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ بقال نے تھکمانہ لنجہ اختیار کیا۔

”تم میری بہن کو کمال لے جانا چاہتی ہو؟“ ”محسن راؤ پریشان ہو کر بولا۔

”پر اکلی امانت ہے۔ اسے راکل کے پاس پہنچانا ہو گا۔“ بقال نے بڑے پر اسرار انداز میں کہا۔

”اوٹونیا یا ترکش جو بھی تمہارا نام ہے۔“

”میرا نام تانیہ ہے لیکن مجھے ترکش بنتے زیادہ ویری نہیں لگتی۔“

”تم ترکش ہو یا تم..... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہاں کسی کو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

۔۔۔۔۔ ”بہر سواری تمہاری منظر ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے تانیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ایسا کا ہاتھ پکڑتے ہی کسی معمول کی طرح اٹھ گئی۔“

”لما کے اٹھ پکڑنے کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ مزاحمت کی خواہش رکھتے ہوئے بھی مزاحمت کی۔ دردازے کی طرف بڑھنے سے پہلے بقال کی نظر اس کے بیگ پر پڑی تو اس نے پوچھا۔ ”بے ہو ہے۔“

۔۔۔۔۔ ”تما۔“ تانیہ نے مختصر جواب دیا۔

”لما ہے اس میں۔؟“ بقال نے پوچھا۔

”خون نزدوت کی چیزیں۔“ تانیہ نے بتایا۔

”بیگ اپنے ساتھ لے لو۔“ بقال نے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

”ہم تم میری بہن کو نہیں لے جائیں۔“ اچانک محسن راؤ کو جو ش آگیا۔

”بن روکے گا مجھے۔“ اس نے ایک زور دار قسم سے لگایا۔ ”کیا تم؟ جس سے بلا جلا بھی نہیں

۔۔۔۔۔ ”اس مجھے تو برباد کر دیا ہے۔ پر میری بہن پر رحم کرو۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔“ محسن راؤ

نے الجائی۔

"ند میں نے تمہیں برباد کیا ہے اور نہ تمہاری بن برباد ہو گئی سمجھے۔"

کما۔ پھر وہ تانیہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "آؤ، چلو۔"

بقال اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے جھوپڑی سے نکل گئی۔ محض راؤ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن نبول پر

وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتا ہوا رہ گیا۔

تائیہ باہر نکل تو اس نے جھوپڑی کے سامنے ایک بھی سجائی اونٹی کو پایا۔ جو بیٹھی ہوئی تھی۔ بقال

اسے اونٹی پر سوار کر دیا۔ پھر وہ نزدیک کھڑے گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ بقال کے پیچے آٹھ سلی گھر ہے موجود تھے۔ بقال کے اشارے پر دو گھر سوار آگئے آئے۔ اور اونٹی سے آگے کھڑے ہو گئے۔ "ا

سوار اونٹی کے پیچے۔ اس سے پیچھے بقال اور آخر میں چار گھر سوار۔"

تب بقال نے ہاتھ انداز کر کوچ کا اشارہ کیا۔ دو گھر سواروں نے عجیب سی آواز کی۔ تیجی آواز

اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر سب سے آگے گواںے گھر سواروں نے اپنے گھوڑوں کو ایڈ لگائی۔ اور اس میں

بقال کا یہ چھوٹا سا قافلہ جنوب کی جانب دھول اڑا تراوہن ہو گیا۔

تین گھنٹے کی مسافت کے بعد جب سورج مغرب کی سمت جھکنے لگا تو سامنے کچھ آثار نظر آئے۔

یہ کسی قدیم عمارت کے ہندز ر تھے۔ سترے ہندز۔ سورج کی پیلی روشنی میں ان ہندزوں کا رہا

مزید چمک اٹھا تھا۔ پھر وہ لوگ ہندزوں میں داخل ہو گئے۔ ان ہندزوں کے درمیان ایک راستہ اندرجا

تھا۔ راستہ نکل تھا لیکن اتنا نکل نہیں کہ دو گھر سوار ساتھ نہ گزر سکتیں۔

یہ عجیب قسم کے ہندز ر تھے۔ اپنی اونچی دیواریں تھیں۔ ان دیواروں کے درمیان اندر داخل ہو۔

کے لئے بغیر کو اڑزوں کے دروازے تھے۔ یہ دیواریں نہ تو ٹوپی پھوٹی تھیں اور نہ یہ احساس ہوتا تھا کہ اس

بات قاعدہ عمارت ہے، یہ چھوٹا سا قافلہ ان ہندزوں کے درمیان گھومتا گھانتا کافی اندر چلا گیا۔

تب اچانک نی ایک بڑا سارا دروازہ نظر آیا۔ یہ بہت بڑا دروازہ تھا۔ اور بند تھا۔ اگلے دو گھر سارا

نے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر چیخ کر کیا۔ "دروازہ گھولو، بقال کی سواری آئی ہے۔"

یہ آواز سنتے ہی چھ آدمی دروازے کی دہنی سست بی کوٹھری سے نکل اور چھ آدمی بائیں کوٹھری

بر آمد ہوئے۔ ان بارہ آدمیوں نے مل کر اس بھاری دروازے کو گھولوا۔

دروازہ کھلتے ہی سارے گھر سوار، گھوڑوں سے اتر گئے۔ تانیہ کو اونٹی سے اتر گیا۔ بقال بھی کہا۔

گھوڑے سے اتر آئی تھی۔ جیسے ہی تانیہ اونٹی سے یقچے اتری۔ بقال نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ دوڑا

دروازے کے اندر داخل ہو گئیں۔ ان کے اندر جانے کے بعد بارہ آدمیوں نے مل کر اس دروازے

بند کر دیا اور اپنی کوٹھریوں میں چلے گئے۔

دروازہ بند ہوتے ہی بقال نے میرہ ہیں چڑھنا شروع کیں۔ میرہ ہیں چڑھتے چڑھتے تانیہ کو اپنی

دروازہ نظر آیا۔ اس دروازے پر ایک سلیخ دربان موجود تھا۔ وہ بقال کو کیجے کر تعظیمی انداز میں

بچا دو پھر سیدھا ہو کر بولا۔ "کیا حکم ہے بقال۔"

"راکل سے ملتا چاہتی ہوں، اس کی امانت اسے سونپے آئی ہوں۔"

"اچھا ٹھہرو۔" دربان نے اگے بڑھ کر بند دروازے پر لگی تنجیر کو ایک خاص انداز میں بجا یا۔ چند

لوگوں بعد دروازے میں ایک چھوٹی کھڑی کھلی اور اس میں سے ایک شخص نے منہ چکایا۔ "ہاں، کیا کتنے

"راکل سے کو بقال آئی ہے۔ وہ اس سے ملتا چاہتی ہے ساتھ ہی اس کی امانت لائی ہے۔" دربان

نے بتایا۔

"اچھا ٹھہرو۔" یہ کہہ کر اس شخص نے فوراً کھڑی بند کر دی۔

کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ تانیہ کو دروازے میں سے ایک بہت بڑا آٹھ نظر آیا۔ جو چورتے پر ایک

ہٹک پر کھڑا تھا اور اس نے اپنی ایک آٹکھ بند کر رکھی تھی۔ برادر میں ایک بہت بڑا استون تھا۔

بقال، تانیہ کا ہاتھ تھا اس اندر داخل ہوئی۔ اور پھر چورتے کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ پھر اس

نے راغبیا۔ اس ایک ٹانگ کے اٹسوک جھک کر تعظیم دی۔ اس نے تانیہ کو بھی جھکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ

سیدھی کھڑی رہی۔ تب اس جیسیم اٹوانے اپنی دوسری آٹکھ کھول دی۔ اور اپنی دونوں آٹکھوں سے پلے

تانیہ پھر بقال کو دیکھا۔

"راکل میرے بھائی، تیری امانت لے آئی ہوں، اسے قبول کر۔" بقال نے بڑے ادب سے

لکھ۔

اس الٹونے ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے اپنے دونوں پر کھول کر پھر پھڑا۔ وہ پرانے بڑے تھے کہ

ان کے بڑے سے بقال اور تانیہ کے چہرے پر اچھی خاصی ہوا محسوس ہوئی۔ پر پھر پھڑا نے کام مطلب یہ تھا کہ

ان نے تانیہ کو قبول کر لیا۔

"میں تیری ٹھکر گزار ہوں، میرے بھائی۔" بقال پھر تعظیمی انداز میں بھکی۔

تمہیں بڑے ستون کے پیچھے سے ایک کے بعد ایک عورت نکلتی تھی۔ وہ سات عورتیں تھیں۔ سنیہر

رگت، گول چڑے ایک جیسے چھوٹے قد، ایک جیسا سرخ رنگ کا بالا۔ شاید ان کے چہرے بھی ایک

بھی تھے۔ اگر کوئی فرق ہو گا تو وہ ایک نظر دیکھنے میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔

لہ دوستیں ایک قطار میں چلتی ہوئی، اس الٹو کے پیچے سے گھومتی، میرہ ہیں اتر کر تانیہ کے کرد گھیرا

ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ بقال نے ان عورتوں کے آتے ہی تانیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کچھ فاصلے سے کھڑی

ہو گئی۔ بھرجن ساتھ عورتوں میں سے دو نے تانیہ کے ہاتھ پکڑ لئے۔ تیری عورت نے پشت سے اسے

بھر جسے آگے دھکیلا۔ وہ دونوں عورتیں ہاتھ پکڑے پکڑے آگے چلے گئیں۔ باقی پانچ عورتیں ان

کے پیچے ہل دیں۔

”وہ ہے کماں؟“ بقال نے پوچھا۔
”ہماری قید میں۔“ راکل نے بتایا۔ ”ویسے بقال تو نے اس کے ساتھ بڑا ظالم کیا ہے۔“

”میرے بھائی کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس چگادر کے بچے سے شادی کرلوں۔“
”یہ میں نے کب کما۔“ راکل نے اسے ترچھی نظریوں سے دیکھا۔ ”دیواہ کالی کی قسم، وہ ہے تیرا چاٹا۔“ ”کوچلا بھس کی چال، اپنی بھی بھولا۔“ بقال نے نہ کر کما۔
”ج بات یہ ہے بقال کہ مجھے اس پر حرم آتا ہے۔“ راکل آج بقال کو ستانے پر خلا ہوا تھا۔
”یہ راکل کو کب سے حرم آنے لگا۔“ بقال نے طڑک کما۔
”تو مجھ سے کیا بات کرنے آئی تھی۔“ راکل نے بات کارخ پھر دیا۔
”میں تھے سے محض راؤ کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔“
”کیا ہوا محض کو؟“

”میرے بھائی تو جانتا ہے کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اسے زندگی ہر کے لئے اپنا بناتا چاہتی ہوں۔“

”اس کے لئے تو عمل تو کر رہی ہے۔“ راکل نے سنبھلی گئی سے کہا۔ ”اس کا کیا ہا!“
”وہ ایک ولیر طلب عمل ہے۔ ابھی اس کی ابتداء ہوئی ہے۔ جانے اس میں کتنا وقت گلے۔“
”وقت کی کیا پرواہ ہے۔“

”وقت کی تھے بالکل پرواہ نہیں، پرواہ مجھے اس چگادر کے بچے کی ہے۔“ مسلسل میرے خلاف مارشوں میں لکا ہے۔ مجھے اس کی ٹھیک سے بھی نفرت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے دیوار اشک میں چڑوا دیا جائے۔ وہ جب تک زندہ رہے گا، مجھے بے سکون کرتا رہے گا۔“

”یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ سردار کو لانا اپنے ایک اہم بندے کی موت پر ایک طوفان کھڑا کر دے گا۔“

”مجھے میں معلوم، میرے بھائی۔ تجھے اس کام کو آسان بنانا ہو گا۔“ بقال نے بعد اصرار ملک

”چھاٹھیک ہے تو پریشان نہ ہو، میں کرتا ہوں کچھ۔“ راکل نے اسے بدلانا چاہا۔
”میں اسے دیوار اشک میں چڑا ہو دیکھنا چاہتی ہوں۔“ بقال اپنی ضد پر اڑ گئی۔
”اس کام کو بہت ہوشیاری سے کرنا ہو گا کہ کسی کو کافیوں کان خبر نہ ہو۔“ راکل نے کما۔
”میں جانتی ہوں کہ تو جا ہے گا تو ہزار راستے کاٹا لے گا۔“ بقال نے پر امید ہو کر کما۔ ”اچھا میں اپنے ہوں تجھے تانیہ کا ساتھ مبارک ہو۔“

”وہ کماں ہے؟“ راکل نے پوچھا۔
”خدا میں اسے تیار کر رہی ہوں گی۔ تھوڑا صبر کروہ آنے ہی والی ہو گی۔“ بقال نے نہ کر کما۔

پھر وہ سیرہ ہیاں چڑھ کر اس اٹو کے پیچے آئیں۔ اور بہاں سے بہت بڑے ستون کی اوٹ میں پہاڑ گئیں۔ تانیہ نے دیکھا کہ اس بڑے ستون میں پیچھے کی جانب ایک دروازہ تھا جو پیچے سے نظر نہیں آتا۔ اس دروازے میں سے سیرہ ہیاں نظر آرہی تھیں جو پیچے کی جانب چلی گئی تھیں۔

وہ دونوں عورتیں تانیہ کا ہاتھ پکڑے پیچے اترنے لگیں۔
تانیہ کے جانے کے بعد بقال راکل سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”راکل۔“ رے بھائی، مجھے تھوڑے بات کرنی ہے۔“
”بقال کی بات سن کر اس اُتو نے اسے گھوڑ کر دیکھا، پھر اپنی ایک آنکھ بند کر لی۔ اور راکل ہو گیا۔

”بقال نے محسوس کر لیا کہ وہ اب بیاں نہیں ہیں۔ لذادہ سیرہ ہیاں چڑھ کر ستون کے پیچے پہنچا۔ دروازے میں داخل ہو کر تیری سے سیرہ ہیاں اترنے لگی۔

”یہ ایک بہت بڑا تھا خانہ تھا۔ یہاں جگہ جگہ روشنی ہو رہی تھی۔ تھہ خانے میں در تک کلی نظر آ رہا تھا۔ وہ عورتیں تانیہ کو اپنے ٹھکانے پر لے جاچکی تھیں۔“

”بقال سیرہ ہیاں اتر کر آگے بڑھی تو اسے گول چڑے والی ایک خادمہ دکھائی دی۔ وہ اچانک عنکبوت سے نمودار ہوئی تھی۔ وہ خادمہ بقال کو دیکھ کر اوب سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔“

”راکل کماں ہے؟“ بقال نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔

”اس خادمہ نے زبان سے کچھ جواب دینے کے بجائے ایک طرف اشارہ کیا۔ بقال اس کے پیچے پہنچ چلے گئی۔ پھر وہ مختلف دروازوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک بڑے دروازے پر رک گئی۔ جب بقال اس دروازے کے سامنے پہنچ گئی تو وہ خادمہ اپنے قدموں والپس ہو گئی۔

”بقال نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ فروکھل گیا۔ وہ بے دھڑک دروازے میں داخل ہو گئی۔ پھر ان نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور آگے بڑھی۔ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر پر وہ پڑا ہوا تھا۔“ ہٹا کر اندر داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ کرے کے عین وسط میں ایک اونچی منڈپ راکل زندقی لہر میں بیٹھا ہے۔ کرے میں سرخ رنگ کا دیزرتائیں پہنچا ہوا ہے اور کرے میں بے حد روشنی ہے۔ راکل منڈپ کی راجج کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں متین کا قیمتی ہار پڑا ہوا تھا۔ گھنٹہ یا بال سرخی مائل سانولی رنگت، صحت مند جسم اور ایک ہاتھ میں سانپ کی طرح مل کھایا ہوا عصا۔

”وہ بقال کو دیکھ کر مسکرا یا بقال اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔“ ”میرے بھائی وہ کماں ہے۔؟“ بقال نے پوچھا۔

”کون تانیہ؟“ راکل نے وضاحت چاہی۔
”نہیں، وہ چگادر کا پچہ۔“ بقال پھر گئی۔

”راکل نے یہ سن کر ایک زور دار قسمہ لگایا اور بولا۔ ”تونے اس کا نام خوب رکھا ہے۔“

”ویسے تو اسے وہاں سے لے کر آیا خوب۔ وہ تیری عیاری کو عمر بھر نہیں سمجھ سکتی۔“
یہ سن کر راکل نے زور دار قسمہ لگایا۔ پھر وہ عصا کا سارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا، اس نے اس عصا
بیساکھی کی طرح بغل میں دبایا اور ابھی مند سے اتر کر دوچار قدم چلا ہی تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے نظر وہ لے
اوچل ہو گیا۔

پھر بقال بھی اٹھی۔ وہ پرودہ ہٹا کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

بقال کے باہر جاتے ہی راکل پھر اچانک نمودار ہوا۔ اور عصا کو بیساکھی کی طرح لگائے۔ پھر مند
آبیٹھا، اس کے ہونٹوں پر مسکرا ہٹھی، آنکھوں میں خواہشون کے دیے ٹھیٹھا ہے تھے۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ راکل نے زور سے کما۔ ”اندر آ جاؤ۔“

پرودہ ہٹا کر وہ دونوں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ان دونوں خادماں کے سر بجکے ہوئے
تھے۔

”کیا ہوا؟“ راکل نے پوچھا۔

”وہ نہ عسل کرتی ہے، نہ کپڑے تبدیل کرتی ہے اور نہ یہاں آنے کے لئے تیار ہے۔“

”کیا تو نے اسے جایا کہ اس سے کون مانا چاہتا ہے۔“

”نہیں اسے ہم نے تیرناام تو نہیں بتایا، ویسے وہ کالا چاغ کے بارے میں بار بار پوچھتی ہے۔“

”اس سے جاکر کوکہ تمہیں راکل نے بلایا ہے۔ راکل سے مل لو، راکل ہی کالا چاغ سے ملا کر
تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم جاکر اسے بتا دیتے ہیں۔“

دونوں خادماں ایسے قدموں والپیں اور پردوں میں غروب ہو گئیں۔

پھر وہ دونوں دروازے سے نکل کر تیز تیز چلتی، اس مقام پر پہنچیں جہاں تانیہ کو رکھا ہیا گا۔ تانیہ
مسری کے کونے پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ حالات ہی نے اس کو
تیزی اور متفاہد سمت میں پلانکھایا تھا کہ وہ بس ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ کالا چاغ کی مدد سے اپنے بھائی کو لے کر اپنی دنیا میں چلی جائے گی۔ پھر والی بُٹا
کر اپنے بھائی کا علاج کرائے گی۔ اسے علاج کے لئے اگر لعن یا امریکہ جانا پڑا تو جائے گی۔ وہ اپنے بھائی
کی ہر قیمت پر صحت کی بھالی چاہتی تھی۔ کیونکہ ابھی تو اس کی زندگی کا ایک اہم کام باقی تھا۔ ابھی اسے اپنے
بھائی کی بر بادی اور بابا کے قتل کا انتقام لینا تھا۔ وہ راؤ احمد علی کو کسی قیمت پر نہیں بخشتے گی۔ اسے عربت
ناک انجام سے دوچار کر کے رہے گی۔

لیکن یہاں تو پانسہ ہی پلت گیا تھا۔ وہ منزل کے قریب آکر اچانک منزل سے دور ہو گئی تھی۔ کالا
چاغ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ ایک ہمدردانہ انسان تھا، یہ ٹھیک ہے کہ وہ اس کی بد بقال کو پانے کے لئے

کر رہا تھا۔ لیکن اس کی اس محبت سے اس کے بھائی کو بھی تو نجات مل رہی تھی۔ جانے اس کے ذہن میں
پاٹ مخصوصہ تھا۔ کاش! بقال کچھ دیر اور نہ آئی تو کالا چاغ اسے اپنے مخصوصے سے آگاہ کر چکا ہوتا۔
اور وہ اس پر عمل کر کے اپنے بھائی کی رہائی کے لئے تک دو میں مصروف ہوتی۔ اب وہ ایک گھرے کنوئی
میں تھی جس کے پانی میں وہ تیر تو سکتی تھی لیکن اس سے نکل نہیں سکتی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ تانیہ نے سراخ ہایا تو اپنے سامنے دو خادماں کو پایا۔ وہ اپنی ٹھکل و صورت
بڑا ہاں بہتی لگتی تھیں۔ وہ دونوں اس کے نزدیک آگر بڑے ادب سے کھڑی ہو گئیں۔ پھر اس کے
ماننے زر اس باجھکیں اور سیدھی ہو گئیں۔ ان میں سے ایک نے گھنگو کا آغاز کیا۔

”تجھے بلا یا ہے۔“ یہ عجب انداز گھنگو تھا۔
”کس نے بلا یا ہے۔“ تانیہ کی سمجھ میں نہ آیا۔
”راکل نے۔“ اس نے سمجھایا۔

”تو چلو۔“ تانیہ یہ سنتے ہی اپنایگ کندھے پر ڈال چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔
”ایسے نہیں۔“ وہ بولی۔

”پھر کیسے۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”پلے عسل کر لو، تم تھک گئی ہو گی۔ عسل کر کے کپڑے تبدیل کرلو۔ پھر چلو۔“
”نہیں میں تھک نہیں ہوں، میں فرا راکل سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا بھائی صحراء میں جانے کیا
ہو گا۔“

”ہمیں نہیں معلوم کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔“ خادمہ کی سمجھ میں نہ آیا۔

”تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم لوگ بنی مجھے راکل کے پاس لے چلو۔“ اس نے
کلد

”اس طرح راکل نا راض ہو گا تو اس کا حکم مان لے گی تو وہ تجھے کالا چاغ سے ملا دے گا۔ یہ اس نے
کہا ہے۔“ خادمہ نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔

خادمہ کے اس جملے سے تانیہ کو راکل کی نیت کا اندازہ کرتے دی رہے گی۔ ایک دم اس کا داماغ گھوم
گیا۔ اس نے غصے سے ان دونوں خادماں کو دیکھا اور بولی۔ ”راکل سے جاکر کوکہ اس نے آنے سے
انکار کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ایسا نہ کر۔“ خادمہ سم کر بولی۔ ”تو اس کے غصے سے واقف نہیں۔“

”جو میں نے کہا ہے، وہ اسے جاکر بتا دو، رہ گیا اس کا غصہ تو وہ میں دیکھ لوں گی۔ اس نے مجھے سمجھا کیا
ہے۔“

”لیکر مرتبہ اور سروچ لے۔“ دونوں خادماں جاتے جاتے رک گئیں۔

”سوچ لیا۔ عزت ہے تو سب کچھ ہے، عزت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔“ اس نے بڑے یقین سے

بے جان مجنتے کی طرح ایستادہ تھا۔
و فراہی دروازے کی طرف لپک۔
و فراہی دروازے کو جب اس نے کھولا اور باہر ایک قدم رکھا تو اس کے سر پر کوئی چیز گردی اور پھسل کر بند دروازے کے سمت کھل گئی۔ اور اس کا دام گھنٹے لگ۔ اس نے چاہا کہ سنبھل کر اپنی گردن میں آگئی۔ پھر ایک زور دار جھٹکا لگا۔ اور اس کا دام گھنٹے لگ۔ اس نے چاہا کہ سنبھل کر اپنی گردن میں آگئی۔ اور اس نے بیک گھما کر زور سے اس پر مارا، اٹویک کی زد پر آگیا۔ وہ بیک اتنی قوت سے کھلے کیا، اور اس نے بیک گھما کر زور سے اس پر مارا، اٹویک کی زد پر آگیا۔ وہ بیک اتنی قوت سے کھلے کیا، اور اس نے بیک گھما کر زور سے جا نکل رہا یا۔ اور نہیں پر پھٹ سے گرا۔
دروازہ کھلا ہوا تھا، اس نے بیک فراہی پسند ہے پڑا اور دروازے کی طرف دوڑ لگا اور تین سے کمرے سے باہر نکلی۔ پھر پلٹ کر اس نے دروازہ بند کیا۔ باہر سے اس کی چیختی چڑھائی۔ اور ارم ایکھی سے دیکھا۔
آس پاس کوئی نہ تھا۔ پورا ہال خالی پڑا تھا۔ وہ سامنے تہ خانے کی شیرھیاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کئے باپوری قوت سے سیرھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔
شیرھیاں چڑھ کر جب وہ بڑے ستون کے دروازے سے باہر آئی تو اس کا خیال تھا کہ یہاں فر خادمیں نظر آئیں گی۔ لیکن یہاں بھی سننا تاطاری تھا۔ جب وہ ستون گوم کر چوتھے کی طرف لگا، وہاں وہ بڑا اٹوایک ٹانگ پر کھڑا نظر آیا۔ اس کا رخ سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اور وہ بالکل اس طرح کھڑا تھا جس طرح تانیہ نے اسے چھوڑا تھا۔ تانیہ اس وقت اس کے پیچھے تھی، وہ آہستہ آہستہ ہوئی چوتھے کی شیرھیاں اترنے لگی۔ دروازے سے باہر نکلنے کے لئے اس کے سامنے سے گزرا پڑا، تھا۔
اس نے سیرھی کی اوٹ میں بیٹھ کر تیزی سے بیک کھولا اور اس میں سے چاقو نکال لیا۔ یہ ایک بڑا پھل کا چاقو تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس اٹوئے اس پر حملہ کیا تو وہ چاقو سے اپنادفاع کرنے کی کوش کرے گی۔
چاقو باہتھ میں تھام کروہ بہت ممتاز انداز میں نیچے اترنی اور پھر چوتھے کی دیوار کے ساتھ چلتی تھا۔ اس جگہ پیچی جان اٹوکھڑا ہوا تھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ کر فوراً بیٹھی۔ چاقو والا تھا اس نے اخدا تھا۔ اگر اس اٹوئے اسے وکھت ہی پیچھے سے حملہ کیا تو وہ اس حملے کے لئے تیار تھی۔
لیکن اٹوئے اسے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ توٹ سے مس نہ ہوا۔ وہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور اسے ایک آنکھ بند تھی۔ تب تانیہ کو اپاٹک احساس ہوا کہ جیسے اس اٹوئے جان ہی نہ ہو۔

اٹوک ایک آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ اور تانیہ ہاتھ میں چاقو پکڑے تیار کھڑی تھی، لیکن اس آنکھ میں گردش نہ تھی۔ ویسے بھی وہ غیر معمولی جامت کا تھا۔ حقیقی کے بجائے مصنوعی و کھالی دنیا تھا۔ وقت وہ قطعاً بے جان و کھلائی ورے رہا تھا۔ حالانکہ جب بد لقاں کے ساتھ اس کے سامنے پیش ہوتا نہ صرف اس کی آنکھوں میں گروش تھی بلکہ اس نے اپنے جہازی پر بھی پھر پھرائے تھے۔ ان پر ڈالنے سے تانیہ نے اپنے چرے پر ہوا بھی محسوس کی تھی۔ خیر، اس وقت یہ اچھی بات تھی کہ وہ اس وقت

”نیک ہے، اسے زمین پر لادو، اسے بے ہوش کس نے کیا ہے۔“

”راکل نے۔“ یہ کہ کران دونوں عورتوں نے تانیہ کو زمین پر لادیا۔ ساتھ ہی اس کا بیگ رکھ دیا۔ اور وائس چل گئیں۔

اس دی قامت محنت نے تانیہ کو کسی گڑیا کی طرح اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور پھر اسے ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور تالا لگادیا۔

پھر دیر کے بعد جب تانیہ کو ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں بند پایا۔ وہ فوراً اپنے کرپیٹھے گئی۔ تھوڑے حواس بحال ہوئے تو اس نے دروازے کو چھین گوا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس کریں میں کوئی کھڑکی وغیرہ نہ تھی۔ البتہ کافی اونچائی پر ایک روشندران ضرور تھا۔ روشندران بڑا تھا۔ لیکن اتنا اونچا تھا کہ وہ اس میں سے جھانک کر باہر نہیں دکھے سکتی تھی۔ زمین پر ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی۔

خدا کا شکر تھا کہ اس کا بیگ اس کے پاس پڑا تھا۔ اس نے اپنا بیگ نزدیک کر کے اس کی تلاشی لی۔ اس میں چاقو نہ تھا، باقی اس کی تمام چیزیں موجود تھیں۔

تب اسے خیال آیا کہ وہ چاقو اٹھانے کے لئے بھی تھی تو کوئی بھاری چیز اس کے سر پر گی۔ اس نے فوراً لپٹ سر پر ہاتھ پھیرا۔ سر میں کسی قسم ناٹھ، نشان یاد کھن نہ تھی۔ راکل نے اسے زخم کرنے کے نتیجے میں زندان میں ڈال دیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں، جو ہو گا۔ دکھا جائے گا۔

لیکن ہوش ادھر اس کی توقع کے خلاف تھا۔ تانیہ کو معلوم نہ تھا کہ راکل نے اس کے بارے میں کیا حکم دیا ہے۔ وہ اسے عام قید سمجھ رہی تھی کہ وہ زندان میں ضرور ہے لیکن اس کے لحاظ پر ہی کا خیال رکھا جائے گا۔ لیکن وہ لوگ تو اسے کمرے میں بند کر کے بھول ہی گئے۔

وون گزر گئے۔ اس کے کمرے کا دروازہ کسی نئے نہ کھولا، اس کے کان کسی آہٹ کو ترس ہی گئے۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔ چھوٹی سی صراحی میں پانی موجود تھا، جواب وہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ اس پر نفاقت طاری ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھاں سی پڑی تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں بند ہو جاتی نہیں۔

اس پر غشی کے سے درے پڑ رہے تھے۔

این حالت میں جب وہ نہ ہوش میں تھی، نہ بے ہوش تھی۔ جاگ رہی تھی نہ سورہی تھی یا پھر وہ گھری نہیں تھی اسے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے دادا عظیم اس کے بالکل نزدیک بیٹھے ہوں، ان کا نور انی چڑھے کر اسے سکون محسوس ہوا، وہ ان سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بول نہیں پائی، تب دادا عظیم اس سے تسلی دیتے ہیں۔

جب اس کی آنکھ کھلتی ہے یا ہوش میں آتی ہے تو اپنے آس پاس نسی کو نہیں پاتی، لیکن اس کے دل

”وار کرنا چاہتی ہے۔؟“

”ہا۔“ تانیہ نے بے وہرک کما۔

”اور کتنے وار کرے گی؟ ابھی تو مجھ پر وار کر کے بھاگی ہے۔“

”میں تیری صورت بگاز دنیا چاہتی ہوں۔“ تانیہ نے غصے سے کما۔

”تو جانی نہیں کہ تو نے کیا کر دیا ہے۔ تو نے میرا ایک بازو بے جان کر دیا ہے۔“ وہ شکایت بھر لجھ میں بولا۔

”کاش! میں تجھے ختم کر سکتی۔“ تانیہ کا غصہ برقرار تھا۔

”میں تو ویسے ہی مرا ہوا ہوں، مجھے اور کیا مرنا۔“ اس نے پھر شکایتی انداز اختیار کیا۔

”ابھی تو مرا نہیں، انشاء اللہ تو ضرور مرے گا اور ساتھ میں تیری بکن کا بھی جائزہ اٹھے گا۔“ تانیہ بھرک رہی تھی۔

”ہا ہا۔“ اس نے ایک سکروہ ققتہ لگایا اور پھر رک کر بولا۔ ”کیا عورتوں والی بات کرتی ہے۔“

”اے عورتوں والی بات نہ سمجھ۔“ تانیہ نے اسے گھوڑتے ہوئے کہا

”تو نہیں جانتی کہ تو کماں ہے۔ تو یہ بھی نہیں جانتی کہ کس کی قید میں ہے، یاد رکھ تیرا جائزہ انھیں میں یہاں سے بالکل دیر نہ لگے گی۔“ راکل کا اب تیور بدلا۔

”میرا چاقو مجھے دے دے۔“ تانیہ نے کما۔

”لے اٹھا لے۔“ اس نے فوراً چاقو میں ٹھوکر مار دی، چاقو تانیہ کے پیروں میں آگیا۔ تانیہ جیسے ہی چاقو اٹھانے کے لئے بھکی۔ راکل نے اس کے سر پر اپنا عصامارا۔ وہ بھکی بھکی وہیں تیور کر گر پڑی۔

تب راکل نے بیٹھے بیٹھے اپنا عصامارا پر کھٹ کھٹ کھٹ بجا یا۔ آواز سنتے ہی وہ دونوں وحشی عورتیں پر دہما کر اندر آگئیں۔

”اٹھاؤ سے اور زندان میں پھیک دو، تین دن بھوکار کھو جاؤ۔“ راکل نے تیور بدلا کر کما۔ ان دونوں کالی بھینگ عورتوں نے اسے مل کر اٹھایا اور تیری سے کمرے سے نکل گئیں۔

پھر ان وحشی عورتوں نے اسے زندان کے دروازے پر پنچا دیا۔ زندان کے دروازے سے بھی ایک دیوقامت کالی بھینگ عورت برآمد ہوئی۔ اس نے ایک نظر بے ہوش تانیہ کو دیکھا جوان کے لئے ہوں؛ سوئی ہوئی تھی، پھر وہ ان عورتوں سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”کون ہے یہ؟“

”ہمیں نہیں معلوم کون ہے یہ؟“ ان میں سے ایک عورت نے کہا۔

”پھر یہاں لانے کا مقصود؟“

”راکل نے بھیجا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ اسے تین دن تک بھوکار کھانا ہے۔“

پر سکون کی کیفیت ضرور نقش ہوتی ہے۔ بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے کہ کاش دادا عظیم نے اس سے لے بات کی ہوتی۔ رہمان میک کس نے پنچایا۔ گلبری تو ایسی چیزیں کھانے کی خود شوپنگ ہوتی ہے، اس نے خود کیوں نہ
رہمان میک کیوں لڑکا دیا۔ پھر اس سیب میں اتنی سیرابی کہاں سے آئی کہ اسے کھا کر پیٹ بھر کر کھانا
کھالیجے کیاں کیوں ہوا۔ کیا یہ سلسلہ جاری رہے گا یا محض اتفاق سے ایسا ہو گیا ہے۔ اور دادا عظیم کے
ہدایتے کا حساس مضمون ایک خواب تھا، اس کا، ہم تھا یا واقعی وہ اس کی تسلی کے لئے یہاں آگئے
خواہ کیا۔ ”دادا عظیم ہی تو تھے جن کی وجہ سے اس کی اپنی زندگی، خود اس پر آشکار ہوئی تھی۔ اس کی واسطہ

بات کا عنوان تو وہ ہیں، وہ اگر اس کی مد نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا؟“
اہمیت اپنی باتوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اپنی نجات کا راستہ سوچ رہی تھی کہ دروازے پر کچھ کھٹ پٹ
لے آؤ۔ آئی جیسے کوئی باہر سے دروازہ کھل رہا ہو۔ تانیہ ذرا سنبھل کر پیٹھ گئی۔
پڑھ لیوں بعد دروازہ کھلا۔ اس کے سامنے راکل کھڑا تھا، بغل میں عصا دیائے۔ اس نے اپنے
لہرے پر ایک بھاری چادر ڈال رکھی تھی۔ شاید اپناٹوٹا ہوا بازو چھپانے کے لئے۔
راکل نے تانیہ کو مٹا شناش کمرے کے وسط میں بیٹھا کھا تو ایران ہوا، دو دن کی بھوک نے اس
پڑھا جانہ کیا تھا بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ابھی کھاپی کر تازہ ہو کر پیٹھی ہو۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ تانیہ
بھوک کی وجہ سے بڑی حالت ہو گی۔ دہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔

”یکیں ہے تو۔“ راکل عصا نیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

”دیکھ لے، اتنے بڑے بڑے دیدے توہین تیرے۔“ تانیہ غصے میں آگئی۔

”یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ ابھی تک حیران تھا۔

”سب کچھ ممکن ہے..... تو نے دیکھ لیا نہ قید کر کے۔ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔“ تانیہ نے
ان پر عرب جملے کی کوشش کی۔

”میں نے کب کما کر تو معمولی لڑکی ہے، معمولی ہوتی تو یہاں تک کیسے آجائی؟“ راکل بولا۔

”راکل کیا تو اپنی بہن کو سمجھا نہیں سکتا۔“ تانیہ نے فوراً موضوع تبدیل کر دیا۔

”لیا کبھی واٹس۔“ جیسے وہ کچھ نہ جانتا ہوتا۔

”میرے بھائی کا بیچا چھوڑ دے۔“ تانیہ نے بتایا۔

”اگر میں اس سے یہ کوئی گا تو وہ پلٹ کر مجھے کہے گی۔“

”چچے ہو کیا کہہ سکتی ہے۔؟“

”وہ کسے گی کہ تو تانیہ کو آزاد کر دے تو میں اس کی بات کیسے مان لوں گا بھلا۔ میں تانیہ کو آزاد
ہے لے تو میں لایا ہیں۔“ وہ تانیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”تانیہ تمہی قید میں نہیں رہ سکتے گی۔“ یہ بات تو اچھی طرح جانتا ہے۔ تو خواہ جوہ اپنادقت برپا کر رہا
بھی۔

ایک بات کی اسے خوش تھی۔ اب تک وہ تمہائی کا ٹھکار تھی۔ خود کو بے یار و مدد گار محسوس کر لے گی
لیکن اب یہ احساس یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کی پشت پر بھی کوئی آگیا تھا۔ اب وہ اکیلہ نہ تھی۔
اس احساس کے ساتھ کہ وہ تمہارا بے بس نہیں ہے، اس میں ہمت پیدا ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے
اٹھ کر پیٹھ گئی۔

تب ہی ایک آہستہ سی محسوس ہوئی۔ یہ آہستہ دروازے پر نہیں ہوئی تھی۔ یہ آہستہ اپر روشنی
سے آئی تھی۔ گلبری کے بولنے کی آواز کے ساتھ اپر روشنیاں میں کوئی چیز لاٹھکی تھی۔

تانیہ نے روشنیاں کی طرف دیکھا تو اسے گلبری کی دم دکھائی دی، اور پھر فروائی کی چیز لاٹھک کر کر
پر آگری۔ اور جب تانیہ نے اپر سے گرنے والی چیز کو بغور دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہاء رہی۔ وہ لیکر
سرخ رنگ کا خوبصورت سبب تھا۔

تانیہ نے لپک کر اسے اٹھایا، اور تھکر آمیز نظریوں سے اپر دیکھا۔ روشنیاں میں سے ایک گلبری
منہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی گلبری روشنیاں میں غائب ہو گئی۔

اب اسے پکا یقین ہو گیا کہ وہ اکیلہ نہیں ہے۔

سیب اچھا برا تھا۔ بڑا نیز، خوشبو دار اور مٹھا تھا۔ اس سیب میں جانے کی بات تھی کہ اسے کھا کر پہا

بھرنے کا احساس ہوا۔ تانیہ کے ہوش و حواس بجال ہوئے۔ وہ اب کچھ سوچنے کے قابل ہوئی۔

تانیہ نے راکل کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر اس نے اپنا بیگ مار کر اس کا ایک بازو قورہ

تھا۔ اس کے نتیجے میں اسے قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ اور دو دن گزر گئے تھے۔ کسی نے پلٹ کر اس کر۔

کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ زندہ ہے یا چال بھی ہے، یہ جانے کی بھی کوشش نہیں

تھی۔ دروزہ بند تھا۔ یہاں سے فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ ایک:

روشنیاں ضرور تھا لیکن وہ اتنا اونچا تھا کہ ہاتھ اٹھانے کے باوجود دسترس سے دور تھا۔ اسے نہیں معلوم

کہ روشنیاں کے اس طرف کیا ہے۔ کاش! وہ کسی طرح روشنیاں سے باہر کا جائزہ لے سکتی۔

اسے اپنا بھائی حسن یاد آیا۔ جانے وہ کس حال میں ہو گا۔ بقال نے یہاں سے واپس جا کر جانے کو

کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو۔ کالے چڑاغ کی گرفتاری کے بعد تو وہ بالکل بے خوف ہو گئی۔

اسے کالے چڑاغ کی بھی فکر تھی۔ جانے اس ہمدرد شخص کا کیا حشر کیا جا بکا ہو۔ کہیں اس کی زندگی

نہ منخر کر دی گئی ہو۔ اب وہ کیا کرے۔ وہ اپنے بھائی حسن کو بچانے آئی تھی لیکن اس کی اپنی زندگی

نظرے میں آگئی تھی۔ اگر اسے غبی امداد نہ ملتی، وہ بھوکی ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی۔

ایک سوال یہ بھی تھا کہ یہ سیب کہاں سے آیا تھا۔ اس صحرائیں اور ایسا خوشبو دار سیب۔ بھل۔

”وقت کی بات کرتی ہے۔ میں تمیرے پیچھے خود برباد ہو گیا۔ یہ محبت کی جگہ ہے۔ اسیلر کچھ جائز ہوتا ہے یہ بات تو تو اپنی طرح جانتی ہوگی۔“
”اچھی طرح جانتی ہوں۔“ تانیہ نے طنزہ لبھ میں کہا۔ ”اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمیرے پڑا دوڑ نہیں۔“

”ہاہا۔“ راکل نے بے ہم قہقہہ لگایا۔ میں اگر جاہ ہوا تو نہ تور ہے گی اور نہ تم ایسا ہی رہے۔ راکل نے دھمکی دی۔

”دیکھا جائے گا۔“ تانیہ ڈرنے والوں میں سے نہ تھی۔
”چل اب میرے ساتھ۔“ وہ حرف مدعا پر آیا۔

”کہاں؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”زندگی کی ہر آسانی کو حاصل کرنے کے لئے۔“ اس نے سبزیاں دکھایا۔

”محجہ بس میرا بھائی چاہئے۔“ تانیہ نے مقصد حیات بیان کیا۔

”وہ بھی مل جائے گا۔ یہ میرا تجھ سے وعدہ ہے۔ بس ایک بار میرا کامان لے۔“

”مجھے کیا کرنا ہو گا؟“ تانیہ نے جانتا چاہا۔

”محبت کا جواب محبت سے رہنا ہو گا۔“ اس نے صاف صاف کہا۔

”لیکن مجھے تو تجھ سے محبت نہیں۔“ تانیہ نے بھی کچھ چھپا کر نہ رکھا۔

”ہوجائے گی تو میرے بارے میں سوچتا تو شروع کر۔“ راکل نے کافی پھینکا۔
”ایک لنگڑے اور بازو ٹوٹے شخص کے بارے میں، میرے جیسی لڑکی کیا سوچے بھلا؟“ اس نے تو زکر پھینک دیا۔

تانیہ کے اس جواب نے راکل کے اندر آگ لگا دی۔ اس نے اپنی بغل سے عصا کاں لیا اور نہ تانگ پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ہاتھ بلند کیا اور چاہا کہ عصا اس کے سر بردارے مارے۔ اسی وقت وہ دیو قامت عورت کر کے میں داخل ہوئی جو شاید اس قید خانے کی گمراں تھی۔

عورت نے آتے ہی پکارا۔ ”راکل۔“

راکل کا ہاتھ اٹھا کاٹھا رہ گیا۔ وہ پہلے ہی غصے میں ہاں داخل ہوتا ہے جیسا کہ رہ گیا۔

”کیا ہے؟“ وہ دھماڑا۔

وہ دیو قامت کا لی بھینگ عورت اس کے سامنے آکر ادب سے جھکی۔ اور بہت مودبانہ لہجے بولی۔ ”سردار کولانا کا کارنہ آیا۔ وہ تجھ سے فرو امانتا چاہتا ہے۔“

سردار کولانا کا نام سن کر راکل کا اوپر اٹھا ہوا ہاتھ فرو ایچے گر گیا۔ اس نے اپنا عصا بغل میں دو:

”کیا کنٹا کیا چاہتا ہے؟“ راکل نے تدرے غصے سے کہا۔
”تو میں کنٹا کیا چاہتا ہوں۔“ میرا انتظار کر تجھے ابھی آکر بتاتا ہوں۔ ”پھر فرما پلا۔“ ایک نظر تانیہ کی طرف دیکھا چیزے کہتا ہو۔ ”میرا انتظار کر تجھے ابھی آکر بتاتا ہوں۔“ پھر فرما پلا۔

”تو میں کنٹا کیا چاہتا ہوں۔“ وہ تو اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ تجھے اگر بقال عزیز ہو تو کالے چراغ کو سرحد پر

پنچاہیتا۔ تجھے ڈیڑھ دن دیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ
ہو گا۔

”کیا ہو گا؟“ راکل یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ کیا ہو گا، پھر بھی سوال کیا۔

”نہ تو ہے گا اور نہ بھال۔“

”میں اسے اعلان جنگ سمجھوں۔“

”بالکل، اس میں کوئی مشک نہیں۔“ اس نے تصدیق کر دی۔

”لیکن یہ اعلان جنگ اس وقت مکمل ہو گا، جب تو سردار کولانا کو جاگر جاتے گا کہ تو نہ راکل کو
دے دیا ہے۔“ راکل نے کہا۔

”تو تھیک کہتا ہے۔“

”اور اگر پیغام دینے والا اپس ہی نہ جاسکے تب۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تو اس طرح کی حمact نہیں کر سکتا۔ تو اچھی طرح جانتا کہ سردار کولانا
قدر طاقتور ہے۔ پھر تجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تمی بی بی بقال اس کے قبضے میں ہے۔“
سے ایسٹ بجادے گا۔“ سردار کولانا کے کارندے نے بڑے اطمینان سے کہا۔

راکل مشکل میں گرفتار ہو گیا۔ بقال کے بارے میں اسے قطعاً کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔
واقعی سردار کے قبضے میں ہے پھر تو اس کارندے پر موت وارد کرنا، حمact سے کم نہ ہو گا۔
زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اسے اپنی بی بی سے بہت محبت تھی، وہ اسے کسی قیمت پر کھانا نہیں
تھا۔

اب راکل کے لئے ضروری تھا کہ کوئی اقدام کرنے سے پہلے وہ بقال کی گرفتاری کا ثبوت مانگے؛
ملنے پر کارندے کو جانے دے اور اس کی دی ہوئی مملت میں کوئی حکمت عملی ملے کرنے کی اک
کرے۔

”سردار کولانا کے ہر کارے..... کیا سردار نے بقال کی گرفتاری کا کوئی ثبوت بھیجا ہے؟“
”ہاں بھیجا ہے؟“ یہ کہہ کر اس کارندے نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور
”احرام کے راکل کی خدمت میں پیش کیا۔“

راکل نے اس چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھا، یہ بقال کی اگونچی تھی۔ اس اگونچی کو وہ بہت اچھی طرح
تھا۔

یہ اگونچی راکل نے ہی اسے دی تھی۔ اس اگونچی میں ٹنگ کی جگہ مٹوکی آنکھ کی ٹنلی ہوئی تھی
آنکھ کی ٹنل کی سی بیرے کی طرح چک رہی تھی۔ یہ اگونچی ہر بھائی اپنی بی بی کے جوان ہوئے پر
تھا۔ کسی لڑکی کے ہاتھ میں یہ اگونچی دیکھ کر ہی کوئی لڑکا اس کی طرف راغب ہوتا تھا۔ اور ہر بھائی

اگونچی کو دیکھ کر راکل کو یقین آگیا کہ واقعی بقال سردار کولانا کے قبضے میں ہے۔ کیونکہ اس اگونچی
بی بارہ پن لینے کے بعد شادی سے پہلا سے لڑکی اپنی انگلی سے نہیں اترتی تھی۔ یہ اگونچی زبردستی اس
انگلی سے اترتی گئی ہو گئی۔

”سردار کولانا سے کہنا کہ اس نے میری بی بی پر قبضہ کر کے اچھا نہیں کیا؟“
”اور راکل کیا تو نے کالا چراغ کو گرفتار کر کے اچھا کیا ہے؟“

”وہ مجرم ہے؟“

”بقال تو نے اسے اپنے پاس ہونے کا اقتدار تو کیا۔ تھوڑی درپیٹے تک تو اس کے نام سے ہی واقعہ نہ
ہوئے پچھے سکتا ہوں کہ اس کا جرم کیا ہے؟“ ہر کارے نے پوچھا۔
”وہ خواہ خواہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔“

”وہ بقال سے محبت کرتا ہے اور محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔“
”مجھے یہ بات پسند نہیں۔“

”خیریہ مسئلہ میرا ہے ناتیڑا ہے۔ یہ مسئلہ کا لے چراغ اور بقال کا ہے، میں نے تجھے اپنے سردار کا
ہوتے دیا۔ اس کی دی ہوئی نشانی بھی تجھے دکھادی۔ اب تو تباہی کہتا ہے۔“
”میں کل سورج نکلتے ہی اسے سرحد پر پنچاڑوں گا۔“

”میک ہے۔ بقال کی نشانی مجھے لوٹادے۔“ ہر کارے نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔

راکل نے دیکھی اس کی طرف اچھا دی جسے اس نے بڑی محنت سے لپک لی۔ پھر وہ تمیز سے
لے گزد کر اپنے گھوڑے کے نزدیک پنچاڑے کے نزدیک پنچاڑ۔ اچھل کر سوار ہوا، ایڑے لگائی اور چشم زدن میں آکھوں
سامنے سے اوچھل ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد راکل نے ٹھیٹا اور گمراہ انسانیں لیا۔ اس کا داماغ پکارا تھا۔ یہ سب کیا ہو گیا۔
اگر کولانا کو کیسے معلوم ہوا کہ کالا چراغ اس کے قبضے میں ہے۔ پھر اس نے بقال کو کہاں سے اور کیسے
کروالا۔ لگتا ہے اس نے بقال کو محرا سے انگواع کرایا ہے، وہ ضرور محسن سے ملنے گئی ہو گی۔ اس
کے عشق نے تو اس کیس کا نہ چھوڑا۔ اب اسے ہر قیمت پر کا لے چراغ کو ازاد کرنا ہو گا۔ ورنہ
اگر کوئی ایسا سرپرہ ایک شخص ہے کہ اس سے کوئی بعد نہیں کہ وہ سنرے کھنڈر پر چڑھائی کر دے۔

ہر کارے کے جاتے ہی بارہ آدمیوں نے مل کر بھاری دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کی آواز پر راکل
کا۔ وہ والپس مڑا۔ اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے سلسلہ دربیان اس کے آگے تھے۔

راکل نے پھر زندان کا رخ کیا۔ اسے دیکھتے ہی دیو قامت عورت نے قید خانے کا دروازہ کھولا اور اس
چچھے چھچھے جعل دی۔ تانی کے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس کا لی بھنگ عورت نے دروازے پر گاتا
اور چڑھا تھا مار کر دروازہ کھول دیا۔ راکل کھٹ کھٹ کر تاکرے کے اندر دا خل ہوا۔

تانية خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ابھی تو اس کے ہاتھوں نیلہ بڑا ہے۔ پھر دوبارہ آگیا۔ یہ ڈھینٹ پن کی انتبا تھی۔ آخراب وہ کیا کرنے آیا ہے۔ اس کے سچے تمکان اور مایوسی کے تاثرات تھے۔ تانية سمجھی کہ شاید وہ اپنے روئے پر شرمende ہے اور اب وہ اپنے معدودت کرنے آیا ہے۔

لیکن ایسا نہیں تھا، وہ کوئی اور ہی منصوبہ لے کر ادھر آیا تھا۔

وہ کچھ دیر تانية کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ پھر دھیر سے بولا۔ ”تانية، بت میں ہے۔“

”کیا ہوا؟“ تانية کے دماغ میں فوراً حسن راؤ کا خیال آیا کہیں خدا نخواستہ اسے کچھ نہ ہو گیا ہو رہا۔

”مند لجع میں بولی۔“ میرا بھائی تو تھیک ہے۔“

”ہاں، وہ تو تھیک ہی ہو گا۔ اسے کیا ہوتا ہے۔“ راکل نے سخت لجع میں کہا۔ ”ویسے یہ مارا اسی کا پھیلایا ہوا ہے۔“

”میرے بھائی نے..... میرے بھائی نے کیا فساد پھیلا دیا۔ وہ تو خود ایک مظلوم شخص ہے اور مظلوم شخص بھلا کیا فساد پھیلا سکتا ہے۔“

”اس نے میرا جھکا دیا ہے۔“ راکل نے شکایت بھرے لجع میں کہا۔

”آخر کچھ پتہ تو چلے، ایسا کیا کیا ہے میرے بھائی نے۔“

”ند میری بہن تمہارے بھائی کی محبت میں گرفتار ہوتی اور نہ آج مجھے یہ دن دیکھنا پڑتا۔ اسے کو لانا نے ان غواء کروالا ہے۔“ راکل نے اکشاف کیا۔

بھائی کے ان غواۓ کی خبر سن کرتانية کے دل میں انار چھوٹے لگے۔ ایک خوشی کی لہڑاہی جو اس پورے وجود کو سرشار کر گئی۔ اسے تھوڑا سا فسوس ہوا کہ اس کے ان غواۓ کی خبر کیوں آئی، اس کے آندر کی خبر کیوں نہ آئی۔ پھر بھی یہ وقت خوشی کے اطمینان کا نہ تھا۔ اس نے مصلحت سے کام لینے پڑا۔ راکل اپنے عساکر کو بیساکھی بیانے کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتا آگے بڑھا۔ تانية اس کے ساتھ ساتھ پڑا۔ قید خانے کی دیوقامت عورت نے ان دونوں کو دروازے تک پہنچایا۔ جھک کر تعظیم دی اور قید

نالے کا دروازہ بند کر کے مستعد کھڑی ہو گئی۔

راکل نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنی مند سنجھاں اور اپنے عساکر میں بار مند پر مار۔ کھٹ کھٹ کی

لڑائی پر دو گول چڑھے والی خادماں میں، پر وہ ہٹا کر اندر آئیں۔ انہوں نے آدھا جھک کر راکل کو تنظیم دی

لڑائی کو جیت بھری نظروں سے دکھا۔

”یا حکم ہے راکل؟“ پھر ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”مدد دروازے پر میرا حکم پہنچا کر سواری اور سوار مجھے تیار میں، میں ابھی آتا ہوں۔“

”یا حکم ہے راکل۔“ یہ کہہ کر وہ دونوں آدھا جھکیں اور تینی سے پر دوں میں غروب

”آخر کیوں؟“

”کا لے چراغ کی وجہ سے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”کا لے چراغ کی وجہ سے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”کا لے چراغ کی وجہ سے۔“

”کا لے چراغ کی وجہ سے۔“

”کا لے چراغ کی وجہ سے۔“

کالے چراغ کا جانے کیا حال ہو گا۔ اس اغوا کے بعد ان دونوں کی دشمنی توکپی ہو گئی۔ بقال کے دل میاں اگر کالے چراغ کے لئے تھوڑی بہت جگہ بھی ہو گی تو اس واردات کے بعد اب وہ بھی نہ رہی ہو گی۔ یہ ہلاجہ بھی عجیب آدمی ہے۔ بلاوجہ اس بڑی عورت کے لئے مرا جا رہا ہے۔ ایسا بھی کیا عشق۔ لخت

بھی اس پر
تائیہ کو نہیں معلوم تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں ابھی کوئی مرد نہیں آیا تھا۔ اس کی زندگی اس انداز سے گزری تھی کہ وہ محبت کے بارے میں کچھ سوچ ہی نہ پائی۔ وہ جب محبت کی باتیں

نہیں تو اسے بڑا حیرت ہوتی۔ ایسی ہوتی ہے محبت۔ آدمی اس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔ محبت میں۔

کالے چراغ پر اسے بڑا رحم آتا تھا۔ وہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے سامنے پھجا جاتا تھا اور بھل اسے مسلسل ٹھوکریں مار کر اپنے سامنے سے اٹھائے جاتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ بقال کے ہاتھ پہنچانے کا بھائی کر کالے چراغ کے سامنے ڈال دیتی۔ اور کھتی کہ لو اب اس سے اپنے سارے بدالے لے لوں کو اوتی ٹھوکریں مارو کہ ٹھوکریں کھا کر ٹھوکریں باندے کا مفہوم اس کی سمجھ میں اپنی طرح آجائے۔

”اسی طرح کی باتیں جانے کتنی دیر تک سوچتی رہی۔ اس کی اونٹنی برق رفتاری سے اپنے سفر پر فرشتے۔

پھر اسے اپنے سامنے کچھ پھر پلا سا علاقہ دکھائی دیا۔ اونچی پنجی پہاڑیاں، چھوٹے بڑے پھر جگہ جگہ بڑے ہوئے۔ آگے دالے سوار نے اب اپنی رفتار کم کر دی تھی۔

تو قورا سما آگے جانے کے بعد وہ سوار رک گیا۔ پھر سارے لوگ اپنی اپنی سواریوں پر ٹھہر گئے۔ تائیہ کو انداز لیا۔ راکل بھی دوساروں کی مدد سے نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنی چادر اور ٹھیکانہ اور بغل میں عصاد بنا کر بیڑے دیہرے آگے بڑھنے لگا۔

یہ راکل دیر ان علاقہ تھا۔ یہاں کس لئے پڑا ڈالا گیا تھا یہ بات تائیہ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ راکل بڑے پا سارے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک بڑے پھر بس میں قدرتی چھوٹی چھوٹی بڑیں ہی نہیں تھیں، چڑھ گیا۔

اس کے بعد اس نے گھوم کر اپنے بغل سے عصا کمال کر اور اٹھایا۔ یہ ایک خاص قسم کا اشارہ تھا۔ اثر دہ پاتی ہی دو سلح سوار تائیہ کے نزدیک آئے اور انہوں نے تائیہ کے ہاتھ پکڑ لئے اور اس کو کھینچ کر اسکے ہر ٹھیکنے لگا۔

اب تائیہ کو اچانک صورت حال کی ٹکنی کا اندازہ ہوا۔ اس کی چھٹی حس ایک دم بیدار ہوئی۔ اسے اس بس ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ ایک دم غصے میں آگئی اور پھر کریوں۔ ”راکل، یہ نہ چڑھنی ہے۔“

”ہاہا۔“ راکل نے ایک فلک شکاف قدمہ لگایا۔ ”بھوراکل کا کہنا نہیں مانتا۔ اسے ہر صورت میں

خادماں کے جانے کے بعد وہ دونوں مرے میں اکیلے رہ گئے۔ تائیہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے بات کرے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات کرے۔ خود راکل نے بھی کوئی بات نہ جیسی تھی۔ اس پر ایک بگیر سوچ طاری تھی۔ وہ پر دوں کی طرف ایک نک دیکے جا رہا تھا۔ یہاں لگتا تھا جیسا کسی کے پھر نہ کام ہو۔

پکھ دیر کے بعد وہ اپنے عصا کے سارے اٹھا، عصا بغل میں دبایا۔ اور تائیہ کے چہرے پر نظر اپنی خاطر ہوا۔ ”آ..... اب وقت رخصت آگیا۔“

تائیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچے پیچھے چل دی۔ صدر دروازے پر جب وہ دونوں پیچے تو ایک مسلح دربان نے زور سے آواز لگائی۔ ”راکل؟ دروازہ کھولا جائے۔“

چھ آدمی دائیں کوٹھری اور چھ آدمی بائیں کوٹھری سے برآمد ہوئے، انہوں نے بڑی پھرتی سے بھاری دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی راکل جو آخری سیڑھی پر کھڑا تھا، اتر کر دروازے کی مددھا۔

دروازے کے باہر چھ مسلح سوار مستعد کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی دو اندھیاں بھی ہوئی پیشی میں تائیہ کو ایک اونٹنی پر سوار کرایا گیا۔ دوسری اونٹنی پر راکل کو بھٹایا گیا۔ پھر راکل نے ایک سوار کو نزدیک بلا کر کچھ ہدایت دی جسے تائیہ دور ہونے کی وجہ سے نہ سن سکی۔

پھر وہ سوار جسے ہدایت دی گئی تھی، دونوں اونٹنیوں کے آگے آیا۔ اس نے منہ سے ایک عبر آواز نکالی اور یہ قافلہ ہندزوں کے درمیان سے گزرتا ہوا، میدان میں آگیا۔

سب سے آگے ایک گھر سوار تھا، اس کے پیچے تائیہ، تائیہ کے بعد راکل کے پیچے پاؤں سوار اور تھے۔ اور اب یہ قافلہ برق رفتاری سے مغرب کی جانب رواں دواں تھا۔

تائیہ سوچ رہی تھی کہ راکل نے کما تھا کہ کسی دوست کو اس کا بیگانہ پکنچا ہے تاکہ وہ سردار کو متوقع جعلے کا مقابلہ کر سکے۔ اور یہ کہ یہ بیگانہ وہی پکنچا سکتی تھی کیونکہ دوست تک پیچنے کے لئے کولاناتی سرحدوں سے گزرن پڑتا۔ لیکن نہ تو راکل نے اس کے حوالے کوئی بیگانہ کیا تھا اس ملنے پتایا تھا۔ اور اب وہ خود بھی ساتھ چل دیا تھا۔ جبکہ اس کا ساتھ جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔؟

تائیہ کی اونٹنی برق رفتاری سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ درستک ریت ہی ریت تھی۔ ”ہا۔“

ہوئے ادراہ در نظر سردار ہی تھی۔ شاید اس کے بھائی کی جھونپسی نظر آ جائے۔ عیوب مہ ہو گئی تھی۔ بقال کو سردار کولاناتے اغوا کرایا تھا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی طرح سردار کولاناتے ملاقات ہو جائے تو وہ بقال کے کرتوت بتائے۔ اس نے محض راؤ کا ہو جاں کر وہ دکھا کر بقال کو سزا دلوائے۔

بھیڑے دس پندرہ نہ تھے، سکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اور ان بھیڑوں نے اسے چاروں طرف سے مہر لایا تھا۔ اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ اس پر چھلانگ لگا کر زمین پوس کرنے والے تھے۔

راکل نے تب اپنا عصا باغل سے کالا اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر بلند کیا۔ ساتھ ہی وہ بھیڑے سے لفظ پوچھا تھا۔ راکل کی اس حرکت پر وہ تمام بھیڑیے ایک لمحے کے لئے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ساکت ہوئے۔ وہ راکل کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔

پھر راکل کے عصا سے ایک پھر پھر مٹا اٹوکلا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک اٹونکتے چلے گئے۔ آسمان ہر چوتھے آؤ توں سے بھر گیا۔ پھر راکل کی آواز پر آؤ توں نے بھیڑوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن یہ حملہ کاملاً بند ہو سکا۔

اُلوجیسے ہی بھیڑوں پر حملہ کرنے کے لئے پیچے آتے۔ یہ بھیڑیے اچھل کر ان کے پر اپنے جڑوں میں رجوع لیتے اور انہیں چاکراڑنے سے مفلونگ کر دیتے۔ زمین پر گرتے ہی وہ سرے بھیڑیے انہیں چرپا ہوا کر موت سے ہمکنار کر دیتے۔ راکل اپنی فون کا یہ حشر دیکھ کر کپکا اٹھا۔

اب آسمان پر ایک بھی الومن تھا۔ سب زمین پر مرے ترے اور ادھرے ہوئے پڑے تھے۔ اور وہ فن آشام بھیڑے پھر اس پھر کو اپنے گھیرتے میں لے رہے تھے جس پر راکل کھڑا تھا۔

وہ بھیڑیے اپنی چمکتی آنکھوں لپاٹی زبانوں اور کھلے وہشت ناک جڑوں سے بڑی دلپی سے راکل کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے کہ رہے ہوں۔ ہاں بھی، اگر تیرے پاس اپنے دفاع میں استعمال کرنے کے لئے کوئی لمحوں بعد یہ بھیڑیے اس پر چھلانگ لگائیں گے اور چیرچھاڑ کر رابر کر دیں گے۔

راکل کی ترقع کے طبق بھیڑوں نے وہ سرے لمحے اس پر جست لگائی، وہ پھر سے لرکتا ہوا زمین پر آیا۔ بھیڑوں نے اسے بھجوڑا نہیں، چند بھیڑوں نے مل کر اس کے باہت پاؤں اپنے جڑوں میں دبائے اور گھینٹے ہوئے لے چلے۔ اس کا بازو تو پسلے ہی زخمی تھا۔ تانیہ نے یہ کار کارے زخمی کیا تھا۔ اب ان بھیڑوں کے دانتوں کی گرفت اس کی جان نکالے دے رہی تھی۔

بھیڑیے اس کی تکمیل سے بے نیاز آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ راکل ایک بھاری بھر کم خخش تھا۔ جب بھیڑیے اسے گھینٹے ہوئے تھک جاتے تو تارہ دم بھیڑیے ان کی گمد لے لیتے اور راکل کو گھینٹے لگاتے۔ راکل اب تکمیل کے باعث بے ہوش ہو چکا تھا۔

بھیڑوں کو اس بات کی پردانہ تھی کہ راکل کس حال میں ہے۔ ہوش میں ہے یا ہوش گناہ بھیٹھا ہے۔ وہ کمرے ہوئے کتوں کی طرح اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ راکل کو گھینٹے والے بھیڑیے جب تھک جاتے تو ان کی جگہ وہ سرے بھیڑیے لے لیتے۔

سزا سے دوچار ہوتا پڑتا ہے۔

"لیکن تو تونگھے کسی کو پیغام دینے کے لئے قید خانے سے نکال کر لایا تھا۔"

"پیغام تو میں تجھے دوں گا۔ موت کا پیغام۔" یہ کہ کہ وہ پھر دیوانہ دار قسمہ لگانے کا۔ کا لے چراغ نے تیرے بارے میں نمیک کھاتا تھا کہ تو ایک غبیث مخلوق ہے۔ "تانیہ کا فخر انہیں تھا۔

"اس نے ٹھیک کھاتا ہیں واقعی خبیث مخلوق ہوں۔ اب تو میری خبات دیکھ۔" یہ کہ کہ وہ اپنے سواروں سے خاطب ہوا۔ "اسے اٹھا دو اور وفات میں ڈال دو۔"

پھر جو کچھ ہوا چشم زدن میں ہوا۔ راکل کا حکم پا کر دونوں سوار اس کے دونوں ہاتھ کھینچتے ہوئے ادا بڑھے۔ پھر ایک جگہ رک کر انہوں نے تانیہ کے پیچے پکڑ کر اپر اٹھایا۔ ڈنڈا ڈولی کے انداز میں اسے جھوٹ دیئے اور پھر ایک عجیب سی آواز نکال کر اسے ہوا میں اچھا دیا۔

جب وہ پنجھے گری تو تانیہ کو احساس ہوا کہ اسے کہاں پہنچانا گیا ہے۔ وہ ایک بست گمراہ کو اکواں تھا۔ اس میں گرتی چلی جا رہی تھی۔

یہ چاہ وفات تھا۔ اس کنوں میں گرانے جانے والا بھی زندہ نہیں پہنچا تھا، وفات پا جاتا تھا۔

راکل، تانیہ کو کنوں میں پھکوانے کے بعد پھر نما چنان پر کھڑا بے تحاشا قسمتے لگائے جا رہا تھا۔ اس کے قفقے کسی طرح رکنے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔

پھر اچاک، ہی راکل کی ساعت سے غرغاہت کی آواز نزدیکی اور یہ آواز نزدیک ہی تھی۔ راکل اسے قسمتے ایک دم سرد پڑ گئے۔ وہ ابھی تک ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس نے گہرا کر اپنا عصا باغل میں لے لا لیا۔ اور پیچھے گھوم کر ویکھا تو پس منظر یکسر بدلا ہوا تھا۔

وہ خون آشام بھیڑیے تھے۔ بڑے جیسی اور تعداد میں بہت۔ انہوں نے اپنی سرخ لپاٹی زبانوں کو نکلے دانتوں سے ان چھ سواروں کو آننا نا اونا جھیڑا لا جو راکل کے ساتھ آئے تھے۔ یہ سب اس قدر تھا۔

سے اور اچاک بوا تھا کہ وہ مسلح سوار اپنے ہتھیار بھی سیدھے نہ کر پائے۔ بن یوں محسوس ہوا تھا جیسے بھیڑیے ہوا کا پردہ چاک کر کے اچاک کیسی سے نمودار ہو گئے ہوں۔

سواروں کو ختم کرنے کے بعد بھیڑوں نے گھوڑوں اور اوٹنیوں پر بھی حملہ کر دیا۔ سواروں پر جملے دور ان گھوڑے اور اوٹنیاں پسلے ہی چوکنا ہو کر بھاگ لئے تھے۔ پھر بھی بھاگتے گھوڑوں میں ہے اور خنوار بھیڑوں نے وہ گھوڑے گرائے اور آننا نا ان دونوں کو او ہیڑ کر کر دیا۔ جونق گئے وہ فزار ہیں میں کامیاب ہو گئے۔

اب راکل تمارہ گیا۔ وہ اس اوپنے اور بڑے پتھر پر عساکو بیساکھی بنائے ان جیسی خنوار بھیڑیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی تانیہ کو چاہ وفات میں پھکوانا یا تھا، اسے کیا جبرتی کہ دوسروں کو موت سے کرنے والے خود بھی موت کے دام میں آسکتے ہیں۔

آنے کے قابل ہوا، اس وقت تک بھیڑیے اپنا کام دکھا کر جا چکے تھے۔

وروازے کے سامنے ناگ اور ہڑا ہوا پڑا تھا۔ اس سے آگے الوز میں پر پھیلائے بے جان پڑا تھا۔ دروازے کے سامنے ناگ اور ہڑا ہوا پڑا تھا۔ اس سے آگے الوز میں پر پھیلائے بے جان پڑا تھا۔ میں راؤ، ان دونوں مخالفوں کا یہ حال دیکھ کر بہت خوش ہوا، وہ فوراً دروازے سے باہر نکل آیا۔

وروازے سے باہر نکلا تو اس نے زمین پر کسی جانور کے پیسوں کے بے شمار نشانات دیکھے۔ اور پھر اس کی نظریں راکل پر ٹھہر گئیں۔ وہ ریت میں مند دیئے اونڈھا لیا تھا۔ وہ تینی سے اس کی لفڑیوں پر۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر دانتوں کے بے شمار نشان تھے۔ وہ بری

لطف زخمی تھا۔ اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے اوپر کٹی ہوئی تھی۔

لطف زخمی تھا۔ بقاں کے مخالفوں کو کس نے مارا تھا۔ اس شخص کو کس نے زخمی کیا تھا۔ یہ ہزاروں یہ سب کیا تھا۔ بقاں کے مخالفوں کو کس نے مارا تھا۔ اس شخص کو کس نے زخمی کیا تھا۔ یہ ہزاروں پیسوں کے نشانات کس جانور کے تھے۔ یہ صبح ہی صبح کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ برا جال ان مخالفوں کے مرتبے کی اسے خوشی تھی۔ اب کم از کم وہ جھوپڑی سے باہر نکل سکے گا۔ بے شک وہ فرار نہیں ہو گا لیکن جھوپڑی سے باہر گھوم پھر تو سکے گا۔

محسن راؤ نے بُنکل اس اجنبی شخص کو سیدھا کیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ کس قدر کمزور ہو چکا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بے ہوش شخص کو اپنی جھوپڑی میں لے جائے۔ لیکن اسے سیدھا کرنے میں کتنی

وقت پیش آئی تھی تو اسے اٹھا کر یا گھیٹ کر اندر لے جانا اس کے میں کا ہرگز نہ تھا۔

پھر اس نے سوچا کہ جھوپڑی میں سے پانی لا کر اس کے منہ پر چھیننے مارے جب اسے ہوش آجائے تو ہمارے سارے کے مخالفوں نے تیز جھلکا ہوا جھوپڑی میں لے جائے۔ وہ قدرے سے دوڑ ہو گئے۔ سانپ کو چاروں بھیڑیوں پر بیک وقت نظر کو مشکل ہو گیا۔ اسے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔ اس نے گھبرا کر سامنے والے بھیڑی پر لڑا کر دیا۔

ابھی وہ سانپ آگے بڑھ کر اس بھیڑی کو کاٹنہ پایا تھا کہ پچھے سے ایک بھیڑی نے اس کی دم لپڑ جزے میں لے لی۔ پھر ان تین بھیڑیوں کو اس ناگ کو کیفر کردار پہنچانے میں کوئی وقت نہیں۔ آئی۔

اُلوار سانپ کو ختم کرنے کے بعد جیسے ان کا کام مکمل ہو گیا۔ ان چاروں بھیڑیوں نے اپنی تھوٹنی اور اٹھا کر عجیب ہی آوازیں نکالیں، اس کے بعد ایک مت دوڑ لگا دی۔

ان کے آگے نکلتے ہی بقیہ بھیڑیے بھی ان چاروں کے پیچھے ہولئے۔ ان کے دوڑنے کی وجہ سے اڑنے لگی۔ اور پھر وہ ریت کے بادلوں میں اس طرح گم ہو گئے جیسے وہ ریت کے بنے ہوئے تھے۔

محسن راؤ کو کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کی جھوپڑی کے آگے کیا تماشا ہو چکا ہے۔ صبح کا وقت تھا؛ گھری نیند سورہ تھا۔ پھر اس کے کانوں میں غراہٹ کی سی آوازیں آئیں۔ یہ کچھ غیر معمولی آواز تھیں۔ اس طرح کی آوازیں اس نے آج تک نہ سن تھیں۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر جب تک اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے۔ اور وہ اٹھ کر جھوپڑی

وہ بھیڑیے بھر کے پوری رات سفر کرتے رہے۔ اب صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ سرخ کنارہ افق سے ابھرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

اور وہ بھیڑیے راکل کوریت پر گھیٹنے ہوئے تھے جارہے تھے۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ وہ بھیڑیے کا جگہ ٹھہر گئے۔ یوں لگا جیسے کسی نے انہیں رنکے کا اشارہ کیا ہو۔ وہ راکل کو پھوڑ کر پیچھے ہے اور پھر پھر دوسرے سے مل کر کھڑے ہو گئے اور زور زور سے ہانپے لگے۔

راکل اونڈھے منہ ریت پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی تھا۔ بھیڑیے اب اس سے نہیں بے نیاز ہو چکے تھے۔ جیسے انہوں نے راکل کو بہایت کے مطابق منزل پر پہنچا دیا ہو۔

وہ سارے کے سارے بھیڑیے اب اس اُتوپر نظر جملے ہوئے تھے جو سامنے جھوپڑی کی بھیڑی بیٹھا تھا۔ وہ ان بھیڑیوں کو دیکھتے ہی بے چین ہو گیا تھا۔ یکاںکہ اس نے اڑنے کے لئے پرتوںے۔ اس کا

اڑتے ہی آگے کھڑے چند بھیڑیے ایک دوسرے سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ پھر جیسے یہ اس اُلوار اس پر حملہ کرنے کے لئے پنج پروازی۔ اسی وقت دو بھیڑیوں نے اچل کر اس کے پردوں کو اپنے ہمراہ میں دوچ لیا۔ پھر جیسے ہی وہ دونوں بھیڑیے ریت پر گرے۔ ان کے گرتے ہی دوسرے بھیڑیوں نے اس اُلوار کو نوجوں ڈالا۔

پھر چار بھیڑیے اپنے گھول میں سے نکلے۔ اور انہوں نے جھوپڑی کے دروازے کی طرف رکیا جہاں ایک سانپ کنٹل مارے اور پھر پھیلائے ان بھیڑیوں کو اپنی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ وہ چاروں بھیڑیاں بُنکل کے نزدیک پہنچ کر ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ سانپ کو چاروں بھیڑیوں پر بیک وقت نظر کو مشکل ہو گیا۔ اسے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔ اس نے گھبرا کر سامنے والے بھیڑی پر لڑا کر دیا۔

ابھی وہ سانپ آگے بڑھ کر اس بھیڑی کو کاٹنہ پایا تھا کہ پچھے سے ایک بھیڑی نے اس کی دم لپڑ جزے میں لے لی۔ پھر ان تین بھیڑیوں کو اس ناگ کو کیفر کردار پہنچانے میں کوئی وقت نہیں۔ آئی۔

اُلوار سانپ کو ختم کرنے کے بعد جیسے ان کا کام مکمل ہو گیا۔ ان چاروں بھیڑیوں نے اپنی تھوٹنی اور اٹھا کر عجیب ہی آوازیں نکالیں، اس کے بعد ایک مت دوڑ لگا دی۔

ان کے آگے نکلتے ہی بقیہ بھیڑیے بھی ان چاروں کے پیچھے ہولئے۔ ان کے دوڑنے کی وجہ سے اڑنے لگی۔ اور پھر وہ ریت کے بادلوں میں اس طرح گم ہو گئے جیسے وہ ریت کے بنے ہوئے تھے۔

محسن راؤ کو کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کی جھوپڑی کے آگے کیا تماشا ہو چکا ہے۔ صبح کا وقت تھا؛ گھری نیند سورہ تھا۔ پھر اس کے کانوں میں غراہٹ کی سی آوازیں آئیں۔ یہ کچھ غیر معمولی آواز تھیں۔ اس طرح کی آوازیں اس نے آج تک نہ سن تھیں۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ پھر جب تک اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے۔ اور وہ اٹھ کر جھوپڑی

"میں ایک قیدی ہوں۔" محسن راؤ نے اسے بتایا۔

"قیدی ہو، اس حرما میں، تجھے کس نے قید کیا ہے؟"

"بُنال نے۔" محسن راؤ نے بتایا۔

”اوہ۔“ راکل نے ٹھنڈا سانس لیا اور چپ ہو گیا۔
”کیا تم بھائی کو جانتے ہو؟“
”کیا تو محن ہے؟“ راکل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بعد جائے اتنا سوال کیا۔

”کیا تو محن کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔“
”کون ہو؟“

”میں راکل ہوں۔“ راکل نے اپنا تعارف کروایا۔
”اوہ۔“ اس مرتبہ محن راؤ کے ٹھنڈا سانس لینے کی باری تھی۔

”کیا تو مجھے جانتا ہے؟“
”ہاں، میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تو میری دشمن جاں کا بھائی ہے۔“ محن راؤ نے اسے گھنی نظر دیں سے دیکھا۔

”تجھے تو بھائی کی محبت پر ناز ہونا چاہئے۔“
”جسے اپنی بھن کو کبھی یہ نہیں سکھایا کہ دوسروں کو تکلیف نہیں دینا چاہئے۔“

”تجھے سے بہت محبت کرتی ہے۔“
”محبت میں تکلیف دینا جائز ہے۔ کسی کی زندگی تباہ کرنے اٹھیک ہے۔“

”تجھے تو بھائی کی محبت پر ناز ہونا چاہئے۔“
”بیرستی باس ہو گیا اور تجھے نازکی سمجھی ہے، اس سے کوہہ کا لے چراغ سے محبت کی پیٹنگیں ہمالے، میری جان بخش دے۔“

”اب تو خود اس کی جان خطرے میں ہے؟“
”اللہ کرے وہ مر جائے۔“ محن راؤ کے دل سے بدعاٹکی لیکن ہونٹوں پر نہ آئی۔ پھر اسے اپنی بھن کا ذیل آیا۔ بھائی اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ اب کہاں ہے؟ اس کے بارے میں راکل نے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

”میری بھن کہاں ہے؟“ محن نے پوچھا۔
”کون تانی۔“ راکل نے گھر اسنان لیا۔

”ہاں، وہ خیریت سے تو ہے۔“
”میں نہیں جانتا۔“ یہ کہہ کر اس نے دوسری طرف منہ موڑ لیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ راکل تو مجھ سے کیا چھپا رہا ہے۔“
”میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ بس تو یوں سمجھ کر وہ گم ہو گئی۔“

”کمال گم ہو گئی؟.....“ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔“ راکل نے یہ کہہ کر بختی سے ہونٹ لٹھانے لے۔

تب محن راؤ کو احساس ہوا کہ راکل زخموں سے چور ہے اور اس سے مسل سوال جواب کے جارہا ہے۔ اسے راکل کو اندر لے جانا چاہئے اور اس کے زخموں کا کوئی علاج کرنا چاہئے۔

”آ..... راکل اٹھ..... میرے ساتھ جھونپڑی میں چل۔ تو شدید زخمی ہے۔“ محن راؤ نے ہمدردی سے کہا۔

راکل نے آنکھ اٹھا کر بڑی منونیت سے محن راؤ کو دیکھا۔ اسے انسان کی عظمت کا احساس ہوا۔ یہ

”اوہ۔“ راکل نے ٹھنڈا سانس لیا اور چپ ہو گیا۔
”کیا تم بھائی کو جانتے ہو؟“
”کیا تو محن ہے؟“ راکل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بعد جائے اتنا سوال کیا۔

”محن راؤ ایک اچھی شخص کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔“
”میں راکل ہوں۔“ راکل نے اپنا تعارف کروایا۔

”اوہ۔“ اس مرتبہ محن راؤ کے ٹھنڈا سانس لینے کی باری تھی۔
”کیا تو مجھے جانتا ہے؟“
”ہاں، میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تو میری دشمن جاں کا بھائی ہے۔“ محن راؤ نے اسے گھنی نظر دیں سے دیکھا۔

”تجھے کس طرح جانتا ہے؟“ راکل نے پوچھا۔
”یہی سوال میں تجھے سے کرنا چاہتا ہوں؟“

”تجھے بھائی نے تیرے بارے میں بہت کچھ بتا رکھا ہے۔“
”اور تیرے بارے میں سب کچھ مجھے کا لے چراغ نے جایا۔“ محن بولا۔

”کالا چراغ۔“ وہ ایک دم گھبرا کر بولا۔ ”اوہ، غضب ہو گیا۔“
”کیا ہوا؟“

”اتا دن چڑھ آیا، مجھے تو سورج نکلتے ہی کا لے چراغ کو سردار کولا نا کے سامنے حاضر کرنا تھا۔ یہ بھیریے مجھے کہاں لے آئے، میں تو سمجھا تھا کہ یہ سردار کولا نا کی فوج ہے۔“

”اوہ، تو وہ باہر کھیڑوں کے پیشوں کے نشان ہیں۔ کیا تجھے بھیڑوں نے زخمی کیا ہے اور کیا بھائی کے ماحنقوں کو کانی نے مارا ہے۔“ محن راؤ نے پوچھا۔

”بال، ایسا ہی ہوا ہے۔“
”بھائی، بیہاں سے کا لے چراغ کو زنجیروں میں ہکھڑ کر گھسیت ہوئی لے گئی تھی۔ وہ بے چارہ تواریت میں تین دم توڑ گیا ہو گا۔“

”وہ خوبی اتنی آسانی سے مرنے والی چیز نہیں۔ کاش، وہ مر گیا ہوتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھ پڑتے۔“

”یہ سردار کولا نا کون ہے؟“
”کالا چراغ، سردار کولا نا کا دامت راست ہے۔ سردار کولا نا کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ کالا چراغ۔

”میری قیوم ہے اس نے بھائی کو اغوا کر رکھا اور بدالے میں کا لے چراغ کو ماٹا۔ آج صبح میں کا لے چراغ کو اس کے حوالے کر کے اپنی بھن کو لے آتا۔ لیکن اب تو تکمیل ہی گز گیا۔ اس نے مجھے دعا

شنا کیا۔ ”
”میں مانتا ہوں۔“ وہ اس کا مظکور تھا۔

”پھر مجھے حق بتا کیوں نہیں دیتا۔“
”س بارے میں؟۔“ راکل نے پوچھا۔

”نہیں کے بارے میں۔ مجھے بتا دے کہ وہ کمال ہے۔“
”آہ۔“ راکل نے تایم کا نام سن کر ایک سرد آہ بھری اور خالی خالی نظر دیں سے محسن کو دیکھنے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ اس نے سر جھکایا۔
میں ان پہنچ سوال کے جواب کا منتظر تھا لیکن راکل نے بڑی دیر تک اپنا سرہنہ اٹھایا۔ تب محسن نے

اے آواز دی۔ ”راکل۔“
راکل نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اور دھیرے سے بولا۔ ”جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کچھ نہیں

ہے۔“
محسن کو اس کا جواب سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا کہ میں نے اس سے پوچھا لیا تھا اور اس

نے جواب کیا دیا ہے۔ شاید اس کا دماغ چل گیا ہے یا پھر یہ مجھے چلانا پاہتا ہے۔
برخلاف محسن کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ صحیح جواب دینے کے لئے تیار نہیں ہے؟ لذا اس نے اس

سے بڑی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔
”محسن کیا یہ ممکن ہے کہ تو کچھ دیر کے لئے جھوپڑی سے باہر چلا جائے۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔“ محسن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بات کیا ہے؟“
”جب تو تھوڑی دیر کے بعد واپس جھوپڑی میں آئے گا، تو تجھے بات کا خود بخوبی پا چل جائے گا۔“

راکل نے کہا۔
محسن اس کے کہنے پر جھوپڑی سے باہر نکل گیا۔ پھر وہ گھوم کر جھوپڑی کے پیچھے چلا گیا، کچھ دیر وہاں

کھڑا رہنے کے بعد جب وہ اپنی آیا اور اس نے اپنی جھوپڑی میں قدم رکھا تو حیران رہ گیا۔
راکل جھوپڑی میں موجود نہ تھا۔ محسن پھر فوراً ہی جھوپڑی سے باہر آیا۔ اس نے چاروں طرف نظر

لیا۔ لیکن اسے راکل جاتا ہوا کہیں دکھائی نہ دیا۔ البتہ ایک اتو مغرب کی طرف اٹتا ہوا ضرور جارہا
نہیں۔

راکل، محسن کو دھوکا دے کر نکل گیا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ خود قسمت نے اس کے ساتھ

کھدا فرب کیا تھا۔ اس پر کئی کاری ضرب لگائی تھی۔
رہیں ہے۔

یہ بات اسے سترے کھنڈر پہنچ کر معلوم ہوئی۔ وہاں کا نتشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سردار کو لانا نے سترے
لئے رکن اپنے سے اینٹ بجواری تھی۔ اب یہاں کچھ نہ پچاہتا۔ ہر چیز تباہ ہو گئی تھی۔ ہر طرف تباہ کاری

لکھا ہیں تھی۔ اور سردار کو لانا کے ہر کارے راکل کی گھات میں بیٹھے تھے۔

انسان ہی ہے جو کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت یہاں کوئی غیر انسان ہوتا تو اس کے ساتھ
ٹھوکر مار کر اپنارستہ لیتا۔ بقاہ نے ایک انسان سے محبت کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔ لیکن اب کیا بھروسہ
تھا۔ معاملہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔

محسن راؤ میں جس قدر طاقت تھی، اس سے زیادہ طاقت صرف کر کے، اس نے راکل کو اٹھنے میں دی۔
پھر وہ کسی نہ کسی طرح اسے جھوپڑی میں لے آیا۔ وہ اسے اٹھا کر بری طرح ہانپہ لے کر

راکل اس کو خاموشی سے ہانپہ ہوئے دیکھتا رہا۔ ”راکل، تمہے زخم کیے ہیں
کچھ دیر کے بعد جب محسن راؤ کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ”راکل، تمہے زخم کیے ہیں
ہوں گے۔“

”یہ جو سامنے آؤ تو ماڑا ہے۔ اسے میرے پاس لا۔“ راکل نے کہا۔
محسن باہر پڑے اٹو کوپ سے پکڑ کر اٹھا لایا۔ بھیڑیوں نے اس کا سر اور بازو چباڑا لے تھے۔

”لے۔“ محسن راؤ نے وہ اٹو راکل کے نزدیک رکھ دیا۔
”اب تو کچھ دیر کے لئے جھوپڑی سے چلا جا۔“

”وہ کیوں؟“ محسن راؤ نے حیران ہو کر پوچھا۔
”میں ہو اپنے زخموں کا علاج کروں گا، وہ تو دیکھ نہیں پائے گا۔“

”اچھا، ٹھیک ہے، میں باہر چلا جاتا ہوں۔“ یہ کہہ دہ باہر نکل گیا۔
محسن راؤ کے باہر جانے کے بعد راکل نے اس اٹو کا دل اس کے سینے سے کال کر اپنے منہ میں رکا
اور اسے پان کی طرح چبانے لگا۔ پھر اس نے اٹو کے خون سے اپنے ہاتھ بھرے اور اس خون کو
زخموں پر پڑنے لگا۔

جب اس نے الو کا خون اچھی طرح اپنے زخموں پر مل لیا، پھر آواز دی۔ ”آجا، محسن
آجا۔“

محسن اندر آیا تو وہ اندازہ نہ کر پایا کہ راکل نے اس اٹو کی لاش کے ساتھ کیا کیا ہے، اس نے اٹو کی
طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اے باہر لے جا، کھود کر گاؤ دے۔“

”میرے پاس گڑھا کھونے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے۔“

”اپنے ہاتھوں سے ریت ہٹا کر، چھوٹا سا گڑھا بنا اور پھر اسے ریت سے ڈھک دے۔“
محسن راؤ نے اس کی پڑاکیت کے مطابق اس مرے ہوئے اٹو کو ریت میں دبادیا، اور ہاتھ جھاڑتہ
کھڑا ہوا۔

جب محسن راؤ جھوپڑی میں پنچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ راکل کے زخم بہت تیری سے
تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے اندر وہ مکمل صحت یا بہت خوش تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا
راکل کو خوش دیکھ کر محسن نے اس سے کہا۔ ”دیکھ راکل میں نے تمہے ساتھ دشمنوں کا سما

”وچھے گھمی نہیں، میں نے تجھے احتمل یونیٹس کہ دیا۔ ارے بے وقوف وہ کالے چانغ کی محبت
چھپتی کواس کے حق میں وست بردار ہونا پڑے گا۔“

”وچھے ہے۔“

”اور شاری بن نے جوا لاد آدم کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔ وہ قلم نہیں ہے کیا؟“
”میں نہیں جانتا۔“ اس نے راہ فرار اختیار کی۔

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے ایک فصلہ کیا ہے۔

”بھین میں بہت کچھ جانتا ہوں، میں نے ایک فصلہ کیا ہے۔“

”ویکی؟“ راکل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

سردار کولاتا نے جب اپنا فصلہ سایا تو راکل پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ جنحے کر بولا۔ ”نمیں، ایسا ہر گز نہیں
ہکل۔“

”میں سچ کھتا ہوں سردار.....“ میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ میں ہر قیمت میں پورا کرتا۔ میں ہر
نکتہ ہی کالے چانغ کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ لیکن چاہ وفات پر لاقداد بھیڑوں نے مجھ پر حملہ کر دیا
وہ گھینٹے ہوئے لے چلے۔ راستے میں، میں زخموں کی تاب نہ لا کر ہوش گنو یا خدا اور جب مجھے ہوش گنا
بست در ہو چکی تھی۔ اب سردار تو ہی بتا کر اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

”تیرے بارے میں کالا چانغ سچ کھتا ہے کہ تو برا خبیث ہے۔ واقعی تو نے بڑی شاندار کمال گمرا
ہے اور اپر سے دیواہ کالی کی جھوٹی قسم بھی کھالی ہے۔ جو تھوڑی بست کسرہ گئی تھی۔ وہ کمی پا
ہو گئی۔“

”اسے بلاو۔“ سردار کولاتا نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔
اس کا شارہ پا کر دو خادماں میں تیزی سے باہر نکل گئیں اور آنکھاتا سے کلائی سے پکڑ کر لے آئیں۔

”انہیں بھائی کو زخمیوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو اسے شدید صدمہ ہوا۔
راکل نے جب اپنی بن بقال کو خادماں کے ساتھ اندر آتے دیکھا تو اسے شدید غصہ آیا۔ اس کی
لہی براہ راست بقال کا ہاتھ تھا۔

”سردار کولاتا کی خادماں بقال کا ہاتھ چھوڑ دو اور اسے عزت سے کری پر بٹھاؤ۔“ سردار کولاتا نے
ایسا۔

”وہ کمی نہیں خادماں نے فوراً اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور پھر اس کے سامنے آدھا جھک کر کری پر
نکا شارہ کیا۔ لیکن بقال اپنی جگہ سے شیس سے میں نہیں ہوئی۔

”یاہو، آگے کیوں نہیں بڑھتی، کیا تجھے عزت راس نہیں۔“ سردار کولاتا نے سخت لمحے میں
ہے۔

”نمیں کا بھائی زخمیوں میں جکڑا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو، وہ کری پر کس طرح بیٹھے سکتی
ہے۔“

”سردار کولاتا کے خادموں، راکل کی زخمیں کھول دو۔“ سردار کولاتا نے حکم دیا۔ ”اس کا اعتراض
نہ ہے۔“

”سردار کولاتا کے حکم کی فرما تعمیل ہوئی۔ پھر اسے بھی کری پیش کی گئی۔ دو خادماں نے اسے سارا

سنرے کھنڈر میں جب وہ اچھی طرح گھوم لیا اور اس نے اپنی تباہ کاری کی نشانیاں ہر طرف دیکھ لیں
کولاتا کے ہر کارے اس کے سامنے آگئے۔ اپنے محل اور اپنے علاقے کی تباہ کاری دیکھ کر وہ پسلے اور
مراہور ہاتھ۔ سردار کولاتا کے ہر کاروں کو جکڑ لیا اور پھر جس طرح کالے چانغ کو لے جا کر ڈال دیا گیا۔

سردار کولاتا کے ہر کاروں نے اسے زخمیں جکڑ لیا اور سردار کولاتا کے سامنے لے جا کر ڈال دیا گیا۔
ویسے راکل کو لے جایا گیا۔ اور اسے سردار کولاتا کے سامنے لے جا کر ڈال دیا گیا۔

”سردار کولاتا نے اپنے بے بالوں پر ہاتھ پھیس اور مکراتے ہوئے بولا۔ ”آؤ، فرمی۔“
”سردار کولاتا..... دیواہ کالی کی قسم، میں نے کوئی فریب نہیں دیا۔“

”دیکھ، دیواہ کالی کی اگر جھوٹی قسم کھائے گا تو میں تجھے چھوڑوں گا نہیں، ابھی رقت کرو
گا۔“

”میں سچ کھتا ہوں سردار.....“ میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ میں ہر قیمت میں پورا کرتا۔ میں ہر
نکتہ ہی کالے چانغ کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ لیکن چاہ وفات پر لاقداد بھیڑوں نے مجھ پر حملہ کر دیا
وہ گھینٹے ہوئے لے چلے۔ راستے میں، میں زخموں کی تاب نہ لا کر ہوش گنو یا خدا اور جب مجھے ہوش گنا
بست در ہو چکی تھی۔ اب سردار تو ہی بتا کر اس میں میرا کیا قصور ہے۔“

”تیرے بارے میں کالا چانغ سچ کھتا ہے کہ تو برا خبیث ہے۔ واقعی تو نے بڑی شاندار کمال گمرا
ہے اور اپر سے دیواہ کالی کی جھوٹی قسم بھی کھالی ہے۔ جو تھوڑی بست کسرہ گئی تھی۔ وہ کمی پا
ہو گئی۔“

”میں سچ کھتا ہوں، سردار کولاتا، تو میرا یقین کیوں نہیں کرتا۔“
”چل کھتا ہو گا تو چ..... اب میں کیا کروں۔ تو وقت پر نہیں پہنچا۔ لذدا وہ ہو گیا جو ہونا چاہ
تا۔“

”تونے مجھے کہیں کانہ چھوڑا، بالکل جاہ کر دیا۔“
”تو جانتا ہے کہ کالا چانغ ہمارا کس قدر اہم آدمی ہے۔ تو نے اسے کیا سوچ کر قید کیا۔“
”بیں، سردار مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دے۔“ راکل عاجزی سے بولا۔

”معافی۔“ سردار کولاتا نے ایک زور دار تقمیہ لگایا۔ ”بیں، تجھے ایک صورت میں معافی لے
ہے۔“

”وہ کیا؟“
”تجھے بقال سے نہ سوت بردار ہونا پڑے گا۔“

”کیا تجھے وہ پسند آگئی ہے۔ کیا تو اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟۔“
راکل کی بات سن کر سردار کولاتا نے ایک زور دار تقمیہ لگایا اور پھر بولا۔ ”احمق۔“

راکل نے اسے نہ سمجھیں آنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”حکم کر سردار کولانا۔“ راکل کا بھی تک سر جھکا تھا۔

”شادی میں شرکت کے بعد تجھے اس انسان کے بچے کو صحت یاب کرنا ہو گا، اس کے بعد اسے اس کی بیانیں چھوڑ کر آنا ہو گا۔“

”مجھے منظور ہے سردار کولانا۔“

”یہ مت بھنا کہ تو اس طرح راہ فرار اختیار کر جائے گا۔ تجھے اپنی روح کو گروئی رکھ کر جانا ہو گا۔ ب تو میرے حکم پر عملدر آمد کر کے واپس آجائے گا تو پھر سوچا جائے گا کہ تجھے معاف کر دیا جائے یا نہ۔“

”تجھے یہ بھی منظور ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔ سردار کولانا کے خادموں، راکل کو ساتھ عزت کے لے جاؤ۔ اسے بڑے مہمان کا رہبود۔“

سردار کولانا کے چھ خادم آگے بڑھے اور راکل کو احترام کے ساتھ مہمان خانے کی طرف لے گئے۔

راکل کے جانے کے بعد دربار میں حاضر خادموں کو سردار کولانا نے جانے کا اشارہ کیا۔ جب دربار قابل ہو گیا اور سردار کولانا تھمارہ گیا تو اس نے تین بار تالی بھائی۔

تالی کی آواز سن کر وہ ستون کی آڑ سے نکلا اور مسکراتا ہوا سردار کولانا کے سامنے آکھڑا ہوا۔ سردار لالانا نے اپنے قریب ہی منڈپ بھایا۔ ساتھ بیٹھنے کا اعزاز صرف اسی کو حاصل تھا۔ وہ سردار کولانا کا

ہل غلام کا دست راست تھا۔ اس کا ”ایاڑ“ تھا۔ وہ کالا چراغ تھا۔

”کالے چراغ تجھے بیان کے مبارک ہو، آج کی رات وہ تیری ہو جائے گی۔“ سردار کولانا نے مسکرا کر

”میں تیر غلام۔ تیرا شکر گزار ہوں۔“ کالے چراغ نے بہت مودبانہ لمحہ میں کما۔

”ایک بات بتا، میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔“

”مگر راڑ کو میں خود اس کی دنیا میں چھوڑ کر آنا چاہتا ہوں۔“ کالے چراغ نے خواہش ظاہر

”تیرا کیا خیال ہے کہ اس کی روح گروئی ہونے کے باوجود وہ میرے ساتھ دھوکا کرے گا۔“

”اس نے محض کی بن کو چاہ وفات میں پھکوا دیا ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہو گی کہ وہ اسے واقعی

نکاری ناک چھوڑ آئے گا۔ اگر اس نے راستے میں ہاتھ دکھادیا تو پھر کیا ہو گا۔“

”اہا، یہ بات بھی تو ٹھیک کرتا ہے۔ اس خبیث کا کوئی بھروسہ نہیں۔..... یوں بھی اس عیار کا زندہ

نہیں۔ پھر تیرا کیا خیال ہے رستے کر دیا جائے۔“ سردار کولانا نے خیال ظاہر کیا۔

”اہا، میں مناسب ہے۔“ کالے چراغ نے فوراً تائید کی۔ ”اگر یہ زندہ رہا تو بیان کو برکاتا رہے

دے کر کری پر بھایا۔ اس کے کری پر بیٹھنے کے بعد بیان نے بھی نشست سنبھال لی۔ لیکن اس چہرے پر پرشانی برقرار رہی۔

”ہم نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ تمہی غیر موجودگی میں، تیرے بھائی کو اپنا فیصلہ سنایا تو اس نے کہا اس فیصلے کو نہیں مانے گی۔ اسی لئے تجھے طلب کیا گیا ہے کہ تجھے فیصلہ سنایا جائے۔“ سردار کولانا بتایا۔

”اپنا فیصلہ سن۔“ بیان نے کہا۔

”راکل تو بتا۔“ سردار کولانا نے راکل کی طرف دیکھا۔

”سردار کولانا، تمہی شادی کا لے چراغ سے کرنا چاہتا ہے۔“ راکل نے بتایا۔

راکل زبان سے سردار کولانا کا فیصلہ سن کر بیان کے ہوش آز گئے۔ وہ فراغتے میں بولی۔ ”ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

”یہی بات ابھی تیرے بھائی نے بھی کی تھی۔ اب تم دو فوں سیری بات کان کھول کر من لو۔ سردار کولانا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”میرا فیصلہ سوچ کی طرح اٹھ ہے۔ جس طرح سوچ کیہ مشرق سے لکھا ہوتا ہے وہی سردار کولانا کی زبان سے لکھے ہوئے ہر لفظ پر عملدر آمد ہونا ہوتا ہے۔ رات بارہ بجے، دیواہ کالی کے ساتھان تسلی تجھے اور کالے چراغ کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جا گا۔“ اتنا کہہ کر سردار پھر اپنی خادموں سے مخاطب ہوا۔ ”سردار کولانا کی خادموں بیان کو اپنے ماں کے جاؤ اور شادی کی تیاریاں کرو۔“

سردار کولانا کے دربار میں اس وقت جتنی خادموں میں حاضر تھیں۔ سب کی سب بیان کو لے کر انداز گئیں۔ بیان پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا راہ عمل ادا کرے۔

بیان کے جانے کے بعد سردار کولانا، راکل سے مخاطب ہوا۔ ”اب تو بول، تیرا کیا کیا جائے؟“

”یہ تو اچھا نہیں کر رہا۔“

”وہ انسان کی بچی کمال ہے جسے تمہی بن نے تمہی خدمت میں پیش کیا تھا۔“ سردار کولانا پوچھا۔

”اسے میں نے چاہ وفات میں پھکوا دیا۔“ راکل نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”تمہی بن نے اس کے بھائی پر قبضہ کر لیا اور تو نے اس غریب کوموت سے ہمکنار کر دیا۔ بھائی مجھ سے کتنا ہے کہ میں اچھا نہیں کر رہا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو اور تمہی بن نے اب تک جو کیا اچھا کیا ہے۔“ سردار کولانا نے طنز پوچھا۔

راکل اس بات کا کیا جواب دیتا۔ اس کے پاس کلی جواب نہ تھا۔ اس نے اپنا سر جھکایا۔

”اب تجھے ایک کام کرنا ہو گا۔“ سردار کولانا بولتا۔

گا۔ میری جان کا دشمن تو پسلے ہی تھا، اب تو بھی اس کی فرست میں آگیا ہے۔ معافی کی صورت میں ہے۔ عرصے کے بعد پھر سراخنے گا۔ اس نے بتیری ہے کہ اس ناگ کے پھن اٹھانے سے پسلے ہی اس پر کچل دیا جائے گا۔ ”

”ایسا ہی ہو گا۔“ سار کولانا نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن تو جانتا ہے کہ اسے رفت کرنے کے دیواہ کالی سے اجازت لینا ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ اجازت آسانی مل جائے گی کیونکہ اس کے جرام کی فرست خاص ہے۔“

”سار کولانا نے اجازت نامہ لے آؤں گا۔ تو جب میں درباکے ساتھ جشن منا۔“

”سار کولانا۔ تیرا غلام سب جانتا ہے، وہ فرار نہیں ہوئی، کاش! وہ فرار ہو جاتی۔“

”پھر کیا ہوا؟“ سار کولانا نے پوچھا۔

”وقت ہو گی۔“ کا لے چراغ نے دردناک خبر سنائی۔

”دیواہ کالی کی قسم یہ اس نے کیا بے وقوفی کی۔“ سار کولانا پریشان ہو گیا۔

”اسے میری صورت سے بھی نفرت تھی، وہ بھلا مجھ سے شادی کیوں کر لیتی، یہ میری بھول۔“

”آمیرے ساتھ۔ مجھے دکھا، کہاں ہے وہ؟“

کالا چراغ، سار کولانا کو لے کر اس کمرے میں پہنچا جہاں بقاں بھائیوں پڑی تھی۔

بھائیوں کا عروسی ہوڑا مسرا کے ایک جانب پڑا تھا اور درمیان میں گمراہ سرخ رنگ کا سیال تھا۔ یہ لہاکل پارے کی طرح کا تھا۔ اگر اس سیال کو تمھیں میں بھریں تو تمھیں میں پکھنہ رہے اور ہاتھ بھی اپنے ہو بیقاں نے اپنی جان، اپنے ہاتھوں لے لی تھی۔ اس نے کا لے چراغ سے شادی سے بچنے کے خود کوئی کری تھی۔

کالا چراغ بے حد داداں تھا۔ اگر اسے یہ معلوم ہو ماکہ وہ اس قدر نفرت کرتی ہے کہ رفت ہونے کا

بے تو جمل لے گی لیکن اس سے شادی نہیں کرے گی تو وہ شادی کی پیش کو واپس لے لیتا، کم از کم

”دشمن کی صورت میں وہ اس کی محل تو دیکھ سکتا تھا۔“

اب تو سارا کھیل ہی ختم ہو گیا تھا۔

ہر چال رسم کے مطابق چاندی کی ایک گاگر منجھی گئی۔ کا لے چراغ نے اس سیال مادے کو گاگر میں

ڈالا۔ اس کے مشن پر کپڑا باندھا۔ اور اس گاگر کو اپنے کندھے پر اٹھا کر سار کولانا کے محل سے باہر لکا

دیواہ کالی کے سامبان کی طرف بڑھا۔

دیواہ کالی کے سامبان میں پہنچ کر کا لے چراغ نے گاگر حوض کی دیوار پر رکھ دی۔ اور پھر اس جلتے

گا۔ میری جان کا دشمن تو پسلے ہی تھا، اب تو بھی اس کی فرست میں آگیا ہے۔ معافی کی صورت میں ہے۔ عرصے کے بعد پھر سراخنے گا۔ اس نے بتیری ہے کہ اس ناگ کے پھن اٹھانے سے پسلے ہی اس پر کچل دیا جائے گا۔“

”ایسا ہی ہو گا۔“ سار کولانا نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن تو جانتا ہے کہ اسے رفت کرنے کے دیواہ کالی سے اجازت لینا ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ یہ اجازت آسانی مل جائے گی کیونکہ اس کے جرام کی فرست خاص ہے۔“

”یہ اب تو بے فکر ہو جا، میں دیواہ کالی کے دربار جا کر اجازت نامہ لے آؤں گا۔ تو جب میں درباکے ساتھ جشن منا۔“

”میں تیرا غلام..... تیرا شکر گزار ہوں۔“ کا لے چراغ نے مودبانہ لمحے میں کہا۔ ”آپکو آرام کر لیں۔“

کالا چراغ جب سوکر اٹھا تو سورج ڈھل رہا تھا۔ سائے پھیل رہے تھے۔ دیواہ کالی کے سامبان وا

میدان میں لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دیواہ کالی کا سامبان بھی جب چیز تھا۔ چار ستون کفر تھے۔ ان ستونوں پر نہ کوئی چھٹت تھی اور نہ سامبان نام کی کوئی چیز۔ چاروں ستونوں کے درمیان ا

چھوٹا سا حوض تھا، اس حوض میں پانی نہ تھا۔ اگل بھری ہوئی تھی۔ اس حوض کی آگ آج تک ز تھی۔ بس اسی مقام کا نام دیواہ کالی کا سامبان تھا۔

اندھیرا چھٹتے ہی اس حوض کی آگ سے بے شمار مشعلیں روشن کی گئیں۔ اور انہیں میدان میں جگہ گاڑا دیا گیا۔ اس طرح شادی کی تقریب کا آغاز ہوا۔

جب اندھیرا خوب گرا ہو گی تو رقص زنجیری شروع ہوا صرف لوہے کی زنجیریں پہنیں تھیں اور تو یہم عورتیں میدان میں اتریں اور انہوں نے زنجیروں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا کہ رقص زنجیری کا آغاز ایک خاص انداز میں اٹھتے تھم، زنجیروں کی جھکار اور تھوڑا خوبصورت عورتوں کے مچکتے بدن، اور الوں کو مسحور کئے دے رہے تھے۔

جب ایک گروپ رقص کرتے ہوئے تھک جاتا تو اس کی جگہ بیا گروپ لے لیتا۔ چودہوں کا جب پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان کی پیشانی پر جھومن بن کر جگہ گانے لگا اور بارہ کامل قریب آتی تو سار کولانا نے ایک مشعل اٹھا کر دو لہادر میں کو دیواہ کالی کے سامبان میں لانے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر کے بعد جب سار کولانا کی نظر دیواہ کالی کے سامبان کی طرف اٹھی تو وہ یہ دیکھ کر پریشان کہ وہاں صرف کالا چراغ تھا۔ یہ بڑی بد شکونی کی بات تھی۔ دیواہ کالی کے سامبان میں دو لہادر میں اساتھ جا کر کھڑے ہوتے تھے۔ یہ آخر بقاں کہا گئی۔

سار کولانا اپنی نشست سے اٹھا تو اسے اٹھتا دیکھ کر رقص کرنے والی عورتیں ٹھہر گئیں، پھر ہم

کالے چراغ کے تصرف میں آگیا تھا، وہ دوسرے گھر سوار کے ساتھ بیٹھ گیا اور یوں واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

سورج روشن ہونے تک وہ اپنے علاقے میں بیٹھ گئے۔ تب ہی انہیں سامنے سے ایک گھر سوار بہت نیزی سے گھوڑا دوڑتا ہوا نظر آیا۔ جب وہ قریب آیا تو کالے چراغ نے دیکھا کہ وہ سردار کولانا کا محافظ نام ہوا اور اس کے چہرے پر ہوانیاں اڑی ہوئی تھیں۔
”کیا ہوا؟“

”کالا چراغ جلدی چل، تجھے سردار نے طلب کیا ہے، وہ کافی دیر سے تمرا منتظر ہے۔“ وہ ہر کارہ بولا۔

”کیا تجھے اس انتظار کی وجہ معلوم ہے؟“ کالے چراغ نے پوچھا۔
”وہی خبیث۔“ ہر کارے نے جواب دیا۔

”کیا اکل نے کوئی گھر بڑی ہے۔“ کالے چراغ نے اس کا اشارہ بھجتے ہوئے تصدیق چاہی۔
”اس خبیث نے سردار پر حملہ کیا اور نکل گیا۔“ ہر کارے نے بتایا۔

”سردار زخمی تو نہیں ہوا؟“
”ہاتھ زخمی ہوئے ہیں، آنکھیں نیچے گئیں۔“ ہر کارہ فکر مند لبجے میں بولا۔

”اوه۔“ کالا چراغ پلے کیا کام افسر وہ تھا، اس اطلاع نے اسے زمیدان فرداہ کر دیا۔ اس نے اپنے لہوڑے کو ایک لگائی اور ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا سردار کولانا کے محل پر بیٹھ گیا۔
تجھوڑہ گھوڑے سے کوڈ کر تقریباً دوڑتا ہوا سردار کولانا کے نشست گاہ تک پہنچا۔
کالے چراغ کو اندر آتے دیکھ کر سردار کولانا نے ہاتھ کے اشارے سے خادموں اور خادموں کو لے سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک اپنی کرسی پر بیٹھا تھا اور کالے چراغ کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”پریشان مت ہو، میں ٹھیک ہوں۔“

”بالآخر وہ اپنی خانش و کھانے سے باز نہیں آیا۔ آخر یہ سب ہوا کیسے؟“ کالے چراغ نے فکر مند لبجے میں بیٹھا۔

”تمہرے جانے کے بعد جب میں نے بھائی کے رہنے کی اطلاع اس تک بھیجی تو وہ کمرے میں مل چا۔ اس کے کمرے سے غائب ہونے کی اطلاع پر میں پریشان ہو گیا۔ میں یہ دیکھنے کے لئے معاملہ کیا ہے۔ اپنے کمرے سے نکل کر باہر آیا تو وہ میری ہاٹ میں تھا۔ بس وہ اپنکی ہی مجھ پر حملہ آرہا۔ اس نکلے آرہا تو وہ اپنی نظر اس پر پڑ گئی اور میرے ہاتھ آنکھوں پر چلے گئے۔ میری آنکھیں نکلیں گے۔“

ہوئے حوض کے سات پنکھہ کا تھا۔ سات پنکھہ پورے کرنے کے بعد اس نے حوض کی دیوار سے ٹکڑا اٹھائی اور اسے ایک مرتبہ پھر اپنے کندھے پر لاد کر چاند کے رخ پل چڑا۔
اس کے پیچے چار گھر سوار چل رہے تھے جو ضروری سامان سے لیس تھے۔

کالا چراغ، بھائی کے جسد سیال کو لادے اس وقت تک چلتا رہا جب تک چاند ہندلانے نہیں لگا۔
جب چاندنی پہنچی پڑنے لگی تو وہ ایک رہت کے ٹیلے کے نزدیک بیٹھ کر رک گیا۔
اس کو رکتا دیکھ کر وہ چاروں گھر سوار فرواؤ اس کے نزدیک بیٹھ کر گھوڑوں سے اتر گئے۔ کالا چراغ ایک جگہ منتخب کر کے گاگر اپنے کندھے سے اتار کر کچکا تھا۔

ان چاروں گھر سواروں نے رہت میں لوہے کی لمبی میخیں گائیں۔ ان میخوں میں اپنے سماں والی زنجیریں باندھیں اور پھر ان چاروں زنجیروں کے سرے، میخوں کے درمیان رکھی ہوئی گاگر کی گردان میں کس دیئے۔ پھر وہ چاروں پیچے ہٹ گئے۔ اور ایک قطار میں سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔
کالے چراغ نے گھنون کے مل بیٹھ کر اپنی مٹھی میں رہت بھری اور وہ رہت اپنے سرمند ڈال لی۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر کے کہا۔ ”لاو۔“

ان میں سے ایک گھر سوار آگے بڑھا اور ایک بیٹھ کا لے چراغ کے ہاتھ میں تھا دیا۔ کالا چراغ بیٹھ ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے وہ بیٹھ زور سے گاگر پر مارا۔ اور سات قدم پیچے ہٹ کر کہا ہو گیا۔

”بھائی تو نے جس سے محبت کی، وہ تجھے نفرت کرتا رہا اور جس نے تجھے سے محبت کی، اس سے نفرت کرتی رہی۔ اور یہی نفرت تجھے آسمانوں میں لے گئی۔ تجھے کیا ملا۔ یہ اب تو اچھی طرح جان گئی ہو گی۔ کاش! تجھے زندگی گزارنے سے پسلے عقل آگئی ہوتی۔ تجھے کسی محبت کی بچپان ہو گئی ہوئی۔ میں نہ سے آج یہی محبت کرتا ہوں اور زندگی بھرا سی طرح کرتا ہوں گا۔ تو میرے دل میں، میری آنکھیں میں میرے خیالوں میں ہیئت زندہ رہے گی۔ چاند سورج کے ماں کے میں تیری مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔“

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے دو آنسو پکے اور رہت میں جذب ہو گئے۔
پھر وہ آگے بڑھا اس نے گاگر کے نزدیک بیٹھ کر بیٹھے سے گاگر پر رہت ڈالی۔ سات بار رہت ڈال کے بعد اور پھر اس گھر سوار کے ہاتھ میں دے دیا جس سے لیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک ملن سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ چاروں گھر سوار آگے بڑھے۔ ان چاروں کے ہاتھ میں بیٹھ تھے۔ وہ بیٹھ میں رہت بھر جکڑا گاگر پر ڈالنے لگے۔ تھوڑی دیر میں زنجیریں رہت میں دب گئیں اور رہت گاگر کی گردان میں لگی۔

تدین کھل ہو چکی تھی۔
ایک گھر سوار نے اپنا گھوڑا کالے چراغ کو پیش کیا۔ وہ اس پر سوار ہو گیا اور پھر وہ گھر سوار جس کا

بہر نکل کر اس نے سامنے وور تک نظر دڑائی۔ کچھ نہ تھا بس ریت کے گولے رقصان تھے۔ وہ یوں ی مٹلا ہوا، جھونپڑی کے پیچے چلا گیا۔
مجن راؤ کے جھونپڑی کے پیچے جاتے ہیں، وہ اُتو یچے اڑا اور جھٹ سے دروازے میں داخل ہو گیا۔
مجن راؤ جھونپڑی کا چکر کاٹ کر واپس آیا۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔
جب وہ جھونپڑی کے دروازے میں داخل ہو کر سیدھا کھڑا ہوا تو راکل کو اپنے سامنے دکھ کر جرت زدہ گیا۔ وہ بڑی طرح ہانپ رہا تھا جیسے کہیں بہت دور سے ووڑتا ہوا آیا ہو۔

”راکل تو۔“ مجن راؤ نے جی ان ہو کر کہا۔ ”تو اس وقت کہاں غائب ہو گیا تھا۔“

”غائب ہونا اور حاضر ہو جانا، ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں اب تجھ سے آخری ملاقات کرنے آیا ہوں۔“

”کیوں آخر؟“ مجن راؤ نے کہا۔

”مجن، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ کسی بھی وقت میرا بلاوا آسکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سردار کو لانا تک ویواہ کالی کے دربار میں پہنچ چکا ہو گا۔ میں نے جو کیا ہے۔ اس کی سزا ہر حال مجھے پہنچتا ہو گی۔ مجھے ہر قیمت پر رقت ہونا ہو گا۔“
”میں نہیں جانتا، تو کیا کہہ رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں، جو کہہ رہا ہوں تو میں سنتا جاں۔“ راکل نے گرے گرے سانس لیتے ہوئے کہا۔
”تو اس دن پوچھا تھا کہ تمی بسن تانیہ کہاں ہے۔ جواب میں، میں نے تجھے گول مول سا جواب دے دیا تھا کہ وہ گم ہو گئی ہے۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے تو نے یہی کہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں مزید بحث کرتا تو غائب ہو گیا تھا۔“

”مجن ایک بات بتا، بقاں تیرے لئے کیا ہے؟“

”بقاں، میرے لئے آگ ہے جو مجھے جلاتی ہے۔ وہ دو دھاری توار ہے جو میرے وجود کو لومان کر لیتی ہے۔ وہ بور کا لڈو ہے جسے ٹھنبا بھی مشکل اور اگلنا بھی مشکل۔“
”مجن، تمی آگ، اپنی ہی آگ میں جل مری، تمی دو دھاری توار خود کو لومان کر بیٹھی، تیرا اور بلڈ سارا کا سارا انگل گئی۔“ راکل نے عجیب انداز اختیار کیا۔

”میں نہیں جانتا کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔“

”نہیں جانتا تو جان لے کہ تمی بھائی رقت ہو گئی، اس نے خود کشی کر لی۔“

”خود کشی کر لی بقاں نے۔ ارے۔ یہ کیا ہو گیا۔“ اس کی عجیب حالت ہو گئی۔ اسے اپنی سماعت پر ثقین نہ آیا۔ دوسروں کو مارنے والی کیا خود کو بھی مار سکتی ہے۔ اور، یہ کیسی خبر ہے۔ اس کی سمجھی میں نہ آکر وہ خوش ہو یا رنجیدہ ہو جائے۔ اس کا ذہن ایک وم خالی ہو گیا۔ ول ہر جذبے سے عاری ہو گیا۔ وہ غال خالی لگا ہوں سے راکل کو دیکھنے لگا۔

”پہلے اسے سترے کھنڈر میں نہ ملاش کر لیں۔“ کالاچڑا غصیلے لمحے میں بولا۔

”اول تو وہ وہاں جائے گا نہیں، اگر گیا بھی تو اس کا با تھہ آنا مشکل ہو گا۔“ سردار کو لانا نے کہ سوچتے ہوئے کہا۔
”کیا پتہ ہاتھ آئی جائے۔“ ہمیں وہاں جا کر دیکھنا چاہئے۔ ہاتھ اگر نہ بھی آیا تو کم از کم اس کے بارے میں یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ وہ دیس ہے۔ دیواہ کالی کو بتانے میں آسانی رہے گی۔“ کالاچڑا بولا۔

”تو نے دیواہ کالی کو کیا سمجھا ہے؟“ سردار کو لانا غصیلے لمحے میں بولا۔

”میں تیرا غلام۔ میرا یہ مقدمہ تھا۔“ کالاچڑا نے فواؤ سرجھ کالیا۔

”اب تو ان باتوں کو چھوڑ دیواہ کالی کے دربار میں چلنے کی تیاری کر۔“ سردار کو لانا نے حکم دیا۔

”آج ہی جانا ہے۔“ کالاچڑا غصیلے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ جواب ملا۔

”تیرے ہاتھ رخی ہیں۔“ تشویش بھرے لمحے میں کما گیا۔

”اس سے کیا ذرق پڑتا ہے۔“ سردار کو لانا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”یہ رخی ہاتھ گولی کے کام ائم گے۔“

”تو نہیک کرتا ہے۔ میں بھر جانے کے لئے سواری کا انتظام کروتا ہوں۔“ یہ کہہ کر کالاچڑا

نشست گاہ سے باہر نکل گیا۔

تمہاری دیر بعد وہ تیر فتار اونٹیوں پر سوار دیواہ کالی کے آتش کدے کی طرف اڑئے چلے جا رہے تھے۔

اڑا تو وہ بھی چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ لکن سترے کھنڈر کی طرف نہ تھا۔

وہ اس صرار کی طرف جا رہا تھا جہاں مجن راؤ کی جھونپڑی تھی۔

اوھر کالاچڑا غلام اور سردار کو لانا دیواہ کالی کے دربار میں پہنچنے تو اوھر راکل مجن راؤ کی جھونپڑی کی چھت پر آبیٹھا۔

مجن راؤ اپنی جھونپڑی میں محو خواب تھا۔ اس کے پاس کام ہی کیا تھا، کھانا اور سوچانا۔ اس وقت تھے

وہ کھانا کھا کر سویا تھا۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھاری پرندہ اس کے سینے پر آبیٹھا۔

ہبڑا کر انہر گیا۔

اس نے جھونپڑی میں چاروں طرف دیکھا۔ کہیں کوئی پرندہ نہ تھا۔ شاید وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ انہر کر

کھڑا ہو گیا اور اپنی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ جب سے اس کے محافظ مرے تھے تب سے مجن راؤ کی جھنکے میں کوئی وقت نہ تھی۔ یہ آزادی ملے ابھی ہوئے ہی کتنے دن تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ذرا اس کی سعی جمال ہو جائے تو وہ پھریساں سے جانے کے بارے میں سوچے۔

”اے ادھر لے آ۔“ ایک پر بیت آواز آئی۔

اس شعلے میں ایک شبیہ لہرائی تھی اور یہ آواز بھی دیوں سے آئی تھی۔ یہ دیواہ کالی کا دربار تھا۔ ایک بہت بڑا ہاں جس میں بے شمار ستون تھے۔ ہر ستون کے ساتھ ایک داسی کھڑی ہوئی تھی۔ سامنے ایک بہت بڑا شیخ تھا۔ اس اشیج پر ایک بارہ فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی ایک شمع نصب تھی۔ یہ شمع ساری کی ساری سوئے کی بنی ہوئی تھی۔ یہ شمع روشن تھی۔ اس شمع کی لو بھی خاصی بڑی تھی۔ اسی شعلے میں شبیہ دکھلائی دیتی تھی اور اس شعلے سے پر بیت آواز آئی تھی۔
”یہ دیواہ کالی تھا۔“

سردار کولانا اور کالا چراغ سنگ مرمر کے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ یہ پورا ہاں، اس کی پیاریں، اس کے تمام ستون سنگ مرمر کے بنے تھے۔ اس دربار کا اپنا ایک حسن تھا جسے دیکھ کر آدمی سور سا ہو جاتا تھا۔

دیواہ کالی کا حکم سن کر، وہ دراز قد شخض آگے بڑھا اور اس نے کالی چادر سے ڈھکی چیز کو ایک چھوٹے سے سنگ مرمر کے چوتھے پر رکھ دیا۔

”چادر ہٹا۔ سب کو اس کا چھوڑ دیکھا۔“ شمع کی لو میں پھر حرکت ہوئی۔ وہ ذرا سالہ رائی۔ اس میں ایک شبیہ دکھلائی دی اور ساتھ ہی پر بیت آواز آئی۔

دیواہ کالی کے حکم کی تعیل میں اس دراز قد غلام نے اس شے سے ایک دم چادر ہٹادی۔ وہ ایک چھبڑے خالاں بچھرے میں ایک آٹو بندھا، اس دراز قد شخض نے کالی چادر اپنے سر پر صاف کی طرح باندھی اور اٹکے قدموں واپس ہو گیا۔ اب ہاں میں سردار کولانا، کالا چراغ اور داسیوں کے سوا کوئی نہ رہا۔ سردار کولانا اور کالا چراغ کی نظریں شمع کی لوپر تھیں۔ بچھرے میں بند آٹو ایک ٹانگ پر ساکت کھڑا تھا۔

”رائل کیا تو چاہتا ہے کہ تو نے اور تیری بن بقال نے کیا ہنگامے کھڑے کر رکھے ہیں۔“ دیواہ کالی کی پر بیت آواز سنائی دی، ساتھ ہی شمع کی لو میں شبیہ لہرائی۔ ”خیر بس ان بقال نے کیا ڈاکر۔ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی گنوایتھی ہے۔ اس نے اپنے کئے کئے خود ہی سزا پالی۔“ مگر اب تو چہا، تیرے جراہم کی فرست بھی کچھ کم نہیں۔ تیرے ساتھ کیا کیا جائے۔ تو ان دونوں کو تو دیکھی ہی رہا ہے۔ یہ دونوں تمہرے بارے میں مجھے بہت کچھ بتاچکے ہیں، ان کے بیان کردہ جراہم کی روشنی میں اب تجھے سزا بھگتا ہے۔ کیا اس کے لئے تیار ہے۔ تیار اگر نہیں بھی ہو گات بھی کوئی بات نہیں۔ میں تیری عدم موجودگی میں بھی اپنا فیصلہ صادر کر چکا ہوں۔ اب تجھے رفتق ہونا ہو گا۔“

”دیواہ کالی تیری قسم۔“ میں نے جو کچھ کیا ہے، اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے تیرے بارے میں تاؤں کو توڑا ہے۔ میرے جراہم کی فرست خاصی طویل ہے۔ مجھے ہر صورت رفتق ہونا ہو گا۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے بچھرے میں پر پھر پھر لائے۔

”تو خود رفتق ہونا پسند کرے گا یا تجھے رفتق کیا جائے۔“ دیواہ کالی کی آواز گوئی۔

”ہاں، محسن..... میری بقال مر گئی، تیری بقال مر گئی۔ رائل پر رقت طاری تھی۔“

”اوہ..... یہ بہت برا ہوا یا شاید بہت اچھا ہوا۔“ ”محسن راؤ نے کھوئے ہوئے لجے میں کمار۔“

”یہ بہت برا ہوا ہے محسن..... اور یہ سب اس چنگاڈڑ کے پچھے کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”کون چنگاڈڑ کا پچھے۔؟ میں سمجھا نہیں۔“

”وہی کالا چراغ..... میری بقال کی، کالے چراغ کے ساتھ زبردستی شادی کی جاری تھی۔“

برداشت نہ کر سکی۔ اس نے رفتق ہونا منظور کر لیا لیکن اس کی ہوتا منثور نہ کیا۔ محسن اصل میں وہ تیری تھی۔ تیرے سوال سے کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔ وہ بڑی محنت سے ایک عمل کر رہی تھی، اس کے بعد تو بیٹھ کر لئے اس کا ہو جاتا۔ وہ تجھ پر مرتی تھی۔ بالآخر وہ تجھ پر قربان ہو گئی۔

محسن، اب تو آزاد ہے۔ جانپی دینا میں لوٹ جا۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھ سے اب کوئی سوال نہ کر۔ جا بہر تیرے لئے سواری موجود ہے۔ اس پر بیٹھ جا، یہ تجھے دھویں کی دیوار پار کر دے گی۔ دھویں کے اس پار تیری دینا ہے۔ ٹلنٹ

اٹھ، جلدی کر۔ دیواہ کالی کے دربار میں کارروائی شروع ہو گکی ہے۔ بس کسی پل مجھے موت کا پیغام دیا جانے والا ہے۔ جا محسن جاؤ۔ دیواہ کالی تیری حفاظت کرے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا میں نہ تیری

بہن تانیہ کو چاہ وفات میں پھکنوا دیا تھا۔ اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ میں اس کے سحر میں بتلا تھا۔ آہ بلاوا، آپنچا۔ میں اب جاتا ہوں۔ جاتا.....“ وہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

”پھر جو کچھ ہوا چشم زدن میں ہوا تھا۔ وہ ایک دم سمنا اور پھر پھر پھر آتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔“

محسن جلدی سے نکل کر باہر آیا۔ اس نے دور نکل آسان پر ویکھا لیکن کمیں کچھ نہ تھا۔

”جھنپڑی سے کچھ فاصلے پر ایک بھی سجائی اوپنی بیٹھی ہوئی جگہ میں مصروف تھی۔ اس کا مطلب تھا۔ وہ جو کہہ رہا تھا، کر گیا تھا۔“

محسن نے اب وقت خالع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی ضروری چیزیں سیپی اور اس اوپنی پر سوار ہو گیا۔ اوپنی اس کے بیٹھتے ہی اٹھی اور ہوا ہو گئی۔

محسن کی جھنپڑی سے نکلتے ہی ہوا تو خiroہ بھی ہو گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود نہ اڑا ہو، اسے کوئی اڑائے لئے جا رہا ہو۔

”اس کی سماعت سے مسلسل دیواہ کالی کی پر بیت آواز گمراہی تھی۔“

”رائل آؤ..... رائل آؤ۔“

اس آواز کو سنتے سنتے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اچانک اس کے بازو پکڑ کر اسے کسی چھوٹے دروازے میں دھکیل دیا ہو، اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندر چھا گیا۔ کالا بادل ما آیا۔

”دیواہ کالی، تیری قسم۔ رائل آگیا ہے۔“ ایک اوپنچہ تقد کا شخص دروازے سے اندر وا غل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز لگی تھی جو کالی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔

بزار آخری ستون جو دروازے کے نزدیک تھا پر گونجی توہ دروازہ کھلا اور وہ دراز قد غلام اندر واصل ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی گاگر تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک مشعل تھی۔ چاندی کی گاگر اس محمد آٹو کو ہٹا کر اس چھوٹے سے چوتھے پر رکھی گئی۔ پھر اس آٹو کو دونوں ٹالاموں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ داسی وہ مشعل لے کر سڑھیوں کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے بھی ہلی مشعل کو ہاتھ اوپنچا کر کے شمع کی لوئے جلایا اور تیزی سے دوڑتی ہوئی ان ٹالاموں کے نزدیک آئی۔

اس نے اس جلتی ہوئی مشعل کوas محمد آٹو کے نیچے رکھا۔ مشعل کا شعلہ اتنا تیز تھا کہ شعلے دھکاتے ہی وہ آٹو چکھنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے تھنگ ہو کر نیچے رکھی ہلی گاگر میں سما گیا۔ تب اس گاگر کے منہ پر ایک کالا کپڑا باندھ دیا گیا۔ ”اس خبیث کو لے جاؤ اور اس کی بہن بقاں کے نزدیک اسے زنجیر کرو۔“ دیواہ کالی نے سردار ٹالا اور کالے چانگ سے مخاطب ہو کر کہا۔

یہ حکم سن کر وہ دونوں اٹھے۔ کالے چانگ نے اس گاگر کو اپنے کندھے پر رکھ لیا اور وہ دونوں دیواہ کالی کے آٹھ کے سے باہر لکل آئے۔ ان کی اونٹیاں موجود تھیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی اونٹیوں پر سوار ہو گئے۔ گاگر کا لے چانگ نے اپنی گود میں رکھ کر ایک ہاتھ سے پکڑی اور پھر دونوں خوش خوش اپنے علاقے کی طرف پلی دیئے۔

خوش توں وقت محسن راؤ بھی تھا۔ اس کی اونٹی ہوا کے دوش پر اڑی جا رہی تھی۔ اور محسن اپنی دنیا میں بیخ جانے کے تصور سے خوشی سے پھولانیں سارہا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا کہ برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی اونٹی دوڑتے دوڑتے ایک دم رک گئی۔ ایسا محوس ہوا جسے کسی نے اچانک اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ محسن راؤ کو ایک زور وار جھکنا لگا۔ اور وہ اونٹی سے بیخ آرہا۔

اور جب وہ اپنے کپڑے جھاڑتا اٹھا تو اسے اپنے سامنے چار زنجیوں سے بندھی ایک گاگر و کھالی دی۔

یہ براجمن کن منظر تھا۔

لوہے کی چار مختین، ان سے بندھی موٹی زنجیر، درمیان میں رکھی گاگر اور ان چاروں زنجیوں سے بندھی ہیں، اس کی گردن۔ گاگر کے منہ پر لپٹا ہوا کالا کپڑا۔ اور چاروں طرف لق دق سحرا، اونچے نیچے سست کے نیلے۔ تیر چلتی ہوا۔

کالے چانگ نے اگرچہ اتنی ریت ڈالی تھی کہ زنجیوں ریت میں دب گئی تھیں اور گاگر کی محض گردن فلک آری تھی۔ لیکن اب اس پر سے کافی ریت ہٹ پچلی تھی، شاید صحرائی ہوا اس نے اس کی ریت اڑا دی۔

محسن راؤ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ اس گاگر کو زنجیوں سے کیوں باندھا گیا ہے اور اس کے

”خود تھنگ ہونا میرے بس کا نہیں۔“ راکل کی آواز مشکل سے نکل رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ دیواہ کالی نے کہا۔ ”تم دونوں میں سے کوئی یہ کام کرنے چاہے گا۔“

”نہیں دیواہ کالی۔“ سروار کولانا اور کالے چانگ نے بیک وقت انکار کیا۔ ”ٹھیک ہے، پھر میں بندوست کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر دیواہ کالی نے قریب کھڑی ایک داسی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اسے تھنگ کرنے کی تیاری کرو۔“

دیواہ کالی کا حکم سن کر وہ داسی آگے بڑھی۔ باوقار چال چلتی ہوئی پھرے کے نزدیک آئی۔ پھرے کی کھڑی کھول کر اس آٹو کو پکڑ لیا۔ اور سچھی کر باہر نکال لیا۔ اور پھر وہ اس کے پر پکڑ کر بوسے اطمینان سے چلتی ہوئی، دیواہ کالی کے سامنے آئی۔ اس نے جھک کر دیواہ کالی کو تعظیم دی۔ اور سڑھیاں چڑھنے کے نزدیک پہنچ گئی۔

”اس خبیث کو نیچے رکھ دے۔“ دیواہ کالی نے حکم دیا۔

داسی نے چٹ چٹ کر کہ راکل کے دونوں بازو توڑ دیئے۔ اور بسا سعی کے نیچے رکھ دیا۔ اور خود فوراً ہی پیچھے ہٹ گئی۔ شمع ذرا سی تھی ہوئی۔ ایک دم بہت سارا موم جیسا سیال اس آٹو پر گرا، وہ سیال دیکھتے ہی دیکھتے جم گیا اور اس نے سفید رنگ اختری کر لی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ آٹو برف کا بہا ہو۔

”اٹھا لے، اس خبیث کو۔“ دیواہ کالی کی آواز گونجی۔

داسی نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے اسے اٹھا لیا۔ اور سڑھیاں اتر کر سردار کولانا اور کالے چانگ کی طرف بڑھی اس نے باری باری ان دونوں کو یہ سفید آٹو دیکھنے کو دیا۔ ان دونوں نے اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی طرح نیکھا۔ اور پھر داسی کو واپس کر دیا۔ اس داسی نے پنجہ زمین پر رکھا اور اس سفید آٹو کے چھوٹے سے چبوترے پر رکھ دیا۔

”رقص۔“ دیواہ کالی نے حکم دیا۔

وہ داسی دیواہ کالی کا حکم سن کر تیزی سے دوڑتی ہوئی سڑھیوں کے نزدیک آئی اور پھر لرا کر محور تھنگ ہوئی۔ اس کے رقص شروع کرتے ہی تمام ستونوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھرمار اور دیواہ کالی کے سامنے آگئیں۔ وہ ساری کی ساری گھر سے سرخ لباسوں میں تھیں۔ ان کے مل کھلتے گورے بدلا تکاروں کی طرح چکنے لگے۔

سردار کولانا اور کالا چانگ کے لئے یہ نظارہ اتنا دلکش تھا کہ ان کی آنکھیں چلیں جپکتا جمل گئیں۔

پھر انہیں ہوش اس وقت آیا جب دیواہ کالی کی پرہیبت آواز گونجی۔ ”بل۔“

اس آواز کے ساتھ ہی ساری داسیاں جمال اور جس انداز میں تھیں، ٹھہر گئیں۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی اپنی بچگوں پر بیخ نگئیں اب وہ اکیلی داسی رہ گئی جس نے راکل کو پھرے سے سچھنگ کر نکالا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اوپنچ کر کے ایک مرتبہ تالی بھاتی گئی۔ پھرہر داسی ایک مرتبہ تالی بھاتی گئی۔ جب یہ تالی

انہیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ محسن پر ان کے کامنے کا کیا رد عمل ہو رہا ہے۔ وہ ہوش میں ہے یا پیش۔ ان کا کام کافی تھا، وہ کامل جاری تھیں۔ وہ اس کے پورے بدن پر چھاکی تھیں۔ اور جو مل کر رہی تھیں۔ وہ ایک طرح سے موت کے متراوف تھا۔ وہ کھیان اس کے آدمیے چرے کی طرح بین دیکھ زدہ کرنے پر لگی ہوئی تھیں۔ اور محسن راؤ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کا کیا حشر کرنے پر لگی تھیں۔

خڑو سردار کو لانا اور کاملے چاغ نے راکل کا دیکھا تھا۔ انہیں بست لطف آیا تھا۔ وہ دونوں ایک رذی کو مل کر بست خوش تھے۔ اور اب دیواہ کالی کی بدایت کے مطابق وہ اسے زنجیر کرنے کے لئے رہے تھے۔

دیواہ کالی کے آتش کدے سے نکل کر پہلے وہ اپنے علاقوں میں پہنچ گی۔ جہاں سے انہوں نے کلی گاگر کو زنجیر کرنے کا بندوبست کیا تھا۔ اور وہ دونوں انہیں پر سوار ہو کر بیٹال کی زنجیر کی ہوئی گاگر بنت جل پڑے تھے۔ کاملے چاغ نے کہا بھی تھا کہ وہ اکیلا اس گاگر کو زنجیر کر آئے گا۔ لیکن سردار انہیں باتا تھا وہ بھی ساختہ آگیا تھا۔

اور اب وہ بیٹال کی زنجیر کی ہوئی گاگر سے زیادہ درد نہ تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں جب یہاں لیا گئے تو یہاں کیا دیکھیں گے۔

راکل اصل میں جاتے جاتے ہاتھ دکھائیا تھا۔ وہ ایک خبیث فطرت مخون تھا، وہ آخر تک خبیث ہی۔ جگہ جگہ اس نے اپنی خباثت کے نقش شہت کئے تھے۔ اور مرنے سے پہلے وہ محسن راؤ کے تابوت، آخری کیل ٹھوپک گیا تھا۔ محسن راؤ کی ایسی صورت میں موت یقینی تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کھیاں اپنے کام پر لگی ہوئی تھیں۔ محسن راؤ ہنوز بے ہوش تھا۔ سردار کو لانا اور کالا چاغ اس طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ ان کی ریت اڑاتی جل دکھائی دینے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بیٹال کے "مقبرے" پر آپنے۔

اوپر پیٹھے بیٹھے سب سے پہلے کاملے چاغ کی نظر گاگر پر پڑی۔ اس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا نہ ارسے کیا ہوا۔ پھر اس کی نظر ایک انسانی جسم پر پڑی جو ایک زنجیر پر لٹکا ہوا تھا۔ اور سرخ رنگ کی نہال کے پورے بدن پر چھائی ہوئی تھیں۔

"شتم غلام..... سردار وہ دیکھے۔" کاملے چاغ نے تیزی سے اپنی انہیں کو بخاتے ہوئے۔

"لوجب سردار کو لانا نے اس طرف نظر کی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔" ارسے یہ کیا ہے؟

مگر یہ بھی جلدی جلدی اپنی انہیں کو بخاتے ہوئے۔ ان دونوں کی انہیں کو بیٹھتا دیکھ کر پیچھے آئے والے پانچوں گھڑ سوار، اپنے گھوڑوں سے اتر

منہ پر کپڑا کیوں لپینا گیا ہے۔ اس نے سوچا، ذرا آگے بڑھ کر دیکھے۔ کہیں اس گاگر میں کوئی تیرہ در خزانہ تو نہیں چھاپا، دوڑتی ہوئی انہیں کا اچانک یہاں رک جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ لگتا ہے قسم است اپنے میریان ہو گئی ہے۔ اور وہ کسی بڑے خزانے کا مالک بنانے پر لگی ہوئی ہے۔

اس نے دو قدم گاگر کی طرف بڑھائے۔ پھر ایسے انہیں کا خیال آیا۔ اس نے پیچھے بڑھ دیکھا، وہ سُم کر رہ گیا۔ انہیں کا دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ واپس پلٹ کر اس جگہ بچا جہاں انہیں کھڑی ہوئی تھی۔ دیاں سے آگے جانے کے پیروں کے نشان موجود نہ تھے۔ جدھر سے آئی تھی انہیں، اس طرف البتہ نشانات موجود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کو کسی نے کھڑے کھڑے انھا لیا ہو۔

انہیں کے غائب ہو جانے پر اسے شدید صدمہ ہوا۔ اب وہ اپنی دنیا میں کس طرح پہنچے گا۔ راکل نے کما تھا کہ یہ انہیں کی رویار پار کر اوسے گی۔ اس طرح وہ اپنی دنیا میں پہنچ جائے گا۔ اسی لئے وہ یہ سفر انہیں کی مریضی سے کر رہا تھا۔ اس نے اسے اپنی مریضی سے کسی طرف موڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جوں جوں وقت گز رہا تھا۔ وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی دنیا نہ دیکھ ہوئی جا رہی ہے۔ لیکن انہیں کے ایک جھکٹے سے رکنے اور اس کے بعد اس کے غائب ہو جانے نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھردا تھا۔

اب لق قصر حرام اور وہ تھا اور اڑتی ہوئی ریت تھی۔ پھر وہ وقت زیادہ دور نہ تھا جب موت پر پہنچ پڑتی ہوئی اس کے سر پر منڈلاری ہو گی۔ وہ باقی ملنا ہوا پھر واپس پلٹا۔ اب اس کے سامنے گاگر تھی، کاملے کپڑے سے بندھی اور زنجیروں میں جکڑی۔ اسے کھول کر دیکھنا چاہئے۔ آخر اس میں ہے کیا؟

وہ دھیرے دھیرے قدم جاتا ہوا، گاگر کے نزدیک پہنچ گیا۔ کاملے کپڑے کو اس طرح اس کے منہ پر باندھا گیا تھا کہ وہ اسے آسانی سے کھول سکتا تھا۔ تب وہ ریت پر گھنٹے بیک کر پہنچ گیا اور گاگر کے منہ بندھا کر پڑا کھونے لگا۔ کپڑا کھول لینے کے بعد جب اس نے گاگر کے منہ سے ہنایا اور یہ دیکھنے کے لئے آگے جھکا کہ اس میں

کپڑا کھول لینے کے بعد جب اس نے گاگر کے منہ سے ہنایا اور یہ دیکھنے کے لئے آگے جھکا کہ اس میں کس قسم کا خواہا ہے تو اسے ایک دم پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی۔

اس میں خزانہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس میں سے جو چیز برآمد ہوئی اس سے پہنچ کے لئے پیچھے ہنا ضروری تھا لیکن وہ تعداد میں اتنی تھیں کہ ان کی گرفت سے پچنا ممکن نہ تھا۔

وہ شدی کھیاں جیسی کوئی چیز تھی۔ اور وہ گاگر سے نکلی بھی شدی کی کمکی کے چھتے کی طرح نہ تھی۔ وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ گرے سرخ رنگ کی۔ اور سرخے پر ڈول و الی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ محسن راؤ کے چہرے پر چھاگکیں۔ اس قدر کہ اس کا چہرہ غائب ہو گیا۔ وہ اس کے چہرے پر اپنے تیز سویوں جیسے ڈنک مار رہی تھیں۔ کامنے کی شدید تکلیف سے اس پر نیم غشی طاہی ہوئی۔ اور پھر پچھے ہی دیر میں اس پر مکمل غشی طاری ہو گئی۔

دیکھ لے سردار، کیسی معاملہ تکین صورت اختیار نہ کر جائے۔
پھر انسان کی جان کیسے بچے گی؟

”سردار، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ انسان اب تک مر جکا ہو۔“
”اگر ایسا ہوتا تو یہ کھیاں اس کا کب کا پچھا چھوڑ جکی ہوتی۔“
”ہاں، یہ بات بھی تو نہیں کہتا ہے۔“

”میں اگر نہیں گی پھر پچھے آنے والے بھڑ سوار بھی ان کی لیبٹ میں آجائیں گے۔
میں تو پھر دیر نہ کر گاگر کو اس انسان کے نزدیک رکھ کر اس کامنہ کھول دے اور
مل کر فراہجاؤ آتا۔“ سردار کو لانا نہ ہدایت کی۔

”نہیں ہے سردار، میں تیرا غلام، ابھی تیرے حکم کی تعیل کرتا ہوں۔“ وہ سعادت مندی سے

بچا لے چاہنے ریت پر سے راکل کی گاگر انھائی اور محتاط انداز میں چلتا ہوا، زنجیر کے نزدیک پانچا
اگر ریت پر رکھی اور بیٹھ کر اس گاگر کے مندیر سے کالا کپڑا کھولنے لگا۔

پڑا کھول را ایک بھٹکے سے اس نے اپنی طرف کھینچا اور دوڑتا ہوا پچھے ہٹ آیا۔
درد سے کپڑا نہیں ہی ایک تیر بھینجا ہٹ کی آواز آئی اور کھیاں لکنا شروع ہو گئیں۔ ایک لمحے کو یہ
گاگر کے اوپر منڈلا میں اور پھر ان کالی کھیوں نے سرخ بدن اور سترے پروں والی کھیوں پر حملہ
کیا۔

لمساں کارن پڑا۔ سرخ کھیاں پٹ پٹ کر کے ریت پر گرنے لگیں۔ کالی کھیوں نے وہ جاہی چالی
پر دیکھتے رہ گئے۔

بے ساری لال کھیاں مر گئیں تو ان کالی کھیوں نے اس انسانی جسم پر حملہ کرنے کی خہانی۔ ابھی وہ
کے بدن کے اوپر جیسی سے چکر کاٹ رہی تھیں کہ پھر وہ بوند بوند ہو کر اس انسانی جسم پر گرنے لگیں
لی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ ساری کھیاں رقق ہو کر اس کے بدن پر گر
ہے اس انسان کا جسم سرخ رقق سے ڈھک گیا۔

نی طرح زبر کا علاج زبر سے کیا جاتا ہے اور لوہے کو لوہا کاٹتا ہے ویسے ہی اس وقت ان کھیوں نے
لما لاخا۔ ان کھیوں نے نہ صرف دوسري کھیوں کو مار دیا تھا بلکہ ان سرخ کھیوں کے کاشنے سے جو
ٹھنڈگی راؤ کو بوا تھا اس کا مدارک بھی ہو گیا۔

ان کھیاں سرخ رقق کی صورت میں اس کے بدن پر چھاگئی تھیں۔ اس سرخ سیال نے محض راؤ کے
انکوں پا چھایا۔ سرخ کھیوں کے کاشنے سے اس کے بدن میں جو آگ بھر گئی تھی، وہ اب تمثیلی
ہوئی تھی۔ اس کے ہوش و حواس بحال ہوتے جا رہے تھے۔

خود کے بعد اس کی غشی ختم ہو گئی۔ ہوش و حواس حکم طور پر بحال ہو گئے تو اس نے آنکھیں کھول
سکیں۔ کھلیں تو اس نے خود کو ایک موٹی زنجیر پر پڑا پایا۔

پڑے۔ ان پانچوں کے گھوڑوں پر راکل کو زنجیر کرنے کا سامان لدا ہوا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پھر
آگے بڑھے۔

کا لے چاہنے اوثی سے اتر کر راکل کی گاگر ریت پر رکھی اور تینی سے آگے بڑھا۔ بھر فراز
رک گیا۔ اسے ایک دم خطرے کا حساس ہوا، انسانی جسم سے چھٹی سترے پول اور گرے سرخ بندان
ہزاروں کھیاں اس نے دیکھ لی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ان کھیوں کو اڑانے کی کوشش کی گئی تو وہ ان دونوں
کو چھٹ جائیں گی پھر پچھے آنے والے بھڑ سوار بھی ان کی لیبٹ میں آ جائیں گے۔

آگے بڑھتے ہوئے سردار کو لانا کا ہاتھ پکڑ کر اس بنے سے آگے جانے سے منع کیا۔
”یہ کون ہے؟“ سردار کو لانا حرمت زدہ تھا۔ ”یہ کھیاں کماں سے آئیں اور یہ گاگر کیوں کھلیں ہیں
ہے۔“

”سردار، میں تیرا غلام..... میں تیرے قربان..... میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ یہ کھیاں کماں سے
آئیں۔ البتہ اندازہ ضرور کر سکتا ہوں کہ اس جنگس کے مارے انسان نے گاگر کامنہ کھول کر رکھا
اس مشکل میں پڑ گیا۔“

”یہا یہ کھیاں، اس گاگر سے نکلی ہیں، کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“ سردار کو لانا نے فرم دیجے
کہا۔

”الگتا تو یہی ہے۔“ کا لے چاہنے جواب دیا۔

”جاڑا جا کر دیکھ، گاگر کے اندر کچھ ہے بھی یا نہیں۔“

”اچھا تو یہیں ٹھر میں گھوم کر ادھر جاتا ہوں۔“

کالا چاہنے گاگر کی طرف بڑھا۔ وہ ان کھیوں سے پچتا، ذرا گھوم کر گاگر کے نزدیک پہنچا۔ اس نے
ڈرتے ڈرتے گاگر میں جھاٹک کر دیکھا۔ گاگر بالکل خالی تھی۔

کالا چاہنے احتیاط سے چلتا ہوا، سردار کو لانا کے پاس آگیا اور بولا۔ ”سردار، گاگر خالی ہے۔“
”اوہ، یہ تو بتتے رہا ہوا۔“ سردار کو لانا اس کی بات سن کر فراہم پچھے نہتا ہوا بولا، اس کے پرے
تشویش رقصان تھی۔

”میں تیرا غلام..... میں سمجھا نہیں۔“

”یہ کھیاں اس انسان کو ختم کر دیں گی، جو کرتا ہے جلدی کر۔“

”لیکاروں تو بتا۔“

”ان کھیوں کا کافڑ کھیاں ہی ہو سکتی ہیں۔“ سردار کو لانا نے پر خالی انداز میں کہا۔

”کھیاں؟“ کا لے چاہنے بے یقینی سے دہرا یا۔ ”لیکن دوسري کھیاں آئیں گی کہ
سے؟“

”راکل کی گاگر کامنہ کھول دے۔“

وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اٹھا تو وہ سرخ سیال کی کھال کی طرح اترتا ہوا ریت پر آرہا تھا۔ پھر وہ اپنے
جگہ اکٹھا ہو کر ریت میں جذب ہو گیا۔ وہ ریت میں جذب ہو کر پھیلائیں بلکہ اس طرح چنبہ ہوا کہ
کاشان تک نہ رہا۔ یہی حال کچھ ان کھیلوں کا ہوا۔ وہ سرخ بدلن اور سرسرے پر دل والی کھیلوں پر
پڑے سرخ بوندوں میں تبدیل ہو گئی۔ اور لڑک کر ایک دوسرے میں جذب ہو گئی۔
پھر یہ سیال ریت کے سینے میں اترتا چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ریت پر کسی قسم کاشان کھیلوں نہ رہا۔
طرح وہ دونوں بین جھائی اپنے بھاری وجوہ کے ساتھ زمین کی کوکھ میں اتر گئے۔
بالآخر بھائی اور راکل اپنے انجمام کو پنچے۔

محسن راؤ بڑی حیرت سے اس سرخ سیال کو ریت میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی کچھ میں نہ ہے!
اس کے پورے جسم پر یہ سرخ کھال سی کیا تھی۔ وہ تو بے شمار کھیلوں کے کاشنے سے بے ہوش ہوا تھا۔
ان کھیلوں کا دور تک پتہ نہیں تھا۔
پھر ایک بات اس نے اور محسوس کی تھی کہ اب اس کے جسم میں کسی قسم کی نقاہت نہ رہی تھی۔ وہ
کوچاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ اب اس نے گردن گھما کر اپنے چاروں طرف جائزہ لیا۔ تباہی
نگاہیں کا لے چراغ پر نھیر کیں۔

کالا چراغ تمہوڑے سے فاصلے پر کھڑا اسے جیرت بھری نظرؤں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر ایک
شخص کھڑا تھا جو اپنے رکھا سے سردار معلوم ہوتا تھا، وہ بھی اس پر آنکھیں جملے ایک نکدی پر
جارہ تھا۔ ان دونوں کے چیچھے پانچ محافظ قسم کے لوگ تھے۔ اور ان کے چیچھے دو اونٹیاں اور پانچ گھول
دھکائی دے رہے تھے جن پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔
محسن راؤ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تب کالا چراغ بڑے باوقار انداز میں چلتا اس کے نزدیک آیا۔ وہ
بھرے لبجے میں بولا۔ ”محسن تم؟“

”ہاں میں..... مجھے دیکھ کر آپ جیلان رہ گئے ہوں گے۔“
”محسن تم یہاں کیا؟ میرا مطلب ہے کہ تم یہاں کیے آئے۔ یہاں آس پاس تماری کوئی سلا
بھی نظر نہیں آرہی۔“

”سب بتاتا ہوں۔“ محسن راؤ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ کون ہیں؟“ اس نے سرا
کولانا کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ میرے آقائیں، سردار کولانا۔ آؤ میرے ساتھ تمہیں ان سے ملاؤں۔“ یہ کہ کر کالا چراغ
سردار کولانا کی طرف بڑھا۔ اور جب وہ دونوں نزدیک پنچے تو سردار کولانا نے پوچھا۔ ”تو ہاتا؟“
اسے۔“

”ہاں، بہت اچھی طرح..... یہ میرا رقبہ ہے۔“ کا لے چراغ نے ہنس کر کہا۔
”رقبہ۔“ ایک لمحے کو سردار کولانا کچھ نہ سمجھ سکا۔ پھر جب سمجھ میں آیا تو وہ بولا۔ ”کیا یہ؟“
”مدرس تاکر کا لے چراغ اور بھائی کی شادی کر دی جائے۔ شادی کی تیاری عروج پر تھی کہ خب آئی کہ بھائی
نہ ہو گئی۔ محسن وہ میری نہیں ہوتا چاہتی تھی۔ وہ تماری تھی تماری ہر رہی۔“ یہ کہ کر کا لے چراغ

بے دیکھتے ہی دیکھتے رست میں اس طرح گھس گیا ہے مل میں سانپ۔ "محسن راؤ نے کالے چراغ

بے چھا۔ "ہم یوں سمجھو کہ تمہاری زندگی تھی تو تم بخ گئے ورنہ راکل نے تمیں مارنے میں کوئی کسرہ چھوڑی تھی میں ان کھیلوں سے بچانے کے لئے مجھے راکل کی گاگار کامنہ کھولنا پڑا۔ اس گاگار سے نکلے والی بیان نے تمہارے بدن پر لپی کھیلوں پر حملہ کر دیا۔ ان کھیلوں کو مار کر خود سیال بن کر تمہارے بدن پیل گئی۔ یوں تمہارے بدن کی آگ جو بھات کی کھیلوں نے لگائی تھی، وہ کھیلوں نے بجھا دیں۔

بھات کی موٹ کے بعد راکل نے میرے سردار پر حملہ کیا اور وہ وہاں سے نکل بجا گا۔ تب میرے دیواہ کا لی کے دربار میں جانے کا فیصلہ کر لیا اور وہاں جا کر راکل کو اس کے انجام تک پہنچا۔ اور اب اس وقت ہم لوگ دیواہ کا لی کے حکم کے مطابق راکل کے جلد قرق کو بھات کے نزدیک زخم کرنے آئے تھے کیا ہے ماجرا دیکھا۔ لیکن محسن تمیساں کیسے پہنچ گئے؟" کالے چراغ نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں کہ میں یساں کیسے پہنچا؟" محسن راؤ نے اپنی پہنچانا شروع کی۔ "ایک دن راکل نے پوچھا۔

"میں نے جو کہا ہے اس پر تمہیں بھی یقین آجائے گا، ذرا اپنے چہرے پر باقاعدہ پھیر کر دیکھو۔" "ہاں۔" محسن راؤ نے خوش ہو کر آنکھیں پھیلائیں اور پھر دترتے ڈرتے اپنے چہرے پر ایک باقاعدہ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ واقعی اس کا جزو صاف ہاں۔ اس نے اپنے جسم میں توہانی تو اٹھتے ہی محسوس کی تھی۔

"میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔"

"شکر ادا کرنا ہے تو میرے سردار کا کردی، میرے آقا کا کرو جن کا میں غلام ہوں۔" کالے چراغ نے انتیت سے کما۔

جب میں نے اٹھ کر اپنے سامنے دیکھا تو زخمیں میں بند ہی ایک گاگر کو پایا۔ میں آگے بڑھا۔ پھیجے مرد دیکھا تو اونٹی غائب ہو چکی تھی۔ تب میں گاگر کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ اس میں کسی قدم کا خود موجود ہے۔ جب میں نے گاگر کامنہ کھولتا تو بے شمار کھیلوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اور میں درد کی نشانے سے بے ہوش ہو گیا۔

"ہوں۔" محسن راؤ کی رو داد سن کر کالے چراغ نے ہنکارہ بھرا اور سردار کو لانا سے مغلوب ہوا۔

"دیکھا سردار؟" "اچھا ہوا سردار وہ مر گئی۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں خواہ جواہ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ نہ تھی، وہ کسی اور کی تھی۔ پر سردار میں بھی کیا کرتا۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی، میں اسے اپنے سے نہ ماننا چاہتا تھا لیکن وہ نہ تھی یہ نہ تھی۔ میں کیا کرتا۔ میں بھی مجبور تھا۔ یہ عاشق اس تدریج مجبور کیوں نہ تھے۔" کالا چراغ بولتے بولتے آبدیدہ ہو گیا۔

"سرو قوف۔" سردار کو لانا اسے ڈانٹا۔ "ایک بھات مری ہے۔ میں ایک ہزار بھائیں تیرے ناگما کر دوں گا۔ غم کیوں کرتا ہے۔"

نے نم آنکھوں کو بند کر لیا۔ "لیکن مجھے تو اس کی صورت سے بھی نفرت تھی۔" محسن راؤ نے صاف گوئی سے کہا۔

"پکھی کی رویہ اس کا میرے ساتھ تھا۔" کالے چراغ نے آنکھیں کھولیں۔ "وہ میری ٹھنڈی کی تھیں نہیں چاہتی تھی، لیکن مجھے اس کے بغیر قرار نہ تھا، اس کی صورت ہر وقت میری آنکھوں میں نہیں تھی۔ اب بھی بھی ہوئی ہے۔"

"اور راکل کا کیا ہوا؟" محسن نے پوچھا۔

"بھات کی موٹ کے بعد راکل نے میرے سردار پر حملہ کیا اور وہ وہاں سے نکل بجا گا۔ تب میرے دیواہ کا لی کے دربار میں جانے کا فیصلہ کر لیا اور وہاں جا کر راکل کو اس کے انجام تک پہنچا۔ اور اب اس وقت ہم لوگ دیواہ کا لی کے حکم کے مطابق راکل کے جلد قرق کو بھات کے نزدیک زخم کرنے آئے تھے کیا ہے ماجرا دیکھا۔ لیکن محسن تمیساں کیسے پہنچ گئے؟" کالے چراغ نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں کہ میں یساں کیسے پہنچا؟" محسن راؤ نے اپنی پہنچانا شروع کی۔ "ایک دن راکل نے پوچھا۔

حالت میں میری جھوپڑی تک پہنچا، اسے بھیڑیوں نے زخمی کیا تھا۔ خیر میں اسے اپنی جھوپڑی میں سا آیا۔ اس کی بدایت پر عمل کر کے اس کے زخموں کا علاج کیا۔ جب وہ ٹھیک ہو گیا تو مجھے دھوکا دے کر اگیا۔ اس دن اس نے تمہارے سردار کا نام بھی لیا تھا کہ مجھے تو اس وقت وہاں ہونا چاہبے تھا۔ خیر وہاں

ہوں کے بعد وہ پھر واپس آیا اور اس نے کہا کہ جھوپڑی کے باہر اونٹی موجود ہے۔ یہ مجھے میری دنیا کی پہنچا دے گی۔ میں فوراً اس پر سوار ہو کر نکل جاؤں۔ اس دن اس نے یہ بھی بتایا کہ کسی لئے دیواہ کا

کے دربار سے بلاوا آنے والا ہے۔ پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اونٹی پر ہوا ہو کر چل پڑا، کافی لمبا سفر کرنے کے بعد میری اونٹی یساں آکر اچانک رک گئی۔ میں ریت پر آگرا بڑھا۔

جب میں نے اٹھ کر اپنے سامنے دیکھا تو زخمیں میں بند ہی ایک گاگر کو پایا۔ میں آگے بڑھا۔ پھیجے مرد دیکھا تو اونٹی غائب ہو چکی تھی۔ تب میں گاگر کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ اس میں کسی قدم کا خود موجود ہے۔

جب میں نے گاگر کامنہ کھولتا تو بے شمار کھیلوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اور میں درد کی نشانے سے بے ہوش ہو گیا۔

"ہوں۔" محسن راؤ کی رو داد سن کر کالے چراغ نے ہنکارہ بھرا اور سردار کو لانا سے مغلوب ہوا۔

"دیکھا سردار؟" "اچھا ہوا سردار وہ ہزاروں کھیاں کہاں گئیں اور یہ میرے جسم پر سرخ سیال ہے۔

بجاءے کسی اور دنیا میں پہنچ چکا ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں پہنچ کر گاگر ضرور کھول کر دیکھے گا اور پس اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔ وہ راکل تو تھی خوب پہنچ تھا۔ تیرے جیسے شاطر ہماری دنیا میں نایاب ہیا۔

سردار کو لانا نہ کما۔

"آپ لوگوں نے مجھے کیسے بچایا۔ وہ ہزاروں کھیاں کہاں گئیں اور یہ میرے جسم پر سرخ سیال ہے۔"

بادرہ کو دیکھ کرتا ہے نے اسے گلے سے گالیا اور بولی۔ ”پریشان نہ ہوں۔ بھائی جان اب بالکل ٹھیک ہے۔“

”مُن راؤ تکیوں سے بیک لگائے، نیم دراز تھا۔ نادرہ کو دیکھ کر مسکرا یا اور بولا۔ ”آؤ، نادرہ۔“ کمرے میں اس وقت محسن راؤ کا بچپن کا دوست آصف صدیقی، انکل عامر اور ان کی نیلی اور تانیہ فی۔ نادرہ کو دیکھ کر آصف صدیقی نے جانے کی اجازت چاہی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں گھر کے لوگ رہ گئے۔ ان سب لوگوں سے اس کا تعارف تھا۔

”یہ کیسے ہوا؟“ نادرہ کی آواز میں بڑی ترپ تھی۔

”عینیں تانیہ نے کچھ نہیں بتایا۔“

”نیس بھائی جان، میں نے جان کر نہیں بتایا تھا کہ پریشان ہوں گی۔“

”تم نے بتا اچھا کیا۔“ اس مرتبہ انکل عامر بولے۔ پھر نادرہ سے مخاطب ہوئے۔ ”محسن راؤ یہ زخم شش کر کھایا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ نادرہ نے کہا۔ ”انکل عامر میں سمجھی نہیں۔ آپ کی بات۔“

”قاتل سے انہوں نے پورا پورا تھاون کیا۔ اسے پورے الٹیناں سے فرار ہونے کا موقع عنایت ہے۔“

”قاتل، یہ آپ کیا کہ رہے ہیں، انکل عامر۔ کیا محسن پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے؟“

”میں، محسن صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ بھی کسی خالق نے کیا ہے؟“

”کون تھی وہ؟“ نادرہ البحص میں گرفتار ہو گئی۔

”تساری دوست۔“ اس مرتبہ محسن راؤ بولا اور بول کر پنس دیا۔

”نیزی دوست؟“ نادرہ نے جیران ہو کر پوچھا۔

”بھائی جان، کیوں پریشان کر رہے ہیں، نام بتا کیوں نہیں دیتے۔“

”تانیہ تم بتاؤ، وہ کون تھی؟“

”انہیں بوچھنے دوتا۔“

”راکھی تھی وہ اور اس کیمنی کو میں نے خود گھر بلایا تھا۔“ تانیہ کے لمحے میں پچھتا تھا۔

”تم کیوں، نادم ہو رہی ہو، تمیں کیا معلوم تھا کہ وہ تمہارے بھائی کی جان کی دشمن بنی ہوئی۔“

”وہ را کھی تھی، راج مداری کی بینی۔ اتنے برسوں کے بعد وہ یہاں کہاں آگئی تانیہ ذرا مجھے تفصیل ملدری بات بتاؤ۔“

”تانیہ نے را کھی سے ملاقات اور اسے گھر بلانے کی ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

”محسن آپ نے یہ کیا کیا۔“ نادرہ نے سارا واقعہ سن کر محسن کی طرف رخ کیا۔

”میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“

”اس کیتیاں لاش کیوں نہیں گرانی، اسے فرار ہونے کا موقع کیوں دیا؟“ نادرہ کے لمحے میں غصے کی

”میں تیرے قربان“ میں تیرا غلام، کاملے چراغ نے بڑی فرمابوواری سے اپنا سر جھکایا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ سردار کو لانا نے گاگر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو تیرا حکم۔“ کمالے چراغ موددانہ لجھے میں بولا۔

”ان گاگروں میں ریت بھر کر دفن کر دے۔ پھر آگے کی سوچتے ہیں۔“ سردار کو لانا نے ہمارے کی۔

”ٹھیک ہے سردار..... ابھی کئے دیتا ہوں۔“ کاملے چراغ نے سعادت مندی سے کہا۔

پھر اس نے بقاں والی گاگر کی زنجیریں کھویں، اس میں ریت بھری اور پھر اس گاگر کو نہیں پر لوندا دیا۔ یہ عمل راکل والی گاگر کے ساتھ کیا گیا۔ یہ دونوں گاگریں برابر رکھی تھیں۔ کاملے چراغ۔

بقاں کی گاگر کی زنجیریں مخفون سمیت اکھار لیں اور اس کی گاگر پر رکھدیں۔ راکل کی گاگر کی زنجیر را میخیں بھی راکل کی گاگر پر رکھو گئیں۔ اس کے بعد اس نے گھر سواروں کو واشارہ کیا۔ ان گھر سواروں

نے دیکھتے ہی دیکھتے اتنی ریت ان گاگروں پر چڑھاوی کہ وہاں ایک انچا سائلہ بن گیا۔

اس سارے عمل کو محسن راؤ خاموشی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ گاگروں کی تدفین جب تکمیل ہو گئی تو کمالے چراغ سردار کو لانا کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”اب بنتی کی طرف کوچ کرو۔“ سردار کو لانا نے حکم صادر کیا۔

”اور محسن؟“ کاملے چراغ نے پوچھا۔

”اس کا کیا کرنا ہے۔“ سردار کو لانا نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”فی الحال اپنے ساتھ لے جانا ہے۔“

”یہ بنتی میں تو نہ جائے گا۔“

”پھر؟“

”ایسا کرو، اسے خوب محل لے جاؤ لیکن ذرا محتاط رہنا۔ میری بات تو سمجھتا ہے تا۔“

”میں تیرا غلام۔ میں تیری سب باشیں سمجھتا ہوں۔“ کاملے چراغ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہ

”بس تو پھر خست ہو۔“ سردار کو لانا نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”تجھ سے پہلے میں کیسے رخصت ہو سکتا ہوں سردار، پہلے تو رخصت ہو۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر سردار کو لانا ایک اوپنی پر بیٹھ گیا۔ اوپنی فوراً کھٹی ہو گئی۔ سردار کو اونچی پر سوار ہوتے دیکھ کر وہ پانچوں سواروں کے ساتھ دیکھتے ہی دیکھتے ریت کے بادل میں گم ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد کاملے چراغ نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولا۔ ”آؤ، میرے ساتھ۔

سامنے تھوڑے سے فاصلے پر کاملے چراغ کی اوپنی بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں کیا کرو؟ کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ میں تم مورتی کی کمانیاں بغیر بولے سن لوں۔“
 ”ہر کمانی سانے والا یہی چاہتا ہے کہ اس کی کمانی کے دور ان کوئی نہ بولے۔ اگر تم مورتی بھی یہی
 لشکر لکھتا ہے تو تانیہ تمیں چاہئے کہ اس کی کمانی خاموشی سے سن لو۔“

”ادا، میں تو خاموشی سے سن لوں گی میں کیوں بچے میں بولوں گی لیکن مجھ سے پہلے جو دس انسان اس
 کی ایسی نشست گئے اور یہ جانے کے باوجود کہ بولنے کی سزا موت ہے، وہ بولے بناں رہ رکے اور موت کے
 اپر ٹھیک ہو گئے تو ادا، میں کس کھیت کی مولی ہوں۔ میں بولے بناکس طرح رہ سکوں گی۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟“
”اس کی کہانیاں خاموشی سے سننا۔“ تانیہ نے بتایا۔
”تھک ہے تک“

”پھر لو لیک، میں مریب ہے۔“
”وہ کیا؟“ تانیہ نے پوچھا۔
”تم سونگی ہو جاؤ۔“ دادا عظم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”گوئی بن جاؤں۔؟“
”گوئی بنے کا کیا فاکہ ہو گا، میں گوئی بننے کو نہیں، گوئی

”وہ کس طرح دادا؟“

”میں تمیں ایک عمل بتاؤں گا۔ جب تم تین مرتبے اس لفظ کو درہ راؤ کی تو فوراً تمہاری قوت کو یکیانی سلب ہو جائے گی۔ وہ تین چڑوں والا شیطان تمہیں کتنا ہی بولے پر اکسے اور تم بولنا بھی چاہو تو بول نہ پاؤ۔ نہ کلی اگر تمہاری گردن پر چھپی بھی رکھ دے اور کہ کہ بولو ورنہ قتل کے دیتا ہوں تو اس وقت بھی تمہاری زبان نہیں کھلے گی۔“

”واہ دادا یہ ہوئی نہ بات۔“ تانیہ نے خوش ہو کر کہا۔ ”اب جلدی سے مجھے وہ عمل مل جائے گے۔“

”ہاں، اب تم میری بات غور سے سنو۔“ دادا نے تنہی لمحے میں کہا۔
کھجور دادا عظیم نے حکم ہٹالا۔ اور نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا۔ پاک کر لیا۔

ہر دادا میں سے بوچھے تباہی، اس سے اپنی رون بخیل یا یادیں نہیں۔ اس کے بعد اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ دادا عظیم کی آمد کا حس ابھی تک اس کے داماغ میں تازہ ترین ہے۔ اسے پول محسوس ہو رہا تھا جیسے دادا عظیم ابھی ابھی اس کے پاس سے اٹھ کر گئے ہوں۔ پتہ نہیں یہ تھا کہ اس کی مدد کرنے والے کیا ہیں۔ براہ راست اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ بھی بھی ہوئی تھی۔ ہو گئی تھی۔

داتات خواب میں ہوئی تھی یا ہوش و حواس میں جاگتے ہوئے۔ بہر حال جیسے بھی ہوئی تھی۔ اور کیا شاندار ترکیب بنائے تھے۔ وہ دادا وہ، اللہ آپ کے درجات پر بلند کر کے۔

اب تانية کو اپنی کامیابی کا مکمل یقین ہو گیا تھا۔ اب اسے کسی قسم کی فرنہ رہی نہیں۔ وہ بڑے سکون سے موگنی۔ اور دیر تک سوتی رہی۔

سورج بلند ہونے پر ایک کیز نے گلب کی کلکی کوتانیے کے دستے رخسار پر مس کر کے اٹھایا۔ کلکی کی ذذوبیت اور رخسار پر نرم طفیل لمس کے احساس نے اس کی بند آنکھوں کو گھوول دیا۔ آنکھ کھلی تو اس نے

تحت لکلی۔ راشون اس کا کون تھا؟ ابھی تو اس نے کاشنگ بیبا سے صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر شرکر کے تر میں جانے سے بہتر اس نے یہ سوچا تھا کہ وہ تم مورتی کے سامنے چلی جائے۔ اس وقت اس نے خنزیر میں جتنا ہو کر ایسا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اب اس کے اندر سے خواہش ابھر رہی تھی۔ اس کا کمی چاہ رہا تھا کہ اس کے لئے کچھ کرے۔

آخر کیوں؟ کیا صرف اپنی جان بچانے کے لئے؟
وہ نہیں، جانتی تھی کہ تین سورقی کون ہے۔ کاشمگان نے بتایا تھا کہ وہ ساحروں کا بادشاہ ہے۔ اے

کے تین چرے ہیں۔ ان تین چروں سے تین کمانیاں سننا ہیں۔ کمانیاں سننا تو کس قدر خوبصورت گل ہے۔ اللہ کی ملکوں ازل سے ایک دوسرے کو کمانیاں سناتی آ رہی ہے۔

یہ عجیب کمانیاں تھیں۔ ان کمانیوں کو سننے والا قتل بھی کیا جاسکتا تھا۔
وہ مثل شل کر تھک گئی لیکن اس کی سمجھ میں کوئی حل نہ آیا۔ اول تو اس کی سمجھ میں رہا تھا

آرہی تھی کہ آخر اس کی کمایاں خاموشی سے کیوں نہیں سنی جا سکتیں۔ کمانیوں کے درمیان میں بولنا پڑا ضروری ہے۔ جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ بولنے کے ساتھ ہی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر بھی اونگ بول پڑتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کمانیوں کے دوران وہ کوئی ایسی بات ضرور کرتا ہے جس کے حباب میں منٹے والا بے اختیار بول پڑتا ہے۔

شلتے شلتے اور سوچتے سوچتے وہ تھک گئی تو بستر پر گر پڑی۔

کوئی نہیں جو اس کی مدد کرے تب اسے راکل یاد آیا۔ اس کی قید یاد آئی۔ اس بات پر اس نے اسے قید خانے کے کرے میں بند کروادیا تھا اور اسے بھول گیا تھا۔ اور وہ بھوک سے مٹھاں ہو گئی تھی۔ شیم غشی کی کیفیت میں اسے دادا عظیم کی آمد کا احساس ہوا تھا اور پھر روشنداں سے گھبرنے لگا۔ اس کے اوپر گرا یا تھا۔ وہ اس قدر لذیز اور خوبصورت تھا کہ اسے کھا کر اس کی طبیعت ہو گئی تھی۔ بھوک مست گئی تھی۔ اور وہ موت کے منہ میں جاتے جاتے رہ گئی تھی۔ دادا عظیم نے اس سمت کے منہ میں، جانے سے بجا لاتھا۔

ایک مرتبہ پھر وہ موت کے دہانے پر آگئی تھی۔ کاش! دادا عظیم اس کی مدد کو آجائیں۔ اس نے تڑپ کر سوچا۔ اے کاش! ایسا ہو جائے۔ اس کے دل کی گمراہیوں سے یہ خواہش ابھری تھی۔ اور پھر وہ یونہی سوچتے سوچتے سوگی تھی۔ تب وہ حیرت انگیزیات ہوئی تھی۔ دادا عظیم اس کے ذاہم میں آگئے تھے۔ ان کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔ ان کامسکرا تاپر تو چہرہ ویکھ کر تابانی کے دل پر سکون سماچھا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دادا عظیم کے دوفوں ہاتھ پکڑ لئے اور الجما آمیز لہجہ پولی۔ ”دادا، میں بہت مشکل میں ہوں۔“

”کیا مشکل ہے، بیٹا مجھے بتاؤ۔“ دادا عظیم نے اپنا ایک ہاتھ چھڑا کر اس کے سر پر پھیرا۔

بُلی جلدی وہ اپنے بال جھٹک کر باہر نکل آئی۔
کرنے میں وہ دونوں کینزیں اس کی بے چینی سے منتظر تھیں۔ تانیہ نے خود کو ان دونوں کے حوالے رہا۔ ان دونوں نے اس کو ایک خوبصورت سالباس پہنایا۔ اسے سچایا سنوارا۔ جب وہ تیرہ ہو گئی اور اس نہ پاشدہ وغیرہ بھی کر لیا تو کامنگن کو مطلع کیا گیا۔
اس اطلاع پر وہ اسے اپنے کرنے میں طلب کرنے کے بجائے خداوس کے کرنے میں آگیا۔ تانیہ بی اوپنی کرسی پر بڑی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ کامنگن کو وکھ کر اس نے اٹھنا چاہا لیکن ہائٹن نے اسے اشارے سے اٹھنے سے روک دیا۔ پھر وہ خداوس کے سامنے کھڑے ہو کر تنظیما جھکا اور

”تانیہ، مجھے معاف کر دیتا۔“

”کس بات کی معافی؟“ ”تانیہ الجھی گئی۔“ ”میں سمجھی نہیں۔“
”میں نے کل جیسی لاموس کے کھڑے میں پیشوا ناچا ہا۔ میں اپنے اس حرکت پر بہت ناوم ہوں۔“
”میں نیشن جانتی ہو کہ تم میرے لئے کیا ہو۔ تم ایک ایسی امنیدی کرن ہو جس کے بعد اندر ہمراہ اندر ہمراہ ہے۔“
”نہ لے انہل کے مجھے پاگل کرو یا تھا۔ میں اپنے اس پاگل پن کے لئے تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔“
ہائٹن نے الجھا آمیز لبجھ میں کہا۔

”آپ کے اس حکم نے میرے وہودو کو لرزایا تھا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں آپ کے جذبات کو۔ آپ لیک باب پیں۔ میرے انہار پر آپ کو غصہ آتا آیک قدری عمل تھا۔ آپ کو اس پر شرمende ہونے کی فرورت نہیں۔“ تانیہ نے کھلے ول سے اسے معاف کرو دیا۔

”تم کتنی عظیم ہوتانیے۔ انسان کو اپر والے نے شاید اسی لئے اشرف الخلوقات کما ہے۔“
”میں بہت چھوٹی سی چیز ہوں۔ بہر حال میں نے طے کر لیا ہے کہ تین مورتی کے وہار میں جاؤں ل۔ اس کی کہانیاں سنوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میں واپس آؤں گی۔ پھر آپ کے لئے خوشیاں ہی خوبیاں ہوں گی۔“

”آسمان والا جھیں کامیاب کرے۔“ کامنگن نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”تم واپس آگئیں اور آہماں والے کی مریانی سے تم ضرور واپس آؤ گی تو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم جو مانگو گی، وہ میں جھیسیں گے۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ آپ کا میٹا، اس ساحرہ کے سحر سے آزاد ہو جائے۔ میں آپ دونوں کو لٹکتے ہوئے دیکھ لوں۔ میں یہی میرا انعام ہے۔“ تانیہ نے خوندی سے کہا۔

”آسمان والا جھیں سدا خوش رکھ۔ تم واقعی عظم ہو۔“
”بلی آپ مجھے بڑا بنا کر میری نظریوں میں چھوٹا نہ کریں۔“ تانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ یہیں تینیں مورتی کے دربار میں کہ جاتا ہے۔“

”اظناتاں ہو رہے ہیں جانے کے..... میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ کامنگن نے کہا۔
انتظامات مکمل ہونے پر کامنگن کو اطلاع دی گئی۔ تب وہ تانیہ کو لے کر اپنے محل سے باہر نکلا۔ تانیہ

ایک جیسیں کینز کو اپنے بھکے ہوئے پایا۔ تانیہ اسے دیکھ کر مسکرا کر وہ گلاب کی کلی اس کے ہاتھ میں وسے دی۔

گلاب کی کلی لے کر تانیہ نے اسے سو گھا۔ بڑی محور کن خوشبو تھی۔ وہ اٹھنے کی تو کینز اسے سارا وینے کے لئے آگے بڑھی۔ تب تانیہ نے فرا کہا۔ ”میں، اس کی ضرورت نہیں۔“

”ضرورت ہے۔“ کینز نے بڑی شاشی سے کہا۔ ”آپ ہمیں اپنی کسی خدمت سے رہو کیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تمہاری اسی میں خوشی ہے تو ایسا ہی سی۔“ یہ کہہ کر تانیہ نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

کینز نے اس کا ہاتھ نری سے کپڑا کر بہت پیارے اٹھایا۔ جب وہ بستر پر انھ کر بیٹھ گئی تو کینز نے کہا۔

”اب آپ غسل فرایلیں۔ تب تک ناشستہ تیار ہو جائے گا۔ آپ کو یادو ہو کا کہ آج ٹھیک بارہ بجے آپ کو تین مورتی کے وہار میں حاضر ہونا ہے۔“

”جاتی ہوں۔“ تانیہ نے خوشگوار لبجھ میں کہا۔

”جاتی ہیں تو پھر فوراً تشریف لے چلے۔ وقت زیادہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس۔“

”ٹھیک ہے چلو۔“ تانیہ فوراً انھ کر کھڑی ہو گئی۔

جب تانیہ حمام میں واخی ہوئی تو اس کے ساتھ ہی دو کینزیں بھی اندر آگئیں۔ اور انہوں نے تانیہ کو بے لباس کرنے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے۔

””میں۔“ تانیہ نے پیچھے بٹتے ہوئے بھختی سے کہا۔

”وہ دونوں کینزیں سُم کر رک گئیں۔“

”تم دونوں جاؤ۔ میں بھی نہ کر آتی ہوں۔“

”لیکن.....“ اس میں سے ایک کینز نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن وہیں کچھ نہیں۔ میں تم لوگوں کی موجودگی کی قیمت پر بروادشت نہیں کروں گی۔“ یہ کہہ اس نے دونوں کینزوں کے ہاتھ پکڑے اور ان کو حمام سے باہر و حیل کر وروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”ارے، ارے“ کرتی رہ گئیں۔

تانیہ نہانے کے بعد جب آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال خٹک کر ہی تھی تو اچانک راشمن کا خیال جیسے اس کے ریشیں بالوں میں آپ وار موتی کی طرح اٹک گیا۔ وہ اپنی جیسیں گھنیری لالوں کو جھکتے جھکلتے رک گئی۔ وہ سامنے آئینے میں اگرچہ اپنا چہرہ وکھ رہی تھی لیکن اس کی خیالی نظریں کیسی اور تھیں وہ کچھ اور وکھ رہی تھیں۔

اس وقت راشمن اس کی نظریوں میں سایا ہوا تھا۔ اس کا جیسیں چہرہ، تانیہ کے دل میں اترنا بارہا تھا۔ وہ بے خودی ہوئی جاتی تھی۔ پھر جیسے اسے ہوش آگئی۔ اس نے گھبرا کر اور حرادہ دیکھا۔ کیسی کی نے اس کے دل میں سامنے والے خیال کو پڑھ تو نہیں لیا لیکن وہاں کون تھا۔ یہ جان کر اسے اٹیناں ہوا تھا۔

نے اپنے سامنے ایک خوبصورت بگھی کو پایا۔ جس میں دو خوبصورت گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ کاشن نے اسے سارا دے کر بگھی میں بٹھایا اور پھر وہ خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بگھی کے پیچے مسلح گھر سواروں کا ایک دستہ تھا۔ یہ چھوٹا سا مقابلہ تین مورتی کے علاقوں کی طرف پرلا۔

ایک بھی مسافت کے بعد جب بگھی رکی اور تانیہ، کاشن کے ساتھ بگھی سے نیچے اتری تو اس نے دیکھا کہ سامنے ایک بلند پہاڑی ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر کوئی مندر جیسی عمارت بنی ہوئی ہے۔ اور پہاڑی کی پہلی پر جانے کے لئے پہاڑی کو تراش کر سیرھیاں بنا لی گئی ہیں۔

”اوپر جانا ہے؟“ کاشن نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلیں۔“ تانیہ یہ کہہ کر آگے بڑھی۔

پھر وہ دونوں سیرھیاں چڑھنے لگے۔ مسلح گھر سواروں کا دوست بگھی کے پاس ہی رہ گیا۔ سیرھیاں بہت زیادہ تھیں۔ اور پہنچنے میں خاصا وقت لگا۔ سیرھیاں چڑھتے چڑھتے تانیہ کا سانس پھول گیا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ مفتر ہونے کے باوجود کاشن کے اپنے ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ اور پہنچنے کے پس سانس لینے لگی۔

”کیا ہوا؟“ کاشن نے فکر مندی سے پوچھا۔

”تحک گئی۔“ تانیہ نے گمراہی لیتے ہوئے کہا۔ ”اندر جانے سے پہلے چاہتی ہوں کہ اپنا سانس درست کر لوں۔“

”اچھا تم یہاں بیٹھو، میں اندر جا کر اپنی آمد کی اطلاع کرتا ہوں۔“ کاشن یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

تانیہ نیچے دیکھنے لگی۔ اسے نیچے کھڑی ہوئی بگھی اور گھر سوار نظر آرہے تھے مگر بت چھوٹے چھوٹے۔ اس وقت وہ خاصی بلندی پر بیٹھی تھی۔ پھر اس نے عمارت پر نظر ڈالی۔ یہ عمارت بڑے بڑے پھرروں سے بنی تھی۔ پھر سرخ تھا اور عمارت کسی قلعے کی طرح مضبوط دکھائی دیتی تھی۔ عمارت بلند تھی لیکن دروازہ کافی چھوٹا تھا۔

کاشن نے دروازے کے نزدیک جا کر اس میں لگے بڑے سے کنٹے کو دروازے پر تین بار مارا۔ کن کن کی آواز ہوئی۔ پھر فروزی دروازہ کھل گیا۔ اندر سے ایک ٹکوار بردار شخص برآمد ہوا۔ اس نے کاشن کو اپر سے نیچے تک بغور دیکھا۔ پھر اسے سامنے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ اس پر بھی اس نے نظر ڈالی اور دھیتے لججے میں بولا۔ ”کون ہو؟“

”میں کاشن ہوں، تین مورتی کو میرا پیغام دو۔ میں آگیا ہوں۔ ایک لڑکی ساتھ لایا ہوں۔“

”لڑکی وہ ہے جو سامنے بیٹھی ہے۔ وہ آخر دہاں کیوں بیٹھی ہے۔“ ٹکوار بردار نے پوچھا۔

”انسان کی بچی ہے تحک گئی ہے۔“ کاشن نے جواب دیا۔

”اچھا اچھا میں سمجھا..... میں ابھی جا کر تین مورتی کو جاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ٹکوار بردار شخص اندر

ایسا۔ جب وہ اپس آیا تک تانیہ کا سانس درست ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کاشن کے پاس پہنچ گئی۔ تکوار بردار خوشنی نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور پھر تکوار بردار خوشنی میں داخل ہو گئے تو اس ٹکوار بردار خوشنی نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا اور پھر تکوار بردار خوشنی نے بائیں جانب بدل دیا۔

خونرخوں کے درمیان ایک چھوٹا سا ساراست اندر گیا تھا۔ وہ راستہ اتنا چک تھا کہ اس پر ایک آدمی ہی لے کر خوشنی کے بعد ہی اندر گھر اگرا ہو گیا۔ پھر تانیہ اس کے بعد کاشن۔ درخت اتنے گھنے تھے لہذا پہلے ٹکوار بردار خوشنی آگے بڑھا۔ نیز اس کے بعد آگے پھیلایا کہ مکمل تاریکی چھا گئی۔ خوشا آگے جانے کے بعد ہی اندر ہی گھر اگرا ہو گیا۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ مکمل تاریکی چھا گئی۔ تکوار بردار خوشنی میں وقت پیش آرہی تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلایا کہ مکمل تاریکی چھا گئی۔ نیز کو چلنے میں وقت پیش آرہی تھی۔ تانیہ کو راستہ ٹوٹ لئے دیکھ کر مرک گیا اور دہیں کھڑے کھڑے بولتا۔

”لیکن مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

تب کاشن اس کے آگے آگیا اور اس نے تانیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا۔ ”اب تم میرے پیچے اڑاں سے چلی آؤ۔“

”کیا آپ کو راستہ نظر آ رہا ہے۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔“ کاشن نے اطمینان سے کہا۔

”بھرستہ گھنے درخوں سے شروع ہوا تھا۔ وہ اب ایک سرگ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد تانیہ کو جالا محسوس ہونے لگا۔ تب اسے پہنچا لکھا کہ وہ گھنے درخوں کے بجائے کسی سرگ میں چل رہی ہے۔

سرگ ختم ہوئی تو ایک برا سا کھو نظر آیا۔ یہ کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ کوئی کھڑکی دروازہ نہ تھا۔ البتہ کافی اوچائی پر تین طرف بڑے بڑے روشنداں تھے۔ انہی روشنداں سے روشنی کر کے میں آری تھی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ فرش سرخ اینہوں کا تھا۔ اور درمیان میں ایک چوکور جگہ چھوڑ دی گئی تھی جس میں گھاس لگی ہوئی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ٹکوار بردار خوشنی نے گھاس کی طرف اشارہ کیا اور خود تیزی سے پلٹ کر سرگ میں رانی ہو گیا۔

تانیہ اور کاشن گھاس پر بیٹھ گئے۔ گھاس بست زم اور دیز تھی۔

”ہاں، کاشن بولو کیسے آتا ہوا؟“ ایک بھاری آواز کر کے میں گوئی۔

تانیہ نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ روشنداں پر بھی نظر ڈالی گمراہے کوئی نظر نہ آیا۔ ”تین مورتی تو جانتا ہے کہ میرے بیٹھے راشموں پر ساحرہ کا ویری نے سحر کر رکھا ہے۔ اس سحر کا توڑ نہ کسے پاس ہے۔ اس توڑ کو حاصل کرنے کے لئے میں اب تک دس انسان تیرے دربار میں حاضر کر چکا

"اب تو گیارہواں کھلاڑی لایا ہے اور وہ بھی لڑکی۔" ایک تقدیر لگا کر کما گیا۔
"دشمن تیری بھینٹ چڑھ پکے ہیں۔ اب تو مجھ پر مرمی کر۔"

"میرے پاس مرمی نام کی کوئی جیز نہیں۔" تین مورتی نے پھر ایک بھی ایک تقدیر لگای اور بولا۔
"اگر یہ لڑکی میری کمپانیاں سن لے گی اور درمیان میں نہیں بولے گی تو میں حک کا توڑ کر دوں گا۔" دشمن صورت میں تو جانتا ہے کہ کیا ہو گا۔"

"تین مورتی ایسا نہ کرہے، یہ میری آخری امید ہے۔ اگر یہ تیری شرائط پر پوری نہ اتری تو میرا بیٹا یہ شکر کے لئے میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تو یہ بات اپنی طرح جانتا ہے۔ پھر تو یہ بھی اپنی طرح جانتا ہے کہ راشون میرا اکٹوما بیٹا ہے۔"

"اکٹوما بیٹا ہے تو میں کیا کروں۔ کیا میں نے اس سے کما تھا کہ تو کا دری کے علاقے میں چلا جا۔ اور سار بری کو اپنا دیوانہ بنا لے۔ تو نے اسے دہاں جانے سے کیوں نہیں روکا۔" تین مورتی نے سخت لمحے میں کہا۔

"تین مورتی، میں نے کیوں نہیں روکا۔ میں نے اسے بیٹھے اوہرہ جانے کی ہدایت کی۔ لیکن ہوئے والی بات کوں روک گیا اور کادیری کے علاقے میں جا لکلا۔ اس سے غلطی ہو گئی تو معاف کر دے۔"

"ٹھیک ہے اب تو جا۔ میرا کمانی سنائے کا وقت ہو چلا۔ تو اس انسان کی بچی کو ہیساں چھوڑ جا۔ اور پہاڑی کے قدموں میں اس لڑکی کی لاش کا انتظار کر۔ جب دشمن میری کمانی نہ سن سکے اور بیچ میں بول پڑے تو یہ بے چاری میری کمانی کیا سن پائے گی۔ پہلی کمانی میں ہی چل بیے گی۔" یہ کہ کہ تین مورتی نے تقدیر لگایا۔

"چھاتانیہ میں چلتا ہوں۔ میں تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔" کامنگ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں جانتی ہوں کہ تین مورتی مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میں ڈر نہ والی نہیں ہوں۔ اللہ ماں ہے جو ہو گا وہ کہا جائے گا۔" تانیہ نے بڑے اطمینان اور یقین سے کہا۔ "اوپر والے نے چلا تو قصہ ہماری ہو گی۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ میں پہاڑی کے دامن میں تیر بجھنی سے منتظر ہوں گا۔"

"اس کے نہیں کامنگ، اس کی لاش کے منتظر ہتا۔ جاؤ اب جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔"

کامنگ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گردون جھکاتے سرگ میں داخل ہو گیا۔ تانیہ نے اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ اس نے بھی جواب میں ہاتھ ہلا کیا اور پھر وہ اندر میرے میں گم ہو گیا۔

اب تانیہ اس خالی کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ وہ گھاس کے قالین پر بیٹھی تین مورتی کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کیا صورت حال پیش آئے گی۔ کامنگ نے تین مورتی کے بارے میں جو معلومات فرم ہم کی تھیں۔ اس کے تحت وہ تین منہ والا شخص تھا۔ وہ خود سامنے آئے گا، یا بعض اس کی

زیستی دے گی۔ ابھی تک تو اس کی آواز سنائی دی تھی۔

اپنے کو اس عجیب و غریب کمرے میں بیٹھے ہوئے خوف سا آرہا تھا۔ جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ تین وہ تین مورتی کی کمپانیاں سن پائے گی یا نہیں۔ اگر نہ سن پائی اور درمیان میں بول اٹھی پھر تو اس شی کی یہاں سے جائے گی۔ اگر وہ مرگی تو اس کی زندگی کامنگ ادھورا رہ جائے گا۔ وہ اپنے بھائی راؤ کو ازاد کرنے کے لئے اس ناطق معلوم دنیا میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے محسن راؤ کو پا بھی لیا تھا۔ الات نے ایسا پلاٹ کھایا کہ وہ اس سے دور ہو گئی۔ وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے کوزہ دہ سلامت اپنی دنیا میں لے جائے گی۔ لیکن اگر وہ مرگی تو پھر کیا ہو گا۔ اس کی موت کے بارے بھی کسی کو کچھ نہ معلوم ہو سکے گا۔ اس سے غلطی ہو گئی۔ اسے چاہئے تھا کہ وہ کامنگ کو وصیت ہو کہ موت کی صورت میں اس کے جسد خالی کو اس کی دنیا میں پہنچا دیا جائے۔ آخر وہ اس طرح کیوں اڑنا ہے۔ وہ یہاں مرنے نہیں، میدان مارنے آئی ہے۔ وہ مسلسل ہو کر آئی ہے۔ دادا عظیم نے اُل کا بھو ہتھیار بخشنا ہے، اس کی موجودگی میں بھلاسے کوں نکست دے سکتا ہے۔

"لیا سوچ رہی ہے لڑکی؟" اچانک آواز آئی۔

"کچھ نہیں، تیری منتظر ہوں۔" تانیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
"لیا ہاتھ ہے تیرا۔"

"میرنام تانیہ ہے۔ یہ بتا جسکے کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟"

"لب انتظار ختم ہوا۔ میرا وقت شروع ہو گیا۔ تو سامنے دیوار کی طرف دیکھ۔"

تانیہ نے اپنے سامنے والی دیوار پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیوار شق ہونا شروع ہے۔ ایک دروازہ سا بن گیا تو دونوں طرف کی دیواریں ٹھہر گئیں۔ سامنے بالکل اندر ہرا تھا۔ دیواریں ہوئے سے تھوڑی تھوڑی روشنی اندر جانے لگی لیکن اسے نظر پکھنہ آیا۔

نکوڈر کے بعد کوئی چیز اندر سے آتی ہوئی محosoں ہوئی۔ وہ ایک کا لے رنگ کا تختہ تھا۔ جو پھسلتا آرہا۔ اس تختے پر تین سر رکھے ہوئے تھے۔ جو آپس میں پیوست تھے۔ وہ تختہ شق ہونی دیوار کے درمیان رک گیا۔

لب تانیہ کے سامنے تانبے جیسے رنگ کا ایک چڑھ تھا اور اسی چڑھے میں دائیں بائیں دو اور چہرے جڑے نہیں۔ اس کی آنکھیں بڑی اور پچکدار تھیں، وہ بار بار پلکیں جھپک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہی ہما تھا کہ وہ زندہ ہے ورنہ وہ کسی مجھسے کی طرح تھا۔

اُسکے عجیب و غریب شخصیت اس کے سامنے تھی۔ اس کو دیکھ کر خوف سامنوس ہو رہا تھا۔ اس کی نہیں اس کی آرہا تھا کہ وہ بولے گا کیسے۔ اس کی کئی ہوئی آدمی گردن تختے پر کھی ہوئی تھی۔

اُل، تانیہ پھر تو تیار ہے۔ "اچانک اس کے ہوتنوں میں جنہیں ہوئی۔

اُل، تین مورتی میں پوری طرح تیار ہوں۔" تانیہ نے بڑے اعتقاد کے ساتھ کہا۔
"لیکن تانیہ اب بھی وقت ہے۔ واپس لوٹ جا۔ تو تانی جسین ہے کہ میرا جی نہیں چاہتا کہ جسکے موت

یاں شیر سے معانی مانگ لو کر آئندہ تم ادھر نہیں آؤ گے۔ ورنہ یہ تمہیں چرچاڑ کر رکھ دے گا۔
یو جوان گھبرا کر کھاتا کہ مجھے معاف کر دو، میں آئندہ ادھر نہیں آؤں گا۔

تین مورتی کی کمانی جاری تھی کہ شیر کے ذکر کے ساتھ ہی ایک شیر تین مورتی کے پیچے سے اپنے مانگ غاہر ہوا تھا۔ تانیہ اس شیر کو دیکھ کر سُم گئی۔ تین مورتی نے اس شیر کو دیکھا اور پھر جلدی سے ہچرا ہوا تھا۔ تانیہ اس شیر کو دیکھ کر سُم گئی۔ تین مورتی نے اس شیر کو دیکھا اور پھر جلدی سے ہچرا ہوا تھا۔ تانیہ اس شیر کو دیکھ کر سُم گئی۔

ایک دم گھبرا گئی۔ اگر اس کی قوت گویائی سلب نہ ہوئی تو وہ یقیناً کہ دیکھ کر میں آئندہ ادھر آؤں گی۔ صور تھا، ہی کچھ اس طرح کی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے شیر کے حملے سے پیچے کے لئے نہیں کی کہ اس کی قوت گویائی بحال ہو جائے لیکن قوت گویائی بحال نہ ہو سکی اور وہ صرف اپنے لامو جبش دے کر رہ گئی۔

زف سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ لمحہ دور نہیں تھا کہ جب شیر اس کو پہنچوڑ کر رکھ دے پڑا ایک لمحہ گزرا۔ دوسرا گزرا۔ پھر انی لمحہ گزرا۔ شیر نے حملہ نہ کیا۔ شیر کے غرانے کی آواز لائی جاتا تھا۔ کمانی سنتے ہوئے اس کی شرطیہ ہوئی تھی کہ کمانی خاموشی سے سنا ہو گی۔ اگر درمیان میں بہت شوق تھا۔ وہ ہر رات ایک کمانی سنتی تھی۔ اس کی کمانی سنتے کے لئے روز ایک خوبصورت نوجوان کو بازی کی تھی۔ وہ شرط بھار جاتی۔ اسے فوراً موت کی نیند سلا دیا جاتا۔ بھلا ہو دادا عظیم کا انہوں نے بولے تو موت کے گھاث آتا دیجے جاؤ گے۔ اس طرح روز ایک خوبصورت نوجوان قتل کر دیا جاتا تھا۔

تانیہ تو جانتی ہے کیوں؟ ”تین مورتی نے اپنے مانگ سوال کیا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“ تانیہ کے بے رانہ لب پلے۔

”لے اسے چیز کر کے بھیجا تھا۔ ان کے عمل نے ہی اس وقت اسے بھیجا تھا۔ اس کے لب ضرور بلے لیکن آواز کوئی نہ لٹکی۔ اگر بیوں کی جنمیں کے مطابق آواز بھی برآمد ہو جائے بازی کی تھی۔ وہ شرط بھار جاتی۔ اسے فوراً موت کی نیند سلا دیا جاتا۔ بھلا ہو دادا عظیم کا انہوں نے اس مقابلے کے لئے اسے چیز کر کے بھیجا تھا۔ ان کے عمل نے ہی اس وقت اسے بھیجا تھا۔

”اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی، سن سکتی تھی لیکن بول نہیں سکتی تھی۔ تانیہ کو اب اندازہ ہوا کہ تین مورتی کس طرح فریب دے کر کمانی سنتے والے کو بولنے پر مجبور کر رہا ہے۔ یہ اس کا پہلا حملہ تھا جس سے وہ چھ گئی تھی۔ جواب نہ پا کر تین مورتی نے پھر کتنا شروع کیا۔

”ہاں تو کماں جاتی ہو گی۔ ہر روز ایک نوجوان اس لئے قتل کر دیا جاتا تھا کہ وہ ملکہ کی کمانی کو بول امتحانا۔ ملکہ کی خوب گاہ میں جانے والے کسی نوجوان کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ درمیان بول امتحانا۔ اور جس کام کو وہ آسان سمجھ کر اس کے سامنے پیش ہو جاتے تھے، وہ اس کو تمکی کمانی سنتی ہے۔ اور جس کام کو وہ آسان سمجھ کر اس کے سامنے پیش ہو جاتے تھے، وہ اس کو جان لیوا کیسے ہو جاتا ہے۔ وہ ملکہ اصل میں سارہ تھی۔ اس نے اپنے محل میں کئی شیر پال رکھ تھے۔ یونہی آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔ کمانی سنتے کے درمیان بھی کوئی نہ کئی شیر اس کی خوب گاہ میں تھی۔ آتھا۔ اور وہ ملکہ کے سامنے کسی اجنبی نوجوان کو بیخدا دیکھ کر بگز امتحانا۔ وہ اس نوجوان کو جلد آتھا۔ ملکہ ایک طرف ڈاٹ کر اپنے شیر کو روکنے کی کوشش کرتی تو دوسرا طرف اس نوجوان کو ہو جاتا۔ ملکہ ایک طرف ڈاٹ کر اپنے شیر کو روکنے کی کوشش کرتی تو دوسرا طرف اس نوجوان کو

”لے اس کے بعد تین مورتی کا چڑھا بائیں جانب گھوم گیا۔ اب تانیہ کے سامنے تین مورتی کا دوسرا چڑھا بائیں آتے ہی اس چڑھے میں زندگی دھکائی دی۔“

”انہوں تو بڑی خوش قسمت ہے کہ تو نے میری پہلی کمانی بغیر درمیان میں بولے سن لی۔ اب میں

کے گھاث آتار دوں۔ تو اس بڑھے کامنگ کے ہاتھ کہاں سے لگ گئی۔“

”تو اس بات کو چھوڑ کر میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں۔ تو مجھ پر مریان ہونے کی کوشش نہ کر۔ جبکہ بقول تیرے مریانی نام کی کوئی چیز تیرے پاس نہیں۔ چل اب اپنی کمانی شروع کر۔“ تانیہ نے دوٹک انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے تو اگر مریانی چاہتی ہے تو مجھے کیا۔ میں کیوں نکل کروں۔ میں پہلی کمانی شروع کرنے سے پہلے تجھے ایک مرتبہ اور تینیہ کر دیتا چاہتا ہوں۔“ یہ کہ کردہ چند لمحوں کو رکا۔

اتی دیر میں تانیہ نے دادا عظیم کا تباہیا ہوا عمل دہرا لیا۔

”دیکھ۔ میری کمانی شروع کرتا ہے سننا۔ اور جب تک میں یہ نہ کہ دوں کہ میری کمانی ختم ہو گی تو وقت تک نہ بولنا۔ اگر درمیان میں بولی تو شرط بھار جائے گی اور تجھے موت کے گھاث آتار دیا جائے گی۔“ تانیہ نے ٹھیک ہے۔“

تانیہ نے اثبات میں گردن پلائی۔ بولی کچھ نہیں۔

”اب میں کمانی شروع کرتا ہوں۔ کسی ملک کی ایک ملکہ تھی، بہت خوبصورت۔ اسے کمانی سنتے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر رات ایک کمانی سنتی تھی۔ اس کی کمانی سنتے کے لئے روز ایک خوبصورت نوجوان کو لایا جاتا تھا۔ کمانی سنتے ہوئے اس کی شرطیہ ہوئی تھی کہ کمانی خاموشی سے سنا ہو گی۔ اگر درمیان میں بولے تو موت کے گھاث آتار دیجے جاؤ گے۔ اس طرح روز ایک خوبصورت نوجوان قتل کر دیا جاتا تھا۔“

”تانیہ تو جانتی ہے کیوں؟“ تین مورتی نے اپنے مانگ سوال کیا۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“ تانیہ کے بے رانہ لب پلے۔

”اس کے لب ضرور بلے لیکن آواز کوئی نہ لٹکی۔ اگر بیوں کی جنمیں کے مطابق آواز بھی برآمد ہو جائے بازی کی تھی۔ وہ شرط بھار جاتی۔ اسے فوراً موت کی نیند سلا دیا جاتا۔ بھلا ہو دادا عظیم کا انہوں نے اس مقابلے کے لئے اسے چیز کر کے بھیجا تھا۔ ان کے عمل نے ہی اس وقت اسے بھیجا تھا۔

”اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی، سن سکتی تھی لیکن بول نہیں سکتی تھی۔ تانیہ کو اب اندازہ ہوا کہ تین مورتی کس طرح فریب دے کر کمانی سنتے والے کو بولنے پر مجبور کر رہا ہے۔ یہ اس کا پہلا حملہ تھا جس سے وہ چھ گئی تھی۔ جواب نہ پا کر تین مورتی نے پھر کتنا شروع کیا۔

”ہاں تو کماں جاتی ہو گی۔ ہر روز ایک نوجوان اس لئے قتل کر دیا جاتا تھا کہ وہ ملکہ کی کمانی کو بول امتحانا۔ ملکہ کی خوب گاہ میں جانے والے کسی نوجوان کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ درمیان بول امتحانا۔ اور جس کام کو وہ آسان سمجھ کر اس کے سامنے پیش ہو جاتے تھے، وہ اس کو تمکی کمانی سنتی ہے۔ اور جس کام کو وہ آسان سمجھ کر اس کے سامنے پیش ہو جاتے تھے، وہ اس کو جان لیوا کیسے ہو جاتا ہے۔ وہ ملکہ اصل میں سارہ تھی۔ اس نے اپنے محل میں کئی شیر پال رکھ تھے۔ یونہی آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔ کمانی سنتے کے درمیان بھی کوئی نہ کئی شیر اس کی خوب گاہ میں تھی۔ آتھا۔ اور وہ ملکہ کے سامنے کسی اجنبی نوجوان کو بیخدا دیکھ کر بگز امتحانا۔ وہ اس نوجوان کو جلد آتھا۔ ملکہ ایک طرف ڈاٹ کر اپنے شیر کو روکنے کی کوشش کرتی تو دوسرا طرف اس نوجوان کو

”ہو جاتا۔ ملکہ ایک طرف ڈاٹ کر اپنے شیر کو روکنے کی کوشش کرتی تو دوسرا طرف اس نوجوان کو

ی ملی جائے تو اپسانی بابر تکل جائے گی۔
ہر کر کے اس نے سرگ میں قدم رکھے۔ پیچھے سے جتنی روشنی آرہی تھی اس روشنی میں وہ تیز تیز
میں پالا خود روشنی محدود ہوتے ہوئے بالکل ختم ہو گئی اور گھوڑا اندر چھا گیا۔
تینی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں کھلی رکھنے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ نظر تو کچھ آئیں رہا
اللہ کا نام لے کر وہ چلتی رہی۔ چلتے چلتے وہ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر دیکھ لیتی تھی۔
پڑی گئے درختوں کے درمیان والا تاریک راستہ بھی کٹ گیا۔ تینی کو اب دروازہ نظر آرہا تھا۔ اور
دروازے پر پیلے رنگ کے کپڑے پہنے ایک اونچ قدر کا شخص نظر آیا۔ وہ سرے پیر تک ڈھکا ہوا تھا۔
پا چڑھے بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ یہ چادر بھی پیلے رنگ کی تھی۔ اس کے پیروں میں لکڑی کی انگوٹھے
اکٹھاویں تھیں۔
تینی کو دیکھتے ہی اس ڈھکے چھپے شخص نے دروازہ کھول دیا۔ اور تینی کا انتظار کرنے لگا۔ جب تینی
پ آئی تو اس نے ڈھکے ہوئے چرسے سے ہی اسے دیکھ لیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر نکلنے کے
نکاوار پھر خود بھی اس کے پیچھے پل جل دیا۔
دروازے سے نکتھی تینی تیز تیر چلتی بلکہ ترقیاً دوڑتی ہوئی سڑھیوں پر پہنچ گئی۔ اس نے پہلی سڑھی
لڑے ہو کر پیچے دیکھا۔ کاشنگن بے چینی سے شل رہا تھا۔ اس کی جیسے ہی تینی پر نظر پڑی وہ خوشی سے
لڑ ہو گیا۔
اور ہر سے تینی سڑھیاں اترنے لگی اور اور سے کاشنگن سڑھیاں چڑھنے لگا۔ تینی اتنی سڑھیاں اتر
لے پائی۔ جتنی سڑھیاں کاشنگن نے چڑھ لیں۔

”ایا ہوا تانیہ؟“ وہ اس کے سامنے پہنچ کر بے قراری سے بولا۔
”خُ۔“ تینی نے ایک لفظ کہا۔ اس لفظ میں ایسا جاودہ بھرا تھا کہ کاشنگن خوشی سے چیخ اٹھا۔
”لہ، زبردست۔“ پھر اس کی نظر اس ڈھکے چھپے شخص پر پڑی جو بڑے اطمینان سے ایک ایک
کے سڑھیاں اترتا چلا آرہا تھا۔
”یہ کون ہے؟“ کاشنگن نے حیرت سے پوچھا۔
”نچھے نہیں معلوم۔“ تینی نے اس اترتے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ دروازے پر ملا
نہیں سے ساختہ آ رہا ہے۔“
لہبہ وہ ڈھکا چھپا شخص ان کے نزدیک آپکا تھا۔ پھر وہ بغیر کچھ بولے۔ سڑھیاں اترتا چلا گیا۔ وہ
لہل بھی سڑھیاں اترنے لگے۔

”تینی مورتی نے کیا دیا؟“ کاشنگن نے پوچھا۔
”کچھ نہیں، بس اپنی نکست کا اعتراف کیا اور کماں بوجا۔ تو جو چاہتی ہے ویسا ہو جائے گا۔“ تینی
نکتھا۔
”تینی، تم نے تو کمال کر دیا۔ تم نے اسے کیسے ہرادیا۔“ کاشنگن کا خوشی کے مارے دم پھول رہا

دوسری کمانی شروع کرتا ہوں، سن۔ ”تینی مورتی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔
تینی نے لب کھولے بغیر اسے دوسری کمانی شروع کرنے کا اشارہ کیا۔
دوسری کمانی بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔ اس کمانی میں جگہ جگہ چندے تھے۔ کھانیاں اور خوش
تھیں۔ شعبدہ گری تھی۔ پر فریب نظارے تھے۔ لیکن تینی ان سب سے بخیر خوبی گزر گئی۔ وہ کچھ
بولی، وہ کیوں کر بولتی۔
دوسری کمانی بھی ناکام ہوئی۔ دوسرا چھرہ پتھر ہو گیا۔
اب تینی مورتی کا تیسرا چھرہ سامنے آیا۔ یہ چورہ تیسرا کمانی کے نام پر تیسرا فریب لایا۔ اس نے طعن
طرح کے چھکنڈے استعمال کئے۔ تینی کی خاموشی توڑنے کے لئے بے شمار طریقے استعمال کئے لیکن تینی
ش سے مس نہ ہوئی۔ وہ پورے اطمینان سے کمانی کے نام پر اس کی بکواس سنتی رہی۔
پھر اس نے تیسرا کمانی کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی تینی کا چھرہ کل
انھا۔ جبکہ تینی مورتی کا تیسرا چھرہ مر جا گیا۔ اداں اور دیران ہو گیا۔
تب اس نے دھیرے سے اعلان کیا۔ ”میں ہارا تو مجھتی۔“
اس اعلان کو سن کر تینی جھوم اٹھی۔ اس نے جلدی جلدی قوت گویائی کی بحال کا عمل کیا۔ اور مجھے
ہی آخری بار اس نے وہ اسم دہرایا جو دادا عظم نے بتایا تھا، اس کے دہراتے ہی اس کی قوت گویائی بحال
پہنچ گئی۔

”تینی مورتی اب تو کیا کہتا ہے۔“ تینی نے خوش ہو کر کہا۔
”تو بہت بڑی سارہ ہے، مجھ سے بھی بڑی۔ میں آج تک نکلت سے دوچار نہیں ہوا لیکن تو نے ایسا
کر دکھایا۔“ تینی مورتی نے بہت اداں لجھے میں کہا۔
”اللہ کے واسطے مجھے سارہ کہہ کر میری توہین نہ کر۔“ تینی نے سبیدگی سے کہا۔ ”اب وہ بات
کر جس کے لئے میں بیان آئی ہوں۔“

”اب تو کیا چاہتی ہے۔“ تینی مورتی نے پوچھا۔
”راشمنوں کے حکر کا توڑ، کا دریا اور اس کی بیٹی ساربری سے اس کی آزادی۔“ تینی نے بتایا
”نمیک ہے، اب تو جا..... تو جو چاہتی ہے وہ ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر تینی مورتی بہت تیری سے پہنچ
ہٹا۔ تخت پر کھی ہوئی گردن اور اس میں جڑے تین سر اچانک پیچھے ہٹ کر اندر ہیرے میں غائب ہو گئے۔
اور فوراً ہی وہ دیوار آپس میں مل گئی۔
تینی کمرے میں تمارہ گئی۔
اس کمرے میں ایک بی راستہ تھا جو سرگ کی طرف جاتا تھا۔ تینی فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور
دروازے کی طرف بڑھی۔ اس سرگ کی طرف جاتا تھا۔ تینی کو اس سرگ سے گزرتے ہوئے اس بات کا نہ
تھی۔ اب اس کو راہ دکھانے والا کوئی نہ تھا۔ تینی کو اس سرگ سے گزرتے ہوئے اس بات کا نہ
ضرور ہو گیا تھا کہ راستہ بالکل صاف اور سیدھا ہے اندھیرا ضرور ہے لیکن اگر وہ سرگ میں داخل ہو

کاشن اور تانیہ کو اس کی تقلید کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ علی اگرچہ کاشن کا تھا لیکن وہ ڈھکا چھپا شخص سیرھیاں چڑھ کر محل میں کچھ اس طرح داخل ہوا جیسے دہ کماں ہو۔ اور دچپ بات یہ کہ محل کے دروازے پر تیزہ بروار حافظت نے بھی اسے روکنے کی کوشش سنی بلکہ اس نے جھجک کر اس ڈھکے چھپے شخص کو قبیلہ کے کر اندر جائے کی اجازت دے دی۔ اس کے پیچھے کاشن اور تانیہ داخل ہوئے۔ وہ بست تیز چل رہا تھا۔ اس کے اس قدر تیز چلے سے یہ ماسی نہیں ہوا کہ اس کامنہ ڈھکا ہوا ہے۔ پتہ نہیں وہ منہ پر پڑی چادر میں سے کس طرح سے دیکھے اُن پر فرش پر اس کی لکڑی کی کھڑاویں بست زور سے نج کری تھیں۔

ہل کے مختلف راستوں سے ہوتا ہوا بالآخر اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جس میں راشمون بیٹھیے کے تابوت میں بند لیتا تھا۔ اس نے پلت کر کاشن اور تانیہ کو دیکھا جو تیری سے کمرے کی بیکھی میں جا بیٹھا تھا۔

جب کاشن اور تانیہ بیکھی کے نزدیک پہنچے تو اس ڈھکے چھپے شخص نے ایک طرف ہو کر گویا ان دونوں کو جگہ دے دی۔ بیکھی میں تین آدمی بڑے آرام سے بیٹھے کتے تھے۔ تانیہ سے پلے کاشن کچھے کا اس منه ڈھکے شخص نے کاشن کو بیکھی میں بیٹھنے سے روک دیا۔ وہ بولا کچھ نہیں، صرف ہاتھ کا شمارہ کیا۔

کاشن فوراً پیچھے ہٹ گیا اور اس نے تانیہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تانیہ بیکھی کے ایک کونے میں بیٹھنے والے دوسرے کونے میں بیٹھا تھا۔ پھر اس ڈھکے چھپے شخص نے ہاتھ کے اشارے سے بیکھی چلانے کیا۔

کاشن نے اپنے سلیکے سے کوئی آگے آنے کو کہا۔ پھر اس نے انی میں سے ایک گھوڑا اپنے نتھب کر لیا۔ اور خود بیکھی کے پیچھے آگیا۔

”چلو۔“ کاشن نے چلا کر حکم دیا۔ اس کے حکم کے ساتھ ہی یہ چھوٹا سے قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

بیکھی تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ تانیہ بیکھی کی کھٹکی سے بھی کاشن کو گھوڑا دوڑاتے اور بھی اس پلے کپڑوں میں لمبوس اس پر دھیں کو دیکھ رہی تھی جو بیکھی کے ایک کونے میں دبا بیٹھا تھا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا تھا۔ اس میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ تانیہ کاشن نے بھی اس سے کوئی سوال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید دونوں کو یہ امید تھی کہ ان چار کے پیچھے ان کی مشکل کا حل موجود ہے۔ تین مورتی نے اسے ان کے ساتھ روانہ کیا۔

تانیہ نے سوچا کہ اس شخص سے پوچھنے کا وہ کون ہے اور اس نے پانچ ماہ کیوں ڈھک رکھا ہے۔ اس نے پانچ ماہ اداہ ملتوی کر دیا۔ کیا پانچ ماہ کو ہلنے اور پکھ بولنے سے سحر کا توڑ بے اثر ہو جاتا ہے۔ لہذا انہی نے خاموشی میں ہی بھلا جانا۔ پھر یہ چھوٹا سا قافلہ پانچ ماہ مکمل کر کے کاشن کی بستی میں پہنچ گیا۔ بیکھی کے رکتے ہی وہ ڈھکا چھپا شخص بلا تاخیر بیکھی سے اتر گیا۔ کاشن کا سونے کا محل کافی اونچا ہے۔ اس کے محل تک جانے کے لئے سگ مرمر کی سیرھیاں تھیں۔ وہ شخص تیزی سے سیرھیاں چڑھنے

اس ڈھکے چھپے قدم اور شخص نے راشمون کے جسم کو اپنے ہاتھ پر اٹھا کر فرش پر رکھ دیا۔ اور خود بیکھی کی تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ اس نے پیڑ کے اگوٹھے میں ڈال لی اور دوسرا کھڑاویں اس نے راشمون کے منہ پر پہنچا گیا۔ ایک کھڑاویں اس نے پیڑ کے اگوٹھے میں ڈال لی اور دوسرا کھڑاویں اس نے دو تین گرے گرے کھڑا۔ بس پھر چند سینٹنڈ لگے۔ ادھر کھڑاویں منہ پر رکھی گئی اور راشمون نے دو تین گرے گرے کھڑا لئے اور پھر اس طرح آنکھیں کھول دیں جیسے گھری نیند سے جا گا ہو۔ راشمون نے فوراً مٹھنا چاہا۔ لیکن اس ڈھکے چھپے شخص نے اسے اپنی کھڑاویں کا ڈال ڈال کر اسے اٹھنے سے روک دیا۔ تب اس نے تین کھڑاویں کو جسم کے ہر حصے پر پھرایا اور پھر خود اٹھتے ہوئے راشمون کو بھی ساتھ اٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ کھڑاویں کو یا تو اس نے راشمون کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور دیر تک رکھ رکھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پر کہہ رکھے کچھ پڑھنے میں مشغول ہو۔

جب تک وہ پاس سارے شخص راشمون کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا، راشمون کی آنکھیں بند رہیں جیسے ہی اس نے ہاتھ ہٹایا، راشمون نے آنکھیں کھول دیں۔ سب سے پہلے اس کی نظر کاشن پر پڑی۔ وہ بے قبول تک باپ سے لپٹ گیا۔

”دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ تم میری امید کا آخری چراغ ہو۔ تم ضرور کامیاب ہوگی۔“ ”کامیاب تو میں خود کو اس وقت سمجھوں گی جب راشمون کو ہوش آجائے گا اور وہ اٹھ کر آپ کے گلے لگ جائے گا۔“ تانیہ نے فکر مندی سے کہا۔

”ایسا ہی ہو گا تانیہ۔ میرا دل کھتا ہے۔“ کاشن نے بڑے یقین سے کہا۔

تانیہ کچھ جواب دینا چاہی رہی تھی کہ اس کے منہ سے اچانک نکلا۔ ”ارے۔“ ”کیا ہوا؟“ ”وہ بیکھی میں پیٹھ گیا ہے۔“

کاشن نے بیکھی پر نظر ڈالی تو اسے پیالا بس نظر آیا۔ وہ ڈھکا چھپا شخص تیری سے سیرھیاں اتر کر بیکھی میں جا بیٹھا تھا۔

جب کاشن اور تانیہ بیکھی کے نزدیک پہنچ تو اس ڈھکے چھپے شخص نے ایک طرف ہو کر گویا ان دونوں کو جگہ دے دی۔ بیکھی میں تین آدمی بڑے آرام سے بیٹھے کتے تھے۔ تانیہ سے پلے کاشن کچھے کا اس منه ڈھکے شخص نے کاشن کو بیکھی میں بیٹھنے سے روک دیا۔ وہ بولا کچھ نہیں، صرف ہاتھ کا شمارہ کیا۔

کاشن فوراً پیچھے ہٹ گیا اور اس نے تانیہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تانیہ بیکھی کے ایک کونے میں بیٹھنے والے دوسرے کونے میں بیٹھا تھا۔ پھر اس ڈھکے چھپے شخص نے ہاتھ کے اشارے سے بیکھی چلانے کے لئے فتح کر لیا۔ اور خود بیکھی کے پیچھے آگیا۔

”چلو۔“ کاشن نے چلا کر حکم دیا۔ اس کے حکم کے ساتھ ہی یہ چھوٹا سے قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔

بیکھی تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ تانیہ بیکھی کی کھٹکی سے بھی کاشن کو گھوڑا دوڑاتے اور بھی اس پلے کپڑوں میں لمبوس اس پر دھیں کو دیکھ رہی تھی جو بیکھی کے ایک کونے میں دبا بیٹھا تھا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا تھا۔ اس میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ تانیہ کاشن نے بھی اس سے کوئی سوال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید دونوں کو یہ امید تھی کہ ان چار کے پیچھے ان کی مشکل کا حل موجود ہے۔ تین مورتی نے اسے ان کے ساتھ روانہ کیا۔

تانیہ نے سوچا کہ اس شخص سے پوچھنے کا وہ کون ہے اور اس نے پانچ ماہ کیوں ڈھک رکھا ہے۔ اس نے پانچ ماہ اداہ ملتوی کر دیا۔ کیا پانچ ماہ کو ہلنے اور پکھ بولنے سے سحر کا توڑ بے اثر ہو جاتا ہے۔ لہذا انہی نے خاموشی میں ہی بھلا جانا۔ پھر یہ چھوٹا سا قافلہ پانچ ماہ مکمل کر کے کاشن کی بستی میں پہنچ گیا۔

بیکھی کے رکتے ہی وہ ڈھکا چھپا شخص بلا تاخیر بیکھی سے اتر گیا۔ کاشن کا سونے کا محل کافی اونچا ہے۔ اس کے محل تک جانے کے لئے سگ مرمر کی سیرھیاں تھیں۔ وہ شخص تیزی سے سیرھیاں چڑھنے

اے کیا ہو گیا ہے۔ کہیں راشمون اس کے دل میں تو نہیں اتر گیا۔ کہیں اسے اس سے محبت تو نہیں۔ کیا اسی کو محبت کہتے ہیں، کیا ایک دوسرے کی طرف بے اختیار نظر س اٹھ جانے کا نام ہی

ہے؟
بلا کیا نام ہے ان کا۔ ” راشمون گویا ہوا۔
پہنچنے ہے۔ ” کاشنگن نے بتایا۔

تانية ” راشمون نے اس کا نام بڑے پیار بھرے لہجے میں دہرا دیا۔ ” تانية میں تمہارا بہت شکر
ہے۔ ”

اب کیا خیال ہے، اس ساحرہ کے علاقے کی طرف پھر جائیں گے؟ ” تانية نے نہ کہا پوچھا۔
بھول کر بھی نہیں۔ ” راشمون نے کان پکڑے۔ ” توہہ میری۔ ”

کیا کادیری کی بیٹی سب ابر بربت حسین تھی کہ اسے دیکھتے ہی اپنے ہوش گنو اپنے۔ ” تانية نے اسے

جواب میں پکھ کرنا چاہتا تھا کوئی خوبصورت بات لیکن باپ کا خیال کر کے محض مسکرا کر رہ گیا۔
ہاں، تانية، وہ کہاں چلا گیا۔ ” کاشنگن کو اب وہ پراسرار شخص یا و آیا۔

تانية اسے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیں خوشی دے کر خاموشی سے نکل گیا۔ ” تانية نے
بلا کون تھا یہ۔ ” راشمون نے پوچھا۔

” مجھے تو یہ محوس ہوتا ہے کہ مجیسے تین مورتی خود تھا۔ ”
” تین مورتی! ” تانية جیران ہو کر بولی۔ ” تین مورتی کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے تو تین منہ ہیں۔ اور
کے سوا وہ کچھ نہیں۔ ”

تانية، وہ تین مورتی ہے۔ ساروں کا بادشاہ۔ وہ کوئی بھی روپ اختیار کر سکتا ہے۔ ” کاشنگن

ہلکا بحث کا کیا فائدہ..... وہ جو بھی تھا راشمون کو ٹھیک کر گیا۔ اور اس طرح تین مورتی نے اپنا
اہواز۔ ورنہ میں تو ذور ہی تھی کہ کہیں وہ غلست کھا کر اپنے وعدے سے پھرنا جائے۔ ” تانية نے

ایک وعدہ میں نے بھی تم سے کر رکھا ہے۔ ” کاشنگن نہ کہا۔

” کیا؟ ” تانية نے پوچھا۔

اُسے بھول گئیں۔ میں نے کہا تھا کہ اگر تم تین مورتی کے دربار سے کامیاب واپس آگئیں تو تم جو
” میں تمیں دوں گا۔ اب وعدہ نہماں کا وقت آگیا ہے۔ بولو کیا مانگتی ہو۔ ” کاشنگن نے ہوش
لئے

تم کیا مانگو؟ ” تانية نے مجیسے خو سے سوال کیا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس نے راشمون

یہ وہ لمحہ تھا جس کے لئے تانية نے اپنی زندگی واپس پر لگادی تھی۔ وہ باپ بیٹے کو بے اختیار ملے لے کر
کر خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اور جب کاشنگن دفور جذبات میں اپنے بیٹے کو لپٹانا ہوئے تھا اور تانية اس منظر کو دیکھ کر ایک بارہ تھی
تو اس پر اسرا ر شخص نے اپنی دلوں کھڑا ویس اپنے ہاتھ میں پکڑیں اور بے آواز دروازے سے بہر کھل گیا
اس کے نکلے کا کسی کو احساں بھی نہ ہوا۔

تانية نے اپنے آنسو پوچھے تو وہ پر اسرا ر شخص کرے میں موجود نہ تھا۔ وہ دروازے کی طرف بھاگی۔
لیکن اس وقت تک وہ اس کی پہنچ سے بہت دور جا پا تھا۔ جانے وہ شخص کون تھا۔ کم از کم جانے سے پہلے

وہ اپنی صورت تو کھاتا تھا۔ یہ بتا جاتا کہ وہ کون ہے۔ لیکن وہ جس طرح اسرا ر کے پردے میں لپٹا ہوا ایسا
قہا۔ ویسے ہی واپس چلا گیا۔

اس کے بارے میں تانية کچھ نہ جان سکی۔
” کاشنگن، وہ چلا گیا۔ ” تانية نے کمرے میں واپس آکر اپنی آواز میں کہا۔

اس آواز پر سب سے پہلے راشمون چونا۔ اس نے اپنے باپ کے کندھے سے سراخایا اپنے سامنے
ایک مد جیں کو دیکھا۔ اس کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کمرے میں کاشنگن کے علاوہ بھی کوئی
اور ہو سکتا ہے۔ اس نے تانية کو دیکھا تو اپنی نظریں ہٹاتا بھول گیا۔

تانية اگر حسین تھی تو وہ بھی کسی سے کم نہ تھا۔ اسے دیکھنے والا بھی بن دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔
تانية اور راشمون کی جب نظریں میں تو یوں محسوس ہوا جیسے کہیں دور پہاڑوں پر بکھل چکی ہو، دور تک

رُوزنی ہی روشنی ہو گئی۔ اور پھر ٹھیڈی پھواری پڑنے لگی۔

” بہا، یہ کون ہیں؟ ” راشمون اپنے باپ سے الگ ہو کر تانية کی طرف بڑھا۔
” راشمون کیا تو جاتا ہے کہ تو وہ سال کے بعد جا گا ہے۔ ”

” بابا..... وہ سال؟ ” راشمون جیران رہ گیا۔
” ہاں، وہ سال۔ ” کاشنگن نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ” اور ان وہ سالوں میں
میں نے تمیرے لئے کیا کیا کہا۔ لیکن کادیری کے سحر کا توزہ نہ لاسکا۔ تب یہ لڑکی قسمت سے میرے ہاتھ
لگ گئی۔ اسے کنوئی کی ملوق میرے پاس لالی تھی۔ یہ انسان ہے۔ یہ اتنی مہریان ٹاہت ہوئی کہ اس نے

اپنی زندگی واپس پر لگا کر تیری زندگی بچا لی۔ کس قدر عظیم ہے یہ لڑکی۔ راشمون اسے مجھہ کر۔ ”

راشمون باپ کا حکم سن کر فوراً تانية کے قدموں میں بھکنے لگا۔ تانية بست تیزی سے پچھے ہٹ گی
اور نور سے چھپی۔ ” نہیں، ہر گز نہیں۔ میری نیکی بر باد نہ کریں۔ ”

تب راشمون اٹھ گیا۔ تانية نے ٹھکرایا۔ راشمون کو دیکھ کر ایک عجیب سا حساس اس کے دل میں جا گا تھا۔ ایسا تو کہیں نہیں ہوا تھا۔ وہ جب گل

راشمون کی طرف دیکھتی اس کے دل کی وہر کن بے اختیار ہو جاتی۔ اور جب وہ تانية کی طرف دیکھنے کا فوراً
پکلوں کی چلسن ڈال لیتی۔ اور ہونٹوں پر خود بخود ایک مہر مسکان بج جاتی۔

کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ تانیہ اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”راشمن میں کیا ماگلوں۔“

”تانیہ، مجھے ملک لو۔“ راشمن نے بے اختیار کما لیکن اپنے دل میں اور پھر ہونوں پر جو بات آئی۔ وہ کچھ یوں تھی۔ ”اپنے دل کا کامانو..... جودہ کے مانگو۔“

”دل۔“ تانیہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میرے دل میں تو بس میرا بھائی بسا ہے۔ جو آپ کی دنیا میں کھو گیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈنے نکلی تھی۔“

”اوہ، میں بھی کتنا خود غرض ہوں۔ تم سے صرف اپنی کھتارہ۔ تم سے تماری سنی ہی نہیں۔ نہیں جانا کہ چاہ وفات میں کیسے پہنچیں۔ وہاں تمیں کون دھکیل گیا۔ معاف کرنا تانیہ..... مجھے معاف کرو بننا۔“

”بابا، اس کمرے سے باہر چلیں، یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔ انہیں کچھ دیر آرام کرنے دیں۔“ راشمن نے کما اور دروازے کی طرف بڑھا۔

”ہاں، راشمن تم تھیک کہتے ہو۔“ کاشنگن بھی اس کے تھے چلا۔ ”آؤ، تانیہ۔“ پھر کاشنگن کے حکم کے مطابق تانیہ کو دو کنیزوں نے اس کی خواب گاہ میں پہنچا دیا۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ وہ کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دور پہاڑوں میں ڈوبتے سورج کا نظارہ کرنے لگی۔

پتہ نہیں یہ کون سا سورج تھا۔ اپنی دھرتی کا سورج تھا یا ان لوگوں کی دنیا کا آتاب۔ وہ کمال سے پکماں آگئی تھی۔ جانے اس کا بھائی کس حال میں ہو گا۔ تانیہ نے محسن راؤ کو اس کی جھونپڑی میں جوڑا تھا۔ بقاں اسے جھونپڑی سے پکڑ کر لے گئی تھی۔ اور محسن راؤ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بقاں نے اسے اپنے بھائی راکل کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ راکل نے اسے حاصل کرنے کے جانے کئے جتن کے تھے لیکن وہ ناکام رہا تھا اور اپنی بخشست کا انتقام لینے کے لئے اس نے تانیہ کو چاہ وفات میں پھنسکوادیا تھا۔ اس کی خوش تھتی تھی کہ کنویں کی مخلوق نے اسے گرتے ہوئے دیکھ لیا اور اعلیٰ ہوئے ہیں جوڑا میں جانے سے بچا لیا۔ ورنہ وہ اب اس خوبصورت خواب گاہ میں زندہ سلامت مہ بیٹھی ہوتی۔ اس کا بڑیاں تک پکھل کر اپنا وجود کھو بیٹھی ہوتی۔

وہ اس تصور سے ہی کاپ گئی۔ سورج پہاڑوں کے پیچے غروب ہو چکا تھا۔ تینی سے اندر ہمیشہ جاہا تھا۔ تانیہ نے پردہ برابر کر دیا اور گھوی تو اس نے دیکھا، کمرے میں دو کنیزیں فانوس روشن کر دیں۔

وہ فانوس روشن کر کے اس کی طرف بڑھیں اور بہت مودب انداز میں بولیں۔ ”ہمارے لئے کوئی حکم۔“

”کچھ نہیں، میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔ شوق سے۔ اگر اجازت ہو تو ہم آپ کا جسم دبادیں۔“

”نہیں۔“ تانیہ نے مجھ پر ساجواب دیا۔

”پھر ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔ کچھ تو تیامیں۔“

”عمل میں کیا ہو رہا ہے۔“

”چوغال کیا جا رہا ہے۔ رات کو زبردست جشن منایا جائے گا۔“ ایک کینرے کما۔ ”آپ کچھ کسے لئے سو جائیں پھر آپ کو جشن کے لئے تیار کیا جائے گا۔“

”کیا مطلب!“ تانیہ حیران ہو کر بولی۔

”مطلب تو ہمیں نہیں معلوم۔ ہم سے بس تیار کرنے کے لئے ہی کہا گیا ہے۔“

رات کو محل میں زبردست جشن منایا گیا۔ اس بھتی کے تمام امراء کو مدعا کیا گیا۔ تانیہ کو زرق برق لپھنا کر سب سے خوبصورت اور سب سے اپنی کرسی پر بھیجا گیا۔

رقص و موسيقی جاری تھی۔ ہر طرف رنگ و نور کی بارش ہو رہی تھی۔ سب کی نظریں تانیہ پر تھیں۔ کا صحن انگھوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ راشمن اس کے برابر دوسری کرسی پر جو اس سے ذرا پتھری تھی،

باقا تھا۔ جبکہ کاشنگن ایک چھوٹے سے تخت پر رہا جان تھا۔

آنے والے مہمان تانیہ کے قدموں میں تھے ڈھیر کرہے تھے۔ سب سے آخر میں کاشنگن نے اپنا نہ پیش کیا۔ وہ ہیروں کا لشکارے مارتا ہوا تھا۔ کاشنگن نے اپنے ہاتھ سے اس چمکتے ہار کو پہنایا تو تانیہ کا

عن مزید بچکا اٹھا۔ راشمن اسے مبہوت ہو کر دیکھنے لگا۔

تانیہ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس کی نظریوں کی تاب نہ لاسکی۔ تانیہ نے فوراً اپنی ہاں پیچ کر لیں۔ اس کا دل ایک دم دھرک اٹھا تھا۔ یہ اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔

جشن ختم ہوا تو کاشنگن اس کے ساتھ ہی اس کی خواب گاہ میں آگیا۔ وہ اس سے اس کی کمائی سننا چاہتا

تھا۔ تانیہ نے اسے اپنی زندگی کی کمائی سنادی۔ وہ کون ہے۔ کماں سے آئی ہے۔ چاہ وفات میں اسے بدل پھیکا گیا۔ ہر وہ بات بتا دی جو کاشنگن سننا چاہتا تھا۔

ماری داستان سننے کے بعد کاشنگن نے ایک گمراہی لیا اور بولا۔ ”اب تم کیا چاہتی ہو؟“

”کسی طرح اپنے بھائی تک پہنچا چاہتی ہوں۔“ تانیہ نے کما۔

”کب جانا چاہتی ہو؟“ کاشنگن نے پوچھا۔

”میرا بس چلتے تو ابھی۔“

”خیریہ تو ممکن نہیں ہے۔“ کاشنگن نے زم لجھ میں کما۔

”پھر سچھی صبح۔“ تانیہ بولی۔

”کچھ دن ہمارے ساتھ رہو۔“ کاشنگن نے درخواست کی۔

”میں رہ سکتی۔“ تانیہ نے کا ساجواب دیا۔

”مجھ سے کچھ مانگو گی بھی نہیں۔“ کاشنگن نے پوچھا۔

”آپ نے اتنا قیمتی ہار دے دیا۔ اب اس کے بعد مالکنے کو کیا رہ گیا۔“

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم کو تو یہ سونے کا محل تمہارے حوالے کر دوں۔"

"نہیں شکریہ..... میں سونے چاندی کے اس محل کا کیا کروں گی۔ مجھے اپنی دنیا میں والپس جانا ہے۔ وہاں یہ محل جانیں سکتے۔" تانیہ نے پس کر کما۔

"ایک بات کوں، برآ تو نہیں مانوں گی۔"

"نہیں مانوں گی آپ کمیں جو کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں نے راشمون کی آنکھوں میں تمہاری روشنی دیکھی ہے۔" کامنگ نے ایک عجیب بات کی۔

"میں جانتی ہوں، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"جب جانتی ہو تو وہ کیوں نہیں جاتیں۔ میرے لئے راشمون کے لئے ہم سب کے لئے رک جاؤ۔ دیکھو اس مختصر سے عرصے میں لوری کا شکن کی بیتی تمہاری گرویدہ ہو گئی ہے۔" کامنگ نے بت محبت کیا۔

"میں آپ سب کی شکر گزار ہوں، میں کیا کروں، مجھے ہر قیمت پر اپنی دنیا میں جانا ہے۔ وہاں پکج لوگ میرے منتظر ہیں۔ وہاں جا کر ان سے کچھ حساب کتاب لینا ہے۔" تانیہ کچھ نہ بھول تھی۔

"اچھا۔" کامنگ نے اوسی سے اسے۔ "جیسی تمہاری مریضی۔ میں بہرحال زندگی پر تھیں نہیں بھول سکوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تم آرام کرو۔ صبح آسمان پوالے نے چاہا تو تمہارے جانے کا کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ میں کنوں کی خلوق کو طلب کرنا ہوں۔"

"کامنگ، میں بھی ہیشہ آپ کو یاد رکھوں گی۔" تانیہ بولی۔
کامنگ کے جانے کے بعد تانیہ کر کرے میں اکیلی رہ گئی۔ جشن میں شرک ہونے کے لئے اسے ایک بھاری ساز قرق برق بس پہنایا گیا تھا۔ وہ اس طرح کے کپڑے پہننے کی بھلا کماب عادی تھی۔ اسے بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کپڑے تبدیل کر کے تھوڑا منہ ہاتھ دھو لے۔ آکہ تانیہ آجائے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دو کینیں کر کرے میں داخل ہو میں۔ انہوں نے اسے شب غوالی کا لباس پیش کیا، کپڑے تبدیل کر کرے میں بہت بکلی بکلی ہو گئی۔ حمام میں جا کر اس نے ہاتھ منہ دھوایا گیا۔ اس کے پیروں کو دھوایا گیا۔

تانیہ کو بہت سکون ملا، اس نے کینیوں کو خصت کر دیا۔ پھر وہ ایک کھڑی کا پردہ ہٹا کر ریشم جیسے بستر دراز ہو گئی۔ پورے چاند کی رات تھی۔ کھڑی سے چاند کے باہم رہا تھا۔ چاندی اس کے چرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے چاند کو تک رہی تھی۔ وہ چاند کو دیکھتے دیکھتے چاند میں محو ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے حسن میں ڈوڈی جا رہی تھی کہ اچاند کھڑی کے شیشے پر کسی نے انگلیوں سے کھٹ کھٹ کی۔

تانیہ ایک دم چونک گئی۔ اب چاند غائب ہو چکا تھا اور چاند کی جگہ ایک چڑھ نظر آ رہا تھا۔ چاند چڑھ راشمون تھا۔

تانیہ فرا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے بترے اتر کر شیشے کی کھڑی کھول دی۔ "راشمون تم؟" تانیہ نے جیڑت زدہ لبجے میں کما۔

"میں دیکھ رہا تھا کہ تم سوری ہو یا جاگ رہی ہو۔" راشمون نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لے۔

"میں ابھی کہاں سوئی۔ جاگ رہی ہوں۔ بڑی دیر سے چاند کو دیکھ رہی تھی۔" "تمیں چاند اچھا لگتا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں بہت۔" تانیہ نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ "اور میں۔" راشمون نے لب کھولے بغیر دل ہی دل میں پوچھا، اور سوچنے لگا کہ یہ میری بات کا بواب کیوں نہیں دیتی۔ بھلا دھو جواب کیے دیتی۔ اسے کیا معلوم کہ راشمون کے دل میں کیا ہے دل کوں کھول کر دیکھتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جب کسی سے محبت ہو جائے تو اسے بتا دیا چاہئے ورنہ اس کا کوئی تجھے نہیں لکھتا۔

"راشمون تم باہر کیوں کھڑے ہو اندر آ جاؤ۔" تانیہ نے راشمون کو سوچتے دیکھ کر کما۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم باہر آ جاؤ۔ کھلی فضا میں۔"

"ہاں، ہو کیوں نہیں سکتا۔ نہ کہ، میں باہر آتی ہوں۔"

"تم دروازے پر پہنچ کر میرا انتظار کرو، میں گھوم کر تمہارے دروازے پر پہنچتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم آؤ، میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔"

لباس درست کرنے کے بعد جب وہ دروازے سے باہر نکلی تو اسے باہر نکلی تو اسے راشمون رہنمایی میں تیزی سے لے گئی بھرتا ہوا نظر آیا۔ باہر ابھی تک چراغاں ہو رہا تھا۔ عجب سال تھا۔ وہ دونوں شلے ہوئے تالاب کی طرف نکل گئے۔ تالاب کے کناروں پر چراغ روشن تھے۔ جن کا گل پانی میں منعکس ہو کر بڑا لفڑیں لگ رہا تھا۔ بٹھیں ایک کونے میں جمع ہو کر شاید سونے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

"بیانے کنوں کی خلوف کو طلب کیا ہے۔ وہ تمہارے جانے کے انتظامات کر رہے ہیں۔" راشمون نے بات شروع کی۔

"راشمون یہ خبر تو تم نے بہت اچھی سنائی۔ اس کا مطلب ہے میں صعیک میاں سے رخصت ہو جاؤں گی۔"

"بیانے تم سے کچھ کہا تھا۔" راشمون نے پوچھا۔

"تمہارے بیا سے میری بہت سی باتیں ہوئی ہیں۔ تمہارا نہ جانے کس بات کی طرف اشارہ ہے۔"

چیز چیزے وہ پکارتی گئی ویسے ویسے وہ تیر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ محل روپی دروازے میں داخل ہو کر غائب ہو گیا۔
کی آوازیں سن کر کئی کنیزیں اس کے گرو اکھا ہو گئیں۔
لیا ہوا؟ انہوں نے بیک وقت پوچھا۔
بھی نہیں۔ تانیہ نے افسروہ لجع میں جواب دیا۔ اور پھر وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چل

پی کے لئے وہ عجیب رات تھی۔ بڑے عجیب انداز میں گزری۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ سونا چالا
بکی۔ بار بار راشمون کا چڑھا اس کے سامنے آتا رہا۔ وہ اسے الجھن میں بنتا کر گیا تھا۔ ایک
جنبدے سے آشنا کر گیا تھا جس سے وہ واقف نہ تھی۔ وہ چلا کیوں گیا۔ شاید اسے اس کی
نائی پر غصہ آگیا تھا۔ محبت کرنے والا اتنا ہی حساس ہوتا ہے۔ اتنا ہی ناٹک ہوتا ہے۔
یہ اس کا چلا جانا ہی اچھا ہوا۔ وہ رک جاتا تو جانے اور کیا کیا کہتا۔ اس کے کہے ہوئے لفظ اس
ہی کی زنجیر بن جاتے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی ایک انسان اور ایک غیر انسان کا مlap
نہیں۔ پھر اسے ہر قیمت پر اپنی ونیا میں لوٹ کر جانا تھا۔ وہاں جا کر اپنے چھا سے حساب لینا تھا۔

ن ان بھیڑوں میں کیسے پڑ جائے۔
پتھے سوچتے جانے کب اسے نیزد آگئی۔ اجالا چھینے کے بعد ایک کنیز نے گلب کی کلی اس کے
پر کھ کر اسے بیدار کیا۔ وہ گھری نیند میں تھی، اس کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔ وہ کنیز جانے
سے اس کے گلب رخساروں پر گلب کی کلی پھیر رہی تھی۔ بالآخر اس کی آنکھ کھل گئی۔

”اوہ، بت اجالا ہو گیا۔“ تانیہ نے اٹھ کر انگوٹی لی۔
”کب سے آپ کو انحرافی ہیں۔“ کنیز نے موہبانہ لجع میں کہا۔
”آواز وے کر اٹھ لینا تھا، یا میرا بازو ہلاویتیں۔“

”ہائے نہیں۔“ کنیز نے کچھ اس طرح کہا جیسے یہ وہنوں عمل قابل تعزیر ہوں۔
”جلدی تیار ہو جاؤ، کاشنگ آپ کا منتظر ہے۔“ دوسرا کنیز نے کہا۔

کاشنگ کا نام سننے ہی اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا۔ اور منہ ہاتھ و ہو کر جلدی جلدی تیار ہونے
جب وہ تیار ہو گئی تو کنیز نے اس کو چلنے کو کہا۔ ”ہیئے چلیں۔“

”غورا کنیز کے ساتھ ہوں۔“ پھر وہ مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی کاشنگ کے کمرے میں پہنچ گئی۔
ن ان اس کو ویکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اپ بیٹھ رہیں، مجھے شرمende نہ کریں۔“ تانیہ نے کہا۔
”اوہ، تانیہ، ناشتہ کرو۔“ اس نے میرکی طرف اشارہ کیا۔

غمزہ ناشتہ کی ہر ملکن پرچر موجو تھی۔ تانیہ نے اپنی پسند کا ناشتہ کیا۔
”تانیہ، میں نے کنویں کی خلائق کو طلب کر لیا ہے۔ وہ باہر موجود ہے۔ یہ لوگ تمہیں چاہ وفات

”تم بس آج رات کی مہمان ہو۔“ اس نے بڑی حسرت سے کہا۔

”ہاں۔“ تانیہ نے سارگی سے کہا۔ پھر راشمون کی طرف ویکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں؟“
”جانے والا رک نہیں سکتا۔“ راشمون بالآخر حرف مدعازبان پر لایا۔

”ہاں، رک سکتا ہے لیکن کتنے وہ۔ ایک وہ، وو وہ۔ زیادہ سے زیادہ وہ دن..... پھر پہاڑا
ہو گا۔ جب جانا ہی مقدر ہے تو پھر تاخیر کرنے کا فائدہ۔“ تانیہ نے تھوڑا توتف کیا۔ پھر بولی۔

”راشمون، مجھے جانے وہ۔ ویکھو کئی ایسی بات نہ کرو کہ میں اچھن میں پڑ جاؤں۔“
راشمون چلتے چلتے ایک وہ رک گیا، چندی روشنی برہار راست تانیہ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا
حسن و دبلا ہو گیا تھا۔ راشمون اس کے چہرے کو بغور ویکھتا رہا۔

پھر اس نے جوبات کی، اس نے تانیہ کو حیران کرو یا۔
ہاں، وہ بات ایسی ہی تھی کہ آؤں سے تو حیران ہو جائے۔

راشمون نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ”تانیہ، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے اپنی دنیا میں لے
جاو۔“

راشمون نے برہار راست محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہنے کے بجائے وہی
بات غیر واضح انداز میں کہہ دی تھی۔ راشمون کا ڈھنکے چھپے انداز میں اظہار محبت تانیہ کے دل کو بھاگیا
تھا۔ اسے بہت خوشی ہوئی تھی یہ خوشی اسے محض اس کے اظہار محبت پر نہیں ہوئی تھی خداوس کے
ولیوں میں بھی یہی تھا۔ یہ ازلی جذبہ بار بار اس کے دل میں سر اٹھا رہا تھا۔ وہوں طرف تھی اگلے راہ
گئی ہوئی۔

”وہ کیوں؟“ تانیہ نے اس کی بات سن کر بڑے انجان لجع میں پوچھا۔ وہ اسے ستانے پر تل
گئی تھی۔

”معلوم نہیں!“ راشمون نے اس کی آنکھوں میں ویکھتے ہوئے کہا۔

”واہ، راشمون یہ کیا بات ہوئی؟“ تانیہ نہیں کر بولی۔ ”میرے ساتھ بھی جانا چاہتے ہو اور
تمہیں معلوم بھی نہیں کہ کیوں؟“

”تم رک جو نہیں رہی ہو۔“ راشمون نے کہا۔

”اس کی وجہ میں تمہیں بنا چکی ہوں۔“

”پھر میں کیا کروں۔“ وہ الجھ گیا۔

”پچھے نہیں، بس نہیں خوشی ابواع کہہ وہ۔“

”نہیں کہہ سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ مٹا اور تیز قدموں سے واپس جانے لگا۔

”راشمون۔“ تانیہ نے آواز وی۔

راشمون اس کی آواز سن کر نہ رکا، نہ واپس پلٹا۔ وہ چلتا رہا۔

”راشمون، میری بات سنو۔“ تانیہ نے الجما آمیز لجع میں پکارا۔

کماں سے کماں پہنچ جانا تھا۔

”راشمن اچھا ہوا جو تم آگئے۔“

”سوچا تو یہ تھا کہ تمہیں جاتے ہوئے نہ دیکھوں گا لیکن دل نے بغاوت کر دی۔ مجبور ہو کر

۔۔۔“

”دکتا اچھا ہے تمہارا دل۔“ تانیہ نے بے اختیار کہا۔

”اور میں؟“ راشمن بے ساختہ بولا۔

”تم بت بڑے ہو۔“ تانیہ نے بڑے پیار سے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”رات کو کتنی آوازیں وہی تھیں۔ لیکن تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔“ اس نے دیکایتے

”تم بھی ابھی یہی کر دگی۔ یہاں سے چل جاؤ گی۔ میں آوازیں دستارہ جاؤں گا۔ لیکن تم پلٹ

نہ آؤ گی۔“

”یہ میری مجبوری ہے۔“ تانیہ نے افسروگی سے کہا۔

”تم میری دنیا میں آئی کیوں تھیں۔“ راشمن نے لکھوں کیا۔

”میں کماں آئی۔ مجھے تولا یا گیا تھا۔“

”لایا گیا تھا تو مجھے سونے دیتیں۔ کیوں مجھے سحر سے آزاد کروایا۔“

”تمہیں افسوس ہے کہ سادر بری کے نہ ہو سکے۔“ تانیہ نے پیار بھرا لٹکر کیا۔

”ہاں اور کیا..... کم از کم وہ میری تو ہو جائی۔“

”پھر چلے جانا شکار پر..... وہ تواب بھی تمہاری منتظر ہو گی۔“

”جاتے ہوئے ایسی باتیں نہ کرو۔“ راشمن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا، اب مجھے اجازت دو، میں چلتی ہوں۔ میری کوئی بات بری گی ہو تو معاف کرو یا۔“

”تانیہ۔“ راشمن نے پکارا۔

تانیہ اپنارخ پلتے پلتے رک گئی۔ اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”یہ قبول کرو۔“ راشمن نے اپنے لباس سے سرخ گلاب کی بے حد روتا زہ کلی نکالی۔

”واہ کس قدر خوبصورت کلی ہے یہ..... کس قدر حسین تھے ہے۔ ہزاروں لاکھوں ہمیروں پر

ری۔“ تانیہ اس کلی کو دیکھ کر واقعی خوش ہو گئی تھی۔ ”میں اسے خوشی سے قبول کروں

۔۔۔“

”ایسے نہیں۔“ تانیہ نے کلی کو لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو راشمن نے اپنا ہاتھ چیچھے

ریا۔

”پھر کیسے؟“

”میں اسے اپنے ہاتھوں سے تمہارے بالوں میں سجانا چاہتا ہوں۔“

تک پہنچادیں گے۔ اس سے آگے یہ لوگ نہیں جاسکتے۔“

”ٹھیک ہے، میں وہاں تک پہنچ گئی تو پھر وہاں سے آگے جانے کی کوئی نہ کوئی راہ نہیں کی۔“

اس کا مجھے یقین ہے۔ ”تانیہ نے کہا۔

”اوہ پھر محل سے باہر چلیں۔ کوئی کی تخلق تمہیں لے جانے کے لئے دروازے پر مددوڑ

ہے۔“ ٹھیک ہے۔ ”تانیہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

جب وہ محل کے دروازے پر پہنچے تو تانیہ نے وہاں ایک کری رکھی دیکھی۔ اسے جرت ہوں۔

کری خالی تھی۔ اور کری کے ساتھ ہی کنویں کی تخلق موجود تھی۔

وہ دو تھے، اور دونوں وہی تھے جو چاه وفات سے اسے یہاں تک اڑا کر لائے تھے۔ ”دونوں ہاتھ

باندھے بڑے مودوبانہ کھڑے تھے۔

تانیہ نے دروازے سے باہر نکل کر اوہر اور هر نظر دوڑائی۔ اس کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی

تھیں۔ جس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کا دور تک پہنچنے نہیں تھا۔

”راشمن کماں ہے؟“ تانیہ نے بالآخر پوچھ دیا۔

”وہ اپنا کمرہ بندر کر کے سورہا ہے۔ وہ رات بھر جاتا رہا ہے۔ صبح سویا ہے۔ میں نے اسے الہا

نہیں۔ کو تو انہاں دوں۔“ کامنگن نے کہا۔

”نہیں۔ اسے سونے دیتھے۔“ تانیہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

”تانیہ اس کری پر بیٹھ جاؤ۔ یہ دونوں تمہیں اڑا کر لے جائیں گے۔“

تانیہ بغیر کچھ کے اس کری پر بیٹھ گئی۔

”اچھا تانیہ چاؤ۔ آسمان والا تمہاری حفاظت کرے۔“ کامنگن کی آواز بھرا گئی، شاید ہے اپنے

آن سوروں کی کوشش کر رہا تھا۔

”اچھا کامنگن اللہ حافظ..... راشمن سے کہہ دیا، میں اسے زندگی بھرنہ بھلا سکوں گی۔“

”وہ آگئیا تانیہ۔“ کامنگن نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

تانیہ نے مڑ کر دیکھا تو راشمن دھیرے دھیرے اس کی طرف آرہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چرے پر بہپناہ اوسی تھی۔ وہ شب خوابی کا لباس پہنچنے تھا۔ بستر سے انھوں کو پیدا

اوہر ہی چلا آیا تھا۔

راشمن کو دیکھ کر تانیہ کے دل کی وہڑکنیں بے اختیار ہو گئیں۔ اسے یوں محوس ہوا تھا۔ ”وہ

ول سینہ پھاڑ کر باہر آجائے گا۔ اچھا ہوا کہ رخت ہونے سے پلے اس سے ملاقات ہو گئی۔“

زنگی بھر خلاش رہتی۔

تانیہ کری سے انھوں کو اس کی طرف بڑھی۔ کامنگن کری کے پاس ہی کھڑا رہا۔ وہ دروازے کی

بری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ تانیہ اتنی آگے چل گئی تھی کہ وہ ان کی گفتگو نہیں سن سکا۔

اب ان کے پاس کئے کورہ کیا گیا تھا۔ یہ آخری ملاقات تھی۔ چدھوں کے بعد تانیہ نے اڑا

تانية کی کرسی اب اور اٹھنے لگی۔ کنوں میں گھپ اندر ہاتھ۔ اس نے اپر سراخا کر ویکھا تو بہت اپنے چھوٹا سا سوراخ دکھائی دیا۔ یہ چاہ وفات کا دہانہ تھا۔

تانية کا دم گھٹنے لگا۔ اس کنوں کی بڑی سوموم فضا تھی۔

اور تیز اڑو..... اس کنوں سے جلدی نکلو..... دیکھو میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ”تانية نے بے چین

کہا۔

و دونوں کافی تیز اڑ رہے تھے۔ تانية کی پرشانی دیکھ کر انہوں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔

اپنے چاہ وفات کے دہانے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو دھیرے دھیرے بڑا ہوتا جا رہا تھا۔

پہلے وقت آیا کہ اس کی کرسی چاہ وفات سے باہر نکل آئی۔ ان دونوں یونوں نے اس کی کرسی

بپھر بر اتار دیا۔ اور وہ خود سیدھے کھڑے ہو گئے۔ تانية نے گھرے گھرے سانس لے کر

ہوش بحال کئے۔ اور چاروں طرف نظر دوڑا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے اسے چاہ وفات میں

اپنی قاتل۔ اور یہ وہی پتھر تھا جس پر راکل نے کھڑے ہو کر اسے کنوں میں پھینکنے کا حکم دیا تھا۔

اس پتھر پر اس کی کرسی رکھی ہوئی تھی۔

”اچھا۔ اب ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں گے۔ ہم جاتے ہیں۔“ کنوں کی تخلق نے

”میک ہے جاؤ۔“

ان دونوں نے چشم زدن میں پتھر پر کھڑے کھڑے قلابازی کھائی اور سیدھے چاہ وفات میں

کنوں کی تخلق کے عائب ہونے کے بعد تانية پاکل خمارہ گئی۔ یہ ایک عجیب و غریب منظر

تھا۔ کنوں کی تخلق کے عائب ہونے کے بعد تانية پاکل خمارہ گئی۔ یہ ایک عجیب و غریب منظر

ایک حصیں تین لڑکی۔ خوبصورت تین لباس میں، ایک نقش و نکار والی کرسی پر کسی شہزادی کی

نیا نہیں تھی۔ اور دور تک کوئی نہیں تھا۔ انسان نہ غیر انسان۔ یہ ایک پچھلا علاقہ تھا۔ چھوٹے

تھے پاہ درور تک پھیلے ہوئے تھے۔

”ہاں پہنچ گئی تھی جہاں اسے موت کے حوالے کر دیا گیا، اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جائے؟

کوئی راڑکی جھونپڑی کیسے تلاش کرے۔ یہ اس نے کیا وہ وقتوں کی۔ اس نے کامگی سے یہ کیوں

نہ کہا کہ وہ کسی طرح اسے محض راٹک پہنچا دے۔ شاید کامگی کے اختیار میں نہ تھا، اس نے تو

ہاتھ تک پھردا نے کے لئے کنوں کی تخلق کی مددی تھی اور کہا تھا کہ یہ تخلق کوئی سے آگے نہ

کوئی۔

ارٹ تخلق اسے اپنے ٹھکانے پر چھوڑ کر عائب ہو چکی تھی۔ اب وہ کیا کرے؟ وہ کرسی سے اٹھ رہے کھڑی ہو گئی۔ پھر جب اس نے زمین پر نگاہ کی تو جیران رہ گئی۔

میں پر راکل کا عصا پڑا تھا۔ وہ عصا کو اچھی طرح پچانی تھی، وہ سانپ کی طرح مل کھایا ہوا

لے کھرے اتر کر نیچے پکنی اور عصا کو زمین سے اٹھا لیا۔ یہ عصا یہاں کیوں پڑا ہے۔ یہ عصا تو

اسکے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے یہاں کیسے چھوڑ گیا۔ یہ عصا تو اس کی بیساکھی کا کام دیتا تھا۔

لایا ہوا راکل کو وہ اپنا عصا یہاں کیوں چھوڑ گیا۔

تانية نے ایک لمحے کو سوچا۔ یہ ایک بے ضرری خواہش تھی۔ اس نے وقت ضائع نہ کیا۔ پھر کچھ کے اپنی گردن گھماں راشون کے چہرے پر ایک دم گلب سے کھل اٹھے۔ اس نے جلدی سے اس کی ریشیں زلفوں میں ڈالی ہائیک دی۔

”تانية یہ کلی اس وقت تک نہیں مر جھائے گی جب تک میں زندہ ہوں۔ جب یہ کلی مر جائے تو کبھی لیتا کہ میں اس دنیا میں نہیں رہا۔“ راشون نے عجیب اکشاف کیا۔

”راشون، میری وعا ہے کہ یہ کلی ہیشہ میرے پاس ترومازہ رہے۔“ تانية نے بڑے غلوٹ سے کہا۔

”آسمان والا، تمیں صد اخوش رکھ۔ جاڑ، بس۔ اب چلی جاؤ۔“

تانية نے نظر بھر کر راشون کو دیکھا۔ راشون کی پرکش آنکھوں میں نبی آگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اس کی آنکھوں میں آسو بھر آتے، وہ تیزی سے پٹی اور جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”لے جاؤ اسے۔“ کامگی نے کنوں کی تخلق کو حکم دیا۔

وہ دونوں بونے تیزی سے کرسی کی طرف بڑھے۔ دونوں نے دامیں بائیں ہو کر اپنے کندھے کریں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ فضا میں بلند ہونے لگے۔

تانية نے پہلے کامگی اور پھر راشون کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا لیا۔

کامگی نے جواباً ہاتھ ہلا لیا لیکن راشون بت بنا کھڑا رہا جیسے پتھر کا ہو گیا ہو۔

کنوں کی تخلق کرسی کو بہت تیزی سے اڑائے لئے جا رہی تھی۔ تانية مڑ کر اس وقت تک پہنچ دیکھتی رہی جب تک وہ نظر آتے رہے۔ پھر جب راشون نظر ہوئے گا تو اس نے آخری بار پہنچ کر اپنے

درمیان میں اچانک پھاڑ آگیا تھا اور جب وہ پھاڑ سامنے سے ہٹا تو پھر جیچے کچھ نہ تھا۔ سربڑا باب علاقہ، درخت تھے، چیٹے تھے، اڑتے پرندے تھے۔ نہیں تھا تو وہ سونے کا محل نہیں تھا۔

تانية نے اپنی نرم آنکھوں کو بند کیا تو وہ آنسو رخادرول پر بہس نکلے۔ اس نے آنسو پوچھ کر اپنے بالوں میں انگی ہوئی گلب کی کلی نکالی، اور اپنے ہاتھ میں لے کر دھیرے سے پھول کی پتا سے اپنے ہوت اس گلب کی کلی پر رکھ دیئے۔

کرسی بہت تیزی سے اڑی جا رہی تھی۔ وہ دونوں بونے کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ پھر اسی سلسلہ عور کر کے اب وہ کرسی پہنچ کی طرف جانے لگی۔ پھر تانية کو ایک چنان میں بڑا سا سوراخ نظر آیا۔ اس سوراخ کے نیچے ایک چشم ابلی رہا تھا۔ وہ کرسی اسی بڑے سوراخ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

پھر وہ کرسی اس بڑے سوراخ میں واصل ہو گئی۔ وہ دراصل ایک غار تھا اور اس کے ذریعے ہاں وفات میں داخل ہوا جاتا تھا۔ پھر وہ اس غار سے نکل کر کنوں میں پہنچ گئے۔ تانية نے پہنچ جائی کر دیکھا تو اسے کھوٹا ہوا تھا۔ سانظر آیا۔ جس سے دھوان اٹھ رہا تھا۔

بھل کا ہام سن کر وہ لا جوں پڑھنے والا تھا لیکن پھر فروہی احساس ہو گیا کہ بھل کا کالے چراغ بیٹھا تھا ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے وہ بھل کو برائیں کہنا چاہتا تھا۔ اس نے نہیں کر سکا۔
میں بھل تو نہیں، البتہ میری ہم خواب میں آگئی۔ ”

”تائیہ کو دیکھا تم نے خواب میں۔“ کالے چراغ نے خوش ہو کر کہا۔ ”وہ کیا کر رہی ہے؟“

”ہر ایجیب و غریب خواب دیکھا ہے میں نے..... ایک بڑے سے پھر پر، ایک زرنگار کری پر ایلوں کی طرح بیٹھی ہے اور اس کے نزدیک ہی چاہ وفات ہے۔“
”ابن اتنا ہی دیکھا۔“

”ہاں۔“
”اس نے کچھ کہا نہیں۔“ کالے چراغ نے پوچھا۔
”کری پر زرق برق کپڑوں میں شنزراویوں کی طرح ضرور بیٹھی تھی لیکن اس کے پھرے پر ہلکے آثار تھے۔ وہ ادھر ادھر گردون گھما کر دیکھ رہی تھی۔“ ”محسن راؤ نے بتایا۔

”تمیں یہ احساس کیسے ہوا کہ اس کے نزدیک ہی چاہ وفات ہے۔“
”یہ بھی خود نہیں معلوم لیکن جب میری آنکھ کھلی تو یہ احساس خود بخود میرے دماغ میں موجود تائیہ چاہ وفات کے نزدیک بیٹھی تھی۔“

”چاہ وفات کے آس پاس کا علاقوں پھر بلاہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کے نزدیک چھوٹے بڑے اپنے ہیں۔ بعض پھر چھوٹی چنانوں جتنے ہیں۔“ کالے چراغ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ایک نہانہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم نے سچا خواب دیکھا ہے۔“

”موہنید..... میرا دل بار بار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تائیہ چاہ وفات پر موجود ہے۔“
”ٹھیک ہے..... پھر وقت ضائع نہیں کرتے۔ فروٹیں ہیں..... ویسے بھم وہاں جانے کا ارادہ نہ تھے۔ اب تو وہاں جانے کی معقول وجہ بن گئی ہے۔“

”ایا اپنا سامان سمیٹ لوں۔“
”نہیں کچھ مت سمیٹو۔“ کالے چراغ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”بس یہاں سے نکل چکے۔“

”ٹھیک ہے چلو، میں فوری طور پر جانے کے لئے تیار ہوں۔“
”اُک، پھر میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر کالا چراغ خواب محل کے اندر وہی دروازے کی طرف شکل۔

”ام جاتے دیکھ کر محسن راؤ کو حیرت ہوئی کیونکہ اس نے واضح طور پر اندر نہ آنے کی تنبیہ کی۔“
”اب وہ خود ہی اسے محل کے اندر لے جا رہا تھا۔“
” محل کے اندر کہاں جا رہے ہو؟ وہاں جانے کو تو تم نے منع کیا تھا۔“ بالآخر محسن راؤ سے پوچھے

پھر جیسے جیسے تائیہ اپنے اطراف میں نظر دوڑاتی گئی اس کے سامنے نئی نئی باتیں آتی گئی۔ اس نے جگہ جگہ اُتو رے ہوئے دیکھے ایسا لگتا تھا جیسے ان اُتوؤں کو کسی خونخوار جانور نے بھجوڑا ہو۔ مگر اس نے قریب ہی گھوڑوں کی لاشیں دیکھیں، وہ بھی خاصی خستہ حالت میں تھیں۔ اس پاں ہو چکیلے ہوئے تھے اس سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہاں گھمنان کا رن پڑا ہو۔

گھمنان کا دشمن راکل اور اس کے بھائی کی جان کی دشمن بھائیں، اب اس دیا میں نہ رہے تھے۔ اور اس کا بھائی محسن راؤ بالکل صحت یاپ ہو گیا تھا۔ اس کا دیکھ زدہ چڑھے بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اور اب وہ کالے چراغ کے ساتھ تھا۔ کالا چراغ اسے خواب محل لے گیا تھا۔ جہاں اس دوست

وہ بستر پر لیٹا تائیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھی بھری جا رہی تھی۔ محسن راؤ تائیہ کے بارے میں سوچتے سوچتے غنوگی میں چلا گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ تائیہ ایک بڑے سے پھر پر ایک زرنگار کری پر شنزراویوں کی طرح بیٹھی ہے، اس کے نزدیک ہی چاہ وفات ہے۔

اس خواب کو دیکھتے ہی محسن راؤ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس قسم کا خواب تھا۔ پھر پر کری اور کری پر شنزراویوں کی طرح برا جہاں تائیہ۔ تب اسے خیال آیا کہ وہ تائیہ کے بارے میں سوچتے سوچتے سوچ گیا تھا۔ شاید اسی لئے وہ خواب میں آگئی تھی۔ لیکن نہیں پہ اس کے دماغ کا فتور نہیں تھا۔ اس کا دل اس کو محض خواب ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسے یوں محسوس ہو۔

”تھا جیسے اس نے جاگتے میں تائیہ کو دیکھا ہو۔ وہ خواب اتنا ہی واضح تھا۔“
اس کا دل بے کل ہو گیا تھا۔ اس کے اندر کی بے چینی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ چاہ وفات کو طرف چلو۔

”وہ بستر سے اٹھ گیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ وہ حمام میں منہ ہاتھ دھوتے ہوئے سوچ رہا کہ کالے چراغ کو کس طرح بلائے۔ وہ جاتے ہوئے ہدایت کر گیا تھا کہ محل کے اندر آئے کوشش نہ کرے چلو کچھ ویر انتظار کر لیتے ہیں۔ یہ سوچ کر باہر لکھا تو حیران رہ گیا۔ کالا چراغ میں بڑے طیناں سے کری پر بیٹھا ہوا تھا۔“
”محسن راؤ کو حمام سے نکلتے دیکھ کر مسکرا یا اور بولا۔“ ”کیا ہوا محسن؟ تم کچھ جلدی نہیں گئے۔“

”اچھا ہوا تم آگئے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ تمہیں کیسے بلاوں۔“
”خیریت تو ہے۔ کوئی گزبر ہو گئی۔“

”نہیں کوئی گزبر نہیں ہوئی۔ بس میری اچاک آنکھ کھل گئی۔“
”بھوک گئی ہے۔“

”نہیں، میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔“
”خواب..... کیا بھال خواب میں آگئی۔“

بیغیر بہانہ گیا۔

”ساتھ میں، میں نے ایک بات اور کسی تھی۔“

”وہ کیا؟“

”تمہیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“ کالے چاغ نے مسکرا کر کہا۔

”اوہ، اچھا، ٹھیک ہے نہیں کرتا سوال..... ایسے سوال کرنے کا بھلا کیا فائدہ جس کا جواب نہ

ملے۔“

کالے چاغ نے دروازے پر پہنچ کر، دروازہ کھولا، اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ جب

دروازے سے باہر نکل آیا تو اس نے دروازہ بند کر کے ایک موٹا ساتالا لگادیا اور چالی فیماں اچھا

دی۔ جو فوراً ہی غائب ہو گئی۔ اس کے بعد کالے چاغ نے محسن راؤ کا ہاتھ قائم لیا اور اس سے

بولा۔ ”محسن میرے ساتھ دوڑنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، میں راضی ہوں۔“ وہ دوڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔

محسن کو زیادہ نہیں دوڑنا پڑا۔ دوڑنگاتے ہی اس کے سامنے اندر ہمرا سا چھا گیا۔ بت گمراہ نہ

تھا۔ ایسا اندر ہمراہ کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر کچھ دیر میں ہی اس کی آنکھوں کے آگے سے اچانک اندر ہمراچھت گیا۔ اس نے خود کو ایک

پتھریلے علاقتے میں پایا۔ دور نزدیک کوئی محل نہ تھا۔ البتہ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی چنان فڑی

تھی۔

پھر وہ دونوں جب چڑھا کی اوٹ سے باہر آئے تو سامنے ایک بڑے پتھر تانیہ کو زنگار کریں۔

زرق برق لباس میں بیٹھا دیکھا تو محسن راؤ کو یقین نہ آیا، اس نے سوچا وہ پلے خواب دیکھ رہا تھا۔

اب دیکھ رہا ہے۔ اس نے فوراً اپنے بازو پر ٹکلی لی۔ تکلیف کا احساس ہوا۔

”محسن راؤ، تمہارا خواب تو واقعی سچا چکلاتا۔“

یہ دونوں ابھی تانیہ سے دور تھے اور پھر وہ کی اوٹ میں چھپتے، کبھی باہر نکلتے تانیہ کی طرف بڑا

رہے تھے۔ تانیہ اطراف کا جائزہ لینے کے بعد پھر کری پر آئی گئی تھی۔ راکل کا عصا اس کے ہاتھ مدد

تھا۔ اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ کھانا جائے۔ کے مدد کو پکارے۔ کیسے اپنے بھالا

محسن راؤ تک پہنچ کر منزل خود بخود آسان ہو گئی۔

اچانک اس کی نظر سامنے اٹھی تو اس کا اور سانس اور پر نیچے کا ٹینچے رو گیا۔ حیرت سے آنکھیں

پھیل گئیں ایک ناقابل یقین منظر اس کے سامنے تھا۔ کیا غصب تھا کہ اس کا بھائی محسن راؤ اور دوڑا

ٹھیک کالے چاغ بنتے مسکراتے اس کی طرف بڑھے چلے آتے ہیں۔

اب اس سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے راکل کا عصا پرے پھینکا اور پتھر سے دھڑو دھڑا

نیچے آگئی۔ اور دوڑ کر محسن راؤ کے نزدیک پہنچ گئی۔

”میرے بھائی۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی کے لگے لگ گئی۔ اور سک پڑی۔

”اویمیری تانیہ۔ میری پیاری بن تانیہ۔“ محسن راؤ نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لا۔

کالا چاغ بہن بھائی کے ملáp کے اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

محن راؤ بھی اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکا۔ وہ بھی رو پڑا تھا۔

”بھائی نہیں بھی کچھ توجہ در کار ہے۔ آخر آپ لوگ کب تک روئیں گے۔“ کالے چاغ نے مار کر کہا۔

بہن راؤ نے تانیہ کو اپنے سے الگ کیا۔ اور تانیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ان سے ملو یہ کالے چاغ صاحب۔“

”انہیں میں کیسے بھول سکتی ہوں۔“ تانیہ نے اپنے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کسے؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں ہی نہیں یہ محسن راؤ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ کیا تم ان کا چڑھے غور رکھا۔“ کالے چاغ نے کما۔

کالے چاغ کے کہنے پر تانیہ نے فوراً اپنے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر یہ جان کر کہ

لے کے چہرے پر جو دیکھ کی لگ گئی تھی۔ وہ اب بالکل صاف ہو یجھی تھی بہت خوشی ہوئی اس وقت

کہ بھائی بہت پیار الگ رہا تھا۔

”ارے واقعی..... بھائی یہ کیسے ہوا؟“

”یہ بعد میں جائیں گے، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ زرق بر ق رہا، یہ زر نگار کری کہاں

ہے۔“ میں تو چاہ وفات میں پھینکا گیا تھا۔ تم زندہ کیے نج گئیں۔ کیسیں تم تانیہ کی روح تو

مل ہو۔“ کالے چاغ نے پوچھا۔

”میں ایک زندہ حقیقت ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے چاہ وفات میں پھینکا گیا تھا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس کے اندر دھکلنا جانے والے انسان کسی قیمت پر نہیں نج گئی ہوں تو اسے

ہی قسم سمجھتے۔ یا مجھہ جائے۔“

”آخر یہ سب کیسے ہوا؟“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”اطمیان سے تباہیں گی۔ ایک لمبی کہانی سے۔“ تانیہ نے مسکرا کر کہا۔

”تانیہ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہارے پاس ہی سنانے کو بہت کچھ ہے، ہمارے پاس بھی سنانے کو بہت

کو ہے۔ سنو گئی تو جی ان رہ جاؤ گی۔“ محسن راؤ بولا۔

”اچھا بھائی..... پھر جلدی سے جائیں۔ مجھے ابھی اچھی کہانیاں سن کر جی ان کریں۔“

”اوہڑتے کوئی کہانی نہ کرے گا، نہ کوئی کہانی سنائے گا۔“ کالے چاغ نے فیصلہ صادر کر دیا۔

”پھر یہ آپ بیتیاں کہاں سنن اور سنائی جائیں گی۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”خواب محل نیچ ہے۔“ کالے چاغ نے بتایا۔

”یہ کہاں ہے؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”نژدیک ہی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا یہ کری بھی ساتھ جائے گی؟“ کالے چاغ نے دریافت

کیا۔

”ہے، اتنی پیاری کرسی ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔“

”ارے تانیہ، کیا بات کر رہی ہو۔ اسے کون اٹھائے گا سرپ۔“ محسن راؤ پریشان ہو کر بولا۔

”اسے بیسیں چھوڑو۔“

”میں خواب محل میں اس سے اچھی کرسی تمہیں پیش کر دوں گا۔“ کالے چراغ نے سمجھیں سے کہا۔

”ارے میں تو ایسے ہی مذاق کر رہی تھی۔ مجھے کسی کرسی میں بھلا کیا دچھپی ہو ستی ہے۔“ تانیہ ہنس کر پوچھی۔

”لیکن تمہاری دنیا میں تو کرسی کی بہت اہمیت ہے۔ ایک مرتبہ جو کرسی پر بیٹھ جائے تو پھر اسے چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا۔“ کالے چراغ نے مسکرا کر کہا۔

”کالے چراغ صاحب اس بیماری علاقے میں سیاسی گفتگو کرنا سخت منع ہے۔“ تانیہ بردھتے بولی۔

”اچھا۔“ کالے چراغ نے ایک زبردست قسمہ لگایا۔ ”بھی بہت خوب۔“

”پھر چلیں۔“ محسن راؤ خواب محل میں جانے کے لئے سخت بے بیجن تھا۔

”ہاں، بالکل۔“ کالے چراغ نے آگے ملے کا اشارہ کیا۔

پھر وہ تینوں گھوم کر اس چڑان کی اوٹ میں آگے جہاں وہ پسلے پہنچے تھے۔

”تم دونوں میرے ہاتھ پکڑ لو اور ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھیں بند کرلو۔“ کالے چراغ نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔

تانیہ نے بایاں اور محسن راؤ نے دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر انہوں نے جیسے ہی آنکھیں بند کیں۔

ایک جھکا ساگ۔ ایسا محسوس ہوا جیسے زمین شق ہو گئی ہوا در وہ پیچے گرتے چلے جا رہے ہوں۔

یہ کیفیت چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی۔ تب کالے چراغ کی آواز آئی۔ ”اب آنکھیں کھول دیں۔“

محسن راؤ نے آنکھیں کھولیں تو اس نے خود کو خواب محل میں پایا۔ تانیہ کے لئے یہ جگہ تھی۔ لیکن کیونکہ وہ کئی محلات میں وقت گزار پھیل تھی لہذا یہ جگہ اسے حیرت میں ڈالنے والی نہ تھی۔

اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ ”اوہ، تو یہ ہے خواب محل۔“

تانیہ آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ محسن راؤ اور کالے چراغ بھی کر سیوں پر برا جان ہو گئے۔

”یہ کس کا محل ہے؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”بیں اپنا ہی سمجھیں۔“ کالے چراغ نے مسکرا کر کہا۔

”جب میں اپنی دنیا سے آئی تھی تو آپ نے مجھے اسی طرح کے ایک محل میں ٹھرا یا تھا جہاں میں رات بھر ڈرتی رہی تھی۔ پوری رات سو نہیں سکی تھی۔ میں جب بھی آنکھ بند کرتی خود کو ایک

”ہاں میں پاتی جہاں بے شمار چکا گزیں اڑتی ہوئی نظر آتیں۔“

”میری غلطی سے ہوا لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“ کالے چراغ نے کہا۔

”یہاں باہر نکلنے کی پابندی تو نہیں۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”نہیں لیکن باغ کی چار دیواری سے باہر جانے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اس کمرے سے محل کے

ہٹنے کی ضرورت ہے۔“ کالے چراغ نے بتایا۔

”پھر یہ باقیں تو طے ہو گئیں، اب جلدی سے ہاں سے کمانی شروع کریں جہاں سے اسے میں فروختا۔“

”نم کہاں تک کے واقعات جانتی ہو۔“ کالے چراغ نے پوچھا۔

”بعنی ہم تینوں اسی طرح بھائی کی جھوپڑی میں اکھاتھے اور بھائی سے نجات کے راستے تلاش ہے تھے کہ وہ بلا اچانک نازل ہو گئی۔ پسلے تو اس نے آپ کو زخمیوں میں جکڑا اور کچھ سوار آپ پہنچنے لے گئے۔ اس کے بعد مجھے بقال اپنے ساتھ لے گئی۔ اس طرح ہم تینوں جدا جدا۔“

”مجھے راکل کے لوگوں نے گرفتار کیا تھا۔ راکل نے مجھے زندگی میں ڈالا دیا۔ وہاں سے سردار

لے مجھے رہا کروا یا اور سترے کھنڈر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔“ کالے چراغ نے بتایا۔

”بھائی مجھے بھی راکل کے پاس لے گئے اور اس کی تحویل میں دے کر چل گئی۔ راکل مجھ سے جو غارہ میں نے نہ مانا۔ نتیجے میں مجھے قید میں ڈال دیا گیا۔ اور کئی دن بھوکا پیاسا سا کمرے میں بند داوا اعظم میری مدد کو پہنچے میں مرنے سے بچ گئی۔“ دو تین دن کے بعد جب راکل نے کھو

ایسا کا خیال تھا کہ میں بھوک سے اس قدر تڑپا ہو چکی ہوں گی کہ فرا اس کا کہاں لوں

نہیں کے بر عکس جب اس نے مجھے ہشاش بیشاں ویکھا تو وہ جیران رہ گیا۔ تب پتہ چلا کہ بقال

بارکو لاتا نے اغوا کروایا اور اس کے بد لے اس نے کالے چراغ صاحب کو مانگا ہے۔ راکل

بھرے بارے میں فصلہ کر لیا تھا کہ مجھے موت سے ہمکنار کر دے گا۔ اس لئے وہ مجھے فریب

کر سترے کھنڈر سے نکال لایا اور مجھے چاہ وفات میں پھکندا ہے۔“ تانیہ نے اپنی آپ بیتی بیان

”تانیہ میں جیران ہوں کہ تم بچ کیے گئیں۔“ کالے چراغ نے کہا۔

”بلی اور پرانے نے چھا لیا۔“ تانیہ نے تکر آمیز لبجھ میں کہا۔ ”جب میں کنوں میں گرتی

نہیں تو میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ میرے چیخنے کی وجہ سے کنوں کی مخلوق جاگ

ا۔ کنوں کی مخلوق نے مجھے کاشنگن کی بستی پہنچا دیا۔ وہاں ایک عجیب و غریب کمانی میری منتظر ہے۔“

”یہ کہہ کر تانیہ کاشنگن کی بستی میں اس پر جو بیتی تھی، وہ پوری تفصیل سے ان دونوں کے کافر کر دی۔“

”باتیا دی مگر وہ بات چھپا لی جو کبھی چھپائے نہیں چھپتی۔ راشمنوں اس کی نگاہوں میں بس گیا

تحا۔ اس نے راشمن کا ذکر تو کیا لیکن یہ نہ تھا یا کہ وہ اس پر مرمتا تھا اور خود وہ بھی اس کے سامنے بتتا ہو گئی تھی۔

تانية کی روادخشم ہوئی تو کالے چراغ نے اپنا قصہ پھیڑ دیا۔ راکل کے سامنے کھنڈر کی تباہی، اس کی گرفتاری، سروار کولانا کے سامنے اس کی پیشی، پھر بھات کے ساتھ اس کی شادی۔ بھات کی خود کی طرف اس کی تدفعی۔ راکل کا سروار کولانا کو زخمی کرنے تک جانا۔ دیواہ کا دربار، راکل کی سر زار موت، پھر اس کی تدفعی۔ تدفعی کے موقع پر محسن راؤ کا مل جانا۔ سمرے پروں والی تھیں کا کائنات۔ محسن راؤ کی صحت یابی۔ بھات اور راکل کا زمین میں اتر جانا۔ ان کا عبرتیک انعام اور محسن راؤ کا کالے چراغ کے ساتھ خوب محل میں آتا۔

تانية اور کالے چراغ کے بعد محسن راؤ نے اپنی آپ بیتی چھبیڑی اور وہ باتیں بتائیں جن سے تباہی واقع نہ تھی۔ محسن راؤ کی روادخشم کراپ پوری کلمات تانية کے سامنے آئیں یعنی طرح چکنے گا۔ « خوش تھی کہ اس نے اپنے بھائی محسن راؤ کو پالیا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد محسن کو سارے اپنی دنیا میں لوٹ جائے۔ تاکہ اپنے چچا راؤ احمد علی سے اس کے ایک ایک ظلم کا حساب سکے۔

« کالے چراغ صاحب اب آپ ہم پر ایک احسان اور کر دیں، ہمیں ہماری دنیا کم بچنچا دو۔» تانية نے پر جوش لے چکری میں کہا۔

کالے چراغ نے تانية کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑے پراسرار انداز میں کرسی سے الہ اور بغیر کچھ کے محل کے اندر رونی دروازے سے اندر چلا گیا اور پھر دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔

تانية اور محسن راؤ ایک دوسرے کا ہمانہ دیکھتے رہ گئے۔

« انہیں کیا ہوا؟» تانية نے فکر مندی سے پوچھا۔

« شاید والہی کا ذکر پسند نہیں آیا۔» محسن راؤ نے خیال ظاہر کیا۔

« بھائی کیا مطلب ہے؟ کیا ہم زندگی بھر انہی لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔» تانية پڑھنے ہو گئی۔

« مجھے تو گلتا ہے۔ وہ ہمیں بند کر گیا ہے۔» محسن راؤ نے خیال ظاہر کیا۔

« ہائے نہیں..... میں جا کر دروازہ دیکھوں۔؟» اس نے پوچھا۔

« ہاں دیکھو لیکن ایک بات کا خیال رکھتا، دروازہ کھلا ہو تو باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔

« وہ کیوں۔؟» تانية نے پوچھا۔

« اس نے مجھے تخت سے منع کیا تھا۔» محسن راؤ بولا۔

« تھیک ہے۔ میں ایسے ہی اندازہ کرتی ہوں کہ دروازہ کھلا ہے یا بند ہے۔» تانية کرتی۔

انٹھ کر اندر وہی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر دیکھا۔ « وہ نہیں کھلا۔ ادھر سے شاید کتنی لگی تھی۔

بھائی دروازہ بند ہے۔» تانية نے پریشان ہو کر کہا۔
اچھا، میں محل کا بیرونی دروازہ جا کر دیکھتا ہوں۔» محسن راؤ اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف

ن راؤ نے باہر کا دروازہ اپنی طرف کھینچ کر دیکھا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ وہ بولا۔ « یہ دروازہ ہے۔»

تانية نے مخفیہ اسنس لے کر کہا۔
ٹلوید ہونے کا خطہ تو مل گیا۔ آؤ باہر چلیں۔ باغ میں پہل کر بیٹھیں۔» محسن راؤ نے ہاں، بھائی چلیں۔» تانية فوراً راضی ہو گئی۔

دونوں بہن بھائی میرھیاں اتر کر باغ میں داخل ہو گئے۔ اور ایک گھنے درخت کے سامنے تھے پر بیٹھ گئے۔

یہ نے محسن راؤ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ « اللہ کا بڑا احسان ہے کہ بھائی آپ کا بہ ہو گیا ورنہ میں بہت فکر مند ہو گئی تھی۔»

تانية، میں نے زندگی بڑے عذاب میں گزاری ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہوں تو روح تک کاپ ہے۔

یہ سب راؤ احمد علی کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ وہ آپ کے قتل کے درپے ہوتا اور نہ آپ اس میں بھلا ہوتے۔

تانية، یہ دولت آدمی کو اس قدر سفاک کیوں بنا دیتی ہے۔ « وہ کھوئے انداز میں بولا۔

دولت ہے ہی ایسی خالم چیز..... ابھی خاصے آدمی کو پاگل کر دیتی ہے۔»
تو پھر ہمارا تمہارا باپ کیوں نہ پاگل ہوا..... کیا اس کے پاس بچا راؤ احمد علی سے کم دولت

بھائی ایک بات بتا دیں۔» تانية کے چہرے پر اچانک دکھ کے بادل چھا گئے۔ « یہ بات میں نے بھائی کہتا نہیں ہے۔ اور بھائی اس نے نہیں کہ آپ پہلے ہی عذاب جھیل رہے تھے۔

خشنداری تو آپ کے دکھوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔»

لیکن کیا خبر ہے تانية..... جلدی بتاؤ..... کافیوں بھری زندگی گزار کر اب میرا دل بہت مضبوط ہے۔»

بھائی اس دنیا میں امی رہیں نہ بنا بر ہے۔» تانية نے اندوہنک خبر سنائی۔

لو۔» محسن راؤ پر یہ خربجی بن کر گری۔ وہ جب اپنے ماں باپ سے پھرنا تو اس کی عمر بارہ لروہی ہو گئی۔ وہ آج بھی اسی عمر میں زندہ تھا۔ اسے احسان ہی نہیں تھا کہ اس کی عمراب کیا ہو گئی ہے۔ صحرا کی قید نے اس کے گھر کے حوالے سے اس کی عمر میں اضافہ نہیں کیا

نہیں۔ ” کالے چراغ نے گھبرا کر کما۔ ” تمہارا کوئی بھروسہ نہیں، پتہ نہیں کیا پوچھ جائے۔ ”

” بین گھبرا گئے۔ ” محسن راؤ بولا۔
” اب آپ نے کیا طے کیا۔ ؟ ” تانیہ نے بات کا رخ موزا۔
” اس بارے میں۔ ؟ ”

” بیان سے جانے کے بارے میں۔ ”
” ابھی تو آپ لوگ اندر چلیں، کھانا وغیرہ کھالیں، پھر کچھ کرتے ہیں۔ ”
” مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ ” محسن راؤ نے کہا۔

” بھوک تو بھائی مجھے بھی نہیں ہے۔ ”

” درے آخر ایسا کیا ہوا کہ دونوں کی بھوک اڑ گئی۔ ”

” پکھ نہیں ہوا۔ ؟ ” تانیہ اب اسے کیا بیاتی کہ اس نے اپنے بھائی کو کیا خبر سنائی ہے۔ وہ اپنا
دکھ اسے بھلا کیوں بیاتی۔ وہ اسے اپنے دکھ میں کیوں شریک کرتی۔ لذابات ثالثے کے لئے خود

کر کھڑی ہو گئی اور اپنے بھائی محسن راؤ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ” آج، بھائی اندر چلیں۔ ”

میں بغیر کچھ کے گراسانی لے کر اٹھ گیا۔ وہ تینوں اندر آئے۔ میز پر کھانا جا ہوا تھا۔ دونوں
ہے کسی نے بھی کھانے کی طرف نہیں دیکھا۔ محسن راؤ بستر پر دراز ہو گیا اور تانیہ کرسی پر بیٹھے

کالے چراغ نے دونوں کی طرف باری دیکھا اور پھر بولا۔ ” اچھا، میں اب چلتا ہوں۔ ”

” یہ غروب ہوتے ہی آؤں گا۔ ” تب تک آپ دونوں آرام کریں بھوک لگے تو یہ کھانا حاضر ہے۔

” اپنے کھانا تازہ اور گرم ملے گا۔ ”

” میں جانتی ہوں۔ ” تانیہ نے کہا۔

” ہاں، تم جانتی ہو گی۔ ” کالے چراغ نے اس کی تائید کی۔ ” اس لئے کہ پہلے تم دیکھے چکی
کیسے۔ ؟ ” محسن راؤ نے پوچھا۔

” جب میں اپنی دنیا سے منتقل ہوئی تھی تو کالے چراغ صاحب نے اسی طرح کے ایک محل میں
لہمان رکھا تھا۔ آپ کی زندگی کی کمائی سنائی تھی۔ پھر اس کے بعد یہ مجھے آپ سے ملانے لے
تھے۔ ” تانیہ نے واضحت کی۔

” اچھا۔ ” محسن راؤ نے گردن ہلا کر کہا جیسے اسے یاد آگیا ہو۔

” اب مجھے یہ بتاؤ کہ کما منتقل ہونا ہے۔ ؟ ” کالے چراغ نے پوچھا۔

” ایسا مطلب۔ ؟ ” تانیہ نے کہا۔ ” اپنی دنیا میں جائیں گے اور کما۔ ؟ ”

” اپنی دنیا میں تو جاؤ گے لیکن کس مقام پر منتقل ہونا چاہو گے۔ کیا اس مکان میں جہاں سے
دلایا گیا یا ساون پور کی حوالی میں یا ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں۔ پھر ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ ”

” میں کو کیا ہوا تائیہ۔ ؟ ”

” بھائی اتنی کو تو آپ کا غم لے بیٹھا۔ آپ کے اغواء کے بعد وہ بکھل تین ماہ زندہ رہیں،
بس ہر وقت آپ کی تصویر لئے گھومتی رہتی تھیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو یہی پر آپ کی فہرست
تصویر تھی اور نظریں دروازے کی طرف تھیں۔ ”

یہ سن کر محسن راؤ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے، پھر وہ گھنٹے میں منہ دے کر سک
سک کر رونے لگا۔ اسے روتا دیکھ کر خود تائیہ بھی صبر نہ کر سکی، وہ بھی بے اختیار رونے لگی
محسن راؤ نے اپنی بین کو قریب کر لیا۔ پھر وہ دونوں گلے مل کر آہ و زاری کرنے لگے۔

” اور بابا۔ ؟ ” محسن راؤ نے روتے روتے پوچھا۔

” تانیہ نے اپنے آسوں پر قابو پاتے ہوئے سے کہا۔ ” بیبا کو قتل کر دیا گیا۔ ”

” قتل کر دیا گیا..... کس نے قتل کیا انہیں۔ ؟ ”

” راؤ احمد علی نے۔ ” تانیہ نے انتہائی غصے سے کہا۔

” اس نے مجھے قتل کروانے کی سازش کی..... میری ماں کو مار دیا۔ میرے بابا کو قتل کر دیا۔ ”

محسن راؤ نے اپنے آسو پونچھ ڈالے اور پر عزم لججے میں بولا۔ ” راؤ احمد علی نکر مت کردا۔ ا
تمہاری موت اور وہ بھی ایسی عبرت کا کہ دنیا دیکھے تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ”

” ہاں، بھائی اس کو چھوڑنا نہیں ہے۔ اس نے ہمیں بالکل جاتا کر دیا ہے۔ ”

” میں اسے دیکھ لیں گا۔ ” محسن راؤ نے بڑے جوش سے کہا۔

” ارے بھی کے دیکھ لو گے۔ میں تو یہاں ہوں۔ اور میں نے تم لوگوں کا کچھ بگالا بھی بیٹھا۔ ”

” اپنک کالے چراغ کی آواز آئی۔ وہ درخت کے جنینہ سے ایک دم ہی باہر آیا تھا۔ ”

” نہیں وہ ان کی باتیں سن رہا تھا یا انہیں تلاش کرتا ہوا اور ہر آنکھا تھا۔ ”

” آپ آگے۔ ؟ ” تانیہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ” آپ کہاں چلے چکے۔ ؟ ”

” میں اپنے سردار کو لانا کے پاس گیا تھا۔ ان سے اجازت لینا ضروری تھی۔ ”

” اجازت لی گئی۔ ” تانیہ نے پوچھا۔

” ہاں، لیکن محسن راؤ تم کس کو دیکھ رہے تھے۔ ”

” ہے ایک خبیث شخص ہماری دنیا کا..... اس نے ہمیں کہانے چھوڑا۔ میں اس کی بات کہا۔ ”

” محسن راؤ نے بتایا۔ ”

” راؤ احمد علی کی بات کرتے ہو۔ ” کالے چراغ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

” ہاں، اسی کی لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو۔ ؟ ”

” میں کیسے جانتا ہوں، بھلا یہ بھی یوچنے والی بات ہے۔ مجھ سے یہ پوچھو کہ میں کیا جانتا۔ ”

” گویا سوال کرنے کی اجازت ہے۔ ” محسن راؤ نے فرما کر۔

”میں بات کاڑے۔؟“
”اگر ہم الگ الگ اپنی دنیا میں گئے تو یہ کالا چراغ ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دے۔ ہو سکتا ہے میں چدا کر دے۔ یہ آپ کو تو دنیا میں پہنچا دے لیکن مجھے یہاں سے نہ جانے دے۔“ تانیہ نہدش خاہر کیا۔

”یہ شخص فربی نہیں لگتا۔ اگر اسے ہمیں جدا کرنا ہوتا تو ملتا کیوں؟ پھر یہ تمہاری بہت عزت ہے۔“

”اہ، اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ یہ راکل کی طرح نہیں ہے۔ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اب میں اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس سے اس کی نیت پر شہبہ کیا جاسکے۔ جبکہ میں اس کے بھی ختماً بھی رہی ہوں۔“

”پھر کیا کرنا چاہئے۔“ محسن راؤ نے پوچھا۔
”کاملے چراغ پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ اس پر اعتماد کرنا دیے بھی ہماری مجبوری ہے۔ ہم اس کے بود کرم پر جو ہیں۔“ تانیہ نے کہا۔

”پڑوا اللہ ماں کہ ہے رسک تو بہر حال لینا ہو گا۔“ محسن راؤ بولوا۔
”پھر ہوت دیر تک بیٹھے اس مسئلے پر بات کرتے رہے۔ اس مسئلے کی باریکیوں پر غور کرتے ہے۔ بالآخر انہوں نے ایک مشترکہ لائجِ عمل طے کر لیا۔ کیا کرنا ہے کیسے کرنا ہے یہ سوچ لیا۔ مددی باتیں طے کرنے کے بعد وہ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ سو گئے۔ پھر جب تانیہ کی ٹونکی تو شام ہوتے کوئی تھی۔ اس نے محسن راؤ کو اٹھایا، دونوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ تانیہ نے اصرار سے محسن راؤ کو تھوڑا سا کھانا کھلایا۔ خود بھی کھایا۔
”سونج ڈھلتے ہی کالا چراغ آپنچا۔ اس کے چہرے پر کمیسر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے اڑ رینے گیا۔

”تانیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ نظریں نیچی کئے۔ گردون جھکائے کسی گھری سوچ میں تھا۔“
”کیا ہوا۔؟“ تانیہ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ کاملے چراغ نے نظریں اٹھا کر خالی خالی نگاہوں سے تانیہ کو ویکھتے ہوئے ”پھر اتنے اوس کیوں نظر آرہے ہیں۔؟“

”وقت رخصت ہے۔ کیا مجھے خوش ہوتا چاہئے۔“ کاملے چراغ نے سادگی سے کہا۔
”جو آتا ہے، اسے جانا ضرور ہوتا ہے۔“ محسن راؤ نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا۔

”تانیہ اور محسن راؤ۔ میں تم دونوں سے مخاطب ہوں۔ میرے کسی روئی سے کوئی تکلیف پچھی اور میں مغدرت خواہ ہوں۔ مجھے غیر انسانی مخلوق سمجھ کر معاف کر دینا۔“

”اپ نے ہم دونوں کا بہت خیال رکھا۔ ہم دونوں آپ کے شکر گزار ہیں مغدرت اور معاف نہ پہنچا سکتیں۔ البتہ ہم دونوں سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو اسے دل سے معاف کر دیجئے گا۔“

دونوں ایک جگہ منتقل ہوتا چاہو گے یا الگ الگ مقامات پر۔ یہ سب باتیں طے کرلو۔ اندھیرا ہوتے ہیں آجاؤں گا۔ پھر تم لوگوں کی مرضی کے مطابق تمہیں منتقل کر دیا جائے گا۔“ یہ کہ کر وہ محل کے اندر ویزی دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ دونوں اسے جاتے ہوئے غور سے دیکھنے لگے۔ وہ ایک قدم آور شخص تھا۔ ڈھیلا ڈھالا کالا لباس، کندھے پر پڑے ہے لمبے لمبے بال، اس کی شخصیت میں عجیب جاذبیت تھی۔ وہ تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اور پھر دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ کاملے چراغ کے جانے کے بعد تانیہ نے خیال انگیز لججے میں کہا۔ ”بھائی کاملے چراغ نے سوال تو ٹھیک اٹھایا ہے۔؟“

”کیا سوال۔“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”یہی کہ ہم ساون پور جائیں، لاہور منتقل ہوں یا کراچی کا رخ کریں۔“

”تم بتاؤ کیا کرنا چاہئے۔“

”میرا بھی تو یہ چاہتا ہے کہ میں جس کمرے سے یہاں منتقل ہوں ہوں۔ وہیں واپس جاؤں اور آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔“ تانیہ نے اپنی خواہش ظاہر کی۔
”یعنی کراچی، گلشن والے گھر میں۔؟“

”ہا۔“ پھر تانیہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اگر میں آپ کے ساتھ اس کمرے سے نکلی تو خالہ فرزانہ، بھائی افضل کو مطمین کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں انہیں کیا بتاؤں گی۔ اگر میں یہاں کے پہارے حالات بتا بھی دوں گی تو ہماری باوقوف پر کون یقین کرے گا۔ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے با پاگل سمجھیں گے۔ ہو سکتا ہے جھوٹ کے اس شاہکار پر نوبل پر اائز مل جائے۔ ہمیں ایسے واقعات گھر نے پر انعام توں لکھتا ہے لیکن یقین نہیں مل سکتا۔ اور بھائی بھی بات تو یہ ہے کہ میں جن عجیب و غریب حالات سے گزری ہوں، وہ سب مجھے خواب سامنے مل جائے۔ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں کوئی طویل خواب دیکھ رہی ہوں۔ جب آنکھ کھلے گی تو ساری حقیقت، سامنے آجائے گی۔ ملا فریب کھل جائے گا۔“

”بات تو تم ٹھیک کھتی ہو لیکن ہمیں ضرورت کیا ہے کہ ہم دنیا والوں کو اپنی کمانی سناتے پھریں۔“ ہمیں کسی سے سند لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی کمانی بھی سنائیں اور جھوٹے بھی کھلائیں۔“

”چلیں، ایک بات تو طے ہو گئی کہ اپنی دنیا میں جا کر یہاں ہم پر جو کچھ بیتا ہے، وہ نہیں سنائیں گے۔ ضرورت کے مطابق کوئی ایسی کمانی گھر لیں گے کہ لوگوں کو یقین آجائے۔ اور ان کا جذبہ جتنی تیکیں پا جائے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ چلیں یا الگ الگ۔“

”الگ الگ جانا ہو گا، اگر ایک ساتھ اس کاملے کمرے سے ظمور پذیر ہوئے تو سارے لوگ گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔“

”آپ کی یہ بات سو فیصد درست ہے لیکن میں اب آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے ڈر لگا ہے۔“

انسان بھر جال خطہ کا پتلا ہے۔

”تانية شرمندہ نہ کریں۔“ کالے چراغ نے کہا۔

”میں ایک حیر ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔ امید ہے آپ انہار نہیں کریں گے۔“ تانية نے کامن کا عطا کردہ لٹکارے مارتہ ہیوں کا ہار اپنے گلے سے اتار کر اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھا، اور ہاتھ اس کے سامنے کرویا، اس کے ہاتھ بجگار ہے تھے۔

”ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کسی نے آپ کو ویا ہے۔ میں اسے ہرگز قبول نہیں کر دیں۔“ کالے چراغ نے فیملے کن انداز میں کہا۔

”اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ وینے کو نہیں۔“ اس مرتبہ محن راؤ بولا۔

”کچھ وینے کی ضرورت بھی نہیں۔ اپنی دنیا میں جا کر مجھے اچھے لفظوں سے یاد کر لینا۔ بس یہی میرے لئے سب سے قیمتی تھا ہے۔“ کالے چراغ نے ہستے ہوئے کہا۔

”ہم جب تک جیسی گے آپ کو یاد رکھیں گے۔ آپ کو کون بھول سکتا ہے بھلا۔“ تانية نے دوبارہ وہ ہار اپنے گلے میں پن لیا۔

”آپ لوگوں نے طے توکر لایا ہے لیکن آپ سے پوچھنا بھی ضروری ہے کہ آیا ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔“

”ہم لوگوں نے طے توکر لایا ہے۔ جو آپ چاہیں، میری طرف سے کھلی آزادی ہے۔ آپ جائیں کیا چاہتے ہیں۔“

تب تانية نے کالے چراغ کو اپنا مصوبہ پیادیا جو انسوں نے آپس میں طے کیا تھا۔ وہ دونوں کی باشیں غور سے ستارہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ چلنے کی تیاری کریں۔“

پھر کالے چراغ نے محن راؤ کو کپڑے فراہم کئے۔ ایک بیک دیا جس میں کئی جوڑے موجود تھے۔ تانية کو بھی اس کی ضرورت کی چیزیں فراہم کیں۔ پھر وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”تانية تم ابھی بیٹھو۔ پلے میں محن راؤ کو منتقل کروں کیونکہ تم الگ الگ اپنی دنیا میں جانا چاہتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“

”تم پریشان تو نہیں ہوگی۔“ کالے چراغ نے پوچھا۔

”نہیں ہرگز نہیں۔“ پریشان تو اسے ہو گئی تھی لیکن اس نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں کی۔

”آؤ، محن راؤ..... اخدا اپنا بیگ اور چلو اپنی دنیا میں۔“

محن راؤ نے اپنا بیگ اخالیہ۔ وہ تانية کے قریب آیا اور دیہر سے بولا۔ ”اچھا تانية۔ میں چلتا ہوں۔ تم ڈرنا مت۔ انشاء اللہ کوئی گز بڑھ نہیں ہوگی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو اچھا بھائی اللہ حافظ۔“ تانية نے ہمت سے کام لیا۔

محن راؤ اور کالا چراغ محل کے اندر وہی ورواز سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد ورواز کھٹاک سے بند ہو گیا۔ ورواز بند ہوتے ہی اس کاول کا پنچے گا۔ خوف کی لہر اس کی ریڑھ کی یہیں اترتی چلی گئی۔ اسے بس یہی خدشہ تھا کہ کمیں کالا چراغ و سوکا نہ وے جائے۔

بھر جال اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اللہ سے لوگا۔ اور سلامتی سے گھر پہنچ جانے کی ہیں مانگنے گی۔

سونچ کب کا ڈوب چکا تھا۔ باہر تاریکی پھیل چکی تھی۔ تانية نے کچھ دیر کے بعد پورہ ہٹا کر باہر ناٹا، تو اسے تاروں سے بھرا آسمان نظر آیا۔ چاند بھی نکل آیا تھا لیکن وہ سامنے نہ تھا۔ چاندنی پی بلغ پر برس رہی تھی۔

کافی دیر کے بعد کالا چراغ واپس آیا۔ وہ پیسہ پیسہ ہو رہا تھا۔ اس کے کالے کپڑے جگہ جگہ ہی بیکھرے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا۔؟“ تانية نے پوچھا۔

”محن راؤ بخیر اپنی دنیا میں پہنچ گئے۔“ کالے چراغ نے بتایا۔

”آپ پیسہ میں نہماں ہوئے ہیں۔“ ہمدرودی سے کہا۔

”یہ پیسہ نہیں ہے۔“ کالے چراغ نے مسکرا کر کہا۔

”پھر کیا ہے۔؟“ تانية جرأت زدہ ہو کر بولی۔

”چھوڑ، اس بات کو۔ آؤ اپنا بیگ اخالو اور میرے پاس آجائو۔“

تانية نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموشی سے کری سے اٹھی اور اپنا بیگ کنہ سے پر رکھ کر اس کی پاس جا کھڑی ہوئی۔

کالے چراغ نے اپنا سیدھا ہاتھ اس کی طرف ہو جایا اور بولا۔ ”میرا ہاتھ پکڑلو۔“

تانية نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا جو برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

”اب اپر پچھت کی طرف ویکھو۔“ کالے چراغ نے کہا۔

تانية نے بغیر کچھ کے اپنی نظریں محل کی پچھت پر جمادیں۔

”کیا نظر آرہا ہے۔؟“ کالے چراغ نے پوچھا۔

”پچھت۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور اب۔“

”پچھت غائب ہو گئی۔ تاروں بھرا آسمان و کھلائی وے رہا ہے۔“

”اور اب۔“

”اب اندر ہمراہ اپنے بھریا ہے۔“

تب اسے محوس ہوا جیسے کالے چراغ نے اپنا ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا ہو۔ کچھ دیر تک وہ خاموش ٹھاڑی۔ اس انتظار میں کہ شاید کالا چراغ اب کوئی سوال کرے۔ لیکن کالے چراغ نے کوئی

سوال نہ کیا۔ وہ اس کے نزدیک ہوتا تو سوال کرتا، وہ توکب کا جاپ کا تھا۔

اب تانیہ کو احساس ہوا جیسے اس کے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ وہ ایکی کھڑی ہے۔

تمنی کے احساس کے ساتھ ہی اچانک اس کے جسم میں سرودی کی لہر کی خوف کی وجہ سے نہ تھی بلکہ یہ سرودی اسے اپنے چاروں طرف برستی محسوس ہو رہی تھی۔ جہاں وہ کھڑی تھی، وہاں گھپ اندر ہرا تھا، اس قدر کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں بھائی دے رہا تھا۔

اس نے اپنا ایک ہاتھ بوحاکر ایسے ہی انہوں کی طرح لبراہی کچھ مٹونے کی کوشش کی لیں اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ بن ہاتھ فضایل لہرا کر رہ گیا۔ اب اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ وہ اندر ہرے میں آنکھیں پھاڑے ویکھ رہی تھی کہ اس نے ایک باریک سے سوراخ سے روشنی آئی ہوئی محسوس کی۔ اور اس سوراخ کی صورت کسی چاپی کے سوراخ کی سی تھی۔

تب اچانک ہی ایک خوشی کی لہر سرتا پا ڈوڑ گئی۔ اس نے جان لیا کہ وہ اس وقت کمال ہے۔ وہ پلا

خوف و خطر تیری سے آگے بڑھی اور اس نے جھک کر چاپی والے سوراخ میں اپنی آنکھ نکالی۔ اسے سامنے چھتا تھا نظر آیا۔ وہ اس کا جانا پچاہا تھا۔ خوشی کے مارے اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اس دھڑکن کی آواز ضاف سن سکتی تھی۔

اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اس وقت وہ اس کمرے میں موجود تھی۔ جس کی دیواریں سیاہ تھیں۔ اور دروازے پر ایک تعین لٹکا ہوا تھا۔ وہ جہاں سے گئی تھی وہیں والپیں آئی تھی۔

یہاں کا موسم شاید تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ بارشوں کے موسم میں گئی تھی۔ اب شاید سر دیاں آگئی تھیں پا ہو سکتا ہے اتنی بارشیں ہوئی ہوں کہ مھنڈ بڑھ گئی ہو۔

اس نے ٹول کر دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے ہلکا سادبایا۔ یہ جان کر مزید سرست ہوئی کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے کے اس طرف خالہ فرزانہ تھیں جو اس پر اپنی جان چھڑکتی تھیں۔ افضل بھائی تھے جو اس کا بے پناہ خیال رکھتے تھے۔ دروانہ تھی جس کی خدمت کا کوئی بدلنا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت رات کا کیا بجا ہے۔ برآمدے کی لائٹ جل رہی تھی۔ لیکن

اس سے وقت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کیونکہ یہ لائٹ ساری رات جلتی رہتی تھی۔ اس نے کان لگا کر کوئی آہست سننا چاہی لیکن باہر کوئی آہست نہیں تھی۔

وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔ کیا کرے۔ باہر تو اس نے نکالا ہی تھا۔ سوال یہ تھا کہ باہر نکل کر اپنے کمرے کا رخ کرے یا خالہ فرزانہ کے کمرے کا دروازہ کھٹکائے۔ اسے یہ بات ابھی طرح معلوم تھی کہ اس کا کمرہ کھلانہ ہو گا۔ اسے خالہ فرزان نے ضرور مغلل کروادیا ہو گا اور اس کی ٹالی بھی انہی کے پاس ہو گی۔

اب اس کمرے میں کھڑے ہو کر وقت بر باد کرنا بیکار تھا۔ سرودی کی وجہ سے اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر بہت آہست سے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔

کھر دوں نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ برآمدے میں کوئی نہ تھا۔ ناتا طاری تھا۔

ب اس نے جلدی سے باہر نکل کر اس کے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اور دروازے پر کھڑے ب ر گھرے گھرے سائنس لینے لگی۔ اس کمرے کے باہر والا کمرہ خالہ فرزانہ کا تھا۔ اس کی جیرت کی انتہاء رہی جب اس نے خالہ فرزانہ کا دروازہ تھوڑا سا کھلا دیکھا۔ اندر لائٹ بھی مل رہی تھی۔ اس قدر سرودی میں دروازے کا کھلا ہونا کیا معنی رکھتا تھا۔

وہ بے آواز آگے بڑھی۔ لیکن اس کے دل نے اپنی دھاڑ دھاڑ بند نہ کی۔ سکھلے دروازے سے اس نے دیکھا کہ خالہ فرزانہ تنکے لگائے بیٹھ پر لیٹی ہیں ہاتھ میں کوئی کھلا ناول ہے جو بیٹھ پر اونڈھا رکھا ہے۔ شاید خالہ فرزانہ پڑھتے پڑھتے تھک گئی تھیں۔ اس نے سوچا، کہیں بخت پڑھتے سونہ گئی ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے ان کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا، کہیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی چھٹ کو سک رہی تھیں۔

دروازے کی طرف ان کا سر تھا۔ اگر وہ آہستہ سے ان کے کمرے میں داخل ہوتی تو وہ اسے دیکھ پاتی۔ اس نے بہت آہستہ سے دروازہ کھول کر قدم اندر رکھا۔ اس کا دل پھر زور سے ہٹکنے لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان کے پلٹ کر دیکھنے سے پسلے وہ ان کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ انہی اس نے دو قدم آگے بڑھ کر ان کی آنکھیں بند کرنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

وہ بغیر اس کی طرف دیکھے بولیں۔ ” دروانہ، میری کافی میں چینی تو زیادہ نہیں بھر لائی۔ ”

دروازہ زیادہ کھلنے کی وجہ سے انہیں اپنے چہرے پر ہوا زیادہ محسوس ہوئی، اس سے انہوں نے اپنا گایا کہ دروانہ اندر واخل ہوئی ہے۔ شاید وہ ان کے لئے کافی بناۓ گئی ہوئی تھی۔

انہی نے بغیر کوئی جواب دیئے۔ جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ان کی آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند تئے پلے تو ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار اپھرے۔ لیکن پھر فوراً ہی یہ آثار معدوم ہو گئے۔ جانتی تھیں کہ دروانہ کسی صورت اس کی آنکھیں نہیں بند کر سکتی۔ انہوں نے ناول چھوڑ کر لعلوں پر ہاتھ رکھنے والی کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھوڑا۔

پھر انہیں تانیہ کا ہاتھ پچانے میں چند سیکنڈ بھی نہ لگے۔ ان کے چہرے پر ایک خوشنگوار جیرت مانگی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ ناول پڑھتے پڑھتے جیسے سو گئی تھیں یا پھر جاگتی آنکھوں سے خواب ہری تھیں۔ ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے والی تانیہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ ایسا ملامٹ ریشم سما نہ تانیہ کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔

” میری جان، یہ تم ہو.....؟ اگر میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں تو یہ خواب کبھی نہ ٹوٹے..... اگر ناٹ بھی نہیں حقیقت ہے تو پھر تانیہ آواز دو۔ مجھے خالہ فرزانہ کے کپارو۔ ”

” غال۔ ” تانیہ نے دھیرے سے پکارا۔ انہوں نے تانیہ کی آواز سن کر فروا اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹادیا۔ آنکھوں سے ہاتھ ہٹا تو بکی میں موہنی صورت خالہ فرزانہ کے سامنے تھی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ گھسیٹ کر اپنے اوپر لایا اور اسے اپنی باتوں میں بھر کر بے اختیار روپڑیں۔

ہوش ربا ○

317

”خالہ اس قدر سروی میں آپ نے کمرے کا دروازہ کیوں کھلا چھوڑ رکھا تھا۔“
”بھی وہ دردانہ میرے پاس ہی تھی۔ شام سے میرے سر میں درد ہو رہا تھا تو وہ میرے پاس

بھی سروباری تھی۔ ہم دونوں تمہاری باتیں کر رہے تھے۔ سر میں درد کم ہوا تو وہ کنٹے لگی کہ میں آپ کے لئے کافی بنا لاؤں۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ناول اٹھایا۔ چند سطر ہر صیں، پھر پڑھنے کو دل نہ چاہا۔ اچانک تمہاری یاد نے دل کو گھیر لیا۔ دردانہ شاید جلدی میں دروازہ ٹھیک سے بند نہ کر پائی۔ وہ ہوا سے تھوڑا کھل گیا۔ مجھے یہ احساس تھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے لیکن میں نے انھے کر بند نہ کیا کہ وہ کافی بنا کر لائے ہی والی ہو گی جب مجھے ہوا زیادہ محسوس ہوئی تو میں نے پیچے مرکر دیکھے بغیر اندازہ کر لیا کہ دروانہ کافی بنا کر لے آئی ہے۔ اسی لئے میں نے اس سے چھپی زیادہ ڈال لائے کا اندازہ ظاہر کیا۔ پھر دروانہ کا جواب نہ آیا اور کسی کا میری آنکھوں پر ہاتھ آیا تو.....“

”آپ سمجھیں کہ دردانہ نے آپ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا ہے۔“ تانیہ نے ان کی بات کاٹ رکا۔ ”ای لئے چند لمحے کو آپ کا چہرہ ناخُشگوار ہوا، پھر آپ حیرت میں ڈوب گئیں۔ ویسے خالہ اپ نے میرا ہاتھ پہچانا خوب۔“

”اری پچھلی۔ تیرا تیارا ہاتھ بھلا میں بھول سکتی ہوں۔“ خالہ فرزانہ نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”دردانہ ابھی تک آئی نہیں۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”آنے والی ہو گی۔ کافی پچینت رہی ہو گی۔“

”خالہ میں چھپ جاؤں۔ مزہ آئے گا۔“ تانیہ شرارت سے نوی۔

”میرے لحاف میں دبک جاؤ۔“ خالہ فرزانہ بھی آنکھ چھوپی کے موڑ میں آنکھیں۔
”نہیں خالہ۔ اگر میں اچانک اس کے سامنے لحاف میں سے نکلی تو وہ ڈر جائے گی۔ چیخ مار کر بے ہوش ہو جائے گی۔“

”ہاں، یہ بات تو تم ٹھیک کہ رہی ہو۔ لیکن تانیہ، اب مجھے خیال آیا کہ تم آئی کدھر سے ہو۔“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ کے برابر والے کمرے سے۔“ تانیہ نے سادگی سے بتایا۔

”تعویذ والے کمرے سے۔؟“ خالہ فرزانہ حیرت زدہ رہ گئیں۔

”ہاں۔“ تانیہ نے کہا۔

”اور تم گئی بھی دیں سے تھیں۔“ خالہ فرزانہ نے پوچھا۔

”ہاں خالہ۔ اب دروانہ آنے والی ہو گی۔ باقی باشیں بعد میں ہوں گی میں فی الحال واش ردم میں بلا جاتی ہوں۔ مجھے سروی لگ رہی ہے میں آپ کی شال اوڑھ لیتی ہوں۔ وہ کافی لے کر آجائے تو سے سونے کی بدایت کر کے دروازہ بند کر لجھے گا۔ پھر میں باہر آ جاؤں گی۔ ٹھیک ہے۔“ تانیہ نے نالہ کو سمجھایا۔

تانیہ نے بھی انہیں بھیچ لیا۔ پھر وہ خود بھی اپنے آنسونہ زدک سکی۔

”اوه، تانیہ میری جان۔ تو کمال چلی گئی تھی۔“ روتے روتے خالہ فرزانہ نے اس کا سر انداز اس کے رخساروں کو چومنا۔

”میں کہیں نہیں گئی تھی، آپ کے ہی پاس تھی۔ آپ کے آس پاس۔“

”تانیہ چند لمحوں پہلے میں تیرے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ ناول پڑھتے پڑھتے اپنک تو یاد آگئی تھی اور ٹوٹ کر یاد آئی تھی۔“

”ویکھ لیں، آپ نے مجھے بہت تربیا ہے۔“

”خالہ میں جانتی ہوں۔ میں آپ مجھے معاف کر دیں۔“

”میں تجھے کبھی نہیں معاف کروں گی۔“ خالہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ویکھیں خالہ اتنا غصہ نہ کریں، اتنا غصہ آپ کی صحت کے لئے ٹھیک نہیں۔“ تانیہ نے ان کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

”اچھا میرے پاؤں چھوڑ، مجھے نہیں چاہئے خو شامد۔“ انہوں نے اپنے پیر سکوڑ لئے۔

”میری اچھی خالہ، معاف کر دیں نا۔“ تانیہ نے پھر ان کے پیر پکڑ لئے۔

”ایک شرط پر معاف کروں گی۔“ خالہ فرزانہ بولیں۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔ جلدی تائیں شرط۔“

”آئندہ تو مجھے اس طرح چھوڑ کر نہیں جائے گی۔“

”ٹھیک ہے خالہ، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ اس طرح نہیں جاؤں گی۔ اگر جاؤں گی بھی تو بینڈ باجے کے ساتھ۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ پہلے تو خالہ فرزانہ نے ہاں ٹھیک ہے کہ دیا، پھر اس کے جملے کا مفہوم سمجھ میں آیا تو وہ پوچھیں۔ پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”ایں، کیا کہا۔“

”کچھ نہیں۔“ تانیہ فوراً مقصوص بن گئی جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

”ہاں اس طرح جاؤگی تو میں تمیں سوبار بھیجنے کے لئے تیار ہوں۔“ خالہ فرزانہ اپنی رومنی کر سکتیں۔

”کچھ خدا کا خوف کریں خالہ۔ ایسا ظلم تو نہ کریں مجھ پر۔“

”کیوں میں نے کیا کہا۔“ خالہ فرزانہ نے اسے سوالیہ نگاہوں نے دیکھا۔

”بُرے آرام سے میری سو شاویاں کر دیں۔“ تانیہ نے انہیں اپنی چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔

”اللہ۔“ خالہ فرزانہ نے فوراً اپنا سر پیٹ لیا۔ انہیں اپنے جملے کا مطلب اب سمجھ میں آیا۔

”تانیہ نے سائیڈ نیبل یہ رکھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔

بھی تانیہ نے کچھ کرنے کے لئے اپنے بھائی کی مدد کی۔ اب وہ میلیفون کی بھتی بھی۔
وہ نوں نے ایک دوسرے کو سالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ نوں کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کے
جلے نمایا تھے۔

یہ بات بھی حیرت اور خوف میں جتنا ہونے والی تھی۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ سخت سردی
بڑی تھی۔ وہ تک سناٹا طاری تھا۔ اور اس سنائے میں جھینگروں کے بولنے کی آوازیں صاف سنائی
تھیں۔ تانیہ نے اچانک ظمور پذیر ہو کر پہلے ہی خالہ فرزانہ کے وجود میں پھر جماوی تھی۔
رب میلیفون کی بھتی بخ رہی تھی۔

”خالہ، یہ اس وقت کس کافون ہو سکتا ہے۔“ تانیہ نے پوچھا۔
”سبھی میں نہیں آ رہا۔“ پھر ایک دم چونک کر بولیں۔ ”ارے کہیں افضل کا نہ ہو، وہ کسی کی
لادی میں گیا ہوا ہے۔“

تانیہ میلیفون کے زیادہ نزویک تھی، اس نے رسیور انھا کر خالہ فرزانہ کو دے دیا۔
”ہیلو۔“ خالہ فرزانہ رسیور تھام کر بولیں۔

”اہ، فرزانہ کیسی ہو۔؟“ اور ہر سے پوچھا گیا۔

”عامر، یہ تم ہو۔؟“ خالہ فرزانہ کے لبجے میں بہپناہ مرت آگئی۔ ”اللہ، آج کا دن کس
ذریمبارک ہے۔“

”فرزانہ، اس وقت وہ نہیں رات ہے اور وہ بھی آدمی ہونے کو ہے۔“ اور ہر سے کہا
لیا۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے۔ آج کی رات میرے لئے بڑی مبارک ہے۔“
تانیہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کیا۔ اسے خدشہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ اس کی آمد کے

بائے میں نہ تباہیں خالہ فرزانہ نے اس کی بات سمجھ کر گروں ہلائی۔

”وہ کیوں۔؟“ جانتے بوجھتے انجمان بننے کی کوشش کی بھتی۔

”تمہارا فون جو آیا۔“ خالہ فرزانہ نے بات کا رخ تبدیل کیا۔

”میں تو فون کرتا ہی رہتا ہوں۔“

”اس سرتیہ تو تم نے کافی نوں کے بعد فون کیا ہے۔“

”فرزانہ پوچھو گی نہیں کہ اتنی رات گئے میں نے فون کیوں کیا ہے۔؟“

”تم نے اس وقت فون کیا ہے تو ضرور کوئی خاص بات ہو گی۔“

”ہاں، بہت خاص بات ہے۔ بڑی زبردست خوشخبری ہے۔ ایسی کہ سنو گی تو اچھل
پنگل۔“

”اللہ، ایسا کیا ہو گیا۔ جلدی تباہ۔“

”اس خوشخبری کے ملتے ہی میں نے تمہیں فون کیا ہے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ فوراً کسی کو یہ

خالہ فرزانہ بڑی معاملہ فرم اور سمجھدار خاتون تھیں۔ وہ فوراً معاملے کی نزاکت کو سمجھ لگیں۔
انہوں نے فوراً کہا۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔“

تانیہ گرم شال اوڑھ کر واش روم میں چلی گئی۔ اور جاتے جاتے کہہ گئی۔ ”خالہ میرے لئے
کافی بچا کر رکھیجئے گا۔“

”اچھا اچھا۔“ خالہ فرزانہ نے مکراتے ہوئے کہا۔

بس چند لمحوں کا ہی فرق ہوا، اور ہر تانیہ نے واش روم کا دروازہ بند کیا اور اوہ رو روانہ کافی کا گک
لے کر اندر آئی۔ اور آتے ہی بولی۔ ”بڑی بی بی، یہ دروازہ کیوں کھلا ہے۔“

”ورو انہ تم خود ہی تو ٹھیک سے بند کر کے نہیں بھتی تھیں، کھلا چھوڑ گئی تھیں وہ ہوا سے مزید کھل
گیا۔ اب سوال مجھ سے کر رہی ہو۔“ خالہ فرزانہ نے بجائے ڈائٹنے کے پیار سے کہا۔

”اوہ، غلطی ہو گئی۔ ویسے بڑی بی بی میں آپ کے لئے زبردست کافی بنا کر لائی ہوں۔“ وردابہ
نے کافی کا گک ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت مجھے تانیہ بی بی بست یاد آ رہی ہیں، وہ
بڑی شوقیں تھیں کافی کی۔“

”ہاں دروازہ۔“ خالہ فرزانہ نے گمراہیں لے کر کہا۔ ”تم وعا کر لو کہ وہ کسی طرح واپس
آ جائیں۔“

”میں تو ہر وقت وعا کرتی ہوں بڑی بی بی ان کے لئے۔ پتہ نہیں کہاں چل گئیں۔“

”اللہ، بتر جاتا ہے۔“ خالہ فرزانہ نے خیال انگیز لمحے میں کہا۔ ”اچھا، ورو انہ تم اپ بچا
سو جاؤ۔ میری طبیعت اب کافی بھتر ہے۔“

”میں، بڑی بی بی ٹھیک ہے۔ میں جارہی ہوں۔ آپ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔“ یہ کہہ کر
وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد خالہ فرزانہ نے فوراً اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ اور پھر آہستہ سے واش روم
کا دروازہ بجا لیا۔ تانیہ فوراً نکل کر باہر آگئی۔ اور خالہ سے لپٹ گئی۔

”میری خالہ۔ پیاری خالہ۔ اچھی خالہ۔“ تانیہ نے بے اختیار کہا۔

”چل تیری کافی آگئی ہے۔ پی لے۔ ورو انہ ابھی تجھے یاد کر کے گئی ہے۔“ خالہ فرزانہ اسے
لپٹائے لپٹائے بیٹھ لیا۔ اسے بیٹھ پر بیٹھا۔ کافی کا گک اس کے ہاتھ میں دیا۔ پھر وہ کاف
اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ تانیہ نے بھی کھاف اپنے اوپر لے لیا۔

”خالہ آپ نہیں پیسیں گی کافی۔“ تانیہ نے کافی کا گک ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے صاف انکار کر دیا۔

”خالہ، میرا کمرہ بند ہے۔؟“ تانیہ نے کافی پیٹے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، چالی میرے پاس ہے۔ میں تمہارے کمرے کی روز صفائی کرواتی ہوں۔“ خالہ فرزانہ
نے بتایا۔

”خالہ میں کوئی جن تو نہیں کہ ظاہر ہوں گی۔“ تانیہ نے سکراتے ہوئے کہا۔
”تانیہ کبھی کبھی مجھے شبہ ہونے لگتا ہے۔“ خالہ فرزانہ نے بڑی سنجیدگی سے نہا۔
”ہے خالہ..... مجھے ڈرامیں نہیں۔ میں کوئی جن ون نہیں ہوں۔“ تانیہ کو جیسے اپنے آپ
کے ڈر آئے لگا۔

”پھر تو اس کرے سے کہاں غائب ہو گئی تھی اور تین ماہ بعد پھر کس طرح آگئی۔“ خالہ فرزانہ
نے پوچھا۔

”خالہ، مجھے گئے ہوئے تین ماہ ہو گئے۔“ تانیہ حیرت زدہ تھی۔

”چلو، اب تمہیں یہ ہی معلوم نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے تشویش بھرے لمحے میں کہا۔
”نہیں، میں کہہ رہی تھی کہ تین ماہ ہو گئے یہاں سے گئے ہوئے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ابھی
دی پندرہ دن ہوئے ہوں۔“ تانیہ نے فوراً بات بنای۔ اس بات پر وہ واقعی حیران تھی۔ اس کے
باب سے گئے ہوئے ہوئے دس پندرہ دن سے زیادہ نہ ہوئے تھے۔
”اری تجھے لگتے ہوں گے، دس پندرہ دن..... مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تو تین سال کے
بدواہیں آئی ہے۔“

”خالہ، یہ آپ کی محبت ہے۔“ تانیہ نے ممنونیت سے کہا۔

”تانیہ بچتا، اس عرصے میں کبھی میں یاد نہ آئی تجھے۔“

”کیوں نہیں خالہ، آپ بہت یاد آئیں۔“ تانیہ نے ان کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔
”اب بہار یاد آئیں۔“

”تانیہ، کچھ بتاؤ تو اس عرصے میں کہاں رہی۔؟“ خالہ پھر خطراہک موضوع کی طرف پلٹ
لی۔

”خالہ اگر آپ اس سلسلے میں مجھ سے سوال نہ کریں تو بہتر ہے۔ میں آپ سے جھوٹ بولنا
نہیں چاہتی۔ اور اگر میں نے تجھا دیا تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔ آپ صبح ہی مجھے کسی ماہر نفیات
کے پاس لے جائیں گی۔“

”لیکن ناقابل یقین بات ہے۔؟“

”ہاں، خالہ ایسی ہی ناقابل یقین بات ہے۔ میں جن حالات سے دوچار ہوئی ہوں۔ وہ سب
لئے مجھ کی بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہا ہے۔ جب میں خود شک و شبه میں بتلا ہوں تو آپ
لئے یقین آئے گا بھلا۔“ تانیہ نے بڑے بچے لمحے میں خالہ فرزانہ کو سمجھایا۔
”آچھا چلو چھوڑو، اس مسئلے پر میں تم سے پھر بات کروں گی۔ فی الحال تو یہ بتاؤ کہ تم اس گھر
کا نہیں طرح داخل ہو گئی۔“

”ہاں، یہ بات سوچنے کی ہے۔ دردانہ تو اپنے کرے میں جا چکی ہے، اس کا دروازہ بند ہو گا۔
بلاؤ فنگ گھر میں موجود نہیں ہیں۔ میں ایسا کرتی ہوں۔ دیوار کے پاس کرسی رکھ کر برابر والے

خوشخبری سداویں۔ تمہارے علاوہ مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ لہذا فوراً تمہارا نمبر کھمادیا۔“
”ترقی ہو گئی تمہاری۔ کیا اپنے کالج کے پرنسپل بن گئے ہو۔“ خالہ فرزانہ نے اندازے کا تیر
پھینکا۔

”ارے نہیں بھی..... اپنا محسن آگیا ہے۔ محسن راؤ۔“ عامر نے جیسے دھماکہ کیا۔

”میں کیا کہا..... کون آگیا ہے۔؟“ خالہ فرزانہ کو اپنی ساعت پر اعتبار نہ آیا۔

”محسن راؤ کی بات کر رہا ہوں..... راؤ ششادھ علی کے بیٹے کی۔“

”اللہ تعالیٰ۔“ خالہ فرزانہ یہ خبر سن کر واقعی اچھل پڑیں۔ انہوں نے رسیور پر اتھ رکھ کر تانیہ
کو بتایا۔ ”محسن آگیا ہے۔“

”میں واقعی۔“ تانیہ نے یہ خبر سن کر مصنوعی حیرت سے کہا۔ اس نے دل ہی دل میں شکراہ
کیا کہ محسن راؤ منصوبے کے مطابق انکل عامر کے پاس پہنچ گیا۔

”ہاں، بھی..... سو فیصد بچ۔“ عامر نے متحکم لمحے میں کہا۔

”کس طرح پہنچا؟ کہاں تھا وہ۔؟“ خالہ فرزانہ نے بے قراری سے پوچھا۔
”یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر سداویں گا۔ مجھے اس کی آمد کی بہت خوشی ہے۔ اب میں راؤ احمد علی کو
تارک پہنچے چبوا دوں گا۔ اچھا یہ تباہ، تانیہ کی کوئی خیر خبر نہیں۔“

”نہیں۔ کچھ نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے تانیہ کی طرف سکراکر دیکھتے ہوئے کہا۔
”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لڑکی کہاں غائب ہو گئی۔ اگر وہ خطہ چھوڑ کر جاتی، پھر تو یہی شہ
ہوتا کہ کہیں راؤ احمد علی نے تو کوئی ہاتھ نہیں دکھادیا۔ اللہ کرے وہ کسی طرح آجائے۔ اور جہاں
بھی ہو بینج ہو۔“

”عامر فکر نہ کرو، محسن آگیا ہے تو اب میرا دل کھتا ہے کہ تانیہ بھی آجائے گی۔“

”اللہ، تمہاری زبان مبارک کرے۔ کوئی خبر ملے تو مجھے فوراً بتانا۔“

”ظاہر ہے، عامر تمہیں نہیں بتا دیں گی تو اور کے بتا دیں گی۔“ خالہ فرزانہ نے اپنی آواز میں لوچ
پیدا کرتے ہوئے کہا۔
پھر عامر نے الوداعی کلامات کہہ کر فون بند کر دیا۔ خالہ فرزانہ نے خوشی سے جھومنتے ہوئے رسیور
تانیہ کو دیا اور بولیں۔ ”تانیہ، اتنی ڈھیر ساری خوشیاں مجھے ایک ساتھ مل گئی ہیں، کہیں میں خوشی
سے مرنے جاؤں۔“

”محسن بھائی آگئے ہیں۔ خالہ یہ خوشخبری تو واقعی بہت بڑی ہے۔“
”میں سوچ رہی تھی کہ عامر کو ان کی خوشخبری کے جواب میں میں بھی ایک خوشخبری سداویں لیکن
تم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔“ خالہ فرزانہ نے ٹککہ کیا۔

”ہاں، خالہ ابھی نہیں۔ کل دن میں فون کر کے بتا دیں گے۔“
”آچھا، اب تم یہ بتاؤ کہ تم کس طرح ظاہر ہو گئی، اس گھر میں۔“

بھر کہیں جا کر اس نے اپنا دروازہ کھولا۔ اور اپنی آنکھیں ملتی ہوئی بولی۔ ”جی بڑی بی

بی بی بی کی پچھی۔ دروازے پر دیکھ کون ہے۔ افضل آیا ہو گا۔“

”اچھا۔“ یہ کہ کہ اس نے اپنے سنجے کے چھپے سے گیٹ کی چابی نکالی اور چادر اور حصتی گیٹ کی طرف بھاگی۔ پھر اس نے گیٹ کے نزدیک جا کر پوچھا۔ ”کون۔؟“
لی ہوں۔ ”تائیہ سردی کی وجہ سے کپکانے لگی تھی۔ باہر ہست تیر اور ٹھمنڈی ہوا تھی۔ اس بھی رُزتی ہوئی تکی۔ دروانہ فوری طور پر پکپان نہ پائی۔

لی کون۔؟“ دروانہ نے پوچھا۔

دروانہ دروازہ کھولو۔ میں ہوں تائیہ۔؟“ تائیہ نے جلدی سے کہا۔
بے تائیہ بی بی آپ۔؟“ تائیہ کی آواز سن کر دروانہ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں بچھوں گئے۔ خالہ فرزانہ برآمدے میں کھڑی تھیں۔ تائیہ نے انہیں کھڑے دیکھے سے آواز لگائی۔

بی بی بی..... تائیہ بی بی۔“ دروانہ نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

سایکا کہ رہی ہو۔؟“ خالہ فرزانہ نے کمال کا مکالمہ یو لا۔ بالکل نچھل۔

دروازے پر تائیہ بی بی ہیں۔“ دروانہ سے خوشی نہیں سست رہی تھی۔

یا تو پھر جلدی سے دروازہ کھول، وہاں کھڑی ہوئی کیا کر رہی ہے۔“

بی بی بی..... تالا کھول رہی ہوں۔“ وہ واقعی تالا کھول رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ قابو میں نہ

ثی کے مارے اس پر لرزہ طاری تھا۔ چابی، تالے میں جاہی نہیں رہی تھی۔

واد بندی کرو..... دروازہ کھولو۔“ ادھر تائیہ سردی سے کانپ رہی تھی۔

ڈاکر کے دروانہ نے گیٹ کھولا۔ اور پھر بے اختیار اس سے گلے ملنے کے لئے آگے بڑھی

تی اسے اپنی حشیت کا خیال آگیا۔ وہ اس گھر کی ملازما تھی۔

بی بی آپ۔“ اس نے تائیہ کے ہاتھ پکڑ کر جو شے دبائے۔

سے اپنے ہاتھ چھڑا کر اسے فوراً اپنے گلے لگالیا۔ ”دروانہ تم کیسی ہو۔؟“

سے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کیسے جواب دیتی اس نے روتا شروع کر دیا تھا۔

ئے میں آہستہ آہستہ چلتی۔ خالہ فرزانہ بھی نزدیک آگئیں۔ تائیہ انہیں دیکھ کر دروانہ کو

تھا سے لپٹ گئی۔ ”میری خالہ۔“

”میری بچی تو کمال چلی گئی تھی۔؟“ یہ کہتے ہوئے وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔ پھر سے

رُوانہ کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھوں سے بھی بن بادل برسات شروع ہوئی۔ وہ روتے

فرزانہ کو زور زور سے بھینچ رہی تھی۔ تب خالہ فرزانہ کو خیال آیا کہ تائیہ کو سردی لگ

پلات پر کوڈ جاتی ہوں اور گھوم کر اپنے دروازے پر آ جاتی ہوں۔ اس کے بعد بیتل بجاویں گی ساری ہی گیٹ کھلنا تو اس کی۔ دروانہ ابھی سوتی نہ ہو گی، وہ اٹھ کر گیٹ کھول دے گی۔ اور میں اس گھر میں داخل ہو جاؤں گی۔ اس طرح گھر میں اندر کا سین مکمل ہو جائے گا۔“

”چلو تمہارا داخلہ تو ہو گیا۔ اب کمالی کیا سناوی گی۔ کمال چلی گئی تھیں اس بارے میں کیا بتاؤ گی۔“

”افضل تو بال کی کھال نکالنے والا آدمی ہے۔“ خالہ فرزانہ نے پریشان کر کہا۔

”بس، یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں..... ویسے آپ یہ کوشش کیجئے کہ بھائی افضل کم سے کم سوال کریں۔“

”ٹھیک ہے..... چلو پھر تم جلدی کرو۔ کیا تم آسانی سے دیوار پھلانگ جاؤ گی۔“

”ہاں خالہ، ادھر سے کرسی پر چڑھ کر دیوار کو دنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔ آپ بس اتنا کچھ

گا کہ دیوار کے پاس سے کرسی گھیٹ کر دور کر دیجئے گا۔“

”ٹھیک ہے تم میری وہ کرسی لے جو بابر پڑی رہتی ہے۔ اور ہاں پہ شال اتارو۔ درونہ دروانہ تمہیں یہ شال اور ٹھیک ہے دیکھ کر پریشان ہو جائے گی۔“ خالہ فرزانہ کو بروقت شال یاد آگئی۔

”ہائے خالہ، مجھے سردی لگے گی۔“ تائیہ سکڑ کر بولی۔

”بس دو چار منٹ کی توبات ہے۔ گھر میں آتے ہی میں یہ شال تمہارے اوپر ڈال دوں گی۔“

”ڈرانے کے سارے کے سارے سین زبانی یاد کرنے لگے۔ یہ طے کر لیا گیا کہ کہنا ہے کیسے کہنا ہے۔ پھر

فروائی لیکشن شروع ہوا۔ تائیہ نے دیوار کے نزدیک کرسی رکھی۔ کرسی سے ذریعے دیوار پر چڑھنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اور دیوار پر چڑھ کر دوسرا طرف کو دنا بھی مشکل نہ تھا کیونکہ اس پلات کی بنیادیں بھری ہوئی تھیں۔

تائیہ کے اس طرف کو دتے ہی خالہ فرزانہ نے کرسی دیوار سے دور کر دی اور اپنے کمرے میں آگئیں۔ کمرے میں آتے ہی گھر کی بیتل بچی اور اس کے ساتھ ہی گیٹ کھلنا تو کی زور دار آواز گوئی۔ اب وقفے ققفے سے بیتل بچ رہی تھی اور زور زور سے گیٹ کھلنا ہیا جارہا تھا۔

دروانہ ابھی ابھی سوتی تھی۔ وہ یہ جاننی تھی کہ ابھی افضل صاحب آئیں گے۔ ان کے لئے گیٹ

کھولنا ہو گا۔ اسی لئے وہ چاہ رہی تھی کہ خالہ فرزانہ کے پاس بیٹھ کر ان کا انتظار کرے اور ان کے آنے کے بعد اطمینان سے سوئے۔ لیکن خالہ فرزانہ نے اسے اپنے کمرے میں جانے کا حکم دے دیا۔ اب وہاں بیٹھنے کا کیا جواز رہا۔ وہ اپنے کمرے میں چل آئی۔ اور جس بات کا ذرہ تھا وہی بڑا

آتے ہی سو گئی۔ وہ بہت گھری نیند سوتی تھی۔ افضل رات کو کبھی دیر سے گھر آتا تو دروازہ، سختا

ہی رہتا۔ تب خالہ فرزانہ کو اٹھنا پڑتا۔ وہ دروانہ کو جاکر اٹھاتیں۔ تب کہیں دروازہ کھلتا۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ بیتل بچتی رہی۔ دروازے پر ٹھک ٹھک ہوتی تھیں دروانہ کے کان ہیں جوں تک نہ رُنگی۔ تب خالہ فرزانہ نے جاکر اس کے کمرے کا دروازہ بھایا۔ اسے آوازیا

رہی ہوگی۔ انہوں نے روٹے رتے جلدی سے اپنی آنکھیں پوچھیں اور اپنی شال اتار کر فرازی ہڑھادی۔ اور پھر خالہ اسے اپنے کمرے میں لے آئیں۔
تانية ٹاف اور ہے بیٹھی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر تمیز سے آگے بڑھا اور خوشی سے بولا۔
”یہ آپ۔؟“
”میں۔“ تانية نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ افضل نے فوراً اسے تھام لیا۔
”یہ تو بڑی زبردست خوشخبری ہے ہم سب کے لئے۔“ افضل خوش ہو کر بولا۔
لیکن دردانہ نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔ خالہ فرزانہ نے مسکرا کر پوچھا۔
زبردست خوشخبری کی نوید دی اور کہا کہ خوشخبری بڑی بی بی کے کمرے میں ہے۔ یہ نہ بتایا کیا ہے۔؟“

”جی کیا سمجھا کہ کس قسم کی خوشخبری ہے۔“

ہاکل اندازہ نہیں کر پایا۔ تانية کا تو مجھے خیال بھی نہیں تھا۔
”بھائی، مجھے بھول گئے۔“ تانية نے پیار بھرا ٹکھوہ کیا۔
کو بھلا کون بھول سکتا ہے؟ ذرا خالہ سے پوچھیں؛ روز ہی ذکر رہتا تھا۔“
تانية یہ بات صحیح ہے۔“ خالہ فرزانہ نے تائید کی۔

”ذوہنی اس ستمبھی کو سلیمانی کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آپ کی
ریگی اور پھر وہ خط..... اگر وہ خط نہ ملتا تو پھر میں پولیس سے ضرور مدد لیتا۔“
کاظمطلب ہے کہ میرا خط چھوڑ کر جانا بہتر ہوا۔“

ہاکل..... اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ کم از کم ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ آپ جماں بھی گئی
رفی سے گئی ہیں۔“ افضل نے کہا۔

”نہ دروازے پر دستک ہوئی۔ خالہ فرزانہ نے کہا۔“ آجائو۔“
”کمل۔ دردانہ ٹرے ہاتھ میں لئے اندر آگئی۔“
”نہ کیا الائی ہو۔؟“ افضل نے ٹرے پر ایک طالہ رانہ نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔
”بھی کافی لاتی ہوں۔ کیا آپ اندازہ کھائیں گے۔“

”بھی میں کھانا کھا کر آرہا ہوں۔ میرے لئے کافی ہی بہت ہے۔“
”نے جلدی سے انداز چھیل کر چھری سے اس کے چار ٹکڑے کئے۔ اس پر ہلکی سی کالی مرچ
ٹکڑیں کانٹا رکھ کر پلیٹ تانية کی طرف بڑھادی۔

”اندازہ کھا کر کافی کا گگ ہاتھ میں لے لیا۔ اور دھیرے وہیرے کافی کی چکلی لینے لگی،
”زبردست دردانہ تمہارا کوئی جواب نہیں۔ بہت عمدہ کافی ہنائی ہے۔“

”لبی بی۔ آپ مجھے بہت یاد آتی تھیں۔“
”غاص و جـ۔“

”باتیں سننے کے لئے۔“ دردانہ نے معصومیت سے کہا۔

رہی ہوگی۔ انہوں نے روٹے رتے جلدی سے اپنی آنکھیں پوچھیں اور اپنی شال اتار کر فرازی ہڑھادی۔ اور پھر خالہ اسے اپنے کمرے میں لے آئیں۔

بہر اچھی خاصی سردی تھی۔ تیز مٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پانچ سات منٹ میں ہی تاری ہو گئی۔ خالہ فرزانہ نے اسے اپنے بیڈ پر بٹھا کر اس کے گرد لحاف پیٹ دیا۔

”بی بی، آپ کے لئے کافی بنا کر لاو۔؟“ دردانہ نے پوچھا۔
”ہاں، دردانہ جلدی کرو اور سنو، ایک اندھا بھی بوائل کر لاؤ، تانية کو سردی لگ رہی ہے۔“

تانية کے بجائے خالہ فرزانہ بولیں۔

”میں یوں لائی۔“ دردانہ نے پہنچی بجا کر کما اور بڑی تیزی سے باہر نکل گئی۔

دردانہ کے کمرے سے نکلتے ہی گیٹ پر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ دردانہ جو کمرے نکل گئی تھی۔ فرزا پلٹ کر واپس آئی اور خالہ فرزانہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”صاحب جی ہیں۔ گیٹ کھول دوں، پھر لاتی ہوں کافی۔“

”ٹھیک ہے دردانہ تم جاؤ۔ اور صاحب کو بتا دو کہ تانية بی بی آگئی ہیں۔“

دردانہ بغیر جواب دیئے کمرے سے نکل گئی۔ اتنی دیر میں گھر کی بیل بجھنے لگی تھی۔ دردانہ ہوئی گیٹ پر پچھی۔ اور حسب معمول سوال کیا۔ ”کون ہے۔؟“

”دردانہ گیٹ جلدی کھولو۔؟“ ادھر سے افضل کی آواز سنائی دی۔

دردانہ نے گیٹ کا تالا کھول کر، گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ افضل گاڑی اندر نے دردانہ نے گیٹ بند کر کے تالا لگایا اور اس سے پسلے کہ افضل گاڑی مقفل کر کے کمرے کا رخ کرتا۔ دردانہ دوستی ہوئی اس کے سارے پر پچھنچ گئی۔

”یا اللہ..... دروانہ خیر تو ہے۔“ افضل اس کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”صاحب جی خیر ہے۔ سب خیر ہے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی خیر ہے۔“ وہ بے پنا خوش تھا۔

”دردانہ، کیا ہو گیا۔ تمہارا کوئی پر اائز بونڈ وغیرہ نکل آیا کیا۔؟“ افضل نے نہ کر کے ”ارے نہیں، صاحب جی۔..... بڑی زبردست خوشخبری ہے آپ کے لئے۔“

”میرے لئے۔“ افضل جیران ہوا۔

”صاحب جی، ہم سب کے لئے۔“

”کماں ہے وہ خوشخبری۔“

”صاحب جی۔ بڑی بی بی کے کمرے میں جائیں اور ہاں جا کر دیکھیں کیا زبردست ڈھ۔“

”اچھا، میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔“ افضل تیز تیز قدم بڑھاتا، خالہ فرزانہ کے کمرے کی چل دیا اور دردانہ پہنچ کی طرف چل گئی۔

خالہ فرزانہ کا دروازہ بند تھا۔ اس نے بلکا سادھا دیا تو وہ فوراً کھل گیا۔ دروازہ کھلنے کی ایک

دردانہ کی یہ بات سن کر تینوں نے تقسیم کیا۔

دردانہ کمرے میں رکنا چاہی رہی تھی۔ وہ تانیہ کی باشی سننا چاہتی تھی۔ اپنا ججیس در کننا چاہتی۔ اسے تانیہ سے خاص لگا تھا۔ تانیہ نے اسے ملادہ بکھی نہیں سمجھا تھا۔ اس کا دوسریہ ان ساتھ بیشہ دوستانہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ وہ باوجود خواہش کے اپنی مرضی سے کمرے رک نہیں سکتی تھی۔ جب تک اسے کوئی رکنے کو نہ کرے۔

اور اسے رکنے کو کسی نے کمانیں۔ لہذا وہ فرمائی کرے سے بکل گئی۔

دردانہ کے جانے کے بعد افضل نے فرماؤال کیا۔ ”آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ آپ کا چلی گئی تھیں۔؟“

اب ایک مشکل مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ تانیہ کے پاس افضل کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اسے جو حق بتا دیتی کہ وہ کمال چلی گئی تھی تو اس گروہ کو سن کر افضل نے اسے پہنچی پہنچ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور یہ سچھنا تھا کہ تانیہ اپنے چہرے مرے سے تو پاگل نہیں دکھائی دے رہی۔ لیکن باشیں پاگلوں والی کر رہی ہے۔

”ارے افضل اب آگئی ہے تو سب جادے گی کہ کہاں گئی تھی۔ ابھی تو اس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ اطمینان سے پوچھ لیتا۔ فی الحال تو اسے آرام کی ضرورت ہے۔“ خالہ فرزانہ فرمادی۔ آئیں۔

”بالکل ٹھیک ہے خالہ۔ انہیں آرام کرنے دیا جائے۔ صبح بات کر لیں گے۔“ یہ کہا افضل اٹھنے لگا۔

”بھائی اب مجھے ایسے آرام کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کچھ دیر تو بیٹھیں۔“ تانیہ کہا۔

تانیہ کے کنے پر افضل کچھ دیر کے لئے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اوہراہر کی باشی ہوتی رہیں، اس اشے میں اسے محسن راؤ کے لاہور والیں پہنچ جانے کی خوشخبری سنائی گئی۔ محسن راؤ کی آمد کی خبر سن کر افضل نے خالہ فرزانہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”خالہ حق بتا لیا گا، آج صبح آپ نے کس کا منہ دیکھا تھا۔“

”کیوں؟“ خالہ فرزانہ نے اسے ترقیٰ نظریوں سے دیکھا۔

”دیکھیں تا، آج کا دن کس قدر خوش نصیب ہے۔ خوشخبری پر خوشخبری چلی آرہی ہے۔“ افضل نہیں کر بولا۔

”تمہارا دیکھا تھا۔“ خالہ فرزانہ نے مذاق کیا۔

”مذاق نہیں کریں۔ میرے آئے سے پہلے تو دردانہ آپ کے پاس آتی ہے۔“

”ہاں، واقعی۔ سب سے پہلے میں دردانہ کی ٹکلی ہی دیکھتی ہوں۔ لیکن وہ تو میں روزی بھتی ہوں۔ آج میں نے صبح ہی تانیہ کی تصویر دیکھی تھی۔ یہ مجھے آج شدت سے یاد آرہی تھی۔“

پھر کچھ دیر بیٹھ کر افضل اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دردانہ گفتگو دردانہ برتن اٹھا کر لے جائیں۔ اسے تانیہ کا کمرہ کھولنے اور ٹھیک کرنے کی پڑایت دے دی گئی تھی۔ اور اس سے کہ دیا گیا تھا کہ وہ تانیہ کا کمرہ ٹھیک کر کے اپنے کمرے میں سونے چلی جائے۔ افضل کے جانے کے بعد خالہ رزانہ کو اچانک عامر کا خیال آیا۔

”کیوں تانیہ تمہارے انکل عامر کو فون نہ کریں۔ اب تو تمہاری آمد سب پر کھل گئی ہے۔“

الہ فرزانہ نے خیال ظاہر کیا۔ ”بارہ سے اوپر ہو رہے ہیں خالہ۔“ تانیہ نے گھری پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اب تک تو انکل مروپکھے ہوں گے۔“

”خوش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ کیا پتہ جاگتی رہے ہوں۔ انہوں نے خوشخبری سنائی ہے تو ہر سے بھی اس کا جواب جانا چاہئے۔ ہم کیوں پہنچ رہیں۔“ خالہ فرزانہ نے کہا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، مزہ آئے گا۔“ یہ کہہ کر وہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اتفاق سے فوراً ہی نمبر مل اب پہلی گھنٹی بجتے کے بعد تانیہ نے رسیور خالہ فرزانہ کی طرف بوجھا دیا۔ ”گھنٹی نئی رہی ہے۔“

”اچھا۔“ خالہ نے رسیور تھامتے ہوئے کہا۔ تیری گھنٹی پر ادھر سے کسی نے رسیور اٹھایا، جب ہیلو کما تو خالہ فرزانہ نے آواز فرمادی۔

”عامر ابھی سوئے نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے براہ راست سوال داغ دیا۔

”مارے فرزانہ تم۔ اس وقت۔ کیا ہوا آخر؟“ ان کے لمحے میں پریشانی تھی۔

”بھی ہم بھی کم نہیں ہیں تم سے۔“ خالہ فرزانہ نے ایک ادا سے کہا۔

”اچھا، خیرہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم بڑی چیز ہو۔“

”پروفیسر عامر مجھے چیز نہ کہتا۔ میں فرزانہ ہوں۔ ایک باوقار خاتون۔“ خالہ فرزانہ نے بن کر

”اچھا باوقار خاتون تم کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”تم اس وقت کیا کر رہے تھے۔“ خالہ فرزانہ نے پوچھا۔

”ہم سب محسن کو گھیرے بیٹھے ہیں، نبی پرانی یادیں تازہ کر رہے ہیں۔“

”اچھا، اب مجھ سے ایک دھاکہ خیز خبر سو۔ میری تانیہ آگئی ہے واپس۔“

”یہ خبر عامر کے لئے واقعی دھاکہ خیز تھی۔ چند لمحوں کے لئے ادھر سننا طاری ہو گیا۔

”عامر..... عامر۔“ خالہ فرزانہ نے جلد جلد پکارا۔

”ہاں، فرزانہ سن رہا ہوں۔“ عامر کی آواز بسکھنے لگی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا مجھے خوشی کی وجہ

، ان سے بولانہ جا رہا ہو۔“ کب آئی؟“ وہ بسکھنے بو لے۔

”تمہارے فون کے آدھے گھنٹے کے بعد اچانک تیل ہوئی۔ دردانہ سوچکی تھی، اسے جاکر اٹھایا۔

اخیل تھا کہ افضل ہو گا وہ ایک شادی میں گیا تھا، گیت کھلا تو افضل کے بجائے تانیہ نکلی عامر میں تھی۔“

تمہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔ ”

”واقعی یہ تو بت دھا کر خیز خوشخبری ہے۔ لگتا ہے راؤ احمد علی کے دن پورے ہو گے۔“ عامر نے خود کو سنبھال کر کما۔ پھر پوچھا۔ ”کما ہے تانیے؟“

”یہ میرے برابر بیٹھی ہے لماف میں.....“ غالے نے رسیور اس کی طرف بڑھایا۔

”السلام علیکم انکل عامر۔“ تانیے نے پر جوش انداز میں سلام کیا۔

”ولیکم السلام تانیے۔“ انکل عامر نے سرخوشی کے انداز میں جواب دیا۔ ”تانیے، تم خیریت سے تو ہو۔“

”بال، انکل عامر۔ بالکل خیریت سے ہوں اور ہر طرح سے خیریت سے ہوں۔“

”شکر ہے اللہ کا۔“ انکل عامر نے کما، پھر پوچھا۔ ”تم کماں چل گئی تھیں تانیے۔“

”انکل عامر، میں آپ کو بتاؤں گی، سب سناؤں گی۔“ تانیے نے ٹالنے کے لئے کما، پھر بولی۔ ”بھائی جان کیسے ہیں؟“

”ہاں لو بات کرو۔“ انکل عامر نے کما۔ پھر ان کی آواز سنائی دی۔ ”محن اپنی بمن سے بات کرو۔“ کچھ دیر نکے بعد رسیور میں محسن راؤ کی آواز ابھری۔ یہ آواز تو اس کی سنی ہوئی تھی۔ لیکن دنیا والوں کے سامنے یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ پہلی بار ایک دوسرے سے مخاطب ہو رہے ہیں۔

”میری بمن تم کیسی ہو۔؟“ محسن راؤ نے بے قراری سے پوچھا۔

”پہلیں ٹھیک ہوں بھائی جان۔ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ آگئے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اڑ کر لاہور پہنچ جاؤں آپ کی صورت دیکھ لوں۔“

”بھائی جان، آپ انکل عامر کے گھر کس طرح پہنچ گئے۔“ تانیے نے پوچھا۔

”تانیے میں تو ماڈل ناؤں اپنے گھر پہنچا تھا۔ وہاں پہنچ کر اپنا گھر بند پایا۔ بس ایک چوکیار سروفٹ کوارٹر میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ میں انکل عامر کے گھر پہنچ گیا۔ تانیے یہاں تو دنیا کی بدل پکھی ہے۔ ویران اور اجائز ہو گئی ہے۔ نہ مگر ریجن سہ ببارہ ہے۔ شکر ہے کہ تم ہو۔ جیسے کی کوئی آس تو ہے۔ ورنہ میں تو جیتے گی مر جاتا۔ جس طرح تم میری صورت دیکھنے کے لئے بے قرار ہو، ویسے یہی میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے جیجن ہوں۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم لاہور آؤ گی یا میں کراچی آؤں۔“

”محن راؤ نے اپنا کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا۔

”بھائی جان آپ کراچی آجائیں، یہاں غالہ سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔ پھر میں آپ کے ساتھ لاہور چلوں گی۔“

”ٹھیک ہے، میں پھر کل کراچی پہنچ رہا ہوں۔ ٹکٹ لے کر تمہیں فون کر دوں گا۔ تم ایسے پورث آجائنا۔“ محسن راؤ نے فوراً ہی فیصلہ سنادیا۔

”بھائی ٹھیک۔“ تانیے خوش ہو کر بولی۔

”بھال صاحب جی جو آگئے تھے، پھر بولی بی بی نے مجھے اپنے کرے میں جانے کو جو کہ دیا۔“

”نہ غلطیت آمیز لمحے میں کما۔“

”کوئی اور توبات نہیں کرنی۔“

”نہیں بن، اب ساری باتیں ملاقات پر ہوں گی۔“

”اچھا، اللہ حافظ۔“ محسن راؤ نے کما اور پھر تابیخ کا جواب سن کر فون بند کر دیا۔

”تانیے رسیور پکڑے کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ اسے کالا چراغ یاد آگیا تھا۔ بالآخر اس نے محسن اور خود اسے بحفاظت ان کی دنیا میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ بہت پیار ایک شخص تھا۔ اس نے بات کو کر چاہا مگر باتیں نے اس کی قدر نہ کی وہ اس کے پیار بھرے دل پر مسلسل ضربیں لگاتی رہی۔ اور اچھا بڑے حوصلے سے اس کے لگائے چڑے ستارا۔ جانے وہ کس مٹی سے بنا تھا۔ وہ مٹی کمال بنا ہو گا۔ مٹی سے تو بس انہاں بنے ہیں۔ وہ آگ سے بنا ہو گا۔ شاید اسی لئے عشق کی برواداشت کر گیا۔ محبت کی تپش برداشت کر گیا۔“

”کیا سوچنے لگی؟“؟“ غالے فرزانہ نے اس کے ہاتھ سے رسیور لینا چاہا۔

”کچھ نہیں خالد۔“ تانیے نے کما۔ وہ کیسے بتاتی کہ اسے کون یاد آگیا تھا۔ اس نے رسیور رکھ اور پھر بولی۔ ”اچھا، غالہ اب میں اپنے کرے میں چلوں؟“؟“

”چج تو تیرے پاس ہی کیوں نہیں سو جاتی۔“ غالے فرزانہ نے الجھا آمیز لمحے میں کما۔

”اچھا، غالہ ٹھیک ہے۔ میں یہیں سو جاؤں گی۔ بس تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں ہو یا مجھے اپنا کمرہ بست یاد آ رہا ہے۔ پھر ذرا کپڑے وغیرہ بھی تہذیل کر آؤں گی۔“

”اہل جاہ۔“ غالے فرزانہ نے خوشی سے اجازت دے دی۔

”تانیے نے اپنا بیک اٹھایا اور غالہ فرزانہ کے کرے سے باہر نکل آئی۔ جب وہ اپنے کمرے میں نکلے لئے یہڑیاں چڑھ رہی تھیں تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جانے کتنے عرصے کے بعد اپنے کی یہڑیاں چڑھ رہی ہے۔“

کرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر واخن ہوئی تو یہ دیکھ کر جیزان رہ گئی کہ دروازہ کے بیڈ سے بیک لگائے قالین پر بیٹھی دروازے کو سکر رہی ہے۔ کرے کی لاست جل رہی تھی۔

”سے دیکھ کر فوڑا کھڑی ہو گئی۔ اور اس کے ہاتھ سے بیک لے لیا۔“

”لکا دروازہ، تم اسی تک سوئی نہیں۔“ تانیے اسے حیرت سے تکتے ہوئے کما۔

”نہیں، بی بی..... میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“

”کیل، کیا ہوا؟“

”ہوا تو کچھ نہیں، بس آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔“

”تم بھی اچھی خاصی بادوی ہو۔“ تانیے بس کر بولی۔ ”وہیں غالہ کے کمرے میں بیٹھ

”بھال صاحب جی جو آگئے تھے، پھر بولی بی بی نے مجھے اپنے کرے میں جانے کو جو کہ دیا۔“

”نہ غلطیت آمیز لمحے میں کما۔“

اس کے حوالے کے اور بولی۔ ”آپ کپڑے تبدیل کر لیں۔ کہیں تو آپ کے لئے کافی بنا لاؤں۔“

”نہیں، دروانہ اب سوٹا بھی ہے۔ دیکھو کیا وقت ہو رہا ہے۔“ تانیہ نے گھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کپڑے لے کر واش روم میں چلی گئی۔ گرم پانی سے اس نے اچھی طرح ہاتھ منہ دھو دیا اور کپڑے تبدیل کر کے باہر آگئی۔

”دروانہ، اب اجازت دو تو خالہ کے پاس چلی جاؤں۔ وہ میرا منتظر کر رہی ہوں گی۔“ ”بانکل بی بی۔ آپ ضرور جائیں۔ انشاء اللہ اب آپ سے صحیح ملاقات ہو گی۔“

دروانہ کے جانے کے بعد اس نے اپنا بیک کھولا، اس بیک میں دیگر چیزوں کے علاوہ دو تھے۔ پسلے اس نے ہیروں کا ہار نکالا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے اپنے گلے میں ڈالا۔ اس کی خوبصورت گردان ایک دم جگہ گاہی۔ اسے کاشنگن یاد آیا جو اسے اپنی دنیا میں روک لینے کے لئے مصروف تھا۔ وہ اسے اپنا سونے چاندی سے بنا محل بھی بخششے کے لئے تیار تھا۔

پھر اسے کاشنگن کا بینار اشمون یاد آیا۔ راشمور، یاد پر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ اسے رخصت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ پھر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کا آخری دیدار کرنے محل کے باہر آگیا تھا۔ اس نے تانیہ کو ایک بے حد حسین تحفہ دیا تھا۔

تانیہ نے بیک میں ہاتھ ڈال کر وہ گلاب کی کلی نکال لی جو اس نے اس کی ریشمیں زلفوں میں لکائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ کلی کبھی نہیں مر جھائے گی۔ اگر مر جائے تو بھنار اشمون اس دنیا میں نہیں رہا۔

وہ کلی ابھی تک تو تازہ تھی۔ اور اس کی مرٹ سے پورا کمرہ بھر گیا تھا۔

تانیہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی، آئینے کے سامنے آئی۔ اور پھر اس نے وہ گلاب کی کلی اپنی زلفوں میں لگانے کے لئے ہاتھ اور اخٹائے تو آواز آئی۔ ”ٹھہرہ، یہ کلی میں خود اپنے ہاتھ سے تماری زلفوں میں سجاوں گا۔“

اور یہ آواز راشمون کی تھی۔

اس کے ہاتھ اٹھ کے اٹھ رہ گئے۔ اس نے چونک کر آئینے میں دیکھا۔ پھر فوراً پلت کر پیچے نظر ڈالی۔ دروازے کی طرف دیکھا۔ آئینے میں کوئی تھا نہ پیچھے کوئی تھا۔ اور دروانہ دروانہ جاتے ہوئے بند کر گئی تھی، وہ ویسے ہی بند تھا۔

پھر وہ آواز؟

وہ آواز یقیناً راشمون کی تھی۔ لیکن راشمون یہاں کہا؟ وہ نہ جانے یہاں سے کتنی دور اپی دنیا میں گئی ہو گا۔ پھر وہ آواز اس کا داہمہ تھی۔ اس نے کیونکہ تانیہ سے اُن کے بالوں میں وہ کلی لٹھائے کی درخواست کی تھی۔ اس نے اس وقت بالوں میں کلی لگاتے ہوئے اس کے ذہن میں، اس لیل آواز گونج گئی۔

”تم عجیب بدو قوف ہو، اگر میں اوپر نہ آتی تو پھر تم کیا کرتیں۔“

”بس پھر میں کچھ دیر اور انتظار کرتی۔ آپ نہ آتیں تو اپنے کمرے میں چلی جاتی۔“

”اچھا، آؤ۔ میرے پاس ہیں۔“ تانیہ نے اسے اپنے بیٹہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خوشی سے بیٹھ گئی اور تانیہ کے پاؤں پکوتے ہوئے بولی۔ ”لامیں بی بی، میں آپ کے پاؤں دیا دوں۔“ ”نہیں، تم آرام سے ہیں۔“ تانیہ مجھے نیچے جاتا ہے۔ خالہ کے پاس، سوٹا ہے، میں یہاں اپا کو دیکھنے اور کپڑے تبدیل کرنے آئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے بی بی..... میں الماری سے آپ کے کپڑے نکال کر استری کر دیتی ہوں۔ آپ جب تک اپنے کمرے پر نظر ڈال لیں۔ میں نے آپ کے کمرے کی کوئی چیز نہیں، چیزیں ہیں۔ جیسا چھوڑ کر گئی تھیں، ویسا ہی رکھا ہے۔ میں اس کمرے کی روز صفائی کرتی تھی۔ بی بی آپ کو کوچ بتاؤں، مجھے یہاں آپ کی خوشبو محبوس ہوتی تھی۔“ دروانہ اپنے دھن میں کے جاہری تھی۔

”اچھا۔ اور سناؤ، دروانہ تم ٹھیک تور ہیں۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”بی بی، آپ کماں چلی گئی تھیں۔“ ”دروانہ نے تابنے کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”آپ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ آپ کسی کے ساتھ جاہری ہیں۔“ بی بی، کہیں آپ کا کے کپڑے والے کے ساتھ تو نہیں چلی گئیں۔“

”تانیہ اس کی اس بات پر جیران رہ گئی۔ خالہ فرزانہ اور افضل سے زیادہ سمجھدار تو اس گھری ملازمہ ہی رہی اس نے نشانے پر کیسا تیر مارا۔“

”کالے کپڑے والے شخص کا خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا۔؟“

”لو بی بی، آپ بھی کیا بات کر رہی ہیں۔ اس نے آپ کو پیغام دیا تھا کہ وہ آپ سے صرانی ملے گا۔“

”ہاں، دروانہ کچھ اسی قسم کا معاملہ تھا لیکن ساری باتیں میں تمہیں بتانیں سکتی۔“ ”بی بی، آپ مجھے کچھ نہ بتائیں۔ بس اتنا بتا دیں کہ اب تو اس طرح غائب نہیں ہو جائیں گی۔؟“

”کل بھائی محض آرہے ہیں۔ ایک دن بعد مجھے لاہور جانا ہو گا۔“

”لاہور آپ ضرور جائیں۔ مل کر تو جائیں گی۔ یہ معلوم تو ہو گا کہ آپ لاہور میں ہیں۔ اب تو کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ آپ کماں ہیں۔ سب پریشان تھے۔ میں تو اس بیٹہ سے لگ کر اکثر دیا کرتی تھی۔“

”ارے، دروانہ، تم مجھے اس قدر چاہتی ہو۔ اور مجھے خبر بھی نہیں۔“

”اوی بی بی، چاہت کے لئے کوئی ویرا تھوڑا ہی لینا پڑتا ہے۔“

”دروانہ تم کس قدر، سمجھداری کی باتیں کرتی ہو۔ یہ مجھے آج پتہ چلا۔“

”میری بے وقوفانہ باتوں کو سراتبے والی پلی بستی ہیں آپ۔“ ”دروانہ نے کپڑے استری کے

ایک پر کشش شخصیت کا ماؤں تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے پر سرفی نہ تھی اور وہی صحت بھی نہ تھی جیسی ہوئی چاہئے تھی، اس کے باوجود اس کی گوری رنگت نبیل پیسوں میں مزید نکھر گئی تھی۔

”جہانی یہ دروانہ ہیں۔ اتنے عمدہ کھانے باتیں ہیں کہ آپ یہاں سے جانے کا نام نہ لیں گے۔“ تانیہ نے تعارف کروایا۔

”بھٹی تانیہ، ہمیں یہاں سے جانا تو ہو گا۔ ایسا کریں گے کہ دروانہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“ ”محسن نے کہا۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ تانیہ نے ہنسنے ہوئے کہا۔ پھر دروانہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”دروانہ، صاحب کا سامان ان کے کمرے میں پہنچا دو۔“

”جی، اچھا بی بی۔“ دروانہ گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اتنی دیر میں افضل نے اس کا سوٹ کیس اور بیک گاڑی سے نکال کر زمین پر رکھ دیا تھا۔

محسن راؤ کو خالہ فرزانہ اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئیں۔ محسن راؤ ان کے کمرے میں پہنچ کر بے تکلفی سے نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ خالہ فرزانہ نے چاہا بھی کہ وہ بیڈ پر بیٹھ جائے یا پھر کرسی پر برا جان ہو جائے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کروایا۔ ”خالہ، مجھے نیچے بیٹھنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم میں زمینداروں والی کوئی بات ہی نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”نہیں، خالہ میں ان زمینداروں میں سے نہیں ہوں جو زمینوں کی وجہ سے ہی زمیندار کہلاتے ہیں لیکن اسی زمین پر اکٹھ کر چلتے ہیں۔ نہیں جانے کہ کل اسی زمین کے نیچے چلے جانا ہے۔“

چائے سے فارغ ہونے کے بعد تانیہ محسن راؤ کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس کے کمرے میں داخل ہو کر محسن راؤ نے چاروں طرف ایک طالزانہ نظر ڈالی۔ اور پھر بولا۔ ”اچھا تو یہ ہے تمara کہہ۔“

”جی بھائی جان۔“

”اچھا ہے۔ تم نے بڑے سلیقے سے ڈیکوریٹ کر رکھا ہے۔“

”اس تعریف کا شکریہ۔“

اپاک محسن راؤ کی نظر، گلب کی کلی پر پڑی۔ ”بڑی خوبصورت کلی ہے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ کر کلی کو دیکھنے لگا۔ ”کس قدر خوب ہے اس میں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی خوبصورتی ہوئی تھی۔“

”جی بھائی جان..... یہ ہماری دنیا کی نہیں ہے۔“

”پھر۔“

”یہ راشمن نے مجھے دی تھی۔“ تانیہ نے محسن راؤ کو بتایا۔

”بہت حسین تھفہ ہے یہ۔“ محسن راؤ نے تو صیفی انداز میں کہا۔

پھر اس نے اس بات کو اپناواہ جس کہ دہن سے جھک دیا، ساتھ ہی اس کلی کو اپنے بالوں میں کانے کا ارادہ بھی ملتی کر دیا۔ اس نے اس کلی کو اپنے کمرے میں موجود ایک ناک میں منتقل کر دیئے۔ پھر اس میں سجا دیا اور گلدان میں لگے پلاسٹک کے پھول دوسرے گلدان میں منتقل کر دیئے۔ پھر اس میں سجا دیا اور اس کے پیڈی کی سائیڈ نیبل پر رکھ دیا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں یہ کلی ہر وقت اس کی لگاؤ ہوں میں ہے گی۔ پھر اس نے ہبہوں کا جگہ کا تارہ اپنے لگے سے نکال کر الماری کے لاکر میں رکھ دیا اور دروازہ بند کر کے تیز تیز ہیڑھیاں طے کرتی خالہ کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

دوسرے دن محسن راؤ کراچی آگیا۔ تانیہ اور افضل اے ایرپورٹ لینے گئے تھے۔ خالہ فرزانہ جی بانا چاہتی تھیں لیکن تانیہ نے اسیں جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ خالہ فرزانہ کے لئے گھنٹوں میں درو کی وجہ سے زیادہ ویر کھڑے رہنا مشکل تھا۔ وہ وہاں بلاوجہ پریشان ہوتی۔

شام کی فلاٹ اپنے وقت پر پہنچ گئی تھی۔ دنیا والوں کی نظرؤں میں وہ پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے مل رہے تھے لہذا اور امامہ کرنے کے لئے دونوں نے بچان کی نشانیاں مقرر کری تھیں۔ انہی شانیوں کے ذریعے دونوں نے ایک دوسرے کو ”بسمانی“ بچان لیا۔

محسن راؤ نے اپنی پچھوٹی بہن کو لگے سے لگایا۔ اور پھر اس کی صورت دیکھتا ہوا بولا۔ ”تمیں پہچاننے کے لئے تو کسی نشانی کی ضرورت ہی نہ تھی۔“ ”کیوں بھائی؟“

”تمہاری صورت تمی سے بہت ملتی ہے۔ میں نے تمیں نیلے سوٹ سے نہیں، تمہاری ٹھکل سے بچانا ہے۔“

”پھر تو مجھے یہ کہنا چاہئے تھا کہ میں تمی کی ہم ٹھکل ہوں۔“ ”اور کیا۔ پہنچ نہیں کیا کیا۔“ اس کلک عمار کو اس بات کا کیوں خیال نہیں رہا۔ ”محسن راؤ نے افضل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ افضل ہیں۔؟“

”بھی جتاب۔“ افضل نے مکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”دیکھا، میں نے کیا پچھا۔“ ”محسن راؤ نے افضل سے بڑی گرجوشی سے ہاتھ ملا یا۔“

”واقعی آپ نے کمال کیا۔؟“ افضل نے اسے تو میغی نظرؤں سے دیکھا۔ ”کوئی کمال نہیں کیا، ظاہر ہے میں نے آپ کو تباہیا تھا کہ میرے ساتھ بھائی افضل ہوں گے۔“ تانیہ نے ایرپورٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

”یہ سن کر محسن راؤ مسکراویا۔ بولا کچھ نہیں۔“ گاڑی گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی تھا خالہ فرزانہ برآمدے میں موجود تھیں۔ تانیہ نے محسن راؤ کو اشارے سے بتا دیا کہ وہ خالہ فرزانہ ہیں۔

محسن راؤ گاڑی سے اتر کر تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور سلام کر کے اپنا سر ان کے سامنے جگا دیا۔ خالہ فرزانہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیٹا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

خالہ فرزانہ کے پیچے دروانہ کھڑی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے محسن راؤ کو دیکھ رہی تھی۔ محسن راؤ

ایک مرتبہ میں پھر اس سے حساب لینے آگیا ہوں۔ ”
 انکل عامر اب کیا کتے ہیں۔؟“ تانیہ نے پوچھا۔
 ”ان کا خیال ہے کہ میں ابھی راؤ احمد علی کے سامنے نہ آؤں۔ یہاں کراچی رہوں تمہارے
 ہاں تو پھر ٹھیک ہے نا، بھائی جان آپ یہیں رہیں، میرے پاس۔ جب تک انکل عامر ہمیں
 آئے کا اشارہ نہ کریں۔“ تانیہ نے کہا۔
 ”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انکل عامر ہمت پیارے آدمی ہیں۔ بے انتہا مغلص۔ انہوں نے
 خواں کو بہت اچھی طرح سنبھالا ہوا ہے۔ لیکن یہ وقت چھپ کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ راؤ احمد علی
 ہی ایک مقدمہ کیا ہے۔ میں اس پر چچھ مقدمے دائر کروں گا۔ اس نے میرے باپ کو مارا ہے۔
 میں کے تینوں بیٹوں کو ختم کر دوں گا۔ اور یہ سارے کام اتنی دور بیٹھ کر نہیں ہو سکتے۔ میری متی
 کا گھر بند پڑا ہے۔ میں اسے جا کر کھولوں گا۔ وہاں جا کر رہوں گا۔“ محسن راؤ نے پر عزم لے
 لے کہا۔
 ”اور میں بھائی جان۔؟“ تانیہ کو اپنی فکر ہوئی۔
 ”تم یہیں رہو گی، اس وقت تک جب تک میں تمہیں لاہور نہ بلاؤں۔“ محسن راؤ نے
 ”میں یہاں کسی قیمت پر نہیں رہوں گی۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ جہاں آپ رہیں گے
 میں رہوں گی۔“
 ”نمیک ہے تانیہ، میں تمہیں بہت جلد لاہور بلاؤں گا۔ ذرا وہاں کا جائزہ لے لوں۔“ محسن راؤ
 نہ لائے کے لئے کہا۔
 ”میں اب آپ سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں ہوں گی۔ آپ بہت جلد بلوانے کی بات
 ہے ہیں۔“
 ”بہت ضدی ہو۔“
 ”میں تو آپ کی غیر موجودگی میں بھی لاہور نہیں چھوڑتا چاہتی تھی، وہ تو انکل عامرنے باباکی قسم
 سے کر چھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔“ تانیہ نے بتایا۔
 ”جانتا ہوں، انکل عامر نے مجھے بتایا تھا۔ ویسے انہوں نے تمہیں یہاں بھیج کر بہت عقائدی کا
 لٹکر مند بھجے میں کہا۔
 ”بھائی جان اب کہیں۔ آپ مجھے یہاں چھوڑ کر عقائدی کا ثبوت تو نہیں دینے والے۔“ تانیہ
 ”نمیں گزی۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ بے فکر ہو جاؤ۔“
 ”اللہ کا شکر ہے کہ میرا بھائی، میرے بیبا جیسا نہ تکا۔“
 ”بابا بہت شریف انسان تھے۔ میرے اغواء سے وہ بہت خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اسی نے مجرماً

تانية ایک گمراہنس لے کر رہ گئی، اس تھے کے پیچھے جو راز تھا، وہ بھائی کو کیسے بتائی۔ ”کیسے
 کہتی کہ اسی کلی میں راشمنوں کی دل کی دھڑکنیں بند ہیں۔“
 ”بھائی جان، لاہور میں کیا حالات ہیں۔؟“
 ”راؤ احمد علی نے وصیت کے خلاف مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ وصیت
 جعلی ہے۔ ہمارے بابا کے انتقال کے بعد ادب کوئی وارث نہیں رہا۔ تم، بابا کی بیٹی نہیں ہو، کیونکہ ان
 کی جو بیٹی پیدا ہوئی تھی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ تم ان کی جعلی بیٹی ہو اور یہ سارا اذرا سارے انکل عامر نے
 اپنے دوست کی جاندار ہتھیانے کے لئے کھیلا ہے۔“
 ”اچھا۔“ تانیہ نے گمراہنس لیا۔
 ”ہاں، مقدمہ چل رہا ہے۔ انکل عامر کہ رہے تھے کہ اب تک یہ ثابت کرنا واقعی مشکل تھا کہ
 تم، بابا کی حقیقی اولاد ہو، راؤ احمد علی نے قبرستان کے اس رہائش کی فتوں کا پی عدالت میں جمع کر دادی ہے
 جس میں تمہارے انتقال کی تفصیلات درج ہیں۔ عدالت کو یہ بادر کرانا مشکل ہوتا کہ ایک باپ نے
 اپنی بیٹی کی موت کا ذرا رامہ کیوں رچایا۔ ایسا کام کوئی ہوشند نہیں کر سکتا قانونی نقطہ نظر سے یہ ہمارا
 ایک کمزور پہلو تھا، اور مقدمہ کی بنیاد اسی بات پر تھی کہ تم، بابا کی حقیقی بیٹی ہو پا نہیں۔ اگر حقیقی بیٹی
 ہو تو اپنے باپ کی جاندار کی وارث ہو۔ اگر تم بابا کی بیٹی نہیں ہو تو پھر ان کی جاندار کا کوئی وارث
 نہیں۔ لذا ہمارے بابا کی ساری باندہ اور راؤ احمد علی کے نام منتقل ہو جاتی۔ ایک طرف تو یہ مقدمہ چل
 رہا ہے۔ دوسری طرف راؤ احمد علی تمہاری ملاش میں ہے تاکہ تمہیں قتل کروانے کے اس جعلی وارث
 سے بھی بچاتے پا لے۔ اسی لئے انکل عامر نے بابا کے قتل کے بعد تمہیں فوراً کراچی منتقل کر دیا
 تھا۔“

”اوہ، میرے اللہ۔“ تانیہ نے افسردہ لمحے میں کہا۔ ”یہ راؤ احمد علی کس قدر سفاک آدمی
 ہے۔ جاندار کے لائق نے تو اسے بھیڑا بنا دیا ہے۔ بھائی جان انسان اس قدر بھی گر سکتا ہے اور وہ
 بھی سگا پچا۔“

”مجھے راؤ احمد علی کے عوام کا شروع سے ہی کچھ کچھ اندازہ تھا اسی لئے میں ساون پور جاتا رہتا
 تھا۔ ویسے بھی دیبات کی زندگی مجھے بہت پسند ہے، وہاں فطرت اپنے اصل روپ میں موجود ہوتی
 ہے۔ پھر میں نے جب بچا ہے اپنی جاندار سے متعلق سوال جواب شروع کئے تو وہ فوراً لکھ کر گئے۔
 ہمارے بابا تو قلندر آدمی تھے۔ انہیں جاندار روپے پیسے سے کوئی دیکھی نہ تھی۔ اسی لئے انہوں نے
 کبھی اپنے بھائی سے زمینوں کی آمدی کا حساب نہیں مانگا تھا۔ سال دو سال میں راؤ احمد علی جو بھی بابا
 کے بریف کیس میں رکھ دیتا تھا، وہ لے کر لاہور آ جاتے تھے۔ اسے چک کرنے والا کوئی نہ تھا۔
 جب میں نے چینگ شروع کی تو اس کے کچھ عرصے بعد ہی راؤ احمد علی نے مجھے جنگل میں قتل کر دیا
 اور مطمئن ہو گیا کہ چلو آنکھوں میں چھپنے والا کانٹا بڑی آسمانی سے نکل گیا۔ اس بچارے کو کیا معلوم
 تھا کہ موت اور زندگی اللہ نے اپنے باقہ میں رکھی ہے۔ اللہ نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا۔

رات کا کھانا سب نے آئٹھے ہی کھایا۔ پھر افضل دنوں بھائی بن کو گاڑی میں گھانے لے گیا۔ فرزانہ بھی ساتھ تھیں۔ گھوم پھر کروالپس آئے تو کافی کا دور چلا۔ محسن راؤ نے اپنی آپ بیتی لئے کہ کس طرح راؤ احمد علی نے شکار کے نام پر اس کے قتل کی سازش کی۔ کس طرح ایک جادوگر، لہذا شعبدہ دکھا کر اس کی جان بچائی۔ پھر کس طرح اس جادوگر نے اس کی روح پر قبضہ جایا۔ ڈر کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہوسکا۔

محسن راؤ کی کمالی سب نے بڑے سحرزدہ انداز میں سنی۔ جب وہ اپنی زندگی کے واقعات دہرا پکھا تو میں نے اس سے سوال کیا۔ ”پھر تو محسن صاحب آپ کو بھی جادو آگیا ہو گا۔“

”اہ، تھوڑا بہت آتا ہے۔ راج مداری نے کچھ شعبدے مجھے سکھائے تھے۔“

”پھر کچھ دکھائیں نا۔“ افضل نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ ”کوئی کمال ہمیں بھی ملے کیا۔“

”اچھا! محسن راؤ کوئی شعبدہ وکھانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔“ ویسے مجھے لاشعبدہ دکھائے کافی عرصہ ہو گیا ہے پر یہ نہیں رہی۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔“

پھر اسے خیال آیا کہ بقاں نے اسے جب سحر میں قید کیا تھا تو اپنی مرضی کی کھانے پینے کی اشیاء غر کرنے کے لئے ایک جادو سکھایا تھا۔ اس جادو کے ذریعے وہ کھانے پینے کی ہر جیز اپنے سامنے افر کر لیا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ بقاں کے سکھائے اس جادو کو آزمکر دیکھے۔ کیا وہ ابھی تک امد ہے یا اس کا اثر ختم ہو گیا۔

محسن راؤ نے ایک غالی پلیٹ مگلوکا کر اپنے سامنے رکھی اور خالہ نے مناطب ہو کر بولا۔ ” بتائیں، لہذا کھائیں گی۔“

”ند بھیتا، میں نہیں کھارہی کوئی چیز۔ پتہ نہیں کہاں سے مگلوکا کر دھر دے گے۔“

”اوہ خالہ، آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ مت کھائیے گا۔ کسی چیز کو آنے تو دیں۔“ افضل نے واڑی سے کہا۔

”آئے والی چیز کو تم کھالو گے۔؟“ خالہ فرزانہ نے افضل کو ٹھوکر کر دیکھا۔

”بیاں، میں کھالوں گا۔“ افضل نے انہیں چڑانے کے لئے کہا۔

”لے بھیل ذرا سے لوہے کے پنے مگلوکا دو۔ دیکھوں کیسے کھاتا ہے یہ۔“ خالہ فرزانہ نے جل دکھا۔

غالہ کی بات سن کر سب نے قہقہے لگایا۔ افضل کھسینا سا ہو گیا۔

”اچھا، غالہ میں ایسا کرتا ہوں کہ لوہے کے بجائے گرم گرم پنے مگلوکا دیتا ہوں۔“ محسن راؤ نہ کہا۔

”لیکن ہے محسن صاحب۔“ افضل نے فوراً ہی کہا۔

تب محسن راؤ ٹھیک سے ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ذہن کو یکسو کیا۔ بقاں کے سکھائے ہوئے نالخنوں کو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دہرا دیا اور پھر اپنا ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”گرم گرم تھا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ محسن راؤ نے گردون ہلا کر کہا۔

انبوں نے تمیں خود سے جدا کیا۔ تانیسہ وہ تمیں بہت چاہتے تھے۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ تم غلام پچاکی بھیث چڑھ جاؤ۔“

”ان کی محبت اپنی جگہ لیکن میں تو ان کی محبت سے محروم رہ گئی۔“

”اب میں جو ہوں، میں تمیں اتنی محبت دوں گا کہ تم سے سیئی نہیں جائے گی۔“

”اللہ، آپ کی عمر دراز کرے۔“ تانیسہ کے دل سے دعا نکلی۔

”آئیں۔ ویسے ایک بات ہے تانیسہ۔ جو لوگ دوسروں کو نقسان پہنچاتے ہیں۔ وہ خود بھی کہیں سے نہیں رہتے۔“ محسن راؤ نے کہا۔

”راؤ احمد علی کا تو ابھی تک کچھ نہیں گزارا۔ جبکہ اس نے ہمیں برباد کر دیا۔“

”ایک ابھی خبر سننے کو ملی ہے۔“ محسن راؤ نے چونکا یا۔

”وہ کیا؟“

”تینوں بھائیوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ سنا ہے تینوں نے راؤ احمد علی سے جائزہ کی تقسیم کا مطالہ کر دیا ہے۔“

”اللہ کرے ایسا ہو کہ راؤ احمد علی جائزہ کی تقسیم سے انکار کرو۔“ تب اپنی میں سے کوئی بیٹا اسے صحیح ہتھی سے مٹا دے۔

”ایسا ہونا کوئی بعد از قیاس نہیں۔ جب راؤ احمد علی، جائزہ کے لئے اپنے بھائی کو مار سلتا ہے تو اسی جائزہ کے لئے کوئی بیٹا بھی اپنے باب کو ختم کر سکتا ہے۔“

”کاش! ایسا ہو جائے۔“ تانیسہ دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”تانیسہ سنو۔ وہ کہہ کہاں ہے؟“ محسن راؤ نے اچانک پوچھا۔

”آپ آرام کرنا چاہ رہے ہیں۔ تو یہیں بیٹھ پر لیٹ جائیں اور اگر اپنے کمرے میں جاننا چاہتے ہیں تو چلیں میرے ساتھ، میں آپ کو آپ کا کہہ دکھا دوں۔“

”اوہ بیا۔ میں اپنے کمرے کی بات نہیں کر رہا۔ اس کمرے کی بات کر رہا ہوں جس کی دیواریں کالمی ہیں!“

”اوہ، اچھا۔ بھائی جان وہ کہہ یقچے ہے۔ خالہ فرزانہ کے برابر والا۔“

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں، ضرور دیکھیں، میں خود چاہتی ہوں کہ آپ وہ کہہ دیکھیں۔ ہاں عجیب و غریب کہہ ہے۔“

”چلیں ابھی۔“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”خالہ نے اگر ہمیں اس کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تو پریشان ہو جائیں گی کیونکہ جس عالی نے اس کمرے کو کالا کروا یا تھا، اس کی ہدایت تھی کہ اس کمرے کو بھی نہ کھولا جائے۔“

”پھر، میں کہے دیکھوں گا۔“

”رات کو چلیں گے ایک بجے کے بعد۔ جب سب سوچائیں گے۔“ تانیسہ نے ترک بٹالہ۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ محسن راؤ نے گردون ہلا کر کہا۔

جادو اور روحانیات کا۔ دراصل یہ دنی فرق ہے جو موسیٰ "اور فرعون میں تھا۔ موسیٰ حق ہے اور فرعون شر ہے۔ یہ دونوں طائفیں ابتداء ہی سے انسان کے ساتھ چلی آری ہیں اور انتاکر رہیں گی۔" "بھائی جان آپ اتنا کچھ جانتے ہیں تو پھر جادو گر کیوں بن گئے؟" "اعتراض ہوا، یہ اعتراض بن نے کیا۔

"خدا نخواست میں جادو گر تو نہیں ہوں۔ جادو گر بننے کے لئے اپنی روح کو بیچنا ہوتا ہے۔ شیطان کا کلمہ پڑھنا پڑتا ہے۔ پھر اس کے مشن پر چلانا پڑتا ہے۔ شیطان کے مشن سے آپ لوگ واقف ہی ہیں۔ جتنا ممکن ہو سکے انسانوں کو نقصان پہنچاؤ یہ کمال جو ابھی میں نے دکھایا ہے، یہ جادو نہیں ہے، محض ایک شعبد ہے۔ میں نے اب تک جو شعبدے و کھانے ہیں اس سے کبھی کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا۔ انسانوں کو تنقیح بہم پہنچانے کے لئے میں نے شبدوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ ہائیں، ابھی جو میں نے کمال دکھایا اس سے کسی کو نقصان پہنچا۔" افضل نے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔" افضل فروا بولا۔ "لیکن محسن بھائی یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"افضل صاحب اصل میں اللہ نے انسان کو بے پناہ وقوف کا مالک بنایا ہے۔ اور ان ساری قوتوں میں سب سے اعلیٰ قوت ہے یقین کی قوت۔۔۔۔۔ یہ قوت اتنی زبردست ہے کہ اس کے ذریعے پہاڑ کو بھی ہلاکیا جاسکتا ہے۔ آپ کسی پہاڑ کے سامنے کھڑے ہو کر اگر یہ کہیں کہ اے پہاڑ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ری یہ کہتے ہوئے آپ کو یقین ہو کہ آپ کے کہتے ہی پہاڑ سامنے سے ہٹ جائے گا تو یقین جانئے پہاڑ آپ کے سامنے سے ہٹ جائے گا مجھے اس وقت وہ دیساتی یا آرہا ہے جو بیٹھے ٹھلائے یقین کی قوت سے مالا مال ہو گیا تھا۔ یہ واقعہ مجھے مولانا اسد ریاض صاحب نے سنایا تھا۔ مولانا احمد سے میں نے پہنچن میں قرآن شریف پڑھا تھا۔ انہی سے میں نے وینی تعلیم حاصل کی۔ وہ اتنے دشمن انداز میں بات کو سمجھاتے تھے کہ فرواد میں اتر جاتی تھی۔ اس دیساتی کا واقعہ بھی میں نے انہی سے سنایا تھا۔ ایک دیساتی مسجد میں بیٹھا پیش امام صاحب کی تقریر سن رہا تھا۔ پیش امام صاحب بسم اللہ پر وعظ دے رہے تھے۔ انہوں نے بسم اللہ کی بے شمار خوبیاں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ بسم اللہ میں اتنی قوت ہے کہ اگر کوئی شخص بسم اللہ کہہ کر پائی میں پاؤں ڈالے تو وہ پانی پر چل سکتا ہے۔ یہ بات اس دیساتی کے ول کی گراہیوں میں بیٹھے گئی۔ ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ پیش امام اور وہ دیساتی اتفاق سے دریا کنارے اکٹھا ہو گئے۔ دونوں کو دریا پار جانا تھا۔ اور پار کرنے والی کشٹی ابھی ابھی اس کنارے سے ادھر گئی تھی۔ کشتی کو واپس آنے میں دیر لگتی۔ اس دیساتی نے پیش امام صاحب کی طرف دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا۔ "مولوی جی، انتظار کس بات کا، پڑھو بسم اللہ۔۔۔۔۔"

پیارے پیش امام صاحب کو پتہ نہیں اپنا وعظ یاد تھا کہ نہیں۔ انسیں دیساتی کی بات سمجھنے میں دیر لگتی۔ اس میں وہ دیساتی بسم اللہ پڑھ کر دریا میں اتر چکا تھا اور بڑے اطمینان سے پانی پر چل قدر کرتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو پیش امام صاحب کو اس دریا کے کنارے ہی کھڑا پایا اس دیساتی نے ذور سے کہا۔ "مولوی جی کشتی دیر میں آئے گی۔ کھڑے کاہے کو ہو۔ بسم اللہ کیوں نہیں

ایک دم اسے ایک جھنکا سا لگا جیسے اس نے بھلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ اور پلیٹ خالی رہی۔

تانية نے محسن راؤ کو جھنکا کھاتے دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "کیا ہوا بھائی جان۔"

"ایک جادو بے اثر ہو گیا۔" محسن راؤ، تانية سے مخاطب ہو کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔" تانية نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہرو، ابھی ایک اور شعبدہ آزمکر دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر محسن راؤ نے افضل سے کہا۔ "اپنی گھڑی اتاریں۔"

افضل نے اپنی گھڑی اتار کر اس کے ہاتھ میں وے وے۔ محسن راؤ نے وہ گھڑی اپنے دونوں ہاتھ میں بند کر لی۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ گھما کر ایک دم کھول دیئے۔ افضل کا خیال تھا کہ گھڑی ایک دم ہاتھ سے نیچ گرے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ گھڑی غائب ہو چکی تھی۔ اس شعبدے پر تانية نے خوشی سے تالیاں بجا دیں۔

"افضل اب تم اپنی گھڑی سے ہاتھ دھولو۔" خالہ فرزانہ نے بھس کر کہا۔

"نہیں خالہ، ایک بھی کیا بات ہے۔ تانية تم ذرا اس خالی پلیٹ کو اونچا کر دو۔"

تانية نے خالی پلیٹ اونچا دی۔ "یہ لیجئے۔"

"اب سیدھا کرو۔" محسن راؤ نے فوراً ہی کہا۔

تانية نے پلیٹ سیدھی کی تو حیرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ افضل کی گھڑی سامنے موجود تھی۔

"تانية، افضل صاحب کو گھڑی چیک کرواؤ۔ ٹوٹی چھوٹی تو نہیں۔"

تانية نے گھڑی اٹھا کر افضل کے حوالے کروالی۔ اس نے اٹ پلٹ کر دیکھی۔ پھر بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔"

"اے محسن ذرا، مجھے بھی بتا، تم نے کیا پڑھا۔" خالہ فرزانہ بڑے اشتیاق سے بولی۔

"نہیں بھائی محسن، خالہ کو جادو نہ سکھا دیتا، ورنہ کسی دن غصے میں آگر مجھی کو غائب کر دیں گی۔"

"اے محسن، کیا آدمی کو بھی غائب کیا جاسکتا ہے۔؟"

"ہاں، کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سحر مجھے نہیں آتا۔ ویسے خالہ جادو اصل میں شیطانی علم ہے۔ سمجھنے کے لئے جو کلمات ادا کرنے پڑتے ہیں، ان کا تعلق شیطان کی ذات سے ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کے چھوٹے سے دماغ میں کائنات کی تینی بھروسی ہے۔ دونوں آدمی اڑکنے میں وہ بھی جو اللہ کا ولی ہو اور وہ بھی جو شیطان کا چیلہ ہو۔ ان دونوں میں فرق صرف عقیدے کا ہے، یقین کا ہے۔ تغیر اور تخریب کا ہے۔ اللہ کا ولی کبھی کسی انسان کو بچ جو اور جھوٹ کا ہے۔ ایچھے اور برے کا۔ تغیر اور تخریب کا ہے۔ اللہ کا ولی کبھی کسی انسان کو فائدہ نہیں پہنچائے گا اور شیطان کا چیلہ بھی کسی انسان کو فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ یہ فتنہ ہے۔"

پڑھتے۔ ”پیش امام صاحب کو اب اپنا وعظ اچھی طرح یاد آپکا تھا لیکن وہ تنذیب کے عالم میں کھڑے تھے۔ بالآخر پیش امام صاحب کو اس دسمائی کی تقلید کرنا پڑی۔ انہیں بسم اللہ پڑھنا پڑھی اور بسم اللہ پڑھ کر دریا میں پاؤں ڈالنا پڑا۔ اتنا بتا کر محن راؤ رک گیا۔ مسکرا کر انہیں دیکھا اور بولا ”کوئی بتا سکتا ہے کہ انجام کیا ہوا۔؟“

”پیش امام صاحب پانی پر دوڑتے چلے گئے ہوں گے اور دسمائی سے بھی آگے نکل گئے ہوں گے۔“ تانية نے انجام بتایا۔

”جی نہیں دریا میں پلا قدم رکھتے ہی وہ دریا کے اندر۔“

”پیش ایسا کیوں۔؟“ خالہ فرزانہ نے پوچھا۔ ”جبکہ دونوں نے بسم اللہ پڑھی۔“

”دونوں نے بے شک بسم اللہ پڑھی لیکن ایک کو وسرول کو تلقین کرنے کے باوجود یقین نہ تھا اور ایک کو محن سن کر پختہ یقین ہو گیا۔ اور جس کو پختہ یقین ہو گیا وہ پورے اطمینان سے دریا پار کر گیا، اپنی منزل پا گیا۔“

”واہ محن، تم نے یہ بہت اچھی بات بتائی۔“ خالہ فرزانہ نے اسے توصیفی نظروں سے دیکھا۔

”بھائی جان، آپ کو کتنا یقین ہے۔“ تانية نے محب سوال کیا۔

”کس پر۔“ محن راؤ نے دریافت کیا۔

”اللہ پر۔“ تانية بولی۔

”محبے تو اللہ کے سوا کسی اور چیز پر یقین ہی نہیں ہے۔ بس جو کچھ ہے وہ اللہ ہے۔ میں نے جب بھی ماٹا اللہ سے ماٹا اس کے سوا کسی کو حاجت روانہ جانا۔ اگر سوئی بھی ماگنی ہے تو اللہ سے ماگنی ہے اور جماز ماگنی ہے تو وہ بھی اللہ سے ماگنی ہے۔ یقین کل بھی تھا، آج بھی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہے گا۔ اور یہ یقین ہی تھا کہ صحرائی قید سے بحث پا کر آج یہاں بیٹھا ہوں۔“

”صحرائی قید۔؟“ خالہ فرزانہ چکنی۔

”میرا مطلب اس جادوگر کی قید سے تھا۔“ محن راؤ کو فوراً پتی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے بات بنائی۔

رات گئے تک وہ سب گپ شپ میں مشغول رہے۔ بالآخر بارہ بجے کے قریب سب نے اپنے کروں کارخ کیا۔ تانية چند منٹ محن راؤ کے کرے میں ٹھری۔ اس نے تعویذ والے کرے میں جانے کا وقت طک کیا اور پھر اپنے کرے میں آگئی۔

ابھی بارہ بجے تھے۔ اس نے دو بجے کے بعد نیچے جانے کا پروگرام بیایا تھا۔ ابھی اس نے ڈھانی گھنے گزارنے تھے۔ اگر وہ بستر پر لیٹ گئی تو سو جائے گی۔ سونے سے نیچے کے لئے اس نے

ایک پرانی فلم نکالی اور کمبل اور اوزھ کر بیڈ سے ٹیک لکا کر آرام سے فلم دیکھنے لگی۔

وہ فلم تو ڈھانی گھنے کی تھی لیکن اس نے فالورڈ کر کے دو گھنے کی بنای۔ فلم ختم کر کے اس نے کمبل پرے پھینکا اور بیڈ سے اتر کر کالی چادر اوزھ لی۔ ٹی وی اور وی سی آر بند کیا۔ اور اپنے کرے

کا دروازہ بند کر کے آہستہ آہستہ بیٹھیاں اترنے لگی۔
باہر ہست تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے چادر اچھی طرح اوزھ لی، چادر گرم تھی۔ ہوابت ٹھنڈی تھی چہرے پر بلیڈ کی طرح لگ رہی تھی۔ چاند پوری طرح روشن تھا۔ اس کی ٹھنڈی چاندنی نے ماحول کو اور سرد بیادیا تھا۔

محن راؤ کے کرے کی بی جل رہی تھی۔ شیشے کی کھڑکی پر اگرچہ پر دہ پڑا ہوا تھا، پھر بھی روشنی محسوس ہو رہی تھی۔ ملے شدہ پر دگرام کے مطابق تائیں نے تین مرتبہ شیشے کی کھڑکی بجالی۔ چند لمحوں بعد محن راؤ اپنے کرے کا آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ اور دھیرے سے بولا۔ ”سب نیک ہے۔“

”ہاں، ابھی تک تو ٹھیک ہے۔“ تانية نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ ”آجایئے۔ میرے ساتھ۔“

”تانية، اگر کوئی اتفاق سے اٹھ کر باہر آجائے اور ہمیں یوں پر اسرار انداز میں گھر میں چل تدی کرتے ہوئے دیکھ لے تو ہم اس سے کیا کہیں گے۔“ محن راؤ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”دیکھا جائے گا۔“ تانية نے بے نیازی سے کہا۔ ”میں جواب دے لوں گی، آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم خدا خواتستہ چوری کرنے تو نکلے نہیں ہیں۔“

”ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔“ محن راؤ نے کہا لیکن وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے جھبک رہا تھا۔ ہر لمحے اس کی خطرہ تھا کہ اب کوئی نکل کر باہر آجائے گا۔

خالہ فرزانہ کے کرے کی لاش بھی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ نادل پڑھ کر پرسکون نہیں کرے لے رہی ہیں۔ وہ خالہ فرزانہ کے برابر والا کرہ تھا۔

تانية نے اس پر اسرار کرے کے سامنے بخوبی کر محن راؤ کو ٹھہر جانے کا اشارہ کیا، دروازے کے پینڈل پر کالے دھاگے میں بندھا کالا تعویذ لکا ہوا تھا۔

محن راؤ نے اس کرے کے دروازے کو بخوبی دیکھا۔ اس تعویذ پر بھی نظر ڈالی۔ تانية نے اس رے سے متعلق جو مرواد بیان کی تھی اس کے مطابق وہ کہہ غیر انسانی مخلوق کی ویبا میں واٹھے کا رویہ تھا۔ لیکن غیر انسانی مخلوق کی ویبا میں آدمی اسی وقت جاسکتا تھا، جب کوئی غیر انسانی مخلوق اس

ماڈو کرے کرے کے پر اسرار دروازے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے محن راؤ کے جسم میں منی اس کاٹے کرے کے پر اسرار دروازے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے محن راؤ کے جسم میں منی ناپہیل گئی۔ خود تانية کے حواس بھی قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس کے ول کی دھڑکن اچانک تیز و بھی تھی۔ اور ہاتھ پاؤں بے جان سے ہونے لگے تھے اس کے جسم میں لرزش سی پیدا ہو گئی۔

تانية نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا، اپنی ہمت بچھن کی۔ اور ہاتھ بڑھا کر اس کے پینڈل پر ہاتھ لگا۔ پھر اس نے پینڈل پر دباؤ ڈال کر دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔
تجھی تانية کے منہ سے نکلا۔ ”ارے۔“

”کیوں کیا ہوا۔؟“ محسن راؤ اس کے نزدیک آکر کسی قدر پر بیان لجئے میں بولا۔
”آپ ذرا دروازہ کھولئے۔“ تانية سے دروازے کے سامنے سے ہٹ کر کما۔

محسن راؤ نے آگے بڑھ کر پینڈل پر باختہ رکھا اور اسے دیا کر دروازہ کھولنا چاہیا لیکن دروازہ نہیں
کھلا۔ ایک بار دوبار اس نے کئی مرتبہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ کھولنا چاہیا لیکن دروازہ نہیں
مقفل تھا کیسے کھلتا۔

”دروازہ لاک ہے۔؟“ محسن راؤ یہ کہ کر پیچھے ہٹ گیا۔
اس کے شے کے بعد تانية نے پھر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ لاک نہ ہوتا تو ضرور
کھل جاتا۔

”جیرت ہے۔؟“ وہ کھلیانی سی ہو کر بولی۔ ”آجائیے۔“

تب محسن راؤ بغیر کوئی جواب دیے، اس کے پیچھے پیچھے چل دیا، پھر اپنے کمرے کے دروازے پر
پیچ کر کہ تانية سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اچھا، تانية تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ اب صحن بات کریں
گے۔“

تانية جمل سی اپنے کمرے میں آگئی۔ اور سونپنے لگی ایسا کیوں ہوا؟ دروازہ مقفل کس طرح ہو گیا؟
کس نے کیا؟

ظاہر ہے یہ کام افضل یا خالہ فرزانہ تو کر نہیں سکتے تھے۔ خاص کر افضل کو تو اس کمرے کی خیر
کمانی معلوم ہی نہیں تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کمہ کھلا ہے یا بند ہے۔ اس نے آج تک
دروازے نئے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ خالہ فرزانہ کو اس کمرے کے بارے میں تھوڑا بہت معلوم تھا۔ انہیں
بھلا کر کرہے مقفل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس سے پہلے تانية کنی مرتبہ اس کمرے میں جا پہنچی تھی۔ اسے اس کمرے کا تالابیشہ کھلا ماتھا۔
پھر جل راست وہ اسی کمرے سے باہر آئی تھی۔ تب بھی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

پھر یہ اچانک کیا ہوا؟ کمرے کا دروازہ آخر کس طرح مقفل ہو گیا۔ یہ بات وہ بہت دیر تک
سوچتی رہی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ سوچتے سوچتے بالآخر اسے نید آگئی۔

رات کو خواب میں وادا عظیم و کھلائی دیئے۔ وہ اس کے کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور
اس کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ہاں، تانية کیوں پر بیان ہو؟“

”وادا کمرے کا دروازہ مقفل کیسے ہو گیا۔؟“ تانية نے اپنی پر بیانی فوراً ظاہر کر دی۔
اس کی بات سن کر وادا عظیم مکرائے اور بڑے نرم لجئے میں بولے۔ ”وہ ہم نے بند کا
ہے۔؟“

”اچھا..... لیکن کیوں؟ میں بھائی جان کو دکھانا چاہتی تھی۔؟“ تانية نے کہا۔
”تانية، جیسیں، تمارا بھائی مل گیا، کیا تم خوش نہیں ہو۔؟“

”میں بے انتہا خوش ہوں۔“
”پھر اب تم اس کمرے کو بھول جاؤ۔ جو کچھ بیتا سے بھی خواب سمجھ کر بھلا دو۔ کسی بات کا

زیادہ کریم اچھی نہیں ہوتی۔ تم میری بات سمجھ گئیں تا۔“ وادا عظیم نے سمجھانے والے انداز میں
کہا۔ ان کے لجے میں ایک طرح کی تنیسی بھی تھی۔

”بھی وادا، اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔“

”بھی پھر اللہ حافظ۔“ یہ کہ کر وادا عظیم کری سے اٹھے۔ اور اٹھتے ہی آنکھوں سے اوچل
ہو گئے۔

تانية کی فوراً ہی آنکھ کھل گئی۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اس خواب نے
وہنی ابھجن دور کر دی تھی۔ اس کمرے کو مقفل کرنے والے وادا عظیم تھے۔ یہ وادا عظیم ہی تو تھے
جنہوں نے اس کمرے کی راہ دکھائی تھی۔ اور یہ راستہ اسے محسن راؤ تک لے گیا تھا۔ جس نے راہ
کھلی تھی، آج وہی ابستے بند کر گیا تھا۔

محسن راؤ اب جن راستوں پر جانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے کراچی سے واپسی ضروری تھی۔ وہ لاہور
جانے کے لئے بے چین تھا۔ خالہ فرزانہ کے اصرار پر دوچار روز وہ بکشکل رکا۔ پھر اس نے لاہور
جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے ساتھ تانية کو بھی لے لیا۔

خالہ فرزانہ نے منع بھی کیا کہ وہ تانية کو لاہور نہ لے جائے لیکن خود تانية محسن راؤ کے ساتھ جانا
چاہتی تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہر قیمت پر رہنا چاہتی تھی۔ اس کے بیانے تو اسے جیتے ہی مار
دیا تھا۔ لیکن اب وہ جیتے ہی مرتا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور
تھا۔

جب وہ لاہور جانے کے لئے تیار ہو گئی تو خالہ فرزانہ نے اسے گلے لگایتے ہوئے کہا۔ ”تانية،
تمہارا کمرہ میں بند کروادوں گی۔ وہ اسی طرح رہے گا۔ جب تم سارا ول چاہے، کراچی آ جائی۔“

”ہاں خالہ، آپ فکر نہ کریں، میں ضرور کراچی آؤں گی۔ ذرا حالات کسی کروٹ بیٹھ جائیں،
پھر اناء اللہ میں آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔“

”واہ، اور مجھ غریب کا کیا ہو گا۔؟“ افضل نے چک کر کما۔

”تمیں امیر بیٹایا جائے گا۔“ محسن راؤ نے بہن کر کما۔

”وہ کس طرح۔“ افضل نے پوچھا۔

”تمہاری شادی کر کے۔“ محسن راؤ نے بڑے یقین سے کہا۔

”اے اللہ..... تو مجھے اپنی پناہ میں رکھ..... یہ لوگ مجھے بر باد کرنے پر تھے ہوئے ہیں۔“ افضل
نے بڑی مخصوصیت سے کہا تو بہن بہن پڑے۔

افضل اور خالہ فرزانہ انہیں ایک پورٹ چھوڑنے آئے، لاہور میں انکل عامر ان کے منتظر تھے۔
محسن راؤ نے فون پر انکل عامر سے بات کر لی تھی۔ ساری تفصیلات طے کر لی تھیں۔ لذدا وہ ایک پورٹ
سے سیدھا اپنی کوئی پہنچا۔

اگلے دن اس نے اپنے ریسٹوران کا رخ کیا۔ وہاں کا چارچ سبھالا۔ ریسٹوران میں کام کرنے
والے کئی ملازمین میں سے ایک بندے کا انتخاب کیا۔ اور اسے صبح کوئی آئنے کی پہاڑت کی۔

راشتہ ایک مضبوط کاٹھی کا نوجوان تھا۔ وہ محسن راؤ کے ریسٹوران میں مل کلر کی حیثیت سے

پوچھے کا وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے ملازم سبق کے ساتھ گیت پر آیا۔ گیٹ کے برابر کوئی کی دیوار کے ساتھ راشد کی لاش پڑی تھی۔ محسن راؤ نے راشد کے جسم کا پارہ لیا تو اسے انداز ہوا کہ اس کا چہرہ اور جسم بالکل صاف ہے۔ کسی قسم کی جوٹ کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ محسن راؤ نے اس کی نہض و یکھی۔ بغیر میں حرکت موجود تھی ول بھی وہڑک ربانا۔ راشد ابھی زندہ تھا۔ محسن راؤ نے فوراً اپنی گاڑی نکالی۔ تینیوں کو ساری صورتحال سمجھائی اور راشد و گاڑی میں ڈال کر ایک اچھے اپستال کا رخ کیا۔

ڈاکٹروں کی ایک دو گھنٹے کی محنت کے بعد بالآخر راشد کو ہوش آگیا۔ اگلے دو گھنٹوں میں اس کی بات بالکل بحال ہو گئی۔ مزید ایک گھنٹہ رکھ کر اسے اپستال سے رخصت کروایا گیا۔ ڈاکٹروں کی پوٹ کے مطابق راشد کو کوئی جسمانی ضرر نہیں پہنچایا گیا تھا۔ البتہ اسے ایک نشہ آور دو کا تیز پکش لگا کر محسن راؤ کی کوئی تھی کے سامنے پھینک دیا گیا تھا۔ اگر راشد کو فوری طبقی لمداونہ ملت تو اکتوبر کی رائے کے مطابق اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔

محسن راؤ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اگر راشد کی موت واقع ہو جاتی تو وہ اس کے گھر والوں کے ائمہ یا شرمندہ رہتا۔ راشد کے کوٹ کی جیب سے ایک کانہ بزرگ آمد ہوا تھا جس پر سرنخ رنگ کے کرسے لکھا تھا۔

گیند ہواں والں انہی بست دور ہے۔ ہماری طرف سے پہلے دن کا تختہ قبول کرو۔ کانڈر پیغام دینے والے کا نام درج نہیں تھا۔ محسن راؤ کو اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ راؤ احمد نے اس کے گیارہویں والن کی وحکی کا کس خوبصورتی سے مذاق ازا یا ہے۔

رات کو محسن راؤ نے گاڑی بھیج کر راشد کو اپنی کوئی بلوایا اور انکل عامر کی موجودگی میں اس نے اون پور کی روادا و ریافت کی۔ راشد نے ساون پور کا حال بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اون پور پہنچ کر حولی کی کارخ کیا۔ اور حولی کے بند گیٹ پر کھڑے چوکیار سے راؤ احمد علی سے ملنے خواہش ظاہر کی۔ مجھے فوراً حولی کے اندر پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر کے بعد عالیشان ڈرائیکٹ روم میں راؤ علی کی تشریف لائے۔ وہ مقصر ہونے کے باوجود مجھے خاصے چاق و چوبنڈ نظر آئے۔ اپنی سرنخ لہاک آنکھوں سے مجھے گھورا اور آمد کی وجہ پوچھی۔ میں نے جواب دیئے لیفٹ کوٹ کی جیب سے پ کار دیا ہوا الغافہ نکالا۔ اور ان کی طرف بڑھا دیا۔ اسی اثنائیں ایک جوان شخص جو غالباً ان کا بیٹا خاموشی سے آکر پیٹھ گیا تھا۔ مجھ سے وہ لفافہ لے کر راؤ احمد علی نے اپنے پیٹھ کی طرف عبارتا۔ بیٹے نے لفافہ کھوکھ کر پڑھا تو اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اس نے راؤ احمد علی سے اے۔ ”آؤ، اب ابھی۔“ بیٹے کے ساتھ راؤ احمد علی بھی حولی کے اندر چلے گئے۔ اب میں ڈرائیکٹ روم مالکیارہ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ان کا بیٹا وبارہ ڈرائیکٹ روم میں آیا اور مجھ سے بولا۔ ”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اس کی یہ بات سن کر میں خاموشی سے اٹھا اور حولی سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد میں نہ سرک پر اسکر لامہور کے لئے بن پکڑی اور رات آٹھ بجے تک اپنے گھر پہنچ گیا۔ کھانا کھا کر میں

ملازم تھا۔ ویگر ضروری کاموں سے فارغ ہو کر رات کو اس نے راؤ احمد علی کے نام ایک خط لکھا۔

آپ نے میرے اور بیبا کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس سے آپ اچھی طرح واقف ہوں گے۔ میں اللہ کے فعل سے اپنے گھر واپس آگیا ہوں میرے ساتھ میری بہن تانیہ بھی ہے۔ اب آپ پر لازم ہے کہ میرے بیبا کی زمینیں، باغات اور ساون پور کی حوالی کا آواح حصہ وس ون کے اندر خالی کر دیں۔ میں گیارہویں والے ساون پور آؤں گا۔ زمینوں کی آمنی کا حساب کتاب تیار رکھئے گے۔ میں اب آپ سے ایک ایک پائی کا حساب لوں گا۔ فقط : محسن راؤ۔

اس خط کو محسن راؤ نے لفافے میں بند کیا۔ اور اسے کوئی چکنچے والے ملازم راشد کے حوالے کرتے ہوئے اسے ہدایت کی گئی کہ یہ خط کمال اور کے دنیا ہے۔

راشد کے ساون پور روانہ ہونے کے بعد اس نے ریستوران کا رخ کیا۔ وہ رات تک وہاں بیٹھا رہا۔ ریستوران کا شیخ بہت محنت آدمی تھا، اس نے ریستوران کو بطریق اسن سنبھالا ہوا تھا۔ انکل عامر نے بھی اس کی بہت تعریف کی تھی۔ کام کے اعتبار سے اس کی تنخواہ کم تھی۔ فوری طور پر محسن راؤ نے اس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ کروایا وہ بہت خوش ہو گیا۔

انکل عامر نے بتایا تھا کہ راؤ مشاہ علی آرٹ کے بڑے قدر وان تھے۔ انہوں نے ذاتی طور پر ایک آرٹ گلری کھول رکھی تھی جس میں مختلف آرٹشوں کی تصاویر کی نمائش ہوتی رہتی تھی۔ محسن راؤ اور تانیہ دونوں کو تصاویر سے وچھی تھی۔ محسن راؤ نے صح آرٹ گلری کی طرف جانے کا پروگرام بنایا۔ اس آرٹ گلری میں تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے آرٹ گلری کو تانیہ کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا۔ اس طرح وہ گھر میں تماہرہ کر بور ہونے سے بچ جائے گی۔

اپنی محسن راؤ سوکر نہیں اٹھا تھا کہ ایک ملازم نے زور سے اس کے کمرے کا دروازہ بھجا یا۔ محسن راؤ نے کمرے کا دروازہ کھولا تو گھر کا نیا ملازم پریشان کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوایاں اڑھی تھیں۔

”کیا ہوا۔؟“ محسن راؤ کی پیشانی پر مل پڑ گئے۔

”صاحب جی..... گیٹ پر ایک لاش پڑی ہے۔“

”کس کی لاش ہے۔؟“

”وہ جی کل جو صاحب بیساں آئے تھے، ان کی لاش ہے جی۔“

”راشد کی لاش۔؟“ محسن راؤ نے جیسے خود سے سوال کیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ جو نہیں ہوتا چاہئے تھا، وہ ہو گیا تھا۔

محسن راؤ کو قطعاً امید نہیں تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ جب راشد، راؤ احمد علی کو خود سے گا، تو اس خط کو پڑھ کر راؤ احمد علی پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا راؤ احمد علی نے خود رزونے کے بجائے محسن راؤ کو النائزہ دیا تھا۔ اس نے پیغام لے جانے والے نہ نبوان کو اس کے گھر کے دروازے پر پہنچا دیا تھا۔ اس سے زیادہ دیدہ دلیری اور کیا ہو سکتی تھی۔ بھر جا ب

”میرے ملازم راشد کو اغواء کرنے کی۔“

”تمارے پاس کیا ہوت ہے یہ کام راؤ احمد علی نے کیا ہے، بھی یہ سیدھا سیدھا منشیات کے دی نوجوان کا کیس ہے۔ جو بھاری مقدار میں لی شے اور چیز کا انجشن لے کر بے ہوش ہو گیا۔ راؤ احمد علی اغوا کروتا تو اپنے علاقے سے کروتا۔ اسے مارنا ہوتا تو قاتلانہ حملہ کروتا۔ ایسا کچھ نہیں ہیں تو کہتا ہوں کہ اگر راشد مر بھی جاتا، تب بھی ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔“

”اور وہ تحریر جو اس کی کٹ سے برآمد ہوئی۔؟“

”ایسی تحریر کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ بلکہ وہ تحریر تم نے خود ہی لکھی تاکہ راؤ احمد علی کو پھنسایا سکے۔“

”اپھا تو یہ بات ہے۔“ محسن راؤ نے ساری صورتحال سمجھ کر کہا۔

”بالکل۔“ انکل عامر بولے۔ ”راؤ احمد علی کی لومزی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کی طرح خونخوار ہے۔“

”میں پھر شیر بن جاتا ہوں، ایک ہی وار میں ادھیڑ کر پھینک دیتا ہوں۔“ محسن راؤ طیش میں لیا۔ ”میں تانیہ نے اندر جھاٹکا اور کئی غیر بندے کو دراٹنک روم میں نہ پاکروہ اندر آگئی۔ اس نے اندر آتے ہوئے محسن راؤ کا جملہ سن لیا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لبجھے میں پوچھا۔ ”کیا ہوا لی جان، کیوں بگز رہے ہیں۔“

”کیا، تانیہ، ذرا تم ہی اپنے بھائی کو سمجھا، یہ مرنے مارنے پر تے ہوئے ہیں۔“ انکل عامر نے تانیہ تم جانتی ہو کہ راشد کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کس نے کیا۔؟“

”جو حالات اب تک میرے سامنے آئے ہیں، میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ ساری راوی راؤ احمد علی کی ہے۔“

”پھر۔“ محسن راؤ نے انکل عامر کو دیکھا۔

”کیا انکل عامر اس بات سے متفق نہیں ہیں۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”سو نیصد متفق ہوں۔ میں نے کب کہا کہ یہ کام اس کا نہیں۔“ انکل عامر نے گمراہی لکھا۔ ”لیکن ایک بات میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے بے حد قیمتی ہو۔ تم اپنی بسنائی انہوں نے اپنے سے دور رکھا۔ تانیہ کو مال کی ستمی نہ باپ کی شفقت، اب کیا تم اس سے بھائی کا پیار اس کا تحفظ اس سے چھین لینا چاہتے ہے۔“

”خدا نو است۔“ محسن راؤ نے تانیہ کو محبت بھری نظریوں سے دیکھ کر کہا۔

”وپھر شیر بن کر راؤ احمد علی کو ادھیڑنے کی خواہیں دل نے نکال دو۔ میں تمہیں جگل میں نہیں لے دوں گا۔ جگل کا قانون نہیں اپنانے دوں گا۔“ یہ کہتے کہتے انکل عامر کا گلارندھنے لگا۔ لیکن محسن، اگر ہم نے راؤ احمد علی کو قتل بھی کر دایا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ یہ

نے سوچا کہ مائل ناون جا کر آپ کو صورتحال - آگاہ کر دوں۔ گھر سے نکل کر گلی میں آیا تو اندر ہیرے میں گھری گاڑی سے اچانک تین چار بندے باہر نکلے اور مجھے گاڑی میں ڈال کر آگے بڑھے گئے۔ میری آنکھوں پر کالی پتی باندھ دی گئی۔ اور یہ الور کی نال پہلو میں جھجاکر خاموش بیٹھے رہے کی دھمکی دی گئی۔ ایک لمبے سفر کے بعد مجھے گاڑی سے آتا گیا۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر میری رہنمائی کی۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کہاں لے جایا گیا۔ جہاں لے جایا گیا۔ وہاں مجھے دعا دے کر گردایا گیا۔ یہ کوئی بستر تھا۔ پھر میرا کوٹ اتار کر قیعیں کی آستین چڑھائی گئی اور ابھی میں اندازہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ لوگ کیا کرنے والے ہیں کہ میرے بازو میں ایک انجشن بھونک دیا گیا۔ انجشن کی دوا اندر جاتے ہی مجھے چکر آنے شروع ہو گئے اور چند لمحوں بعد ہی میں اپنے ہوش نوٹا بیٹھا۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں اپستال میں تھا۔“

”راشد تم خوفزدہ تو نہیں ہو۔؟“ راشد سے ساری رواداد سن لینے کے بعد محسن راؤ نے پوچھا۔ ”زارے نہیں سر خوفزدہ ہونے کی بھلا کیا بات ہے۔ ویسے میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ یہ کون لوگ تھے اور انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ بلکہ میری کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔“ راشد نے کہا۔

”اصل میں ان کا مقصد تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں تھا بلکہ تمہارے ذریعے مجھے خوفزدہ کرنا تھا۔“ جو لوگ بھی تھے انہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وشنی ان کی تمہارے ساتھ نہیں میرے ساتھ ہے۔ بہر حال تم بے قکر ہو جاؤ۔ اگر چاہو تو ایک دو دن کی چھپی لے کر گھر پر آرام کرو۔ جب طبیعت بالکل بحال ہو جائے تو پھر رستوران آجائنا۔“ محسن راؤ نے ہمدردی سے کہا۔

”نہیں سر..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ انشاء اللہ میں کل ضرور رسیوران آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے پھر تم جاؤ۔“ محسن راؤ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر اس نے رفق کو آواز دے کر اسے ہدایت کی۔ ”جاوہڑا یور سے کوکہ راشد صاحب کو ان کے گھر چھوڑ آئے۔“

”سرمیں چلا جاؤں گا، اس زحمت کی ضرورت نہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ ڈڑا یور تمہیں چھوڑ آئے گا۔“

”سر، جیسی آپ کی مرضی۔“

”اوے کے، اللہ حافظ۔“ محسن راؤ نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اور راشد کے جانبے بعد محسن راؤ نے انکل عامر کی طرف دیکھا جو ابھی تک کچھ نہیں بولے تھے۔ خاموش تماشائی ہوئے تھے۔

”جی انکل، آپ کیا کہتے ہی پچ اس مسئلے کے۔“

”راؤ احمد علی نے بڑے شاطر انداز میں وار کیا ہے۔“

”اس کے نام انیف آئی آر کٹوا دوں۔؟“

”کس بات کی۔“

کیس مرید پچیدہ ہو جائے گا۔ ”
”اکل، میرا کچھ تو محضدا ہو جائے گا، اس نے میرے بابا کو مارا ہے۔ میں اپنا انتقام لینے میں حق بجانب ہوں۔“

”قاتل بننا چاہتے ہو۔؟“ اکل عامر نے سوال کیا، اس سے پہلے کہ محسن راؤ کوئی جواب دیتا۔
”تانية سے مخاطب ہو کر بولے۔“ کیوں تانية، کیا تم چاہو گی کہ تم سارا بھائی قاتل بن جائے۔؟“
”نہیں اکل، بھول کر بھی نہیں۔“ تانية نے فوراً جواب دیا۔ ”میں اپنے بھائی کو کھو نہیں چاہتی۔“

”سن لیا محسن۔“ اکل عامر نے تانية کو تو صیفی نظر دیں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو محسن
تمارے آجائے سے ہمارا کیس اب بے حد مضبوط ہو گیا ہے۔ اب ہم نے سرے سے راؤ احمد علی پر
مقدمہ قائم کریں گے۔ بالآخر اسے ہماری زمینیں، ہماری جاندار ہمارے حوالے کرنا ہوگی۔ رہ بات
انتقام کی تو تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ اللہ سب سے بڑا مقنم ہے۔ اس پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے
اس انتقام کے مسئلے کو۔ وہ لے گا ہمارا انتقام۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس طرح لے گا کہ دنیا دیکھے
گی۔ راؤ احمد علی کا انجام دیکھ کر دنیا عبرت پکڑے گی۔“

پہنچے نہیں اکل عامر کے ان جملوں میں کیا اڑتا تھا کہ محسن راؤ کے دل کو قرار سا آگیا۔ وقت طریقہ
اس کے دل میں بھرتکے انتقام کے شعلے سرد سے پڑ گئے۔ تانية کے چہرے پر بھی کچھ اطمینان جھلکنے
لگا، اگرچہ شروع میں جب اسے اپنے بابا کے قتل کے بارے میں معلوم ہوا تھا تو اس کے دل میں
انتقام کی آگ اس قدر بھڑکی تھی کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اڑ کر چل جائے اور راؤ احمد علی کو بھرم
کر کے آجائے۔ لیکن جب سے وہ محسن راؤ کو لے کر اپنی دنیا میں واپس آئی تھی تو اب وہ ایک لمحے کی
جدائی بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ وہ اپنے بھائی کو دیکھ کر جیتنی تھی۔ اب وہ اندر سے
نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بھائی کسی قتل و غارت گری میں ملوٹ ہو۔ آخر وہ صلح جو، امن پسند اور
آرٹ سے دپچی رکھنے والے باپ کی بیٹی تھی۔ پھر دولت سے اسی قدر بے نیاز تھی جس قدر اس کے
والدین تھے۔

اکل عامر کی بات سے تانية نے اتفاق کیا۔ طے ہوا کہ زمینوں اور جاندار کی واپسی کے لئے نا
مقدمہ دائر کیا جائے گا۔ اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ہرگز کوش نہیں کی جائے گی۔ آخر
راوی احمد علی اور محسن راؤ میں کچھ تفرق ہونا چاہئے محسن راؤ کو شناسی سے بیٹھا سب سنتا رہا۔ بولا کچھ
نہیں، اس نے فیصلے کو قبول کر لیا تھا یا پھر اس نے اپنے دل میں کوئی اور فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی نہیں
جانتا تھا۔ ہر حال جاندار کی بھالی کے لئے وکیل کے ذریعے نوٹس بھجوادیا گیا۔ اس طرح مقدمے کا آغاز
ہو گیا۔ قانونی کارروائی کی ابتداء ہو گئی۔ اور اس مقدمے کی گرانی اکل عامر نے خود اپنے ذمے
لی۔

محسن راؤ نے ریستوران کا چارچ سنبھالنے کے بعد آرٹ گیلری پر توجہ دی۔ اس آرٹ گیلری

چدید تھاںوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نئے سرے سے ترینیں و آرائش کروائی۔ ابھی تک یہ
رٹ گیلری ان کے باپ کا شوق تھی۔ یہاں بڑے محمود پیلانے پر منتخب آرٹشوں کے فن پاروں کی
انیں ہوتی تھی۔ اور اس نمائش کو دیکھنے والے بھی بہت منتخب ہوتے تھے۔ لیکن محسن راؤ نے اس
رٹ گیلری کو عام کرنے کی خانی۔ اس نے اس آرٹ گیلری کو پیک کے لئے کھول دیا۔
سارا انتقام کرنے کے بعد اس نے اس آرٹ گیلری کو تانية کے حوالے کر دیا۔ تانية کو آرٹ
ہے نظری لگا تھا۔ اس کا ہاتھ بہت اچھا تھا۔ اس نے ایک نامور خاتون آرٹسٹ کی شاگردی اختیار
لی۔ اور بہت تیزی سے آرٹ کے بیانیوں رموز سیکھ لئے۔ اب وہ اپنی آرٹ گیلری کے دفتر میں
پینٹنگ بنانے میں مصروف رہتی۔

ایک دن تانية اپنے کام میں مصروف تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بیکی۔
”پیلو۔“ اس نے ریپورٹ اخھایا۔

”دیکھئے، مجھے اس آرٹ گیلری کے مالک سے بات کرنی ہے۔“ ادھر سے کسی خاتون کی بادو قار
ز عالیٰ دی۔

”جی، فرمائی۔“ تانية نے پر اعتماد انداز میں جواب دیا۔

”کیا آپ اس آرٹ گیلری کی مالک ہیں۔“ ادھر سے پوچھا گیا۔

”مجھے اصل میں مالک کہلوانا پسند نہیں ہے۔ آپ مجھے اس آرٹ گیلری کی مفلحہ کہہ سکتے
۔“ تانية نے اکساری سے کہا۔

”آپ کا نام کیا ہے۔؟“ تو صیفی انداز میں پوچھا گیا۔

”جی، میرا نام تانية ہے۔“ تانية نے بتایا۔

”ویکھتے تانية، میں اصل میں لاہور میں نہیں رہتی۔ مجھے کسی نے اس آرٹ گیلری کے بارے
تباہی تھا۔ میں نے سوچا۔ بات کرلو۔“

”جی فرمائی۔“ تانية نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”میرے پاس کچھ پینٹنگز ہیں، ان کی نمائش کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتی
۔“

”ویکلم۔“ تانية نے خوش مراجی سے کہا۔ ”تشریف لائیے۔“

”کل کسی وقت حاضر ہو جاؤ۔“ پوچھا گیا۔

”جب جی چاہے آئیں۔ میں دن بھر میں ہوتی ہوں۔“ جواب دیا گیا۔

”پھر بھی۔“ وقت کا تعین چاہا گیا۔

”تعین میں آجائیں، گیارہ بجے تک۔“ تانية نے وقت کا تعین کر دیا۔

”جی تھیک ہے۔“ یہ کہہ کر ادھر سے فون رکھ دیا گیا۔

فن جب بند ہو گیا تو تانية کو خیال آیا کہ اس نے فون کرنے والی کاتام تو پوچھا ہی نہیں۔ نہ یہ
کہ وہ کماں سے بول رہی ہے۔ کون ہے۔ چلو خیر کل تو وہ آئے گی ہی۔ کل ساری تفصیلات

معلوم ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر وہ پرش پکر کر کیوس پر اسٹوک لگانے لگی۔
شام کو جب وہ گھر پہنچی تو محنت را جائے کی میز پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے محنت را کو ہاتھ
کے اشارے سے دو منٹ کا اشارہ کیا۔ اور منہ ہاتھ دھوکر جائے کی میز پر آگئی۔
”ہاں بھی آرٹ آج تک تصویریں بنالیں۔؟“ ”محنت را کو سکراتے ہوئے کہا۔
”تصویریں!“ تانیہ نے چیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”بھائی جان، کیوں مذاق کر رہے ہیں۔ مجھے تو
ایک تصویری پر کام کرتے ہوئے ہی پندرہ دن ہو گئے ہیں۔“
”اوہ..... اس قدر ست روی سے کام ہو گا۔ پھر تو پانچ سال بعد تصویریں کی نمائش ہو سکے
گی۔“ ”خر سے مجھے نمائش کی کوئی جلدی بھی نہیں۔“ تانیہ نے کیتیلی سے چائے نکالتے ہوئے
کہا۔

”کوئی پہنگاں کرو بھی، تمہاری آرٹ گلبری بڑی محنتی جا رہی ہے۔“

”بھائی جان، آج ایک خاتون کافون آیا تھا۔ وہ اپنی تصویریں کی نمائش چاہتی ہیں۔“
کہا۔ ”اُکر تصویریں اپنی ہیں تو پھر فوراً نمائش کا انتظام کرو۔“ ”محنت را نے سبک کھاتے ہوئے
تصویریں کا توکل پڑے چلے گا۔ وہ کل گلبرہ بجے آئیں گی۔“
ابھی وہ دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ باہر سے ”تڑتڑ“ کی آوازیں آنے لگیں۔
”بھائی جان، فائزگ۔“ تانیہ نے سُم کر کہا۔

تب ہی ڈر انگ روم کی گھر کیوں کے شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ محنت را نے جلدی سے کہا۔
”تانیہ فوراً نیچے بیٹھ جاؤ۔ یہ فائزگ تو ہمارے گھر پر ہو رہی ہے۔“

تانیہ فوراً کرسی سے اتر کر نیچے بیٹھ گئی۔ تب تک محنت را بھی زمین پر بیٹھ چکا تھا۔
یہ کھیل مشکل سے ایک دو منٹ کا تھا۔ فائزگ کرنے والی گاڑی فائزگ کر کے جا بچی تھی۔
ون را نے باہر نکل کر جانا چاہا لیکن تانیہ نے اسے باہر نہ جانے دیا۔ جب اپنی طرح اطمینان ہو گیا
کہ فائزگ کرنے والے جا چکے ہیں تو وہ دونوں بہن بھائی گیٹ پر پہنچے۔ گیٹ پر بھی طبع آزمائی کی گئی
تھی۔ وہ گولوں سے چھلتی ہو چکا تھا۔ گیٹ سے ملختی دیوار پر بھی گولوں کے نشان تھے۔ گھر کے
ڈر انگ روم پر بھی اچھی خاصی نشانہ بازی کی گئی۔ گھر کیوں کے متعدد شیشے ٹوٹ چکے تھے۔
پاس پڑوں کے لوگ محنت را کو باہر دیکھ کر ہمت کر کے اپنے گھروں سے نظر آئے تھے۔ کسی
نے فائزگ کرنے والوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اتفاق سے اس وقت گھر کا ملازم سفی سبزی ترکاری لیتے
باہر نکلا ہوا تھا۔ جب وہ والپس آرہا تھا تو اس نے ایک سفید گاڑی کو گھرے ہوئے اور اس گاڑی سے
فائزگ کرنے تھے لے لوگوں کو دیکھا تھا۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ ان کے منہ پر نقاب چڑھے ہوئے
تھے۔ فائزگ دو بندوں نے بیک وقت کی۔ ایک نے گیٹ کو نشانہ بنایا۔ دوسرے نے ڈر انگ روم
فائزگ کی۔ اور گاڑی کو تینی سے بھگاتے ہوئے گلی میں مڑ گئے۔

محنت را کوئی کا گیٹ بند کروا کر واپس چائے کی میز پر آگئی۔ اس نے تانیہ کو بیٹھنے کا اشارہ
نہ ہوتے کہا۔ ”کم بخوبی نے چائے کا مزہ بھی کر کر کر دیا۔“
”بھائی جان، اس فائزگ کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔“ ”تانیہ فکر مند تھی۔
”بھی خوفزدہ کرتا۔“ ”محنت را نے اطمینان سے کہا۔
”اُس کے پیچے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“
”ایک ہی شخص ہے وہ ... میں کا نام ہے راؤ احمد علی۔“
”بھائی جان، وہ لوگ گھر میں بھی داخل ہو سکتے تھے اور کوئی جانی نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔“
”ٹھٹھاڑ کیا گیا۔
”ہاں، ایسا ہو سکتا تھا وہ بغیر کسی رکاوٹ کے کوئی میں داخل ہو سکتے تھے۔“ خداش کی تائید کی

”بھی سیکورٹی گارڈز کا انتظام کرنا چاہئے۔“ تانیہ نے فکر مند ہو کر کہا۔
محنت را چائے سے فارغ ہو کر لاونچ میں رکھے ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔ اس نے انکل عامر کو
ہی پڑونے والی فائزگ سے آگاہ کیا۔ انکل عامر نے زیادہ بات سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔
وہ نہ سے کہا۔ ”میں آرہا ہوں۔“ یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ وہ آئے تو انہوں نے کوئی کام عائد
دنلوں کی خیریت پوچھی۔ ساری تفصیل معلوم کی پھر بولے۔ ”چلو پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔ اس
دہ کی پورٹ ضروری ہے۔“

تھانے میں روپورٹ درج کر اوری گئی۔ فائزگ کے سلسلے میں راؤ احمد علی پر شہباد ظاہر کیا گیا۔ پولیس
تایا گیا کہ راؤ احمد علی کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں۔ پچھلے میں ایجوج او کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ یہ کوئی نیا
ہلہ آپنہ۔ اس کا نام جاگائیکر بٹھتا۔ اسے راؤ احمد علی کے پارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ انکل
رنگ لے تفصیل سے سمجھایا۔ یہ بھی بتایا کہ اسی کوئی پر دو ملازمن کا قتل بھی ہو چکا ہے۔ تب بھی
ایک بیٹھتا کہ یہ کام راؤ احمد علی کے بندوں نے کیا ہے کیونکہ وہ دونوں میاں یہوی راؤ شمسداد علی
قتل کے سلسلے میں بہت کچھ جانتے تھے۔

پچھاً اتعہ کی طرح پولیس نے اس فائزگ کی بھی روایت انداز میں کارروائی کی۔ اور پھر معاملہ سرو
نے ہمچلا گیا۔ انکل عامر اور محنت را دو دونوں ہی جانتے تھے کہ کیا ہو گا۔ لیکن انہوں نے یہ
روٹ نہیں قانونی کارروائی کے طور پر کی تھی۔ آگے چل کر یہ روپورٹ مقدمے کے سلسلے میں
اون ہوت ہو سکتی تھی۔

محنت را نے فوری طور پر دو گارڈ رکھے۔ انہیں گیٹ پر کھڑا کرنے کے بجائے اندر سروٹ کوارٹر
و دروازے پر کھڑا کیا۔ تاکہ کسی مکمل حلے پر موڑ طور پر کارروائی کر سکیں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے
ٹوٹ و ختم کر کے کوئی کے اندر داخل ہونا کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا۔ لیکن سیکورٹی گارڈوں کا کوئی
اندر ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا کہ گارڈ کہاں ہیں؟ حملہ ہونے کی

صورت میں یہ گارڈ بھر طریقے سے کارروائی کر سکتے تھے۔ پھر محسن راؤ بھی ہر وقت اپنے پاس روپا اور رکھنے لگا تھا کہ تانیہ اب گھر سے کم سے کم ہی نکلے لیکن وہ آرٹ گلیری جھوڑنے اور گھر میں بند ہونے پر راضی نہ تھی۔ تب محسن راؤ نے اس کے لئے بھی ایک گارڈ کا انظام کر دیا جو اس کی گاڑی کے پیچے موڑ سائکل پر چلتا تھا۔ تانیہ اس فائرگر سے متاثر تو ہوئی تھی لیکن اتنی نہیں کہ وہ گھر سے نکلتا تھی توک کر دیتی۔ وہ دوسرے دن اپنے وقت مقررہ پر آرٹ گلیری بیٹھنے لگی تھی۔ اس نے گیارہ بجے کام نام دیا تھا۔ اس وقت پونے گیارہ بجے تھے۔

وہ جانے کیوں اس خاتون کا بڑی بے قراری سے انتظار کر رہی تھی۔ خیر خدا خدا کر کے گیارہ بجے۔ جب ہی آرٹ گلیری کے دروازے پر گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی اندر آگئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے راہداری میں کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ جو قون کی ہیل کی آواز تھی۔ تانیہ اپنی میز کے پیچے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔ وہ سفید سائزی میں اس قدر گریں فل لگ رہی تھی کہ تانیہ پیکر جھپکتا بھول گئی۔ اس خاتون کے فوراً بعد ایک سادہ بس میں کالا ٹکونبرد دار شخص اندر داخل ہوا اس نے تانیہ کو گھوڑ کر دیکھا۔ پھر کمرے کا چڑھہ لیا اور اٹھے قدموں واپس چلا گیا۔

”معاف کیجئے گا، آپ تانیہ ہیں؟“ اس نے بھجنکتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھی۔“ تانیہ نے مختصر سا جواب دیا۔ ”جیت ہے۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”آپ تو بہت کم عمر ہیں۔“

”آپ کا کیا خیال تھا کہ یہاں کوئی پچاس ساٹھ سال کی خاتون بیٹھی ہوگی۔“ تانیہ بھی ”میرا خیال تھا کہ کم از کم میری ہم عمر منظم ہوگی یہاں کی۔“ اس پر کشش خاتون نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کمال ہے۔“ تانیہ نے کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ بڑا ملام، گلزار اور جاذب نظر تھا۔ تانیہ نے گرم جوش سے ہاتھ ملا کر اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ترشیہ رکھئے۔“

”شکریہ۔“ اس نے بڑے دلاؤین تبسم کے ساتھ کہا۔ ”میرا نام بڑا پرانا سا ہے، اس لئے بیانے سے احتراز کرتی ہوں۔“ ”لو یہ کیا بات ہوئی بھلا..... نام صرف نام ہوتا ہے پرانا یا نیا نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ بیس سال کے بعد اپنا نام تبدیل کر لیا کرتے۔ ہاں، کیا نام ہے آپ کا۔“ ”میرا نام نرگس انصاری ہے۔“

”واہ، اتنا پا انا نام تو ہے۔“ تانیہ نے توصیفی انداز میں کہا۔ ”آپ کا کام کہاں ہے؟“

”میری پینٹنگز گاڑی میں ہیں، ابھی آپ کے سامنے آئی جاتی ہیں۔“ زگس انصاری ابھی یہ بات کہہ رہی تھی کہ وہ بندے بڑے بڑے فریم اٹھائے اندر داخل ہے۔ وہ کل میں تصویریں تھیں۔ اور پیک تھیں، ان پر بھورا کانگذ لپٹا ہوا تھا۔ شاید وہ تصادر برہا ت فریم کرنے والے کی دکان سے لائی گئی تھیں۔ جب سب تصویریں آگئیں تو تانیہ نے کہا۔ آپ اب اجازت دیں تو ان کا گھوٹکھٹ اٹھا کر دیکھ لوں۔“

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ لیکن ان تصویروں کو دیکھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ میں اپنا قude آرٹسٹ نہیں ہوں۔ یہ ساری تصویریں میں نے چورہ سال کی طویل مدت میں پینٹ کی۔ جب اتنی تصویریں اکٹھا ہو گئیں تو جی چاہا کہ اسے لوگوں کے سامنے رکھوں۔“

”یہ تو آپ نے اچھا کیا۔ ایسے کام کا کیا فائدہ جو لوگوں کے سامنے نہ آئے۔“ ”ایک بات اور میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔ میں اپنا کام ضرور آرٹ کے چاہنے والوں کے نئے پیش کرنا چاہتی ہوں لیکن خود سامنے آنا نہیں چاہتی۔ اگر آپ نے ان تصویروں کی نمائش نہیں کر لی تو میں اس نمائش میں ایک دیزیٹری حیثیت سے آؤں گی اور خاموشی سے لوگوں کے اس نئنا چاہوں گی۔“ نیز کہہ کر اس نے ایک تصویر کے اوپر سے کاغذ پھاڑ دیا۔ تانیہ پہلی ہی تصویر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اور جب اس نے ایک ایک کر کے ساری تصویریں دیکھ تو وہ دم بخود رہ گئی۔ ہر تصویر دیکھنے کے بعد وہ جیرانی سے زگس انصاری کو دیکھتی۔ وہ پینٹنگ اقبال سے تو زیادہ پہنچتہ تھیں۔ لیکن تصویروں میں جو کچھ دکھایا گیا تھا، وہ بہت پہنچتے تھا۔ ان بیوں میں آرٹسٹ کے ذاتی چیزیں بھی دیکھتے ہوئے تھے۔

ساری تصویریں دیکھ لینے کے بعد تانیہ نے بڑے جوش سے کہا۔ ”میں ان تصاویر کی نمائش اس دعوم دھام سے کر دوں گی کہ پورے ملک میں آپ کے چرچے ہو جائیں گے۔“

”تانیہ مجھے شہرت نہیں چاہتے۔“ اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ”ہاں، مجھے اندازہ ہے، اسی لئے آپ نے ان تصادر پر اپنا نام بھی نہیں لکھا۔“ تانیہ نے نرگس ری کو پر شوق نگاہوں سے کھکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات پوچھوں، سچھ جیتاںیں گی۔“

”ہاں، پوچھیں تانیہ..... میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔“ وہ تھوڑا سا حیران ہو کر بولی۔ ”لیکن آپ کا نام واقعی نرگس انصاری ہے۔؟“ یہ ایک عجیب سوال تھا۔

اس سوال پر نرگس انصاری کو ایک دم کرنٹ سالگا۔ اس نے ایک نظر تانیہ کو دیکھا اور پھر اپنی ہست آنکھوں پر پکلوں کا شامیانہ ڈال لیا۔ اور دھیرے سے بولی۔ ”نہیں، یہ میرا اصل نام ہے۔“

”زندہ ہا۔“ تانیہ ایک دم خوشی سے اچھل پڑی۔ ”یہ جان کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ یہ آپ اصل نام نہیں ہے۔“

”آپ کی خوشی میرے لئے حیرت انگیز ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ نیلام نہ گس ہے یا عابدہ۔“

”آپ ٹھیک کہ رہی ہیں۔ اس سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا نام نہ گس ہے یا عابدہ..... لیکن اگر آپ کا نام نادرہ ہو تو فرق پڑتا ہے۔“ تانیہ نے اسے تجھی نگاہوں سے دیکھنے ہوئے کہا۔ اس کے ہونتوں پر شریم مسکراہست تھی۔

تانیہ کی زبانی اپنا نام سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

تانیہ سے اس کی پہلی تصویر دیکھتے ہی اسے پوچھاں لیا تھا۔ اس تصویر میں درخت ہی درخت تھے اور انہی درختوں کے نیچے پتھر پر ایک مردانہ قبیل پڑی ہوئی تھی۔ ایک تصویر میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی گھوڑوں پر بیٹھے باٹیں کرتے جا رہے تھے۔ پس منظر میں کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ایک تصویر میں ایک لڑکی گھوڑے پر بیٹھی تھی اس کے چہرے کے تماڑات سے پتہ چلا تھا جیسے وہ کسی کو دھومنڈر یا ہر غرض جتنی تصویریں تھیں۔ سب کی سب اسی کمانی کی عکاسی کرتی تھیں جو کالے چراغ نے اسے عالیٰ تھی۔ اور اب اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ وہ اس کے بھائی محسن راؤ کی نادرہ تھی۔

”اپنا نام سن کر جیران ہو گئیں تا۔“ تانیہ نے شوخی سے کہا۔

”میری بھجوں میں کچھ نہیں آ رہا۔“ تانیہ آپ کو میرا نام کیے معلوم ہوا۔“

”یہ سب سمجھ میں آجائے گا۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں ان تصوریں کا افتتاح ایک بت بڑے آدمی سے کراؤں گی۔ آپ دیکھتی جائیں کہ میں کیا کرتی ہوں۔ افتتاح والے دن میں آپ کو ایک ایسا سربراہز دوں گی کہ آپ زندگی بھر بیار رکھیں گی۔“

پھر تانیہ نے نادرہ کو پر تکلف چائے پلائی۔ نادرہ وہاں جتنی دیر بیٹھی رہی تانیہ سے یہی پوچھتی رہی کہ اس کا اصل نام کیے معلوم ہوا۔ تانیہ بھی ایک شاطر چیز تھی اس نے اسے کچھ بنا کر نہ دیا، بس یہی سکتی رہی کہ وہ افتتاح کے دن کا انتظار کرے۔ اس راز سے کہ اس نے نادرہ کو کس طرح بچان لیا۔ اسی دن پر وہ انجئے گا۔

نادرہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر جب جانے کے لئے اٹھی تو تانیہ اسے گاڑی تک چھوڑنے کے لئے باہر آئی۔ کلاشکوپ بردار شخص نے اسے آتا دیکھ کر جلدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول۔ نادرہ کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کیا اور خود فرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی جب گیت سے باہر نکل گئی تو وہ خوشی سے جھومتی ہوئی اپنے دفتر میں آئی۔ اس نے نادرہ کی بناکی ہوئی تصویریں کو ایک ایک کر کے دیوارہ دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی فون کر کے محترم راؤ کو بلا لے اور یہ تصویریں دکھادے لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر رک گئی۔ اس نے طے کر لیا کہ افتتاح والے دن سے پہلے ایک دوسرے کے بارے انہیں ہوا نہیں لگنے دے گی۔

بس افتتاح والے دن وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ وہ لمحہ کس قدر حسین ہو گا۔

پھر اس سے اپنے دفتر میں نکالنے لگا۔ عام مدرسے دہ آرٹ گلری سے چار پانچ بجے اٹھتی تھی۔

دپھر کا کھانا اس کے لئے رستوران سے آتا تھا۔ جبکہ محسن راؤ ایک بجے رستوران سے اٹھ آتا تھا اور کھانا گھر پر کھاتا تھا۔ کھانا کھا کر وہ آرام کرتا۔ پھر شام کو تانیہ کے ساتھ چائے پی کر رستوران چلا جاتا اور رات گئے اور پس آتا۔

وہ گھر پہنچی تو محسن راؤ آچکا تھا۔ رفق میز پر کھانا جن رہا تھا۔ تانیہ کمرے میں داخل ہوئی تو محسن راؤ نے اسے خوٹگوار حیرت سے دیکھا۔ اور بولا۔ ”بھی، خیریت تو ہے۔“

تانیہ اس قدر خوش تھی کہ وہ اپنے بھائی کے گلے میں بانیں ڈالے بنا نہ رہ سکی۔ ”بھائی جان، پیرے پیارے بھائی جان۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا۔

”یا اللہ خیر..... آج تو بن بادل برسات ہو رہی ہے۔“

”آج میں بہت خوش ہوں، اتنی خوش کہ جانا میں سکتی۔“

”میرا خیال ہے کہ خاتون کچھ زیادہ ہی اچھی تصویریں لے کر آگئی ہیں۔“

”اف..... بس مت پوچھیں..... انہوں نے تو پاگل کر دیا اور جب آپ دیکھیں گے تو اپنے ہوش نو با بیٹھیں گے۔“

”تصویریوں کو دیکھ کر۔“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”تصویریوں کو بھی اور انہیں بھی۔“ تانیہ نے ایک اداۓ خاص سے کہا۔

”کوئی بہت خوبصورت خاتون ہیں کیا۔؟“

”بیں بھائی جان، مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔“

”چلیں نہیں پوچھتے۔ ہم خود دیکھ لیں گے۔ ہمیں آپ کی آرٹ گلری میں آنے کی اجازت تو اہنگ۔“

”اجازت کیا معنی۔ ان تصاویر کا افتتاح آپ کریں گے۔“

”ارے نہیں تانیہ..... لوگ کیا کہیں گے۔ بہن نے آرٹ گلری کھول لی، افتتاح بھائی صاحب کے ہاتھوں ہو رہا ہے اور ہا بائی ریوڑھی اپنے اپنوں کو دے۔ نا بھتی تا۔“

”بھائی جان لوگ جو مرضی آئے کہیں۔ مجھے کسی کی پروا نیں لیکن ان تصاویر کا افتتاح آپ کے ملا داہ کوئی نہیں کر سکتا۔ میں بس اتنا جانتی ہوں۔“

”پتھر نہیں بھتی تم کیا کہ رہی ہو۔ میرے خیال میں تم جسمیں بھوک لگ رہی ہے۔ اسی لئے اٹھ بیدھی باتیں کر رہی ہو۔ آؤ کھانا کھالو۔“

”کھانا تو آج میں ایسا کھاؤں گی کہ آپ دیکھتے رہ جائیں گے۔“

”یا اللہ..... میری اکلوتی میں پر رحم فرم۔“ محسن راؤ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اور پھر کھانا لانے میں مصروف ہو گیا۔

”بھائی جان، آپ کیا سمجھ رہے ہیں کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔“

”نمیں بھتی، بھالا میں ایسا سمجھ سکتا ہوں۔“

”میں واقعی پاگل ہو گئی ہوں۔ وہ آرٹسٹ تھی ہی ایسی۔“

نے کھولا۔ اس نے محسن راؤ کو دروازے پر دیکھ کر اسے سلام کیا۔ اور پھر تانیہ کی طرف دیکھا۔ جیسے ل کے حکم کی منتظر ہو۔

”صائمہ تم جاؤ اپنی دوستوں کے ساتھ نمائش دکھو۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہ صائمہ اندر کمرے میں چل گئی۔ اس کے ساتھ ہی محسن راؤ نے اندر آنے کے لئے قدم اٹھائے تو تانیہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر شوخی سے بولی۔ ”صبر را مبر۔“

استئنے میں صائمہ اپنی دوستوں کو لے کر کمرے سے نکل گئی۔ تانیہ نے کمرے میں جھانک کر بکھا۔ نادرہ خاموشی سے کری پیٹھی تھی۔ دروازے کی طرف اس کی پیٹھی تھی۔

”جایئے، بھائی جان..... اندر تشریف لے جائے اور ملے اس آرٹس سے جو اپنی ذات میں نہیں کارہے۔“

”تم میرے ساتھ آؤ۔“

”بھی نہیں..... میں تصویریں دیکھنے جا رہی ہوں۔ آپ کو اکیلے ہی اندر جانا ہو گا۔ ڈریں میں۔“

”ڈر کس بات کا۔“ یہ کہہ کر محسن راؤ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر باتی تانیہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا اور مسکراتی ہوئی نمائش والے حصے میں چل گئی۔ محسن راؤ بہت آہنگی سے کمرے میں داخل ہوا۔ نادرہ اس کی طرف پیٹھی کے پیٹھی تھی۔ جب دروازہ زور سے بند ہوا تو اس نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔

ایک بجلی سی ٹھیکی۔ بادل سے گریجے اور لوون پر یوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس طرح مل جاؤ گے کبھی، سوچا بھی نہ تھا۔ وہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر پلٹی تھی۔

جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اسے احسان ہوا جیسے ایک لمحے میں اس کی قسمت ہی پلانا کھا گئی ہو۔ لرے میں داخل ہونے والے خوبصورت شخص کو اس نے ایک سینٹ کے ہزاروں حصے میں بچان لیا۔ وہ اس کا محمن تھا۔

وہ ترپ کر اٹھی۔

محسن جب کمرے میں داخل ہوا تو اسے سب سے پہلے بالوں کا سادہ سا جوڑا، سفید بلاؤز اور نہ صورت کر نظر آئی۔ پھر وہ دروازہ بند ہونے کی آواز پر ایکدم پلٹی۔ اس کا پلٹنا غصب ہو گیا۔ یہ ل کی ٹکا ہوں نے کیا دیکھا۔ اس کے دروں پر کس نے دستک دی۔ یہ کون آیا۔ اس کو دیکھنے کے وقت کی گروئے اگرچہ دونوں کے نتوش کسی قدر دھنڈا ویئے تھے۔ لیکن مجت کرنے والے صرف چہروں سے ایکس و دسرے کو نہیں پچانتے۔ آکھوں سے زیادہ ان کے دل پکار اُٹھے نہ۔ محسن کا دل بھی پکارا اٹھا۔ ارسے یہ تو اس کی نادرہ ہے۔

”یا اللہ۔“ محسن راؤ نے اپنا سر تھام لیا۔ ”تانیہ، تمہیں اگر بھوک نہیں ہے تو کھانا مت کھاؤ لیکن مجھے تو کھانے دو۔“

”مجھے بھوک کیوں نہیں ہے۔ مجھے تو زبردست بھوک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کھانے پر اس طرح

افتتاح والے دن بھی لوگوں کا کچھ اسی طرح کا حال تھا۔ لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ تانیہ نے انکل عمار کو اعتماد میں لے کر انہیں افتتاحی تقریب کا انچارج بنا دیا تھا۔ وہ ایک مقابی کالج میں پوپ فر

تھے۔ وسیع تر تعلقات رکھتے تھے۔ انہوں نے اس تقریب میں لاہور کے منتخب لوگوں کو اکٹھا کر دیا۔

نادرہ کو تانیہ نے اپنے دفتر میں بخادیا تھا۔ اس کے ساتھ صائمہ اور اس کی دوست پیٹھی تھیں۔ پھر وہ دفتر کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ وقت مقررہ پر محسن راؤ پہنچ گیا۔ وہ ایک اوپنے قد کا گوری رنگت والا، حسین آدمی تھا۔ آج اس نے ڈارک براؤن سوٹ پن پن رکھا تھا۔ اس رنگ نے اس کی شخصیت کو اور نکھار دیا تھا۔

فیٹنہ کائنے سے پہلے چند کلمات عمار نے آرٹس کے بارے میں کہے۔ ”خواتین و حضرات! یہ تصاویر اور یکھ کر آپ تھوڑا سا جاگنکیں گے۔ یہ انوکھی تصاویر ہیں۔ فیض اقبال سے ان کا معیار کیا ہے۔ اس کا فیصلہ تو آرٹ کو بھینٹے والے کریں گے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ موضوع کے اعتبار سے آپ انہیں نیا پامیں گے۔ یہ ساری تصویریں تخلیقی ہیں۔ انہیں جن آرٹس خالقون نے تخلیق کیا ہے“ پر پوٹے کے پیچھے رہنا چاہتی ہیں۔ لہذا آپ فن ویکھنے اور چھپے فنکار کو داد دیتے ہیجے۔ اب میں محسن راؤ صاحب سے ورخواست کروں گا کہ وہ فیٹنہ کاٹ کر نمائش کا باقاعدہ آغاز نہیں۔“

تب تانیہ نے چاہدی کی پلٹ میں رکھی قیچی، اپنے بھائی کے سامنے کی۔ محسن راؤ نے مسکرا کر قیچی اٹھائی اور تالیبوں کی گونج میں فیٹنہ کاٹ دیا۔

جب محسن راؤ دوسرے لوگوں کے ساتھ اندر تصاویر دیکھنے کے لئے جانے لگا تو تانیہ نے بڑے پیارے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور سرگوشی میں بولی۔ ”تصویریں دیکھنے سے پہلے تصویر والی کو دیکھ لیجئے۔“ وہ محسن راؤ کا ہاتھ پکڑے پکڑے دفتر کی طرف بڑھی۔

”وہ خالقون موجود ہیں یہاں۔؟“ ”محسن راؤ نے پوچھا۔“

”بھی۔“ تانیہ نے جواب دیا۔

”لیکن وہ تو پوٹے کے پیچھے رہنا چاہتی ہیں۔“

”آپ سے کیا پردا..... ان کا پردا لوگوں سے ہے۔“ تانیہ نے عجیب بات کی۔ ”وکھو، تانیہ کمیں پڑوان دینا۔“ وہ پریشان ہو کر بولا۔

”ہے کسی میں اتنی جرأت جو میرے بھائی پر ہاتھ اٹھائے۔“ اپنے دفتر کے دروازے پر پکنچ کر اس نے دستک دی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازہ صائمہ

وہ ترپ کر آگے پڑھا۔ ”ناورہ، یہ تم ہو۔“

وہ بے اختیار اس کی باتوں میں سماں گئی اور روپڑی۔ ”ہاں، یہ میں ہوں، تمہاری ناورہ۔“
محن راؤ نے اسے خود سے الگ کیا۔ اس کی ٹھوڑی کو اپنی ووائکھوں سے اٹھایا۔ نادرہ کی کجراری
آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں اور آنکھوں کا کچھ پھیل گیا تھا۔

”ناورہ رو مت، ویکھو تمہاری آنکھوں کا کابل چھینے لگا ہے۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کسیں
گے؟“ چھوڑو محن، میں نے لوگوں کی بھی پروانیں کی۔ جب تم ہوتے ہو تو پھر کتنی نہیں ہوتا۔ میں
نے تو اپنے بابا جانی کی پروانیں کی۔ اپنے منگیر وقار کا خیال نہیں کیا۔ میں لوگوں کی بھلا کیا پروا
کروں گی۔“

”ناورہ، کیا تم ابھی تک میری ہو۔؟“ محن راؤ نے ایسا سوال کیا جل کا جواب انہیں دو
بھی کر سکتا تھا اور قریب بھی۔

”میں کل بھی تمہاری تھی، آج بھی تمہاری ہوں اور آئندہ بھی تمہاری رہوں گی۔ میں تو ابھی
دہیں کھڑی ہوں جہاں تم مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ کیا تم نے ابھی تک میری تصاویر نہیں دیکھیں۔“
ناورہ نے چیران لیج میں پوچھا۔

”نہیں ابھی کہاں، اس شریروںکی نے مجھے اندر جانے ہی کہاں دیا۔ مجھ سے افتتاح کرو کے
سیدھی بیساں لے آئی۔“ محن راؤ نے بتایا۔

”تیجھی تو، ورنہ تم مجھ سے یہ سوال کبھی نہ کرتے۔“ نادرہ نے بڑے یقین سے کہا۔
”آؤ، میں یہ نادرہ۔“ اس نے نادرہ کو کری پیش کی۔

”یہ لڑکی کون ہے محن؟ اس نے میرے ساتھ اس قدر پانیت کا سلوک کیا ہے کہ میں بتائیں
سکتی۔ پھر اس نے مجھے میرے تصاویر سے پہچان لیا جبکہ میں نے اپنا نام بھی غلط بتایا تھا۔“ نادرہ نے
وضاحت چاہی۔

”وہ تمہیں کیسے نہ پہچانتی، وہ تمہیں مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔“ محن راؤ نے توصیفی انداز میں
کہا۔ ”تمہارا اس سے کیا تعلق ہے۔؟“

”بہت قریبی تعلق ہے اس سے۔“ محن راؤ نے اپنی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”وہ میری
چھوٹی بہن ہے۔“

”آہ۔“ نادرہ نے ٹھنڈا اور گھرا سانس لیا۔ ”بہت پیاری ہے۔“
”ہاں، پیاری بھی اور شریروں بھی، نہ اس نے میرے بارے میں تمہیں کچھ بتایا اور نہ ہی تمہارے
بارے میں مجھے کچھ بتایا۔“

”محن، تم کہاں چلے گئے تھے۔؟“
”بیرون گا، ہر رہ بات بتاؤں گا جو تم جانا چاہوگی۔ فی الحال اتنا سن لو مجھے کسی نے انغواء کر لیا
تھا۔ میں صحرائیں قید تھا۔ یہ میری بہن تانیہ مجھے دہاں سے آزاد کرو کر لائی ہے۔“

”اچھا۔ کب آئے۔؟“

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“

”تم نے مجھے کوئی اطلاع نہیں دی، نہ تم میرے پاس آئے۔ کیا میں تمہیں یاد نہ آئی۔“
”ناورہ، میں تمہیں کبھی نہیں بھولا۔ میں ہواؤں کہ اتنے ہی کچھ الحجاجوں میں الجھ گیا۔ ایک
بھجن یہ بھی تھی کہ اتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ جانے کیا سے کیا ہو گیا ہو۔ ممکن ہے تم پہچانے سے یہ
انکار کرو۔ سوچتا رہتا تھا۔ دیسے ول میں یہ ارادہ بھی تھا کہ ایک مرتبہ بہرام گلر جا کر ضرور دیکھوں
گا۔ میں میں آئنے ہی والا تھا۔“

ناورہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر تانیہ مسکراتی ہوئی
اندر داخل ہو گئی۔

”اگر شصت صاحب، آپ بہاں برا جہاں ہیں اور لوگوں نے اوہر توصیف کے ڈنگرے بر سارے ہے
ہیں۔ تعریف پر تعریف ہو رہی ہے اور وہاں سننے والا کوئی نہیں۔“ پھر وہ محن راؤ سے مخاطب ہو کر
بولی۔ ”اور مہمان خصوصی صاحب لوگ آپ کو کوہ ہونڈ رہے ہیں کہ بندہ افتتاح کر کے کدھر کھک
لیا۔ اگر آپ دونوں کو زحمت نہ ہو تو نمائش میں تشریف لے چلے۔“

”اوہ، نادرہ، مجھے اپنی تصویریں دکھائو۔“

”ہاں، چلے نا۔“ نادرہ فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

ناورہ کیا مل گئی تھی، محن راؤ کی خزان زندگی میں بہار آگئی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال نادرہ کا تھا۔
ان نے ایک طویل عرصہ اس کی یاد بین اس کے انتشار میں گزار دیا تھا۔ جس وہ محن راؤ جگل میں
کم ہو گیا تھا، وہ وہ اس کی زندگی کا بدترین ورن تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی کا ایک حصیں نہیں مرتبت
کر لیا تھا۔ محن راؤ اپنے گھر لا ہو رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے والدین کو بہرام گلر لانا تھا۔
ناورہ کے بابا جانی راجہ بہرام گلر غیر حملک کی سیر کو گئے ہوئے تھے وہ چند دن میں واپس آنے والے
تھا اس نے اپنے والد سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ وقار سے شادی نہیں کرے گی اور راجہ
ماسب نے روانی پاپ بننے کے بجائے اس سے کہا تھا کہ وہ اس انکار کی وجہ انہیں دکھائے۔ نادرہ
نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی محن راؤ اپنے والدین کو بیساں لائے گا تو وہ اپنے انکار کی ”وجہ“ کو ان کی
ذمہ میں پیش کروے گی۔ اسے قوی امید تھی کہ اس کے بابا جانی اس ”وجہ“ کو فوراً قبول کر لیں
گے لیکن ایسا ہونہ سکا۔ آؤی سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ قسمت نے کچھ اور طے کر لیا تھا۔ محن راؤ
اپنے گھر جانے سے پہلے ہی جگل میں کہیں گم ہو گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس ون اسے پکارتی رہی
کہن کہیں سے اس کا جواب نہ آیا۔ بس پتھر پڑی اس کی قیص ملی اور آگے جا کر گھوڑا مل گیا۔ وہ
”ونوں چیزیں جگل سے لے آئی۔“

پھر وہ روز ہی جگل جانے لگی۔ جگل میں بھکتی پھرتی۔ لیکن اس کی ہر کوشت رائیگاں گئی۔ محن
اپنے ملنا تھا نہ ملا۔ اس کی پیچکی ہوئی قیص اس کے لئے کل متاع حیات بن گئی۔ وہ اسے آنکھوں
سے اگیج چومتی اور سوکھتی۔ اس قیص میں اس کا محن بسا ہوا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد راجہ بہرام گمر سیاحت کر کے واپس آگئے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو الجھا ہوا
گلر مند پایا تو وہ خود گلر مند ہو گئے۔ انہیں اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ وہ اسے کسی قیمت پر پریشان
نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اسے ہو پریشانی لائق تھی اس کامداوان کے پاس نہ تھا۔ اس پریشانی
حل تو خود نادرہ کے پاس بھی نہ تھا۔

کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد راجہ صاحب نے چاہا کہ نادرہ کی شادی کر دیں، لیکن نادرہ نے شادی
سے بحثی سے انکار کر دیا۔ حسن راؤ کے بعد اب کوئی اور اس کی زندگی میں نہیں آئتا تھا۔

راجہ صاحب نے اسے وقار سے شادی کرنے پر مجبور نہ کیا، لیکن وہ شادی کے لئے اصرار ضرور
کرتے رہے۔ اور پھر اصرار کرتے کرتے وہ چل بے۔ اتنی بڑی حوصلی میں وہ تمہارے گئی۔ لیکن اس
نے بہت نہ ہاری۔ بہرام گمر کا پورا انتظام بخیر و خوبی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ باپ کی زندگی میں ہو
سارا نظام کارندوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ اب بھی سارا انتظام انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ زمین
جاندار کی طرف سے اسے کسی قسم کی کوئی فکر نہ تھی۔

اب اس نے فلاجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ اس نے بہرام گمر اور اس
ملائے کے لوگوں کے لئے کئی پروجیکٹ شروع کئے۔ ایک بہت اچھا اسپیتال بنایا۔ کئی اسکول اور کار
قاوم کئے۔ غریب لڑکیوں کی شادی بیاہ کے اخراجات کا ذمہ خود لے لیا۔ بھلائی کے کاموں سے
اسے راحت ملتی۔ لیکن اس کے دل پر جو زخم تھا، وہ کبھی بھی اسے بے چین کر دیتا۔ تب اس
پینٹنگ کی طرف توجہ کی۔ ایک مشہور آرٹسٹ کو کئی ماہ بہرام گمر بلارکھا۔ اس آرٹسٹ نے یہاں
کی دیکی زندگی کو پینٹ کیا اور نادرہ کو بھی پینٹنگ سکھائی۔

لب پھر جب بھی وقت ملتا۔ جب بھی دل کا زخم ہرا ہونے لگتا۔ وہ اس زخم کے طور
پینٹنگ کرنے بیٹھ جاتی۔ اس طرح اس نے حسن کے نام پر ایک طویل زندگی گزار دی۔

حسن کی گکشیدگی اس کے لئے ایک معتمد تھی۔ دل میں چھان بن کر چھوٹی گئی تھی۔ ایک ٹیس تھی
جو درہ کر اٹھتی تھی۔ وہ کسی فلاجی کام میں مصروف ہوتی کہ اچاک ہی حسن کی یاد گھٹان بن کر دل
چھا جاتی۔ پھر اسے کچھ یاد نہ رہتا کہ وہ کہاں ہے، کیا کر رہی ہے، وہ ہوتی اور حسن کی باتیں ہوتیں۔
اس کی یادیں ہوتیں۔ کبھی وہ بست مایوس ہو جاتی کہ حسن اب کبھی واپس نہیں آئے گا اور کبھی اس
کے دل میں امید کے دیے جائیں۔ نہیں وہ ضرور آئے گا۔ یونہی زندگی گزرتی گئی۔

بالآخر اس کے نام پر جینے کی تپیارنگ لے آئی۔ وہ سپیل ہو گئی۔ اب اس کے چاروں طرف
رنگ ہی رنگ تھے۔ پھول ہی پھول تھے۔ خوبی خوبی تھے۔

وہ ایک احساس شاخزیر کے ساتھ آرٹ گیلری میں بیان دہان گھومتی پھر رہی تھی۔ حسن اس
ساتھ تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ کر حسن بہت متاثر ہوا، اسے اندازہ نہیں تھا کہ نادرہ اسے اس قدر
ڈوب کر چاہتی ہے۔ ہر تصویر میں نادرہ کی بے پناہ محبت موجود تھی۔ حسن راؤ ایک طویل عرصے
میں قید رہا۔ ایک طرح سے اس نے قید تھامی کاٹی۔ اس قید میں نادرہ اسے بے شمار بار بیاں آئی۔
لیکن اس یاد میں ترپ نہ تھی۔ پھر جب وہ صحراء سے واپس آیا تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ آئے وہ

بہرام گمر کا رخ کرتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اگر دل میں محبت کی شدت ہوتی تو وہ سب کچھ بھول کر بہرام
گمر دیکھ جاتا۔

حسن کو نادرہ سے محبت تو تھی لیکن اتنی نہیں بحثی نادرہ کو۔ اب آرٹ گیلری میں نادرہ کا رنگ
دیکھ کر اس کا جا چاہا کہ وہ اس کے قدموں میں بیٹھ جائے۔ اس کا داس بن جائے۔

اس دن تانیمی نے چاہا کہ نمائش کا وقت ختم ہونے کے بعد وہ نادرہ کو اپنے ساتھ ماذل ٹاؤن تے
جائے اور اس سے ساری رات باتیں کرے۔ نہ اسے سونے دے نہ خود سوئے۔ لیکن حسن راؤ نے
معن کر دیا۔ اس نے کہا کہ پسلے ہیں بہرام گمر جانا چاہئے۔ پھر اس کے بعد ہم اسے اپنے یہاں مدعو
کریں گے۔ بات معقل تھی لہذا تانیمی کو بجود رہا ماننا پڑی۔

دوسرے دن حسن اور تانیمی ناشتہ کر رہے تھے۔ تانیمی پڑھنے والوں کی باتیں کئے جا رہی تھی۔ وہ جلد
سے جلد بہرام گمر جانا چاہتی تھی۔ حسن راؤ کو خود قرار نہ تھا۔ لہذا دو دن بعد بہرام گمر جانے کا
پوگرام طے کر لیا گیا۔

انہی یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ سبقت نے آگر اطلاع دی۔ ”صاحب جی! آپ کا فون
ہے۔“ یہی ہے گفتگو چل ہی رہی تھی کہ سبقت نے آگر اطلاع دی۔ ”صاحب جی! آپ کا فون

”کون ہے۔“ حسن راؤ نے پوچھا۔

”وہ جی آصف صدیقی صاحب ہیں۔“ انسیں سبقت نے بتایا۔

”اے صبح صبح کیا ہو گیا۔“ حسن راؤ نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ پھر سبقت سے مخاطب ہو کر
ہلا۔ ”انہیں بتاؤ کہ میں ناشتہ کر رہا ہوں۔ انہیں تھوڑی دیر میں خود انہیں رنگ کرتا ہوں۔“

”بھی بھر۔“ سبقت نے کہا۔

”بھائی جان، یہ آصف صدیقی صاحب کون ہیں۔“ تانیمی نے پوچھا۔

”اوہ، میں نے تمہیں ان کے بارے میں بتایا نہیں، بھی وہ اسکوں کے زمانے کا دوست ہے۔

”یہ دن ہوئے اس سے اتفاقی طور پر ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی اپنے ریسٹوران میں۔“

”اچھا..... کس نے پہچانا؟“ تانیمی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”بھی پہچانا تو میں نے دو بندوں کو ریسٹوران میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں میں سے ایک
لڑ رہا تھا تو میں نے دو بندوں کو ریسٹوران میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان دونوں میں سے ایک
اوی آصف صدیقی تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس بندے کی شکل جانی پہچانی ہے۔ ذہن پر زور دیا تو یاد
ایکر یہ تو اپنا کلاس قیلو آصف ہے۔ کلاس میں ہم دونوں برابر برابر بیٹھتے تھے۔ اور ایک دوسرے
کے بہت اچھے دوست تھے۔ اس کی رہائش بھی ماذل ٹاؤن میں تھی ہم دونوں ایک وسرے کے گھر
اتے جاتے تھے۔ خیر میں نے گھر جانا فوراً متوقی کیا۔ ریسٹوران میں واپس آیا۔ وہ دونوں ایک میز
بینہ پکھے تھے۔ میں نے ان کے قریب سے گزتے ہوئے اس بندے کو بغور دیکھا جس پر مجھے
انف ہونے کا شہبہ تھا۔ میرا شہبہ یقین میں بدل گیا کہ وہ میرا دوست ہی ہے۔ ان دونوں نے مجھے
گھر دیکھا تھا۔ میں واپس لوٹا اور اپنے دفتر میں جا کر بینہ گیا اور سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح ملاقات

کی جائے۔ وہ کھانا کھانے آیا تھا۔ مجھے شرارت سمجھی میں نے ان کے کھانا کھا لینے کا انتظار کیا۔ اس اثناء میں، میں نے خود بھی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد انہوں نے کافی میگوائی۔ جو بیر انہیں اٹھنے کر رہا تھا، اسے میں نے ہدایت کی کہ جب وہ مل مانکن تو بل مجھ سے لے کر جائے میں نے ایک مل میگوائر رقم لکھنے کے بجائے اس پر ایک جملہ لکھ دیا، جب انہوں نے مل میگوایا تو بیر امیر سے پاس آیا۔ میں نے اس کی پیٹ میں مل ڈال دیا اور اس کو ہدایت کی جو صاحب سرخ ٹائی لگائے ہوئے ہیں ان کے سامنے جا کر یہ بل رکھے۔ اس پر اس کو ہدایت کی جو صاحب سرخ ٹائی لگائے ہوئے ہیں ان کے آصف نے اپنے ساتھ آئے والے شخص سے بے وصیانی میں بتائی کرتے اس مل پر نظر ڈال تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور کئی رنگ گئے۔ اس کی حالت غیر معمونی۔ اس نے غصے سے بیڑے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ کیا بکواس ہے۔“

بیڑے کو میں نے سمجھا یا تھا، وہ موبانہ انداز میں خاموش کھڑا رہا۔

”یہ کس نے لکھا ہے؟“ بیڑے کو خاموش دیکھ کر اسے اور غصہ آگیا۔ ”بولتے کیوں نہیں ہو۔؟“

”یہ ہمارے صاحب نے لکھا ہے جی۔“ بیڑے نے پڑے اطمینان سے جواب دیا۔ دراصل میں نے مل پر ایک ایسی بات لکھ دی تھی جسے پڑھ کر اس کا چراغ پا ہوتا تھا۔ میں نے مل پر لکھا تھا کہ اتنے بڑے ریستوران میں آخر کیا سچ کر کھانا کھانے آگئے ہو۔ تم اپنی اوقات کیوں بھول گئے۔

”کیا ہے، تمہارا صاحب ذرا مجھے اس کی صورت دکھاؤ۔“ آصف کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”میں ایسے چھ ریستوران خرید کر پھینک سکتا ہوں آخر اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔“ وہ غصے میں بھرا ہوا میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چچے وہ شخص بھی تھا جس کے ساتھ وہ کھانا کھانے آیا تھا۔ میں بڑے شہابہ انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے بڑی بینازی سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”جی، فرمائیے۔“

میرا چہرہ دیکھتے ہی وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اس نے مجھے چونک کروکھا۔ اور اپنی بانیں پھیلا کر میری طرف بڑھا۔

”اوے کہنے تو۔“ میں نے اسے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”تو آیا تو بڑے غصے میں تھا، پھر

آگے بڑھتے رک کیوں گیا۔ اندر کس ارادے سے آیا تھا۔“

”میں یہ ریستوران خریدنے آیا تھا۔“ آصف صدیق نے مکراتے ہوئے کہا۔ ”میں جیان تھا کہ مل پر یہ بکواس کس نے لکھی ہے۔ پچی بات یہ ہے کہ ایسا جملہ تو ہی لکھ سکتا تھا۔“

”پھر ہم دونوں نے بیٹھ کر پچھلی یادوں کو تازہ کیا۔ اسے میری گشادگی کا بابا سے معلوم ہو گیا تھا۔ وہ جب تک ماڈل ٹائون میں رہا۔ میرے گھر آتا رہا۔ پھر اس کے والدین شادمان منتقل ہو گئے۔ اور ہمیرے ملے کی آس بھی کم ہوتی گئی۔ اس کا آنا جانا بھی کم ہو گیا۔ پڑھ لکھ کر اس نے

پڑھا اور بولا۔ ”یہ کیا بکواس ہے۔“

”آپ کے دوست نے آپ کو ہیرو بنانے کی آفر نہیں کی۔“ تابی نے پہنچتے ہوئے کہا۔

”وہ کئی بار کہہ چکا ہے۔“ ”محسن راؤ نے سمجھی گئی سے جواب دیا۔

”بھائی جان، آپ فلموں کے چکر میں مت پڑ جائیے گا۔“ تابی نے فوراً تنبیہ کی۔

”اڑے نہیں تابی، مجھے ادا کاری سے دلچسپی ہے اور نہ فلم کے کسی ودرسے شجھے سے۔ مجھے تو مناظر فطرت سے لگاؤ ہے۔ ویسی زندگی اور کھلی فضا کا ولادہ ہوں۔ انشاء اللہ، ساون پور میں ایسی جعلی تیزی کروں گا کہ دنیا بھی گی۔“ ”محسن راؤ نے اپنی ولی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے

پھر وہ آصف صدیق کو فون کرنے کے لئے اٹھ گیا۔

فون ملنے پر محسن راؤ نے کہا۔ ”ہاں بھی، خیریت تو ہے۔“

”یار، آج شام کو کوئی مصروفیت تو نہیں۔“ آصف نے پوچھا۔

”نہیں، کیوں؟“

”پھر آج تو میرے وفتا آجا۔“ آصف نے کہا۔

”آجاؤں گا لیکن تیرے و فتر بھی تو کئی ہیں، کماں آؤں۔“ ”محسن راؤ نے پوچھا۔

”رائل پارک والے و فتر میں، وہی جگہ مناسب ہے۔“

”اُن بھائی کیا چکر ہے۔“

”یار، ایک شخص سے تجھے ملانا چاہتا ہوں۔ جب اسے معلوم ہوا ہے کہ تو اپس آگیا ہے۔ وہ

سے مٹے کے لئے بے جھیں ہے۔“ آصف صدیق نے بتایا۔

”یار، ایسا کون شخص ہے۔؟“

”اس نے اپنا نام جانانے سے منع کیا ہے۔“ آصف صدیق نے کہا۔

”تو تو اس سے اچھی طرح واقف ہے تا۔“ ”محسن راؤ نے پوچھا۔

اہ، میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سے اچھے تعلقات ہیں۔ اچھا آدمی ہے۔ ایک

طرح سے تو اسے میرا دوست سمجھ۔ ”آمف صدیقی نے اس شخص کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔؟“

”یہ بات تجھے وہ خوب ہتائے گا۔“

”عجیب شخص ہے وہ..... ہر بات راز میں رکھنا چاہتا ہے۔“

”ہاں، عجیب تو ہے لیکن عجیب کے ساتھ شریف بھی ہے۔“ آمف صدیقی مسلسل اس کی دو کال کے جاری تھا۔

”اچھا، تمیک ہے۔ میں شام کو پہنچ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے رسپورٹ کھو دیا۔ رسپورٹ کھو کر وہ واپس پلٹ رہا تھا کہ تانیس کمرے میں داخل ہوئی۔ تب وہ ویس بینٹ گیا۔ اس نے تانیس کو بھی بینٹنے کا اشارہ کیا۔

”خیریت تو تھی۔“ تانیس نے آمف صدیقی کی کال کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں، خیریت تھی..... کوئی شخص مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ملے سے پلٹ، نہ وہ اپنا نام جانا چاہتا ہے اور نہ کام۔“ محسن راؤ نے تانیس کو تھا۔

”پھر آپ نے کیا کہا۔“ تانیس نے پوچھا۔

”شام کو ملاقات کا وعدہ کر لیا ہے۔“

”پچھے نہیں کون شخص ہے؟“ تانیس نے تشیش بھرے لبھے میں کہا۔ ”ہاں گارڈ کے بغیر متوجہ ہے گا۔“

”پرشال کی کوئی بات نہیں ہے۔ آمف اس سے اچھی طرح واقف ہے۔“ محسن راؤ نے تانیس کو اطمینان ولایا۔

شام کو محسن راؤ، آمف صدیقی کے رائل پارک والے وفتر میں پہنچ گیا۔ یہ فلم ڈسرٹ یوشن کا وفتر تھا۔ جب وہ وفتر میں داخل ہوا تو آمف صدیقی کسی شخص سے کاروباری گفتگو میں مصروف تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر محسن راؤ کا استقبال کیا۔ سامنے بیٹھے شخص سے اس کا تعارف کرایا۔ محسن راؤ نے اس شخص کو غور سے دیکھا لیکن پہچان نہ پایا۔

”جی فرمائیے۔“ محسن راؤ نے اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

اس سے پلے کہ وہ شخص جواب دیتا، آمف صدیقی فوراً بولا۔ ”محسن جو تم سے ملنا چاہتا ہے،“ یہ نہیں ہیں۔ وہ شخص اندر بینٹا ہے۔ ”یہ کہہ کر اس نے اپنے اندر والے خاص کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس سے اندر جا کر مل لو۔“

محسن راؤ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اس نے بند دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اور محسن راؤ کی طرف تیزی سے لپکا۔

محسن راؤ ایک قدم پیچھے بٹا اور اپنے کوٹ کی جیب سے فوراً بیوالور نکال لیا۔ اور اس کی ہلیق

ناتھ ہوئے بولا۔ ”جمان سے اٹھے ہو فرا وہیں جا کر بیٹھ جاؤ۔ درنہ گولی چلا دوں گا۔“ وہ شخص وہیں رک گیا۔ تجھی آمف صدیقی اندر داخل ہوا اور اندر کی صورتحال ویکھ کر چیخا۔ ارے، محسن یہ کیا کر رہے ہو؟“

”آمف تم نے بہت بڑی حماثت کی ہے۔ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔“ ”ہاں، جانتا ہوں، میں نے تمیں بتایا تو تھا۔“

”یہ اٹھوڑھی کی اولاد ہے۔ کیا اس نے تمیں یہ بھی بتایا تھا۔“ ”محسن راؤ نے بیوالور بدستور اس نہ ہوا تھا۔“ یہ مجھے دیکھتے ہی سانپ کی طرح لپکتا تھا۔ میں اگر بیوالور نہ نکالتا تو یہ اب تک میرا م تمام کر چکا ہوتا۔“

”وہ شخص بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔ اس کے پھرے پر ذرا بھی گھبراہٹ نہ تھی۔“ ”محسن، یہ کیا بے وقفی ہے۔ یہ بیوالور فرا جیب میں رکھو۔ میں نے تمیں بلا یا ہے تو پچھے سوچ جی بایا ہو گا۔“ ”آمف صدیقی نے اسے ڈائٹ نہ ہوئے کہا۔“

”تم نے مجھے اس سانپ کا نام کیوں نہیں بتایا۔“ ”محسن راؤ بھی غصے سے بولا۔“ ”میں نے من کیا تھا۔“ اس مرتبہ وہ شخص بولا۔ ”اگر آپ کو میرا نام معلوم ہو جاتا تو آپ لامجھ سے ملے نہ آتے۔“

”اعتبار را، اب تمہارے باپ نے کون سا جال بھیکنے کے لئے تمیں بیان بھیجا ہے؟“ ”محسن نے تکھیکے لبھے میں کہا۔“

”مجھے ابا نے نہیں بھیجا مجھے تو ان کی صورت سے بھی نفرت ہے۔ ایسی بات کہہ کر میرا دل نہ لٹک۔“ ”اعتبار را وہ نہ بڑے سچے لبھے میں کہا۔“

”میں تم پر کیسے اعتبار کروں۔“ ”محسن راؤ شک و شبہ میں بدلتا تھا۔“ ”میں کب تم سے اعتبار کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اطمینان سے بیٹھ شکنے وال سے میری بات سن لو۔“ ”اعتبار را وہ نہ کہا۔“

”تمہارے پاس کوئی اسلحہ ہے؟“ ”محسن راؤ نے پوچھا۔“ ”میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔“ ”اعتبار را وہ اپنے دونوں ہاتھ کھول کر دکھائے۔“ ”میری اٹھ لیتا چاہو تو لے سکتے ہو۔“

”ہاں، میں تمہاری تلاشی ضرور نہیں گا۔“ یہ کہہ کر محسن راؤ آگے بڑھا۔ اس نے سیدھے فر سے اس پر بیوالور تانے رکھا اور بائیں ہاتھ سے اچھی طرح اس کے کپڑوں اور جسم کو کھنگا ل۔ اے اعتبار را وہ سچا تھا اس کے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہ تھا۔

تب محسن راؤ نے بیوالور اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور ایک کری گھیث کر اس سے مخاطب ہوتے ہے بولا۔ ”ہاں اعتبار را وہ کیوں کیا کہنا چاہتے ہو۔“

کمرے کی فضائیہ ہوتی دیکھ کر آمف صدیقی یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ”اچھا تم لوگ بات کرو۔“

”کتنے بچے ہیں تمہارے؟“

”بچے تو دور کی بات ہے، میں نے تو ابھی شادی بھی نہیں کی۔“ اعتبار راؤ نے اکٹھاں کیا۔

”اڑے کیل؟“

”میرے ابا کاروباری شادی کے قائل ہیں۔ لڑکی بے شک لویٰ لگنڈی ہو لیکن صاحب جاندے ہوں ہے۔ میں ایسی شادی پر راضی نہ ہوا۔ اس لئے میری شادی نہیں ہوئی۔ البتہ آنکھ بھائی اور لکی شادیاں ہو چکی ہیں دونوں زمیندار گھرانوں کی جاہل عورتیں ہیں۔ میرا تو اس حوالی میں دم نکلا تھا۔ ہر وقت مار دھاڑکی باتیں۔ اس کو اکھاڑا، اس کو پچھاڑا، چھل فریب ہر وقت زمینیں بڑھانے پہنچتا کھانے کی ہوس۔ محسن میں شروع ہی سے مختلف مزاج کا اننان رہا ہوں۔ ابا اور دونوں لئے مجھے ہر وقت طعنے دیتے تھے۔ یہ تو زمیندار لگتا ہی نہیں۔ زمیندار سے زیادہ مزاج لگتا۔“ محسن میں پوچھتا ہوں کیا زمینداری صرف ظلم اور دہشت کا نام ہے۔ پتہ نہیں لوگ کسی کو دکھ پا کر کس طرح خوش رہ لیتے ہیں۔“

”دیکھ لومٹاں تو تمہارے سامنے موجود ہے۔ تمہارے ابا نے ہمیں کونسا گھاؤ نہیں لگایا۔ پھر بھی ٹلی ہیں۔ آج تک ان کا بال بھی پکا نہیں ہوا۔“

”ایسا نہیں ہے۔ میں انھیں رات رات پھر حوالی کے چکر کافتا ہوا دیکھتا رہا ہوں۔ بعض اوقات میں پوری رات نینڈ نہیں آتی۔ پھر آنکھ بھائی اور اقبال میں ایک سرد جنگ جاری ہے۔ ادھر ابا اک لومزی بننے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے جیتے ہی جاندار تقسیم کرنا نہیں چاہتے اور ان کے مرنے کے نیک آثار نہیں۔ دونوں بھائیوں کو ہر ماہ بندھی لگی رقم ملتی ہے۔ دونوں بھائی اب ابا کے دست نہیں رہنا چاہتے۔ وہ خود مختار ہوتا چاہتے ہیں اور ابا زمین جاندار تقسیم کر کے اپنے ہاتھ کو نہانہ نہیں ہے۔ لیکن آخر کتب تک؟“

”کیا تم اپنے حصے کی زمینوں سے دست بردار ہو چلے ہو؟“

”نہیں، ہرگز نہیں..... ویسے میں تما آدمی ہوں۔ اب بھی میرے پاس جو کچھ ہے، وہ میرے ہم بتتے ہے۔“

”اعتبار راؤ یہ تو تم میرے بابا کی طرح باتیں کر رہے ہو۔“ محسن راؤ نے جیت کا اطمینان ”محسن، میں تمہارے بابا کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ میرے آئیندیں تھے۔ وہ جب بھی ساون پور تھے۔ بس میں ہی ان کے آگے پیچھے ہوتا تھا۔ یہ جان کر مجھے شدید صدمہ پہنچا ہے کہ وہ میرے ابا، ہاتھوں قتل ہوئے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں تم سے کس انداز میں تعزیت کروں۔ میرے بچ پنے تمہارے سامنے میری گردان جھکا دی ہے۔“

اس دن اعتبار راؤ حقیقی دیر بیٹھا رہا، بس اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ محسن راؤ اس کی باتیں پر آنکھ کر کے یقین نہیں کر لیتا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں حقیقت کی تو اس کی ہربات حرفاً بسچ نہ ثابت ہوئی۔ حوالی چھوڑے ہوئے اسے واقعی کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اس نے لکھی چوک کا

”میں باہر چلتا ہوں۔“

آصف صدیقی کے باہر جانے کے بعد اعتبار راؤ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور محسن راؤ کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں محنت موزیز تھی۔

”محسن راؤ، میرے بھائی، میں تم سے معافی کا طلب گار ہوں۔“ بالآخر وہ بولا۔

”کس بات کی معافی؟ تم نے کیا کیا ہے؟“ محسن راؤ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا لیکن میرے باب پر نے بہت کچھ کیا ہے۔ اسی کی معافی مانگ رہا ہوں۔“

”تمہارے باب پر نے میرے باب کی جاندار پر قبضہ کر لیا۔ اس نے میرے قتل کی سارش کی، اس نے میرے باب کو قتل کیا۔ آخر میں کس کس بات کو معاف کروں۔“ محسن راؤ کا الجھ تھا ہو گیا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو، تایا کو اپانے قتل کیا لیکن انہوں نے تو خوب کشی کی تھی۔“

”میرے بابا کو بھلا خود کشی کرنے کی کیا ضرورت تھی، ایسا پاکیزہ فس انسان بھلا خود کشی کیوں کرے گا۔ انہیں مارا گیا اور انہیں مارنے والا تمہارا باب تھا۔ جمارے گھر کا پرانا ملازم عبدالاس راز سے کسی حد تک واقف تھا لذت اسے بھی یوں کے ساتھ ختم کروادیا گیا۔ تاکہ کسی قسم کا کوئی گواہی نہ رہے۔“ محسن راؤ نے بتایا۔

”خدا کی قسم، میں اس بات سے واقف نہیں۔“ اعتبار راؤ کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

”ابھی حال ہی میں، میں نے اپنا ایک آدمی ساون پور بھیجا تھا۔ تمہارے باب کے نام ایک خدا رہا تھا۔ اس آدمی کا جو حشر کیا گیا۔ کیا تم اس سے بھی واقف نہیں ہو۔“ محسن راؤ نے اسے پھر گھیرا۔

”بس اتنا جانتا ہوں کہ کوئی شخص تمہارا خط لے کر ساون پور گیا تھا۔ اس آدمی کے ساتھ کیا کیا، یہ میں نہیں جانتا۔“

”کیا تم ساون پور میں نہیں رہتے۔“

”نہیں، مجھے تو ساون پور چھوڑے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ میں پلا فرو تھا جس نے ابا سے جاندار کی تقسیم کی بات کی۔ انہوں نے جاندار تقسیم کرنے سے انکار کر دیا لیکن مجھے اتنی رقم فراہم کر دی کہ میں نے لاہور آکر ایک سینما خرید لیا۔ اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا تقسیم کار اداوارہ کھول لیا۔ اسی سلسلے میں آصف صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ پھر یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ جب مجھے ساون پور کی حوالی سے یہ خرغلی کہ تم لوٹ آئے ہو تو میں تم سے ملنے کا سوچتا رہا۔ اسے اتفاق ہی کہ چاہئے کہ آصف صدیقی تمہارا بچپن کا دوست نکل آیا اور میرے بار بار کے اصرار پر بالآخر وہ تم سے ملاقات کرانے پر راضی ہو گیا۔“

”تم یہاں کہاں رہتے ہوئے؟“

”میں سمن آباد میں رہتا ہوں۔“

ہدایت اللہ واقعی خوش نصیب انسان تھا۔ وہ ایک زمانے میں نادرہ کا ذرائعیور تھا۔ تھوڑا بہت پڑھا تھا۔ نادرہ کے اعتقاد کا آدمی تھا۔ لذاجب راجہ صاحب کا استقالہ ہوا تو اس نے گڑھی کی دیکھ ل کے لئے اسے گمراں مقرر کر دیا۔ وہ ایک طرح سے اس کا پاریمیت سیکرٹری بھی تھا۔ اس سے ت لئے بغیر کوئی نادرہ سے نہیں مل سکتا تھا۔

لیکن محسن کا معاملہ دوسرا تھا، اس سے مٹے کے لئے وہ خداوس کے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ ہر کار پر تکلف کھانا کھا کر محسن راؤ کچھ دیر آرام کی خاطر لیٹ گیا تھا۔ شام کے وقت جب اس کے ازے پر دستک ہوئی تو اس نے سمجھا کہ تانیہ ہو گی۔ اس نے بیڈ پر لیٹے لیئے ہی آواز لائی۔ اباؤ بھائی..... کون ہے؟“

جب دروازہ کھلا تو سب سے پہلے اسے ٹرے نظر آئی۔ پھر جن ہاتھوں میں ٹرے تھی، وہ نظر ہے۔ محسن راؤ فوراً بیڈ سے اٹھ کر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ ”ارے، نادرہ آپ نے کیوں رحمت

”میرا جی چالا کر اپنے ہاتھوں تمہیں چائے پلاوں۔“ نادرہ دلفرب اندماز میں مسکرانی۔ ”تانیہ کمال ہے؟“ محسن راؤ نے پوچھا۔

”میں نے اس کی کپنی کے لئے اپنے اسکول کی دو ٹیپوں کو بیالا یا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بیت بازی مگن ہے کیا اسے بلوادیں؟“ نادرہ نے پوچھا۔

”بے وقوف ہوئی ہو، اسے ادھر ہی لگا رہنے دو۔“ محسن راؤ نے اسے گھری نظردوں سے دیکھا تو س کی نظردوں کی تاب نہ لاسکی، اس نے فوراً نظریں جھکالیں۔ ”آخر ہمیں بھی تو بت کرنے کا، چاہئے۔“ وہ بہنا۔

”ایسی لئے تو آئی ہوں، تمہارے پاس۔“ نادرہ نے صاف گوئی سے کہا۔

”لاو، چائے کی ٹرے مجھے دو، میں بناوں تمہارے لئے چائے۔“

”جی نہیں شکریہ..... میں مردوں کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے نہیں پیتی۔“ نادرہ نے اسے اپنی ہوت چکتی آنکھوں سے دیکھا اور فی کوزی ہٹا کر کیتنی سے چائے نکالنے لگی۔ اس کے ہونتوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔

محسن کو اس کی یہ ادامت اچھی لگی۔ اس نے کیتیل والا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”تم اس قدر پیاری ہو؟“

”ارے، ارے..... ہاتھ چھوڑیں۔ چائے گر جائے گی۔“

”گر جانے دو۔“

”پلیز محسن۔“ نادرہ نے انتباہ کی۔ تب محسن راؤ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اور وہ نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا۔ پھر پر تشویش لجھ میں بولی۔ ”محسن تم جنگل میں گم ہو گئے تھے۔“

”ہاں، نادرہ میں تمہیں پوری کمائی ساتھا ہوں۔ اب یہ تمہاری مرضی کہ اس کمائی پر یقین کرنا یا ن۔ لیکن مجھ پر جو بیتی ہے وہ حرف بہ حرفاً نادرہ گا۔ اگرچہ تانیہ اور میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ

ایک سینما خرید لیا تھا۔ ایک چھوٹا سا تقسیم کا ردارہ کھول لیا تھا۔ یہ دونوں باتیں صحیح تھیں۔ اس کی رہائش سمن آباد میں تھی اور وہاں وہ ایک ملازم کے ساتھ رہتا تھا۔ کوئی اور نیلگوں کا نمبر دونوں محسن راؤ کے پاس تھے۔ آسف صدیقی نے اس کی شرافت کے گھن گائے تھے۔ انکل عامر بھی تھوڑا بہت اس کے بارے میں جانتے تھے انہوں نے بھی اس کے مختلف ہونے کی گواہی دی تھی۔

گھر کا بھیدی لکھا ڈھانے لکھا تو یہ کوئی تجھ بخیر بات نہ تھی۔ شریفوں کے ہاں نیک اور نیکوں کے ہاں بد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اللہ جب چاہتا ہے فرعونوں کے ہاں مویں کی یروش کراویا ہے۔

تانية، بہرام نگر جانے کے لئے بے چین تھی۔ اس نے نادرہ کے لئے ڈھیروں تھے خرید لئے تھے۔ ان دونوں میں کئی مرتبہ اس سے فون پر بات کر لی تھی۔ اسے ہتھ بھی دیا تھا کہ وہ کب بہرام نگر پہنچے گی۔ نادرہ کو خیال آیا کہ کیونکہ محسن راؤ نے کبھی لاہور سے بہرام نگر کا سفر کیا نہیں ہے، اس نے اسے وہاں تک پہنچنے میں ضرور وقت ہو گی۔ اس کی آسانی کے پیش نظر نادرہ نے اپنی جیپ پہنچ دی تھی۔ اس طرح وہ نادرہ کی جیپ کی رہنمائی میں بآسانی بہرام نگر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں تو وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔

جب دونوں گاڑیاں گڑھی بہرام نگر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں تو وہ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس کی بے قراری کا عجیب عالم تھا، وہ کمی مرتبہ کھڑکی کے چکر کاٹ پچھی تھی۔

محسن راؤ جب راجہ ماری کی قید سے نکل کر پہلی مرتبہ گڑھی بہرام نگر پہنچا تو بھی نادرہ کی بے قراری کا یہی عالم تھا۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں گزاری تھی۔ یہ رات بھی اس نے آنکھوں میں گزاری تھی۔ برسوں پہلے کی ملاقات کا ایک مسئلہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح گزر رہا تھا۔ وہ اس دن اس سے رخصت ہو کر لاہور جانے والا تھا۔ اس نے کما تھا کہ وہ جاتے ہی اپنے والدین کو لے کر یہاں آئے گا۔ لیکن وقت نے اسی کروٹ بدی کہ ہر چیز تھس نہس ہو کر رہ گئی۔ اس کے دل میں ایسا طوفان اٹھا جو امتحانی چلا گیا۔ اور ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔

آج محسن پھر آرہا تھا۔ اس نے اپنا برسروں پرانا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کے والدین نہ رہے تھے لیکن اب گھر میں جو تھا، وہ اسے لے کر گڑھی بہرام نگر پہنچ چکا تھا۔

وہ گاڑیاں دیکھتے ہی اور پرکی منزل سے فوراً پہنچ آگئی۔ اور گڑھی کے دروازے پر اس نے تانیہ اور محسن راؤ کا استقبال کیا۔ محسن اور نادرہ کی اس گڑھی پر یہ دوسری ملاقات تھی۔ اس دوسری ملاقات پر پہلی ملاقات کی ایک ایک بات دونوں کو یاد آرہی تھی۔

نادرہ کے ساتھ استقبال کرنے والوں میں ہدایت اللہ بھی تھا۔ محسن راؤ کو دیکھ کر اس نے بتا دب سے جھک کر سلام کیا اور نظریں پیچی کر کے، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ محسن راؤ کی اس پر نظر پڑی تو اس نے اسے فوراً پہچان لی۔ اگرچہ گزرے ہوئے وقت نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں۔

”ہدایت اللہ، کیسے ہو؟“ محسن راؤ نے اس سے مصالحتے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”صاحب جی، آپ کو میرا نام بھی یاد ہے۔ میں کس قدر خوش نصیب انسان ہوں۔“

یہ عجیب و غریب واقعات کسی کو نہیں سنائیں گے۔ لیکن تمہاری بات اور ہے۔ تم کسی نہیں ہو۔"

یہ کہ کہ محسن راؤ نے ہر دو بات بتا دی جو صحرائیں اس پر اور تانیہ پر بیتی تھی۔ سارا قصہ سن کر نادرہ دم بخود رہ گئی۔ وہ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی، ایک نک اسے دیکھا۔ یہ کسی ہوش رہا دشمن تھی۔ تاقابل یقین..... لیکن یہ سب اس کے محبوب پر بیتی تھی۔ وہ اسے کیسے جھٹا دیتی۔ پھر تانیہ کی صورت میں ایک گاؤہ بھی موجود تھا۔

"کیا ہوا؟" محسن راؤ نے اسے اس طرح سکتے میں دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لرا یا۔

"اللہ کا شکر ہے محسن کہ جسمیں اس صحرائی قید سے نجات مل گئی، نہ صرف نجات مل گئی بلکہ تم صحیح سلامت بھی واپس آگئے۔ اگر تمہارا چڑھ دیکھ زدہ ہو جاتا تو کس قدر مشکل پیش آتی۔"

"مشکل کیا، میری تو زندگی عذاب ہو جاتی۔ میں بس اس دیکھ زدہ چڑھے کو چھپائے چھپائے پھرتا۔" "محسن راؤ نے ٹھینڈا سماں لے کر کما۔

"اچھا، چھوڑو، اس قھتے کو جو ہوتا تھا ہو چکا۔ آؤ، چلو باہر نکلتے ہیں۔ تھوڑی سی گھٹ سواری ہو جائے۔" نادرہ کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ "میں گھوڑے کسواتی ہوں۔ تم جب تک لباس تبدیل کر لو۔"

"ہاں، میرا جی بھی کھٹ سواری کو جاہ رہتا تھا۔ ایک طویل عرصہ ہو گیا کھٹ سواری کئے۔ ہاں تمہارے ساتھ ہی تو کی تھی چلو نہیں۔ ذرا کھلی فضائیں چلتے ہیں۔" "محسن راؤ نے کہا۔

پھر کچھ دیر بعد جب وہ دونوں گڑھی سے باہر نکلے تو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ دونوں سفید رنگ کے گھوڑے تھے۔ محسن اور نادرہ دونوں گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ تانیہ حولی کے دروازے پر موجود تھی۔ سفید گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے وہ دونوں تانیہ کو بہت اچھے لگے۔ اس نے فروآن کی درازی عمر کی دعا کی۔ اور اس وقت تک گڑھی کے دروازے پر کھڑی رہی جب تک وہ بڑے دروازے سے باہر نہیں نکل گئے۔

کچھ دیر تک وہ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ پھر جب ذرا کھلا علاقہ آگیا تو محسن راؤ نے کہا۔ "کیا خیال ہے جنگل کی طرف چلیں۔؟"

محسن راؤ کی آپ بیتی سن لیئے کے بعد وہ جنگل کی طرف رخ کرنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ میسیت دیہیں سے شروع ہوئی تھی لیکن محسن راؤ کی خواہش کے احرازم میں وہ چپ ہو گئی۔ پھر وہ خوفزدہ ہونے کا تاثر بھی نہیں دیتا چاہتی تھی لہذا اس نے فروآن کما۔ "چلیں۔"

تب پھر دونوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڈ لگائی۔ دونوں گھوڑے جو سے باتیں کرنے لگے۔

جنگل میں داخل ہو کر وہ گھوڑے دروازے اس مقام پر پہنچ گے جہاں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ "ج

جب اس چبوترے پر اس کی نظر پڑی تو وہ ایک دم خوفزدہ ہو گیا۔ خوفزدہ کیا چبوترے پر اس نے جو کچھ دیکھا، اسے دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا جنم سخت روئی کے باوجود پیٹے میں بھیگ گیا۔

سامنے چبوترے پر پیٹوں پنج ایک آٹھ، ایک ناٹک پر کھڑا تھا۔ اور اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔

اسے دیکھتے ہی محسن راؤ نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا اور نادرہ سے مقابلہ ہو کر بولا۔ "نادرہ، ہاگو۔"

نادرہ نے بھی اس الٹو کو دیکھ لیا تھا، اسے دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے فوراً اپنے رڑھے کی لگام کھینچی اور اس کا رخ مرتے ہی اس نے جلدی اپنے لگائی۔

دونوں گھوڑے بنت محفوظ طریقے سے جنگل سے نکل آئے۔ جنگل میں درختوں کی وجہ سے میں دوڑنے میں وقت پیش آرہی تھی۔ جنگل سے نکل کر جیسے ہی کھلا اور صاف علاقہ آیا، وہ رڑھے سرپیٹ دوڑنے لگے۔

محسن اور نادرہ نے گڑھی کے بڑے دروازے پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ بڑے دروازے سے گڑھی کی مل عمارات کافی فاصلے پر تھی۔ اندر ایک دسیع و عریض باغ تھا۔ محسن کو دور ایک لان پر تانیہ بیٹھ نہ کھلتی ہوئی وکھائی دی۔ وہ دونوں دروازے پر گھوڑوں سے اتر گئے۔ گیٹ پر موجود ملازموں نے نوں گھوڑے تھام لئے۔

محسن اور نادرہ نے تانیہ کی طرف رخ کیا۔ راستے میں نادرہ نے پوچھا۔ "محسن، یہ کیا

"پچھے نہیں کہہ سکتا میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آرہا۔" محسن الجھن میں جتنا تھا۔

"کسی الٹو کو ایک ناٹک پر کھڑا، میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ کیا وہ اُٹو لکڑا تھا۔"

"اللہ، بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا چیز تھا۔" محسن راؤ ابھی تک پریشان تھا۔ "ہم سے غلطی ہو گئی، جنگل کی طرف نہیں جانا چاہئے تھا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے تانیہ تک پہنچ گئے۔ تانیہ نے ان دونوں کو بیٹھ منش کھیلنے کی پیشکش پکھ دیں۔ وہ ان دونوں نے بیٹھنے کھیلی۔ ول نہ لگا تو وہ گوڑھی میں آگئے۔

محسن راؤ رات کے کھانے سے پہلے اپس جانا چاہتا تھا لیکن نادرہ نے اسے اصرار کر کے روک رات کے کھانے کے بعد وہ تیوں بہت رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ صبح دیر سے اٹھے۔

ماہجے ہاشت کرنے کے بعد محسن راؤ نے نادرہ سے اجازت چاہی۔ اور اپنی گاڑی میں لاہور کا رخ نادرہ انہیں بڑی سڑک تک رخصت کرنے آئی۔

"نادرہ، اب تم کب لاہور آؤ گی۔" محسن راؤ نے پوچھا۔

"لاہور تو میرے لئے گھر آگئن سا ہے، میں جاتی رہتی ہوں۔"

"ہمارے گھر کب آئیں گی۔" اس مرتبہ تانیہ نے مداخلت کی۔ "لاہور تو خیر سے آپ آتی

”جلد ہی آؤں گی۔ میں وہاں پہنچ کر تمیں فون کروں گی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ آپ کی سماں نوازی کا بہت شکریہ، اللہ حافظ۔“

”جاتے جاتے شرمندہ کر کے تو نہ جائیں۔“ نادرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے تانیہ کو گلے لگایا۔ تانیہ جلدی سے گاڑی میں جائیٹھی تاکہ ان دونوں کو بات کرنے کا موقع مل جائے۔

”میں، آپ ہمیں بھی ایسے ہی رخصت کر دیجئے۔“

”وہ کس طرح۔“

”جیسے تانیہ کو رخصت کیا ہے۔؟“ وہ شرارت سے بولا۔

”فضل باشیں نہ کریں۔“ نادرہ نے تانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو گاڑی میں بیٹھی محسن کا انتظار کر رہی تھی۔ ”جائیں وہ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔“

”اچھا، اللہ حافظ۔“ محسن راؤ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری آمد کا منتظر ہوں گا۔؟“

”محسن، تمیں، وہ میں یاد ہے۔“

”ہاں، یاد ہے..... تیکن اس وقت تمیں وہ میں کیسے یاد آگیا۔“

”ایسے ہی..... آئندہ جب تم آؤ گے تو ہم وہاں چلیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”اچھا۔“

محسن راؤ نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”واہ، کیا حسین ہاتھ ہے تمہارا۔“ نادرہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مسکرا کر بولی۔ ”الله حافظ۔“

پھر دونوں گاڑیاں مختلف سمتیں میں روائہ ہو گئیں۔

نادرہ گڑھی برام گر پہنچی تو اسے اپنی گڑھی دیران ویران کی گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سب کچھ محسن راؤ کے ساتھ چلا گیا ہو۔ نادرہ کا گڑھی میں دل نہ لگا، وہ دوسرے دن ہی لاہور کے لئے روائہ ہو گئی۔

گلبگ میں نادرہ کے رشتے کے چچارہتے تھے۔ وہ ایک بھرا پا گھر تھا۔ اس کا اس گھر میں بہت دل لگتا تھا۔ وہ اکشہ لاہور آتی رہتی تھی۔ چچا کا تو کافی عرصہ ہوا مقابل ہوچکا تھا۔ گھر میں اب پہنچتی تھیں۔ اس کے چچا زاد بھائی اور بھین تھیں۔ ایک چھوٹی بیٹی کے سواب سکی شادیاں ہو چکی تھیں۔

چچی اور چچزاد بھائی اسے ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ لاہور پہنچ کر اس نے سب سے پہلے تانیہ کو فون کیا۔ نادرہ کی آواز سن کر تانیہ جھوم گئی۔ ”خوش ہو کر بولی۔“ ”کہاں سے بات کر رہی ہیں آپ۔“

”تمہارے شر سے۔“ نادرہ نے بتایا۔ ”لاہور پہنچ گئی ہوں۔“

”اچھی خبر ہے، بھائی جان سین گے تو خوش ہو جائیں گے۔“

”تم اپنی کو۔“

”میں اپنی کیا کھوں۔ میرا تو بھی چاہتا ہے کہ آپ کو کہیں جانے ہی نہ دوں۔“

”اچھا۔“ نادرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”آج کا کیا پروگرام ہے۔“

”آپ گھر آ جائیں ہمارے۔ کہیں تو گاڑی بیچ جو دوں۔“

”گھر آتا کوئی مسئلہ نہیں، گاڑی ہے میرے پاس۔“ نادرہ نے کہا۔ ”میں کچھ اور سوچ رہی“

”وہ کیا؟“ تانیہ نے پوچھا۔

”آج ایک زردست فلم میلزی ہوئی ہے۔ کیوں نہ اس کا پہلا شو دیکھ لیں۔ مجھے فلم دیکھے ایک عرصہ ہو گیا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بھائی جان سے اجازت لے لیتی ہوں۔ آپ آ جائیں۔“ تانیہ نے کہا۔

”ہاں..... رات کا گھانا آپ کو ہمارے ساتھ کھانا ہو گا۔“

”منظور۔“ نادرہ نے چک کر کہا۔

لم کا پہلا دن اور پہلا شو تھا۔ سیناپر زردست رش تھا۔ لیدیز کی کھڑکی پر اچھا خاصارش تھا۔ وہ

اکھڑکی کے پاس کھڑی ابھی یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ کیا کرنا چاہئے۔ پہ نہیں انہیں نکٹ بھی

کا یا نہیں کہ ایک شخص ان کے نزدیک آیا اور بہت موبانہ انداز میں بولا۔ ”میں اس سینما کا دل۔ آپ یہاں کہاں کھڑی ہیں۔ میرے دفتر میں آجائیے۔ میں دیتا ہوں، آپ لوگوں کو“

”تانیہ اور نادرہ نے پہلے اس شخص پر نظر ڈالی۔ وہ انہیں ایک معقول اور مستقر شخص نظر آیا۔ پھر

مانے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نادرہ نے سمجھا کہ شاید اس نے راجہ برام گر کی بیٹھی کی حیثیت سے پہچان لیا ہے۔ تانیہ نے یہ جانتا کہ اس کے بھائی محسن راؤ کی وجہ سے ان پر یہ عنایت کی گئی۔

بڑھاں انہیں فلم کے دل نکٹ چاہئے تھے جو انہیں پورے احترام کے ساتھ عطا کئے جا رہے تھے۔

”انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔“

”اوونوں فیجر کے ساتھ چل پڑیں۔ ایک کونے میں فیجر کا دفتر تھا۔ وہ دنوں کو اپنے ساتھ لئے اگل ہوا، اس نے بہت ادب سے ان دنوں کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر بڑے سے پوچھا۔ ”آپ لوگوں کے لئے کیا منگواؤں۔ چائے یا مہنڈا۔“

”جناب اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں نکٹ مل جائیں۔ یہی ہمارے لئے بہت ہے۔“

”نہ شخص نہ مانا اور اس نے منع کرنے کے باوجود ٹھنڈا منگوالیا، جو انہیں مجبور آپنی پڑا، اتنی دری رکیاں کھل گئیں، نکٹ تھیں ہونے لگے۔ نادرہ نے اپنے پرس سے پیسے نکال کر فیجر کی طرف ٹھیک ہیں۔“

”لیکن اس نے پیسے لیئے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”پیسے دے کر مجھے الجھن میں نہ آئیے۔ میں آپ کو آپ کی سینوں تک چھوڑ آؤں۔“

”بڑھ دنوں ہاں میں اخیل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ پورا ہاں خالی پڑا ہے۔ انہیں ہاں میں میں بھی اویسیت دی گئی تھی۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد دوسرے فلم بیوں کے لئے ہاں کھولا گیا۔“

اور دیکھتے ہی دیکھتے ہاں کی تمام سیلیں بھر گئیں۔
نادرہ اور تانیہ آخری وقت تک حیران پریشان رہیں۔ اس سینما ہاں پر انہیں جو دی کی تھی مٹتی دیا گیا تھا وہ ان دونوں کی سمجھ سے باہر تھا۔

بہرحال میشی شود کیجھ کرو وہ دونوں جب گھر پہنچیں اور محن راؤ سے سارا ماجرا یہاں کیا تو اس نے سب سے پہلے سینما ہاں کا نام پوچھا تانیہ نے سینما ہاں کا نام بتایا۔ محن راؤ نے سینما ہاں کا نام کر پڑے میں خیر انداز میں سرہا یا۔
”کیا ہوا بھائی جان۔؟“

”اس سینما کا ماں اک اعتبار راوے ہے۔“ محن راؤ نے اکشاف کیا۔
”اوہ، مائی گاؤ۔ تجھی تو میں کہوں کہ آخر اس قدر اہم تھے والا شخص یہاں کون ہے۔؟“
”کیا وہ تم لوگوں کے سامنے آیا تھا۔“

”نہیں۔“ تانیہ نے کہا۔

”کیا تم اسے بچاتی ہو..... ہو سکتا ہے کہ شیر کے روپ میں وہ خود ہی ہو۔“
”نہیں، وہ شیر ہی تھا۔ میں نے انہیں میں ببا کے انتقال پر دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی میں انہیں پہچان لوں گی۔ دونوں بھائیوں کے مقابلے میں ان کا چڑھہ بالکل مختلف ہے۔“

”کیا مطلب۔“ نادرہ نے پوچھا۔

”مطلوب یہ کہ آفتاب راؤ اور اقبال راؤ کے چہوں سے ایسی خلاشت تھی ہے جبکہ اعتبار راؤ کا فیض ٹھاٹا سو فٹ ہے۔“ تانیہ نے اپنی بات کیوضاحت کی۔
اسوضاحت پر نادرہ نے محن راؤ کو دیکھا اور وہ دونوں جانے کیا سوچ کر دھیرے سے مکرا دیئے۔ تانیہ ان دونوں کو مکرتا ہوا دیکھ کر کچھ ابھی میں پڑ گئی۔
”کیا ہوا، کوئی غلط بات کہہ دی میں نے۔“ وہ بولی۔

کہا۔ ”نہیں..... دراصل ہم دونوں تمہاری چہرہ شناش کی داد دے رہے تھے۔“ محن راؤ نے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تانیہ زردست چہرہ شناس تھی۔ کیونکہ بہت حساس تھی۔ اس لئے کسی بھی شخص کو ایک نظر دیکھ کر اس کے بارے میں اچھی یا بُری رائے قائم کر لیتی تھی۔ انسان کا چہرہ اس کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور یہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بس آئینہ دیکھنا آنا چاہئے۔
تانیہ کی اپنی زندگی آئینے کی طرح شفاقتی۔ اس نے بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ سب سے بڑا دکھ تو یہ تھا کہ وہ باپ کے ہوتے ہوئے باپ کی خفقت سے محروم رہی۔ چچا کے ظلم سے۔ صراحت طوفانوں سے کھلی۔ ایک کے بعد ایک آزمائش آتی گئی۔ اور ان آزمائشوں سے گزرتے ہوئے اسے اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔

اب زندگی نے اسے تھوڑی سی فرصت دی تھی۔ رات کو بید پر لیٹ کر کروٹیں بدلتے ہوئے اس کے تصور میں راشمن آ جاتا تھا اس کی دی ہوئی حسین کلی وہ کراچی سے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

پہاں اس نے کرٹل کا بہت خوبصورت اور ناٹک سا گلدن خریدا تھا۔ اس گلدن میں وہ کلی سجادی فی اور اس گلدن کو بید کی سائینڈ نیل پر رکھ دیا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں اختنے بیٹھتے اس پر نظر پڑتی تھی۔ اس گلاب کی کلی کی تازگی اور خوبصورت کوئی فرق نہیں آیا تھا حالانکہ صحراء آئے اچھا ناما وقت ہو گیا تھا۔

وہ اس کلی پر اگر نظریں جھاتی۔ ایسے ہی اسے دیکھ لئی تو راشمن کا چڑھہ اس کی نگاہوں میں بہرے لگتا ہے کس قدر سچا چڑھہ تھا۔ اسے واقعی تانیہ سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن تانیہ کیا کرتی، اس کی محبت کا جواب محبت سے کس طرح دیتی۔ ایک تو اسے وہاں سے لٹکنے کی جلدی تھی۔ دوسرے وہ جاتی تھی کہ راشمن انسان نہیں ہے۔ وہ اس کی دنیا میں رہ سکتی ہے اور نہ وہ اس کی دنیا کا ہو سکتا ہے۔ پھر پیار پڑھانے کا فائدہ۔؟

اب اس کی نگاہیں اس دنیا کے راشمن کو ڈھونڈنے لگی تھیں۔
تب ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

تانیہ کی زندگی میں پہلے ہی انوکھے واقعات کیا کم تھے کہ ایک اور واحد رونما ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کبھی ایسا بھی ہو جائے گا۔ بہرحال لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔
تانیہ کو وقت گزاری کے لئے بہت اچھا مغلظہ ہاتھ آگیا تھا۔ وہ اپنی آرٹ گلری میں بیٹھی پینٹنگ میں مصروف رہتی۔ کوئی بھی جعلیٰ کام سکون ذات کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔ تانیہ کو مصوری رکے بڑا سکون ملتا۔

ایک دن وہ اسی طرح مصوری میں گم تھی کہ چپڑی نے آگر اطلاع دی۔ ”تانیہ بی بی، آپ سے کوئی ملتے آیا ہے۔“

”کون ہے؟ نام نہیں بتایا۔“ تانیہ نے برش چلاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں بھی، نام انہوں نے نہیں بتایا۔ بس اتنا کہا تانیہ بی بی سے ملتا ہے۔“

”اچھا بلاو۔“ تانیہ نے برش رکھ کر اپنے ہاتھ کپڑے سے صاف کئے اور کرسی پر جائیں۔
”میں اندر آسکتا ہوں۔“ اس شخص نے دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت مانگی۔

جب تانیہ نے نظریں اٹھا کر آنے والے کو دیکھا تو اس کی ایک دم عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ اس نے اسے فوراً بچان تو لیا لیکن وہ بچان کر بھی ابھی بن گئی۔ اس نے اپنی نظر سامنے ایبل پر گلی پینٹنگ پر مرکوز کر دی اور سپاٹ لیجے میں بولی۔ ”بھی، آئیے۔“

وہ شخص تھری پیس سوٹ پہنچنے تھا۔ رنگ سانولا، لیکن بے حد پر کش، وہ بست پر اٹھیناں چال چڑھا لی کی میز کے نزدیک آیا اور کرسی اٹھا کر اس نے میز سے ذرا دور کی، پھر آرام سے اس پر برا جان دیا۔

”معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو ڈشرب تو نہیں کیا۔“ اس نے بڑے مودبانہ انداز میں چھا۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔؟“ لیجے میں ہلکی سی تاپنڈیگی تھی۔

”آپ سے ملتے۔“ اس نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

”بھی آپ بھائی جان سے ملتے ہیں، کبھی انکل عامر سے ملتے ہیں۔ آخر یہ سب کیا ذرا سامد ہے۔“

”اگر آپ کو میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ میرے آئے کام مطلب آپ کو تکلیف دتا ہرگز نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

تانية کو تونج نہیں تھی کہ وہ اس کی بات کا اس قدر اٹھ لے گا کہ فوراً اٹھ کر چلا جائے گا۔ اس نے اسے آواز دیا پاہی لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہی گئی۔ اتنی ویر میں وہ دروازے سے نکل گیا۔

تانية تیزی سے اٹھ کر دروازے پر آئی تو وہ برآمدے کی سڑھیاں اتر رہا تھا۔ گٹ کے باہر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی کو تیزی سے نکال لے گیا۔

تانية برآمدے میں کھڑی اس کی گاڑی کو جاتا ویکھتی رہی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آکر کرسی پر وحہم سے گری۔ یہ اس نے کیا کیا۔ وہ اس سے ملنے آیا تھا تو اسے چالنے تھا کہ اس کی بات سن لیتی۔ اسے اس طرح بدسلیک سے پیش نہیں آتا چاہئے تھا۔ یوں تلخ کلامی پر نہیں اتنا چاہئے تھا۔ لیکن اب تو جو ہوتا تھا، ہوچکا تھا۔

وہ کس قدر گریں فل لگ رہا تھا۔ ایسے پرشش مرد کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں، پھر اسے ایک دم جھنکا سالاگ۔ جیسے اسے ہوش آگیا۔ یہ کیا فضول بات وہ سوچنے لگی۔ اسے اپنے رویے پر بڑی جیت ہوئی۔

تانية بڑی محبت سے اپنی بیننگ کمل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے پھر سے برش ہاتھ میں لیا اور اسٹرول کلانے لگی لیکن اس کا اشناک ختم ہوچکا تھا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چیز گم ہو گئی ہے لیکن کیا چیز گم ہو گئی ہے۔ اس بارے میں وہ باوجود کوشش کے کچھ نہ جان سکی۔

وہ وہ بھر کھوئی کھوئی کی رہی۔ رات کو کھانے کی میز پر بھی اس کے ہاتھ بہت بے ول سے اٹھ رہے تھے۔ محسن راؤ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس سے رہانہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”تانية، تم ساری طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟“

”بھی، بھائی جان۔“

”پھر کیا بات ہے، کھانا کیوں نہیں کھا رہیں۔“

”کھاتور ہوں۔“

”کیا کھارہی ہو خاک۔ ایسے کھاتے ہیں کھانا۔ ایک نوالہ منہ میں رکھ لیا پھر سو گے۔“

”بھائی جان بھوک نہیں لگ رہی۔“

”خیر تو ہے..... آج تم ساری بھوک کیسے اڑ گئی۔“

”بھائی جان، ایک بات آپ کو بتاؤ۔؟“ تانية نے محسن راؤ کے چہرے کی طرف دیکھ کر

کہا۔

”بھائی جان، گیلری میں اعتبار راؤ آئے تھے۔“

تانية کا خیال تھا کہ محسن راؤ اس کی بات سن کر اچھل پڑے گا۔ اسے بڑی حریت سے دیکھے گا۔ اس کی آمد پر تعجب کا اطمینان کرے گا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

”اچھا۔“ یہ کہہ کر وہ پورے انہماں سے کھانا کھاتا رہا۔ پھر اس نے ایک نظر تانية کے چہرے پر ڈالی اور پر سکون انداز میں بولا۔ ”اچھا بھر۔“

”کمال ہے بھائی جان۔ آپ کو اس کی آمد پر جیت نہیں ہوئی۔“

”جیت اس لئے نہیں ہوئی کہ میں جانتا تھا کہ وہ تم تک پہنچے گا۔“ عجب انکشاف ہوا۔ ”وہ کیوں۔؟“ تانية پر بیشان ہو گئی۔

”اصل میں، میں نے ہی اس سے کھا تھا کہ وہ تم سے مل لے۔“

”آخر کس نے۔“

”کیا اس نے تم سے کوئی بات نہیں کی۔“

”میں نے اس کی نوبت ہی نہیں آئے وی۔ ان کے کچھ کئے سے پہلے ہی واپس چلا رویا۔“

”تم نے کوئی بد تیزی تو نہیں کی۔“ محسن راؤ کو فکر ہوئی۔

”بد تیزی تو نہیں کی البتہ تھوڑی سی بد سلکی ضرور کی ہے۔“ تانية نے بتایا۔

”ہوا کیا آخر۔؟ پوری بات بتاؤ۔“ محسن راؤ نے پوچھا۔

تانية نے جواب میں جو کچھ ہوا تھا وہ محسن راؤ کے گوش گزار کر دیا۔ تانية کی بات سننے کے بعد سن راؤ اسے بھنوں اچکا کر اور منہ بگاڑ کر دیکھنے لگا۔

” بتائیں نہ بھائی جان، وہ میرے پاس کیوں آئے تھے۔“

”اعتبار راؤ نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔“ محسن راؤ نے بڑی مخصوصیت سے کہا۔

”یہ آپ کیا کہ رہے ہیں بھائی جان۔“ تانية کو جیسے سکتہ ہو گیا۔

”اس میں اس قدر پر بیشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے ابھی پرپوز کیا ہے۔ رشتہ منظور رہنا یا نہ کرنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ تانية الجھ کر رہ گئی۔

”فی الحال تم طمینان سے کھانا کھاؤ۔“ محسن راؤ نے مشورہ دیا۔

”بس میں کھا پھیکی۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔

”تانية، ایک بات سنو۔“

”بھی، بھائی جان۔“ تانية جاتے جا رک گئی۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اعتبار راؤ کے بارے میں غور کر لو۔ تمہارا جو بھی فیصلہ ہو، مجھے صحن بتا

”تورو لو..... رونے میں تو کوئی حرج نہیں۔ ویسے جب پھلارشٹ آتا ہے تو لوکیوں کی کمی کیفیت ہوتی ہے۔“

”اللہ خالہ بس آپ“

”سنا ہے ابشار راؤ زبردست شخصیت کا ماں ہے۔“ خالہ فرزانہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
”تمہیں کیساں گا۔؟“

”اس میں کوئی شہر نہیں کہ ان میں بلا کی کشش ہے۔ پھر وہ بڑے سورے ہیں۔“ تانیہ نے اپنی رائے پیش کی، پھر بولی۔ ”لیکن خالہ آپ کو ان کے بارے میں کس نے بتایا۔“

”مجھے عامر نے بتایا۔ دراصل وہ پسلے رشتے کے سلسلے میں عامر سے ملا تھا۔ پھر عامر نے محسن راؤ سے بات کی۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر کوئی شخص ان کی طرف محبت سے ہاتھ بوجھا رہا ہے تو اس کا ہاتھ جھکانا نہیں چاہئے۔“

”خالہ، یہ کہیں سب کچھ فرزانہ ہو۔“

”کیا تم محسن راؤ اور اپنے انکل عامر کو بے وقوف سمجھتی ہو۔“

”بے وقوف تو نہیں سمجھتی البتہ دونوں کو سیدھا ضور سمجھتی ہوں۔“

”محسن کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی البتہ عامر کے بارے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ سیدھے ہرگز نہیں ہیں۔“

”خالہ، میں کیا کروں۔“

”لڑکے سے ملاقات کرلو..... اچھا لگے تو ہاں کر دو۔“

”وہ لڑکے نہیں ہیں۔“

”چلو مرد کہہ لو، تمہارے مقابلے میں اس کی عمر ضرور زیادہ ہے لیکن مرد کی عمر کیا ویکھنا۔؟“
خالہ فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

”اس کا مطلب ہے، آپ کو یہ رشتہ پسند ہے۔“

”عامر کو پسند ہے، محسن راؤ کو پسند ہے تو پھر مجھے کیوں نہ پسند ہو گا۔“

”چاہے مجھے پسند ہو یا نہ ہو۔“

”اگر تم انکار کرو گی تو پھر تمہیں کوئی مجبور نہیں کرے گا۔“ خالہ فرزانہ نے فوراً کہا۔ ”لیکن میں ایک مشورہ ضرور دوں گی کہ اعتبار راؤ سے ملاقات کئے بنا انکار مت کرنا۔“

”اچھا خالہ ٹھیک ہے۔“ تانیہ نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس نے رسیور رکھ دیا۔

وہ رات تانیہ نے تقریباً آنکھوں میں کافی۔ اسے نیند نہ آئی۔ وہ ساری رات سوچتی رہی اور سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی۔ وہ کبھی کروٹیں بدلتی۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی اور کبھی اٹھ کر ٹھیٹے لگتی۔

وینا۔ ”محسن راؤ نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجی اچھا۔“ تانیہ جلدی سے واش روم میں چل گئی۔ اس نے صابن سے ہاتھ دھوتے ہوئے آئینے میں اپنی شکل ویکھی۔ اسے اپنا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا وکھائی ویا۔

جب سے وہ لاہور آئی تھی۔ خالہ فرزانہ کو نہیں بھولی تھی۔ کبھی روز اور کبھی درسرے تیرے دن، انہیں فون ضرور کرتی تھی۔ کچھ اپنی ساتھی تھی، کچھ ان سے سنتی تھی۔

اس وقت جانے کیوں خالہ فرزانہ بڑی ٹوٹ کر یاد آئی تھیں۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کر ٹیلیفون اٹھایا۔ بیڈ پر بیٹھ کر اس نے ٹیلیفون اپنی گود میں رکھا اور خالہ فرزانہ کا نمبر ملانے لگی۔

نمبر ملتے ہی خالہ فرزانہ نے رسیور اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں ”بیلو“ کہا۔ ”ہاں، خالہ کی ہورہا ہے۔؟“ تانیہ نے سلام دعا کئے بنا برہ راست سوال کیا۔

”اوہ، اچھا، یہ تم ہو۔“ خالہ فرزانہ کے لجھے میں ایک دم خوشی بھر گئی۔ ”ہاں، میری جان کیسی ہو؟“

”خالہ، میں ٹھیک نہیں ہوں۔“ تانیہ کے لجھے میں افسوگی تھی۔

”ارے، کیا ہوا؟“ خالہ فرزانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”خالہ، مجھے آپ شدت سے یاد آرہی ہیں۔؟“ وہ تنپ کر بولی۔

”تم دو چاروں کے لئے کہاچی آجائو۔“

”میرا تو مجھی چاہ رہا ہے کہ اسی وقت آپ کے پاس اڑ کر پہنچ جاؤ۔“

”تم پریشان ہو آخر کیوں؟“

”آپ کو منس معلوم یہاں کیا ہو گیا ہے۔؟“

”کچھ بنا تو پہنچ جائے۔“

”آج اعتبار راؤ میری آرٹ گلری میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔“

”کیا کہہ رہا تھا وہ۔؟“

”ان کے کچھ کرنے سے پہلے ہی میں نے انہیں بھگا دیا۔“ تانیہ نے ساری بات تفصیل سے بتائی، پھر بولی۔ ”ابھی تمہوڑی دیر پسلے جب میں نے بھائی جان کو ان کی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے جواب میں کہا اکھبار راؤ کو انہوں نے خود میرے پاس بھیجا تھا۔ دراصل خالہ انہوں نے مجھے پروز کیا ہے۔ اب آپ بتائیں خالہ میں کیا کروں۔ یہ سب کیا ہورہا ہے۔“

”اے تو اس میں پریشانی کی کوئی بات ہے۔ جماں یہی ہوتی ہے، وہاں پھر آتے ہی بیس۔“

”خالہ، میں یہی نہیں ہوں۔“ تانیہ نے احتجاج کیا۔

”ہاں، تم یہی نہیں ہو لڑکی ہو، اسی لئے پھر نہیں، رشتہ آیا ہے۔“ خالہ نے ہنس کر کہا۔

”بھائی جان نے میں تک فیصلہ مالا گا ہے۔“ وہ اپنی ابھن میں گرفتار تھی۔

”تو پھر دیو دیو فیصلہ۔“

”خالہ، مجھے تو روٹا آ رہا ہے۔“

ہوشیا ○ 381

"اجازت ہے۔" تانیہ نے ایک دم اپنی نظریں اٹھا کر کہا۔
 "بی بست شکریہ۔" محسن راؤ نے اپنی گردن جھکا کر کہا۔
 "بھائی جان، آج میں صائمہ کی طرف جاؤں گی اور دوسرے کا حکما و جیں حاوز ہوں گی۔"
 "ہاں، ٹھیک ہے چلی جانا..... لیکن سیکورٹی گارڈ کو اپنے ساتھ ضرور لے جانا۔"
 "سیکورٹی گارڈ کے ساتھ جانا بڑا عجیب سالگزاب ہے۔ لوگ بڑی حرمت سے دیکھتے ہیں۔ بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ان گارڈوں سے جان نہیں چھٹ سکتی۔"
 "مجبوری ہے۔" محسن راؤ نے کہا۔ "آدمی کو اپنی حفاظت سے غفلت نہیں برنا چاہئے۔"
 محسن راؤ کے جانے کے بعد تانیہ نے صائمہ کو فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ پھر وہ تیار ہو رہا اور روڈ کی طرف چل دی۔ وہ گاڑی خود ڈرائیور کر رہی تھی۔ گاڑی کے پیچھے موڑ سائکلن پر گارڈ پل رہا تھا۔
 جب اس کی گاڑی راہی روڈ کے پل پر پہنچی تو اس نے فٹ پاٹھ پر ایک تماشا دکھانے والی کو باتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک بندر اور ریچھ تھا۔ تانیہ نے فوراً اپنی گاڑی آہستہ کر لی۔ پھر اس نے مڑکر اس عورت کی طرف دیکھا۔ وہ ایک پکی عمر کی خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر بیشتر سے اوپر رہی ہو گئی لیکن وہ اپنی صحبت کے اعتبار سے تمیں کی دھمکی دے رہی تھی۔ وہ قیصہ اور لامگرا پہنچتے ہوئے تھی۔
 اس عورت کو دیکھ کر تانیہ کے دماغ میں ایک خیال بھلی کی طرح کوئی۔ اس نے فوراً اپنی گاڑی دک لی۔ اور گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔
 جب ریچھ والی عورت نے ایک گاڑی والی عورت کو اپنے انتظار میں دیکھا تو اس نے جلدی جلدی ذم اٹھائے اور نزدیک جا کر بولی۔ "بی بی، میم صاحب۔"
 "یہ بتاؤ، تم تماشا دکھانے کا کیا ملتی ہو۔؟" تانیہ نے مسکرا کر پوچھا۔
 "یہاں پل پر دیکھو گی تماشا۔" وہ جیران ہو کر بولی۔
 "نہیں، اپنے گھر پر۔ تم یہ بتاؤ کہ پورے دن میں کیا ملتی ہو۔"
 "کبھی سو بھی پچاس۔" اس عورت نے بتایا۔
 "تانیہ نے اپنے پرس سے سوروپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے اور بولی۔ "فی الحال یہ سو دس پر رکھ لو، کل صبح میرے گھر آ جانا میں تمہیں پانچ سوروپے اور دوں گی لیکن تمہیں میرے گھر پر وچار گھنٹے گزارنے ہوں گے۔"
 "میم صاحب۔ تم نے میرا کیا کرنا ہے۔"
 "میں تمہاری تصویر ہاؤں گی۔ اپنے ساتھ ریچھ اور بندر کو لانا نہ بھولنا۔"
 "نہیں بھی۔ ان کو میں کہاں چھوڑ سکتی ہوں بھلا۔ یہ میرے ساتھ ہوں گے۔ پر بھی آؤں مال۔؟"

بادر پار اس کی نظر گلب کی کلی پر ٹھرم جاتی تھی۔ گلب کی کلی پر نظر پر قی تو دل میں خلش کی ایک برسی دوڑ جاتی۔ وہ گلب کی کلی اسے کچھ مر جھائی سی دھکائی دیتی۔
 صح ناشتے کی میز پر محسن راؤ تانیہ کا انتظار ہی کرتا رہا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ ناشتے نہ کیا ہو۔ کچھ ویر انتظار کرنے کے بعد اس نے رفت سے تانیہ کے بارے میں پوچھا۔
 "تانیہ بی بی کہاں ہیں۔؟"
 "صاحب جی، ان کے کمرے کا دروازہ بند ہے۔ شاید وہ ابھی اٹھی نہیں۔"
 "اچھا میں دیکھتا ہوں۔" وہ ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گیا۔
 اس نے اس کے کمرے کا دروازہ پلے آہستہ پھر زور سے بجا لیا۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمدہ ہوا۔ پھر اس نے دروازہ بجا کر زور سے آوازیں دیں۔ تانیہ نے فوراً دروازہ کھول دیا۔
 "کیا ہوا تانیہ..... تم ابھی تک سورہ تھیں۔" محسن راؤ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
 تانیہ کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ اور نیند سے بو جمل تھیں۔ کمرے کی لائٹ بھی روشن تھی۔
 "بھی بھائی جان۔"
 "تمہارے کمرے کی میت بھی جل رہی ہے۔ کیا تم رات بھر جاتی رہی ہو۔"
 "بھی بھائی جان۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ پھر وہ بیٹھ پر میٹھی اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر دو پڑی۔
 "ارے، تانیہ، یہ کیا؟ تم رو رہی ہو..... رونے کی ہر گز ضرورت نہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آجائے۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے تانیہ کا سر چھپتایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔
 کچھ دیر کے بعد تانیہ ناشتے کی میز پر آئی تو وہ اپنے آپ کو خاصاً بندھاں پکھی تھی۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔ محسن راؤ نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، پھر بولا۔ "ہاں، تانیہ، کیا میں اعتبار راؤ کو انکار کر دوں۔"
 تانیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اپنا سر جھکایا۔
 "تانیہ میں تمہارا جواب سننا چاہتا ہوں۔"
 "میں یہ اختیار آپ کو دیتی ہوں۔ آپ خود فیصلہ کر لیں۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منثور ہو گا۔"
 تانیہ نے سعادت مندی سے کہا۔
 "مجبوراً۔"
 "نہیں خوشی سے۔"
 "کیا آج رات میں اسے کھانے پر بلالوں۔"
 "شوق سے بلائیے۔" تانیہ نے نظریں جھکائے جھکانے کہا۔
 "اگر اجازت ہو تو نادرہ کو بھی بلالوں۔؟" محسن راؤ نے اجازت چاہی۔

محن راؤ کا بڑی مبارت سے نشانہ لیا۔ محن نے اسے اپنی طرف چاٹو پھینکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً ایک طرف کو ہو گیا۔ اس طرح وہ چاٹو ہے دل میں بیوست ہو جانا چاہئے تھا، دل میں بیوست نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے بازو میں ضرور گھس گیا۔
دونوں گارڈوں نے فوراً اپنی کلاشنکوف سیدھی کر لیں۔ لیکن محن راؤ نے زور سے بیخ کر کما۔
”نہیں۔“

محن راؤ نے اس روپچھ والی کو پہچان لیا تھا۔
وہ راکھی تھی، راج ماری کی بیٹی۔
چند لمحوں میں جانے کیا سے کیا ہو کیا تھا۔

اگر وہ اپنے گارڈوں کو منع نہ کرتا تو اب تک راکھی کی لاش نہیں پر پڑی ترپ رہی ہوتی۔ چاٹو کا وار کرنے کے بعد راکھی نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ وہ اپنے روپچھ اور بندر کے ساتھ تیری سے بھاگتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔
سفق ابھی گیٹ پر موجود تھا۔ وہ گیٹ بند کر رہا تھا۔ اس نے راکھی کو محن راؤ پر چاٹو پھینکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ گیٹ بند کر کے بھاگتی ہوئی راکھی کو روک دے۔ ادھر سے گارڈ بھی اسے اپنی رفت میں لینے کے لئے آگے بڑھے۔

تب محن راؤ نے پھر انہیں تباہی کی۔ ”اسے جانے دو۔“

سفق اور گارڈ بھاٹھ ملتے رہ گئے۔ تانیہ ششدھ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندر ہمراچھایا ہوا تھا۔ ول دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ اور نائکین لرز رہی تھیں۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ خود ہی اپنے بھائی کے قتل کا سامان کر رہی ہے۔ خود ہی قاتل کو گھر بباری ہے۔ کیا عجب تماشا تھا۔

وہ چاٹو اس کے بازو میں پیوست تھا لیکن آر پار نہیں ہوا تھا اور بڑی بھی مزروع ب نہیں ہوئی تھی۔ کوٹ پنے ہوئے تھا، اس لئے بچت ہو گئی تھی۔ محن راؤ نے اس چاٹو کو ہٹھ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ اور خون آلوہ چاٹو سفق کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”اسے دھوکر اپنے پاس رکھو۔“

پھر اس نے گارڈ کی مدد سے کوٹ اتارا، زخم پر رومال باندھا۔ اور گاڑی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”چلو، اپتال چلو۔“

تانیہ پچھلی سیٹ پر فوراً اس کے برابر بیٹھ گئی۔ وہ پہنچ پہنچ آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھے جا رہی تھی۔ تانیہ، مجھے کچھ نہیں ہوا۔ معمولی زخم ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بالکل فخر مت کرو۔ ”اس نے حوصلہ دیا۔

تانیہ نے کچھ کے بغیر اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اپتال میں ضایطہ کی کارروائی کے بعد فوری طور پر بھی امداد فراہم کی گئی۔ زخم گرا تھا لیکن ملک نہیں تھا۔ اوپر والے نے اسے بچا دیا تھا۔ راکھی نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے براہ راست دل پر دار کیا تھا۔ اگر یہ دار کارگر ہو جاتا تو محن راؤ کی موت یقینی تھی۔

”ماڈل ٹاؤن آتا ہو گا۔“ تانیہ نے ایک کافنڈپر اسے اپنے گھر کا پتہ لکھ کر تھا یا۔ ”اس کافنڈپر میرے گھر کا پتہ لکھا ہے۔ کسی سے پوچھ کر آجائنا۔ میں صبح دس بجے تمہارا انتظار کروں گی۔“
”ٹھیک ہے۔ میم صاحب۔ میں آ جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے وہ کافنڈا اور سوروبے کا نوٹ بت اختیاط سے اپنی قیصی میں رکھ لیا۔

تانیہ کو بات کرتے دیکھ کر کپڑے سے گزرنے والے لوگ وہاں رکنے لگے تھے۔ تانیہ اس سے بات کر کے جلدی سے گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی تیری سے نکال لے گئی۔

ووسرے دن وہ وقت مقررہ پر ماڈل ٹاؤن تانیہ کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئی۔ سفق نے دروازہ کھولا اور اپنے سامنے روپچھ والی کو پا کر اسے ڈانتھتے ہوئے بولا۔ ”اوچل آگے بڑھ، یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا تیرا تماشا۔“

”اویل کے سے منہ والے اندر جا کر میم صاحب کو بول کہ تماشے والی آئی ہے۔“

”میم صاحب۔ کون نیم صاحب، ادھر کوئی میم صاحب نہیں رہتی۔“

تانیہ کو اس روپچھ والی کا انتظار تھا۔ وہ بیل کی آواز سن کر سفق کے ساتھ خود بھی باہر نکل آئی۔ سفق کو اس نے گیٹ پر کسی سے الجھتے ہوئے دیکھا تو وہ تیری سے گیٹ کی طرف آگئی۔ سامنے اسے روپچھ والی نظر آئی۔ روپچھ والی نے بھی اسے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ سفق کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جمیٹ بوتا ہے۔ وہ کیا آرہی ہیں میم صاحب۔“

سفق بنی چھپے پلٹ کر دیکھا۔ تانیہ نے اشارے سے کہا۔ ”اسے اندر آنے دو۔“

”بی بی بی۔“ سفق کو بڑی حیرت ہوئی۔ بہرحال اس نے گیٹ کھول دیا۔

وہ اپنے روپچھ اور بندر کے ساتھ اندر آگئی اور بولی۔ ”میم صاحب، مجھے دیر تو نہیں ہوئی۔“

”تم نے کمال کر دیا۔ یہ رے ٹھیک وقت پر آئی ہو۔“ تانیہ نے خوش ہو کر کہا۔

تانیہ نے پہلے اپنے کیمرے سے اس کی مختلف انداز میں تصویریں اتاریں۔ پھر اس نے اسکے درخت کے نیچے اسٹول پر بٹھادیا۔ اور ایزیل پر گے کافنڈپر اس کو اسکچ کرنے لگی۔

محن راؤ کا معمول تھا کہ وہ دوسرے کا لحاماں گھر پر کھاتا تھا۔ کھانا کا کھارہ اور پھر شام کی چائے پی کر ریستوران کا رخ کرتا تھا۔ آج بھی وہ ٹھیک ایک بجے گھر پہنچ گیا۔

گاڑی کا ہارن سن کر سفق نے کوٹھی کا گیٹ کھولا۔ محن راؤ گاڑی اندر لے آیا۔ گاڑی کی پچھلی نشت پر اس کا گارڈ بیٹھا تھا۔ جبکہ دوسرا گارڈ کوٹھی کے اندر الٹ کھڑا تھا۔

محن راؤ نے گاڑی سے اتر کر تانیہ کی طرف بڑی دپچی سے دیکھا جو بڑے اشناک سے تصویر بارہی تھی۔ روپچھ والی پر ابھی اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ لیکن روپچھ والی نے اسے گاڑی سے اترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اچانک اس میں بجلی سی دوڑ گئی۔

وہ بڑی برق رفتاری سے اٹھی۔ اس نے پاک جھکتے اپنی قیصی سے چاٹو نکلا اور قریب آتے ہوئے

جائے۔

نادرہ کو دیکھ کر تانیہ نے اسے گلے سے لگایا اور بولی۔ ”پریشان نہ ہوں۔ بھائی جان اب بالکل ٹھیک ہے۔“

محسن راؤ نکیوں سے بیک لگائے، نیم دراز تھا۔ نادرہ کو دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ”آؤ، نادرہ۔“ کمرے میں اس وقت محسن راؤ کا بچپن کا دوست آصف صدیقی، انکل عامر اور ان کی فیملی اور تانیہ لی۔ نادرہ کو دیکھ کر آصف صدیقی نے جائے کی اجازت چاہی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں گھر کے لوگ رہ گئے۔ ان سب لوگوں سے اس کا تعارف تھا۔

”یہ کیسے ہوا؟“ نادرہ کی آواز میں بڑی ترپ تھی۔

”تمہیں تانیہ نے کچھ نہیں بتایا۔“

”نہیں بھائی جان، میں نے جان کر نہیں بتایا تھا کہ پریشان ہوں گی۔“

”تم نے بتا اچھا کیا۔“ اس مرتبہ انکل عامر بولے۔ پھر وہ نادرہ سے مخاطب ہوئے۔ ”محسن راؤ نے زخم نہیں کر کھایا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ نادرہ نے کہا۔ ”انکل عامر میں سمجھی نہیں۔ آپ کی بات۔“

”قاتل سے انہوں نے پورا اپورا تعاون کیا۔ اسے پورے اطمینان سے فرار ہونے کا موقع عنایت ہے۔“

”قاتل، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، انکل عامر۔ کیا محسن پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے؟“

”بھی، محسن صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ بھی کسی خاتون نے کیا ہے؟“

”کون تھی وہ؟“ نادرہ الجھن میں گرفتار ہو گئی۔

”تماری دوست۔“ اس مرتبہ محسن راؤ بولا اور بول کر نہیں دیا۔

”میری دوست؟“ نادرہ نے جیران ہو کر پوچھا۔

”بھائی جان، کیوں پریشان کر رہے ہیں، نام بتا کیوں نہیں دیتے۔“

”تانیہ تم بتاؤ، وہ کون تھی؟“

”انیں بوجھنے دونا۔“

”راکھی تھی وہ اور اس کیفی کوئی نے خو گھر بلوا یا تھا۔“ تانیہ کے لمحے میں بچپنا تھا۔

”تم کیوں، نادم ہو رہی ہو، تمہیں کیا معلوم تھا کہ وہ تمہارے بھائی کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔“ وہ راکھی تھی، راج ماری کی بیٹی۔ اتنے برسوں کے بعد وہ یہاں کہاں آگئی تانیہ ذرا مجھے تفصیل سے ساری بات بتاؤ۔“

تانیہ نے راکھی سے ملاقات اور اسے گھر بلانے کی ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

”محسن آپ نے یہ کیا کیا۔“ نادرہ نے سارا واقعہ سن کر محسن کی طرف رکھ کیا۔

”میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“

”اس کیلئی لاش کیوں نہیں گرفتی، اسے فرار ہونے کا موقع کیوں دیا؟“ نادرہ کے لمحے میں غصہ کی

جس چاقو سے اس پردار کیا گیا تھا، اس چاقو کو محسن راؤ ابھی طرح پہچانتا تھا، وہ راج ماری کا چاقو تھا۔ یہ چاقو تیہش اس کے پاس رہتا تھا۔ راج ماری دھوکے میں مارا گیا تھا۔ وہ محسن راؤ پر پا جادو کر کے اسے ہی شر کے لئے اپنی قید میں لے لینا چاہتا تھا۔ اور اپنے اس مقدمہ میں اس نے خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ لیکن وہ ماوس کی رات، سیاہ تاریک شب خود اس کی زندگی کو موت کی آغوش میں قید کر آئی تھی۔

جوگی رام پال نے راج ماری پر ایسا مسلک وار کیا تھا کہ اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ راج ماری خود کو براز بر دوست جادو گر سمجھتا تھا۔ اور یہ یہ عزم اسے لے دیا تھا۔ وہ محسن راؤ کو قید کرتے ہوئے خود موت کی گرفت میں آگیا تھا۔ اگرچہ آخری لمحوں میں اس پر سارے راز فاش ہو گئے تھے۔ وہ جان گیا تھا کہ کس نے کیا کیا ہے، لیکن اس وقت کچھ ہوئیں سکتا تھا۔ وہ ترپ کر مر گیا تھا۔

وہ سرے دن جب جنگل سے اس کا باپ گھرنہ پہنچا تو ارکھی فکر مند ہو گئی۔ ایک دن اس نے اس کے آنے کا اور انتظار کیا۔ جب وہ تیرے دن بھی گھرنہ آیا تو وہ اپنے ریپچھ اور بذر کو لے جنگل کی طرف گئی۔ بالآخر اس نے اپنے باپ کی لاش تلاش کر لی۔ اس کے باپ کی لاش اگرچہ ناقابل شاخت تھی لیکن وہاں موجود دوسری چیزوں سے اس نے اندازہ کر لیا کہ یہ راج ماری کی لاش ہے۔

وہاں محسن راؤ بھی موجود نہ تھا۔ اس نے ریپچھ کی کھال میں گڑا ہوا چاقو کھینچ لیا۔ اور اسی لمحے اپنے باپ کی قسم کھائی کہ وہ محسن راؤ سے اس قتل کا انتقام لے کر رہے گی، وہ جب بھی جماں بھی اسے نظر آگیا، اسے مار دے گی۔ وہ اگر اس کا نہیں ہوا تو وہ پھر کسی کا بھی نہیں ہو سکے گا۔

کچھ دنیا کے بعد اس نے لاہور کا رخ کیا۔ چاقو چینک کر مارنے کا فن اس کے باپ نے اسے سکھا کہا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے اس چاقو سے مزید مشق کی، یہاں تک کہ وہ چاپو چینک کروار کرنے کے فن میں طاقت ہو گئی۔ قبیلے کے کئی نوجوان اس پر فرقہ تھے تو اس سے شادی کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن اس نے اپنے قبیلے والوں سے صاف صاف کہ دیا تھا کہ جب تک وہ اپنے دشمن سے انتقام نہیں لے لے گی، بھی کسی خوشی کا منہ نہ دیکھے گی۔ چاہے اپنے دشمن کو تلاش کرنے میں عمری کیوں نہ بیت جائے۔

عم رائیگاں کا سفر جاری تھا۔ اس کی زندگی ایک تماشی ہوئی تھی۔ وہ یہاں بھلک رہی تھی کہ اچاک ہی اس کی منزل اس کے سامنے آگئی۔ محسن راؤ کو اچاک اپنے سامنے پا کر اس کے جسم میں بھی ہی بھر گئی۔ اس نے آنا فنا نہ کر دیا جس کی اس نے اپنے باپ کی لاش پر قسم کھائی تھی۔

وارکر کے وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رکی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس کاوار کار گر ہوا ہے یا نہیں۔ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اسے اپنے پار یقین تھا، وہ جانی تھی کہ اس نے ہاتھ سے نکلا ہوا چاقو کی بھی بے نشانہ نہیں ہوا۔ پر اس کا کیا کیجھ کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔

نادرہ کو جب علم ہوا کہ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے تو وہ بھاگ کر اپسٹال پہنچی۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ اس وقت لاہور میں تھی۔ جب وہ اپسٹال کے کمرے میں بچنی تو ہاں ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ تانیہ نے نادرہ کے چرپے پر ہوانیا اڑی ہوئی تھیں۔ تانیہ نے نادرہ کو اپسٹال ہی سے فون کیا تھا۔ اس وقت محسن راؤ آپریشن تھیز میں تھا۔ بہت چھوٹا سا آپریشن تھا۔ زخم صاف کر کے ناٹک لگادیے گئے تھے۔ تانیہ نے نادرہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا ہی کہا تھا کہ بھائی جان زخمی ہیں۔ وہ فوراً اپسٹال

جھلک تھی۔

محسن راؤ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ جب اس تو یہ ہے کہ اسے خود معلوم نہ تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔

اپنال سے گھر آجائے کے بعد زخم بھر جانے تک، نادرہ نے اس سے بار بار یہ سوال کیا کہ اس نے قاتلانہ حملے کے پار جو راکھی کو کیوں چھوڑ دیا۔ لیکن ہر بار محسن راؤ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ ویسے وہ اپنے اس رویے کے بارے میں مسلسل سوچتا رہا۔

پھر ایک دن تانیوں نے اس سوال کو دہرا�ا۔ وہ بولی۔ ”بھائی جان، یہ خاش تو زندگی بھر میرے دل میں رہے گی کہ میری حمact سے میرے بھائی پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن یہ بات بھی میرے دل میں پھانس بن کر چھپی ہوئی ہے کہ آپ نے اس کیمی کو پورے اطمینان سے کل جانے دیا۔ آخر بھائی جان کوچھ بتائیں تو آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

”یہ سوال نادرہ بھی مجھ سے کئی مرتبہ پوچھ چکی ہے۔ پھر جو سنتا ہے، اس کے دماغ میں پسلا سوال یہی آتا ہے کہ میں نے راکھی کو جانے کیوں دیا۔ میں خود بھی اپنے اس رویے پر مسلسل غور کرتا رہا ہوں۔ میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں اور شاید یہ بات نادرہ سے نہ کہ سکوں لیکن تم کیونکہ میری زندگی کے ہر راز سے واقع ہو اس لئے تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے اس لئے چھوڑ دیا کہ شاید میں اسے کوئی خوش دینا چاہتا تھا۔“ اس نے عجیب بات کی۔

”خوبی! دننا چاہتے تھے، ایک قاتلہ کو خوشی.....؟ میرا خیال ہے کہ آپ دنیا کے سب سے انوکھے زخمی ہیں۔ آپ نے زخم اس لئے کھایا کہ زخم مگانے والا غوش ہو سکے۔ وہ بھائی جان جواب نہیں آپ کا۔“

”دیکھو۔ تانیوں..... راکھی کا باب میرا محسن تھا۔ اس نے مجھے قتل ہونے سے بچایا تھا لیکن پھر وہ میرے ہی ہاتھوں مار گیا۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی لیکن میں نے کبھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا۔ جبکہ میں نادرہ کا اسیہ ہو گیا، میرا خیال ہے کہ وہ ہماری ان ملاقاتوں سے واقع تھی۔ اس کے باوجود وہ اس نے کبھی خبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اب تم اندازہ کر سکتے ہو کہ جب اس نے اپنے پاپ کی سخت شدہ لاش جنگل میں پالی ہوگی اور مجھے وہاں سے غائب پایا ہو گا تو اس کے دل میں اچانک انتقام کا شعلہ بہڑک اٹھا ہو گا..... بات اصل میں یہ ہے تانیوں کی میں راکھی کے بارے میں بیش ایک مجرمانہ احساس میں بیتلراہ ہوں۔ راکھی کے قاتلانہ حملے نے اس مجرمانہ احساس کو مناویا ہے۔ اب میں خالم نہیں مظلوم ہن گیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تم میری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی۔“ محسن راؤ نے اپنی بات اسے واضح سے سمجھائی۔

پچھے نہیں تانیوں اس کی بات سمجھی یا نہیں۔ بس وہ اتنا کہ کہ چپ ہو گئی۔ ”اللہ، آپ پر رحم کرے بھائی۔“ اللہ نے اس پر واقعی رحم کر دیا تھا۔ راکھی کے جان لیواوار سے وہ صاف طور پر بیٹھا تھا۔ اس دن شام تک اسے اپنال سے فارغ کر دیا گیا۔ جب وہ اپنال سے گھر جا رہا تھا تو اپنال کے احاطے میں

اے اعتبار راؤ مل گیا۔ اگرچہ آصف صدیقی نے محسن راؤ پر قاتلانہ حملے کی اطلاع سینما کے میجر کو دے دی تھی لیکن اعتبار راؤ اس وقت گھر پر تھا نہ سینما پر۔ وہ کسی کام سے نکلا ہوا تھا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر سینما پہنچا تو میجر نے فوراً اسے آصف صدیقی کا پیغام دیا۔ وہ پیغام سنتے ہی ائمہ قدموں سینما سے نکلا اور گاڑی لے کر اپنال پہنچ گیا۔ وہ بے حد فخر مند تھا۔ اس کے میجر نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ محسن صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ فلاں اپنال میں ہیں، وہ اس حملے کو راؤ احمد علی کی جانب سے گھناؤنی کا رواںی سمجھ رہا تھا۔ اسی لئے وہ فخر مند ہونے کے ساتھ، شرمندہ شرمندہ سا سمجھی تھا۔

”محسن، کیا ہوا؟ خیر تو ہے۔ کسی نے حملہ کیا ہے تم پر.....؟“

”ہاں، سب خیر ہے۔ بازو میں معمولی ساز خم آیا ہے۔ مرہم پڑی کر دی گئی ہے۔ اور مجھے اپنال چھوڑ دینے کا حکم ہوا ہے۔ اعتبار تم ہمارے ساتھ گھر چلو، وہاں بیٹھ کر باش ہوں گی۔“ محسن راؤ نے خوش ہڑا جی سے کہا۔

تانیوں اور نادرہ ساتھ تھیں۔ انکل عمار پرے گھر جا پکے تھے۔ وہ دونوں محسن راؤ کے ساتھ بیٹھ گئیں جبکہ اعتبار راؤ اپنی گاڑی میں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ گھر پہنچ کر تانیوں اور نادرہ تو اندر کوٹھی میں چل گئیں۔ محسن راؤ، اعتبار کو لے کر ڈر انگ روم میں بیٹھ گیا۔ اعتبار راؤ اس حملے کا پس منظر سمجھنے کے لئے بے تاب تھا۔ جب محسن راؤ نے اس قاتلانہ حملے کا پس منظر سمجھایا تو اعتبار راؤ نے اندر ہی اندر اطمینان کا سائز لیا۔ وہ محسن راؤ کے سامنے مزید شرمندہ ہونے سے بچ گیا تھا۔

چائے پینے کے بعد جب اعتبار راؤ نے جانے کی اجازت چاہی تو محسن راؤ نے اسے زبردستی روک لیا۔ اس نے کہا۔ ”اعتبار راؤ تم کھانا کھائے بیغیر یہاں سے نہیں جائیں۔“

اعتبار راؤ رک گیا۔ تانیوں کو جب معلوم ہوا کہ اعتبار راؤ کو محسن راؤ نے کھانے پر روک لیا ہے تو اس نے اپنی خصوصی ٹکرانی میں کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ وتفہ و قنے سے وہ ڈر انگ روم میں بھی جاتی رہی۔ نادرہ بھی اس کے ساتھ ہی ہوتی۔ محسن راؤ اپنی آپ بیتی اسے شارہ تھا۔ اور وہ بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ جب محسن راؤ کا قصہ ختم ہو گیا تو نادرہ اور تانیوں نے بھی وہاں ہونے والی گفتگو میں حصہ لیا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ محسن راؤ اس سے باٹھ روم جانے کی اجازت لے کر وہاں سے اٹھا۔ کچھ دیر کے بعد ہی نادرہ بھی اٹھ کر باہر چل گئی۔ اب ڈر انگ روم میں تانیوں اکیلی رہ گئی۔ خود کو تنہا محسوس کر کے اس کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ اسے نادرہ پر پڑا غصہ آیا کہ وہ اچانک ہی کچھ کے بغیر ڈر انگ روم سے نکل گئی۔

اب تانیوں چاہتی بھی تو ڈر انگ روم سے نہیں اٹھ سکتی تھی کیونکہ اعتبار راؤ کو ڈر انگ روم میں تنہا چھوڑ دینا کسی طور مناسب نہ تھا۔ وہ ہمت کر کے بیٹھی رہی۔ اعتبار راؤ جو ابھی نادرہ سے بے تکلفی سے اٹھ کر رہا تھا۔ اچانک خاموش ہو گیا۔ جیسے اسے سانپ سو گھنگی کیا ہو۔

کچھ دیر خاموشی سے وہ تانیوں کی طرف دیکھتا رہا جو نظریں جھکائے بیٹھی تھیں۔ اس کی لگا ہوں میں آرٹ نیکری والا منظر گھوم رہا تھا جب اعتبار راؤ اس سے مٹے آیا تو اس نے ناپنندگی کا انہصار کر کے اسے

وہیں جانے پر مجبور کردیا تھا اور یہ شریف آدمی کتنی خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔
اچانک تانیہ نے نظریں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔

وہ صوفی پر بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اسی وقت اس نے بھی تانیہ کو دیکھا۔ نظریں نظریں
لیں اور پھر دونوں پلکیں بھچکانا بھول گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات ہوئی۔ اور نظریوں کے یہ تم
دونوں کے لوؤں میں اترتے چلے گئے۔

نہ کسی نے کچھ کہا۔ نہ کسی نے کچھ سنا۔ پھر بھی بہت کچھ کہا گیا۔ بہت کچھ سنا گیا۔
چند لمحوں بعد نادرہ والیں آگئی۔ وہ دونوں کو خاموش دیکھ کر بولی۔ ”اس قدر سنا۔ ڈر انگ رو
میں داخل ہوتے وقت میں سوچ رہی تھی، شاید یہاں کمرے میں کوئی ہے ہی نہیں۔“
”اب تو یقین آگیا کہ ہم دونوں کمرے میں ہی ہیں۔“ ”اعتبار راؤ بولا۔“

”ہاں، یہ یقین تو آگیا۔ لیکن ایک بات پر پھر بھی حیرت ہے۔“

”وہ کیا؟“ اعتبار راؤ نے پوچھا، تو تانیہ نے پونک کر نادرہ کو دیکھا۔
کر کما۔ ”اس قدر خاموشی..... کیا آپ دونوں کو کسی نے بات کرنے سے منع کر دیا تھا؟“ ”نادرہ نے نہیں
”جس طرح ایک ہاتھ سے تالی نہیں بھتی، ویسے ہی یک طرفہ گھنکو بھی نہیں ہوتی۔“ ”اعتبار راؤ نے
مسکرا کر کما۔“

”کیا آپ کی بات کاتانیہ نے جواب نہیں دیا۔؟“ ”نادرہ نے تانیہ کی طرف دیکھا۔
”نہیں..... میں نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ اصل میں ہوا یہ کہ یہ سر جھکا کے کچھ سوچ رہی تھیں۔ میں
نے انہیں ڈسٹرپ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے نادرہ، میں آپ کو ایک بات بتاؤں، کبھی خاموشی بھی زبان
بن جاتی ہے۔ اور ایسی خاموشی پر ہزار جملے قربان کے جاکتے ہیں۔“
”جب لب خاموش ہوں تو آنکھوں آنکھوں میں بات ہوتی ہے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بات
نظریوں میں ہو رہی تھی۔“ ”نادرہ نے اس کی بات کو ایک ڈنار گنگ دے دیا۔
”میں ابھی آتی ہوں۔“ ”تانیہ ایک دم ہڑپا کر اٹھی۔ اسے یوں محوس ہوا جیسے نادرہ نے اس کی
چوری پکڑی ہو۔ وہ محبوب ہی ہو گئی۔ اس سے وہاں بیٹھانہ گیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ ”نادرہ نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔
”کچن میں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے ڈر انگ رو دم سے نکل گئی۔
اعتبار راؤ اور نادرہ ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار مسکرا پڑے۔
اور پھر ایک دن جب تانیہ حسب معمول اپنی آرٹ گیلری کے دفتر میں ایک پینٹنگ پر کام کر رہی تھی
تو دروازے پر کسی کی دستک سے چوکی۔ اس نے چوک کر دیکھا تو دروازے پر اعتبار راؤ کھڑا اس سے اندر
آئے کی اجازت طلب کر رہا تھا کہہ رہا تھا۔ ”میں اندر تو آسکتا ہوں نا۔“
اسے دیکھ کر نہ جانے تانیہ کے حواس کیوں گم ہو جاتے تھے۔ وہ اندر ہی اندر سمنئے لگتی تھی۔ اسے
جب آئے لگتا تھا۔ اس وقت بھی ہی ہوا، وہ اسے دیکھ کر گزر بڑا گئی۔ برش ٹھیک طرح سے رکھا گیا۔

وہ الٹ کر اس کے کپڑوں پر گرا اور اس کے رنگیں کپڑوں کو مزید رنگیں کر گیا۔
”جی، آئیے۔“ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ پورے اطمینان سے اندر آیا اور کرسی گھیٹ کر بیٹھ گیا۔ تانیہ نے تو یہ سے اپنے ہاتھ اور کپڑے
صف کے اور اپنی کرسی پر آگر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں میر پڑھیں۔

”تانیہ۔“ اعتبار راؤ نے بہت وہیرے سے پکارا۔
اس کی زبان سے اپنا نام سن کر اسے ایک خوشی کا ساحس ہوا۔ اس نے اپنی گھنیری پلکوں کی چلنی
اخالی اور اپنی کالی خوبصورت آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”جی۔“

”میں نے آپ کے بڑوں سے ایک بات کی تھی، اس کا جواب میں آپ کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔
چاہے یہ جواب انکار میں ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن انکار کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لجئے گا کہ میں پھر زندگی
بھرنا دی نہیں کروں گا۔“ ”اعتبار راؤ نے اسے گھری نظریوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس کا فیصلہ اپنے بڑوں پر ہی چھوڑ دیا ہے۔“ ”تانیہ نے آہنگی سے جواب دیا۔
”اچھا، لیکن آپ کے بڑوں کا فیصلہ کیا ہے؟“ ”اعتبار راؤ نے سوال کیا۔

”یہ آپ بڑوں سے ہی معلوم کریں لیکن ایک بات میں آپ سے ضرور کہنا چاہوں گی۔“
”ہاں، ضرور کئے، میں آپ کی باتیں سننے ہی بیسان آیا ہوں۔“

”اگر آپ یہ سب جانکرو حاصل کرنے کے لئے کر رہے ہیں تو میں اپنے حصے کی جانکرو دیے ہی
آپ کے نام کروں گی۔ آپ کو میری زندگی برپا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ”تانیہ نے اپنے دل کی
بات صاف کہ دی۔

”آپ کو شاید پوری بات معلوم نہیں، اس لئے آپ نے ایسی بات کہہ دی ہے۔ میں نے یہ بات
ٹھکی ہے اور اس کا اظہارِ محض بھائی اور انکل عامر دنوں سے کر دیا ہے کہ شادی سے پہلے میں اپنی تمام
جانکرو اور آپ کے نام نعقل کر دوں گا۔ مر آپ کی مریضی کا ہو گا چاہے وہ ایک کروڑ کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس
کے علاوہ طلاق کا حالت بھی آپ کو حاصل ہو گا۔ اب بتائیے، اب تو کوئی خدشہ نہیں۔ اگر آپ مزید کوئی
غمبوطی چاہتی ہوں تو اس کے لئے بھی حاضر ہوں۔“ ”اعتبار راؤ نے پر خلوص لجھ میں کہا۔

”حیرت ہے، آپ یہ سب کس لئے کر رہے ہیں؟“ ”تانیہ کو واقعی حیرت تھی۔
”تمہیں، حاصل کرنے کے لئے۔“ ”اعتبار راؤ نے اسے گھری نظریوں سے دیکھا۔

”مجھ میں ایسا کیا ہے۔ میری مجھی لڑکیاں آپ کو بے شمار مل جائیں گی۔“
”مجھے بے شمار لڑکیاں نہیں پاہیں، مجھے صرف ایک لڑکی چاہئے اور وہ بھی تانیہ..... اور یہ بات میں
اچھی طرح جانتا ہوں کہ تانیہ جیسی لڑکی اس روئے زمین پر دوسرا کوئی اور نہیں۔“

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔“

”تانیہ تم بے حد حسین ہو، اس بات میں کوئی شبہ نہیں لیکن اگر تم حسین نہ ہی تو میں محض قبول
صورت ہوتیں تو تھی میں تم ہی سے شادی کرتا۔“

”اچھا..... اس کی وجہ۔“

پھر ایک دن سوال پیدا ہوا۔ ”آخر بک تک؟“ اور یہ سوال تانیہ نے اعتبار راؤ سے کیا تھا، نہ نادرہ نے محسن راؤ سے..... یہ سوال انکل عامرنے کیا تھا۔ اس سوال کو سن کر محسن راؤ کو مجیسے ہوش آگیا تھا۔ انکل عامرنے بہت صحیح وقت پر یہ سوال اٹھایا تھا۔ وہ دونوں کو ایک دوسرے سے متھے ہوئے وکھرے ہے تھے۔ وہ کہانیوں کی ابتداء ہو جکی تھی اور اب اتنا وقت گزر چکا تھا کہ ان کہانیوں کا انجمام ضروری تھا۔

انجمام بالآخر شادی تھا۔ لیکن انکل عامر اور خالہ فرزانہ اس فریضے کو بہت دھرم دھام سے انجمام دینا چاہتے تھے۔ تب طے یہ ہوا کہ پہلے ممکنی کی جائے۔ اور رسم ممکنی بھی کسی بڑے ہوٹل میں انجمام پائے۔ کسی بھی طرف پیسے کی کمی نہ تھی لہذا اعتبار راؤ اور محسن راؤ کی ممکنیاں ایک ہی ہوٹل میں ایک ہی وقت طے ہوتا تھا پائیں۔

نادرہ کے والدین نہ تھے، وہ تھا تھی۔ لے دے کے اس کے رشتے کے چھازاد بھائی تھے۔ اور هر اعتبار راؤ کے پس منظر میں کوئی نہ تھا۔ پس منظر میں تو خیر اس کا باپ راؤ احمد علی اور اس کے بھائی موجود تھے لیکن یہ پس منظر بہت بھی ایک تھا۔ اعتبار راؤ اس ممکنی کی ان لوگوں کو ہوا بھی لگنے دیتا ہیں چاہتا تھا۔ محسن راؤ اور تانیہ کے والدین بھی موجود تھے۔ تانیہ کے سرپر اگرچہ محسن راؤ موجود تھا لیکن محسن راؤ کے سرپر کوئی نہ تھا۔ لے دے کے ایک انکل عامر تھے۔ اس لئے سب نے انہیں اپنا سرست بنا لیا تھا۔ وہ لڑکی والے بھی تھے اور لڑکے والے بھی۔ یوں انہیں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

خالہ فرزانہ کو کراچی سے بلو الیا گیا تھا۔ ایک بہتے کے بعد ممکنیاں ہونے والی تھیں۔ لہذا افضل نہیں آیا تھا۔ اس کا پروگرام ایک دن پہلے آئے کا تھا۔ خالہ فرزانہ ایک طویل عرصے کے بعد انپر شر آئی تھیں۔ یہاں آگر انہیں اپنی جوانی یا آگئی تھی۔

تانیہ، خالہ فرزانہ کی آمد سے بہت خوش تھی۔ وہ بار بار ان کے گلے میں باٹیں ڈال کرتی تھیں کر رہی تھی۔ ”خالہ، میں اب آپ کو جانے نہیں دوں گی۔“

”کیا مطلب ہے تیرا..... کیا تو یہیں بیٹھی رہے گی۔؟“ انہوں نے انساول ٹانک دیا۔ ”اوہ خالہ۔“ وہ نہ کر بولی۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کو شادی سے پہلے نہیں جانے دوں گی۔“ ابھی تو تمہاری شادی میں دو ماہ باقی ہیں۔ ممکنی کے بعد میں جلو جاؤں گی۔ افضل وہاں اکیلا ہے۔ پھر میں شادی سے پہلے آجائو گی۔“ خالہ فرزانہ بولیں۔

”بھائی افضل کی تو آپ کو فکر ہے۔ یہاں کوئی اور بھی اکیلا ہے۔ اس کی فکر نہیں آپ کو؟“ خالہ فرزانہ نے ایک دم چونک کر تانیہ کو دیکھا۔ انہیں ایسے بھلکی توقع نہ تھی۔ تانیہ کا اشارہ تو ان کی سمجھ میں آگیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنا شنک دور کرنے کے لئے پوچھا۔ ”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”اس کی جو ساری رات تھا کھڑا بارش میں بھیکتارہا۔“ تانیہ نے بتایا۔ ”نہیں تانیہ نہیں۔“ خالہ فرزانہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔“

”میں اپنے باب کے پاپ کو دھونا چاہتا ہوں۔ دونوں خاندانوں کو ایک کرنا چاہتا ہوں اور خدا کا شر ہے کہ محسن بھائی بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔ ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ میں آپ دونوں کی وسعت قلمی کی دار دیتا ہوں ورنہ میرے باب نے جو کیا ہے وہ قابل معافی تو نہیں۔“ اعتبار راؤ نے صاف گوئی سے کہا۔ ”آپ کے لئے کیا ممکناؤں۔ چائے یا مھنڈا؟“ یہ کہہ کر اس نے گھمنی بھائی۔

”تانیہ تم نے ایک قاتل کے بیٹے سے اچھی طرح پات کر کی، یہی میرے لئے کافی ہے۔“ ”اچھا، اب مجھے شرمende کرنے کی کوش نہ کریں۔ اس دن میں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی میں معدتر جا چکی ہوں۔“ تانیہ نے الجما آمیز لمحے میں کہا۔

”تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ سخت بے عزیز کرتی، تم نے تو پھر بھی ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ چھوڑا۔ میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔“ ”اچھا، بس بس۔“

اتنی دیر میں چپر اسی اندر واصل ہوا۔ اسے دیکھ کر تانیہ نے اعتبار راؤ سے پوچھا۔ ”ہاں، کیا؟“ ”کافی مل جائے گی۔“ ”ہاں کیوں نہیں۔“ تانیہ نے کہا، پھر وہ چپر اسی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”کافی بنا، ابھی کی۔“

”تانیہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم کہیں باہر چل کر کافی پی لیں۔“ اعتبار راؤ نے چھبھکتے ہوئے فرمائش کی۔ ”بالکل ممکن ہے۔“ تانیہ نے خوش دلی سے کہا۔

”تو پھر چلیں..... کسی اچھے سے ہوٹل میں چل کر کافی پیتے ہیں۔“ چپر اسی جاتے جاتے ترک گیا تھا۔ اور تانیہ کے جواب کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر تانیہ نے کہا۔ ”بل، ٹھیک ہے کافی کی ضرورت نہیں، میں باہر جا رہی ہوں۔“

پھر دو چار ملاقوں میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ دونوں ایک دوسرے پر اعتبار کرنے لگے اعتبار راؤ کو تو خیر تانیہ پر اعتبار تھا لیکن تانیہ اس کی طرف سے بھلکوک تھی۔ اب یہ شک بھی جاتا ہے۔ اعتبار راؤ نے اپنے قول کے مطابق تمام کاغذات و کیل سے تیار کرو کے اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ سچا تھا، اب اس میں کوئی شبہ نہ رہا۔ اعتبار راؤ نے اپنے پچھے جذبے پر خلوص رویے اور اپنی ثابت قدی سے تانیہ کے دل میں جگہ بنا لی۔ اب وہ اس کی راہ دیکھنے لگی۔ وہ اگر ایک دن نہ ملتے تو یہ محسوس ہوتا جیسے آج کا دن طاوع ہوا ہی نہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چیز نہ آتا۔ پھر رات کو اپنے بیتروں پر لیٹئے ٹیلیفون کے تاروں کے ذریعے اپنے نیک جذبات کا انہصار کرتے۔

یہ حال کچھ اس طرف بھی تھا۔ اعتبار اور تانیہ کی محبت تو نہیں تھی لیکن نادرہ اور محسن راؤ تو ایک عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ہاں، یہ اور بات کہ ایک طویل عرصے کے بعد تجدید محبت ہوئی تھی۔ اب حال یہ تھا کہ جب تک وہ ایک دوسرے سے مل نہ لیتے، بے قرار دلوں کو چین نہ آتا۔

تائیے نہیں چاہتی تھی کہ اس چاقو کو گھر میں رکھا جائے لیکن محسن راؤ نے اس چاقو کو اپنے بیٹر دوم میں جا بیٹھا۔ وہ چاقو اس نے ایک خوبصورت پلیٹ میں، سماں میں پر رکھ لیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اس پر اس کی نظر پڑتی رہتی تھی۔

تائیے اعتراض کیے کرتی؟ اس نے خود ایک کر شل کے خوبصورت گلدان میں کلی سجائی ہوئی تھی۔ جس پر اٹھتے بیٹھتے اس کی نظر پڑتی رہتی تھی۔ اگر یہ محبت کی نشانی تھی تو وہ چاقو بھی کسی کی نشانی تھا، اسے بہت کچھ یاد دلا تھا۔

درخت کی شاخ پکڑے، تائیے اپنے خیالوں میں گم تھی کہ پچھے سے محسن راؤ آیا اور اس کے نزدیک آکر خاموشی سے لکھرا ہو گیا۔ کسی کے نزدیک کھڑے ہونے کا احساس ہوا تو تائیے نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔

”خیریت تو ہے، کہاں گم تھیں؟“ محسن راؤ لان میں پچھی میزکی طرف بڑھتا ہوا بولا۔
رفیق اس میز کو چائے کے لوازمات سے سجара بیٹھا۔

”محجے وہ کینی یاد آگئی تھی۔“
”راکھی۔“ محسن راؤ ہنسا۔

”اس بھروس کا نام نہ لایا کریں، اسے راکھ کما کریں۔“ تائیے جعل کر بولی۔
”تائیے، اب اس بات کو بھول بھی جاؤ، اب تو میرا بازو بھی ٹھیک ہو گیا۔“

”میں اسے بھول نہیں ہوں، مجھے وہ جس دن بھی نظر آگئی، اپنے گارڈ سے کہ کر اسے گولیوں سے چھکنی کروادوں گا۔“ تائیے نے غصے میں کہا۔

”اچھا..... جو مرضی آئے کرنا، چلواب چائے پی لو۔“ محسن راؤ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنے ساتھ چلے چلا۔ ”ہاں، وہ خالہ فرزانہ کماں ہیں، انہیں نہیں بلایا ہے۔“

”نہیں۔ میں ان کی چائے خود لے کر کرے میں جاؤں گی، مجھے ذرا آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“ ”لیکی کیا بات ہے جوان کے سامنے نہیں کی جاسکتی۔“ محسن راؤ نے کری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہے تا، ایک ایسی بات؟“ تائیے بولی۔
”وہ کیا؟“ محسن نے پوچھا۔

”ان کی شادی کی بات۔“

”ان کی شادی کی بات۔“ محسن راؤ نے حیرت سے دہرا یا۔ پھر قدم دیتے چاہتے ہوئے بولا۔ ”یعنی خالہ فرزانہ کی شادی کی بات۔“

”بھی۔“ تائیے نے بڑے یقین سے کہا۔
”کس سے۔“

”آپ پھر پریشان ہوں گے۔“ تائیے نے نہیں کر کما۔ ”اٹکل عامر سے۔“
”ہیں۔“ وہ واقعی پریشان ہو گیا۔

اور جب تائیے نے ان دونوں کے عشق کی دستان سنائی تو وہ مزید حیرت میں بٹلا ہو گیا۔ پھر وہ دونوں

”میں نے اگرچہ اٹکل عامر سے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھیں یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ بہت اکیلے ہیں، وہ آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔“
”جو ہوتا تھا۔ وہ ہو چکا۔“ خالہ فرزانہ نے آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر رخساروں پر لڑکتے گے۔

”اگرچہ، آپ بے بھی، میں نے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھیں یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ خود بھی بہت اکیلے ہیں۔ آپ آج تک بہنیں مس کرتی ہیں۔“

”بس کرتائیے بس۔“ ان کی آواز گلے میں رندھنے لگی۔ ”بھولی ہوئی داستان کو اب یاد رکھ لے۔“ ”آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں، اٹکل عامر سے۔“ تائیے کسی طور پر ہونے کو تیار نہ تھی۔ بالآخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہ کہ وہ تائیے کے کمرے سے چلی گئیں۔ اس نے انہیں روکنے کی کوشش نہ کی۔ آج کے دن اتنا ہی بہت تھا۔ اس نے ماہ سال کی راکھ میں دبی چنگاری کو اچھی طرح کر یہ دیا تھا۔

اب اس دبی پنچاری کو باہر نکال کر ہوادیئے کی ضرورت تھی آکر وہ بھڑک اٹھے۔ اور یہ کام وہ پوری احتیاط سے کرنا چاہتی تھی۔

خالہ فرزانہ کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکل کر کچن میں پہنچی، وہاں رفق شام کی چائے کی تیاریوں میں عصروف تھا۔ تائیے نے رفق سے پوچھا۔ ”صاحب، کہاں ہیں؟“

”صاحب ابھی اٹھے ہیں، شاید باہر روم میں ہیں۔“ اس نے بتایا۔
”اچھا تم یوں کر دو، میں باہر لان میں جارہی ہوں۔ ہم چائے وہیں بیس گے صاحب سے کہ دینا۔“

”بھی اچھا۔“ رفق نے مودبانہ انداز میں کہا۔
”تائیے شلیت ہوئی اس درخت کے نیچے پہنچی جہاں اس نے راکھی کو بنھا کر اس کی تصویر بنا لائی تھی تو ایک دم اس کی نگاہوں میں سارا منظر گھوم گیا۔ اگرچہ محسن راؤ کا ذمہ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا لیکن وہ آج بھی اپنی اس حیات پر شرمende ہوتی تھی کہ وہ خواہ نخواہ ایک تماشے والی کو اپنی کوئی پر مدعا کر بیٹھی۔ خدا نخواست اگر اس کا چاقو ٹھیک نہ شانے پر لگ جاتا تو وہ یقیناً اس صدرے سے پاکل ہو جاتی۔

راکھی بھی عجیب عورت تھی۔ اس کی محبت نفرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ کسی زخمی ناگن کی طرح محسن کو تلاش کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے ٹوٹنے کی کوشش کی۔ وہ تو اپر والے نے محسن کو چجادیا ورنہ راج مراری کی بیٹی تو اپنا ہاتھ دکھا چکی تھی۔

محسن راؤ نے اس چاقو کو اپنے پاس بہت احتیاط سے رکھ لایا تھا۔ یہ راج مراری کا چاقو تھا۔ اس چاقو کو وہ بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اسی چاقو نے اسے بچپن میں قتل ہونے سے بچایا تھا۔ اور وہ چاروں قاتل میں کے کٹ کٹ کرتے گرتے اعضا دیکھ کر دہشت زدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔

”یہ نہیں معلوم ہو سکا۔“ آصف صدیقی نے کہا۔
”کمال سے کیا گیا ہے اغواء“
”گھر کے باہر سے۔“ آصف صدیقی نے بتایا۔
”تمہیں کسیے معلوم ہوا۔؟“

”میں جب اسے ڈھونڈتا ہوا، اس کے گھر پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کے گھر کی لائیں تو جلی ہوئی ہیں لیکن گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ شاید پڑوس کے لوگوں کو کچھ معلوم ہو، برادر والی کو بھی کی کال تبلیجی۔ باہر آنے والے شخص سے جب میں نے اعتبار راؤ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اعتبار راؤ نے ہمیں اپنی مخفی میں مدعا کیا تھا۔ جب میں اپنی بیوی کے ساتھ ہوٹل جانے کے لئے باہر کلا تو اعتبار راؤ اپنے لازم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں ان کی گاڑی کی طرف بڑھے۔ تمہی ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح سر پر آگئی۔ کھٹاکھٹ کئی مسلسل افراد باہر آئے۔ اور انہوں نے اعلیٰ کے نور اعتبار راؤ کو اپنی جیپ میں بٹھایا۔ جبکہ دو افراد ان کی گاڑی میں سوار ہو گئے جس میں ان کا لازم شہزاد میٹھا ہوا تھا۔ اور پھر وہ دونوں گاڑیاں آنا فنا نظر وہیں سے اوچھل ہو گئیں ہم دونوں گھبرا کر اپنے گھر میں داخل ہو گئے اور.....“

”کیا اس شخص نے پولیس کو اطلاع دی۔؟“ محسن راؤ نے جلدی سے اس کی بات کافی۔
”میں۔“ آصف صدیقی نے بتایا۔

”اوپر چلو سب سے پہلے مغلقتہ تھا نے میں اس واردات کی روپورت درج کرتے ہیں، اس کے بعد آگے کی سوچیں گے۔“ محسن راؤ نے آصف صدیقی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”لیکن محسن تمہاری مخفی کیا ہو گا۔؟“ انکل عامر نے فراہم اعلاء کی۔

”اپنی بہن کی مخفی سے پہلے میں اپنی مخفی بھلاکس طرح کر سکتا ہوں۔“ محسن راؤ نے فیصلہ کن انداز لئے کہا۔

”اور یہ مہمان۔؟“ انکل عامر نے قلم مند ہو کر پوچھا۔

”کوئی مہمان کھانا، کھائے بغیر بیان سے نہ جائے، یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔“ محسن راؤ نے انکل پاہر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں آصف کے ساتھ تھا نے جا رہا ہوں۔“

یہ کہ کہ وہ دونوں تمیں سے باہر نکل گئے۔ مخفی ملتوی کرنے کے سوال کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ویسے یہ بات چھپنے والی نہ تھی، اور اس بات کو چھپانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ جلد ہی سب کو معلوم ہو گیا۔

اس واردات نے تانیہ کو بہت متاثر کیا۔ وہ ہنسنی بھتی ایک دم خاموش ہو گئی۔ وہ اس وقت خالی رزانہ سے بات کر رہی تھی۔ وہ انہیں جیبھر رہی تھی۔ بار بار ان کی توجہ انکل عامر کی طرف مبذول کر رہی تھی۔ جو سوٹ پہنچ ادھر سے ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔ وہ اچھے لگ رہے تھے۔
تجھی یہ روح فرسا اطلاع آئی۔ تانیہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ نادرہ اس کے برابر ہی بیٹھی تھی، اس نے نورا سے سنبھالا نادرہ کو ایک خوبصورت تقریب ملتوی ہو جانے کا بے حد افسوس تھا لیکن وہ اتنی خود غرض نہ

بنت دیر تک ان کے بارے میں باتش کرتے رہے۔ تانیہ نے بار بار اپنے اس عزم کو دہرا یا کہ وہ ہر قسم پر ان دونوں کی شادی کردا کر رہے گی۔ خالہ فرزانہ کا معاملہ ابھی دور تھا انہی تو خود تانیہ کی مخفی سرپر تھی۔ جب مخفی کا دن آیا تو وہ ہو گیا جس کی کوئی توقع نہیں تھی۔

اس دن، اس بڑے ہوٹل کا شادی ہال مہماںوں سے پر تھا۔ ہر طرف رنگ و نور کی بارش تھی۔ نقشہ بکھر رہے تھے۔ نادرہ، تانیہ اور محسن راؤ اسی پر بیٹھے تھے۔ اعتبار راؤ ابھی نہیں پوچھا تھا، حالانکہ اب تک اسے پہنچ جانا چاہئے تھا۔

تانیہ کی نظر اس بار بار اٹھتی تھیں اور پھر ہالیوس ہو کر لوٹ آتی تھیں۔
محسن راؤ کے چہرے پر بھی فکر کے اثمار غمودار ہوتے جاتے تھے۔

جب وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ اور پھر ہو گیا تو چاروں طرف سکھلی بیٹھی۔ انکل عامر محسن راؤ کے پاس آئے اور بولے۔ ”محسن، سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا معاملہ ہے۔ اعتبار راؤ نہ گھر پر ہے اور نہ سینما پر۔ گھر کی مخفی مسلسل بیٹھ رہی ہے، کوئی اٹھانا نہیں۔ سینما پر میجر نے بتایا کہ وہ آج سینما آئے ہی نہیں۔“

”اوہ۔“ محسن راؤ یہ سن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آصف صدیقی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور ساری صورت حال تائی۔ معاملے کی نزاکت سمجھ کر آصف صدیقی نے کہا۔ ”اچھا تم پریشان نہ ہو، میں اس کے گھر جا کر دیکھتا ہوں۔ ابھی بلکہ لاتا ہوں۔ شادی بیاہ کے موقع پر دیر ہو ہی جاتی ہے۔ کیس دہ بیوی پارلائے چلا گیا ہو۔“

آصف صدیقی نے بات پر مراجعت کیا اور معاشرے کی تیکنی کم کرنا چاہی اور پھر وہ فوراً ہی ہال سے باہر چلا گیا۔
سممان پریشان ہو رہے تھے کہ آخر مخفی کی رسم کب ادا کی جائے گی۔ جب دو گھنٹے گزر گئے اور آصف صدیقی بھی پلٹ کرنا آیا۔ اور نہ ہی فون پر کوئی اطلاع ملی تو انکل عامر نے محسن راؤ سے کہا۔ ”تمہاری اور نادرہ کی رسم ادا کر دیتے ہیں۔ سارے سمنان پریشان ہو رہے ہیں۔“

”نہیں انکل، اپنی مخفی سے پہلے، میں اپنی بہن کی مخفی کی رسم ادا کرنا چاہوں گا۔“
”وہ اور اگر کسی وجہ سے اعتبار راؤ نہ آیا تو۔“ انکل عامر نے خدش ظاہر کیا۔
”تو مہماں کو بغیر مخفی کے ہی کھانا کھلادیا جائے گا۔“ محسن راؤ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
ابھی یہ بات ہوتی رہی تھی کہ آصف صدیقی سامنے سے آتا کھائی دیا۔ اس کامنہ لٹکا ہوا تھا۔ وہ تھیں کوئی اچھی خبر نہیں لایا تھا۔

”کیا ہوا؟“ محسن راؤ نے آگے بڑھ کر بے قراری سے پوچھا۔
”اعتبار راؤ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“ آصف صدیقی نے پریشان کن خبر سنائی۔
”اغوا کر لیا گیا۔“ یہ خبر بھلی بن کر محسن راؤ پر گری۔ پھر اس نے اپنے ہوش و حواس قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کس نے کیا ہے اغواء؟“

”پھر جانتے بوجھتے مکھی نگل رہا ہے۔ اپنے خاندان کے نام پر بڑا لگا رہا ہے۔“

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے تایا کو قتل کس نے کیا۔؟“

”اچھا۔ رواز احمد علی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔“ اور تو کیا کیا جانتا ہے۔؟“

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اب سے میں بائیں سال پلے محض راؤ کو قتل کروانے کی سازش کس نے لی۔“ اعتبار راؤ نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”آفتاب..... اقبال سن رہے ہو بھی۔“ رواز احمد علی دونوں سے مخاطب ہونے کے بعد اعتبار راؤ کی لرف مڑا۔ ”وہ کس نے کی۔؟“

”ابھی؟ آپ نے۔“ اعتبار راؤ نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”آپ نے بڑے ٹلم کئے ہیں۔ ان دگوں پر۔“

”سن رہے ہو، تم دونوں۔“ رواز احمد علی نے آفتاب راؤ اور اقبال راؤ کی طرف دیکھا۔ ”ہم نے بڑے ٹلم کئے ہیں، ان لوگوں پر..... یہ تو مجھے اپنا بیٹا لگتا ہی نہیں۔ پہنچنے کس وقت کی پیدائش ہے۔ س میں زمینداروں والی کوئی بات نہیں، یہ بات میں تم دونوں سے یعنیش کھتا آیا ہوں۔ اسی لئے میں نے س مصیبت کو کچھ وے والا کریماں سے نکال دیا تھا مجھے خدشہ تھا کہ کہیں یہ تمیں اپنے رنگ میں نہ بگ لے..... مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ لاہور جا کر یہ ہمارے وشمنوں سے مل جائے گا تو میں اسے کبھی ہاں نہ جانے دیتا۔ بھی یہ تو بتتے ہی بے وقوف تباہت ہوا۔“

”ابھی، شادی کرنا کوئی بے وقوفی کی بات نہیں۔ سمجھی کرتے ہیں۔ آپ نے بھی کی تھی۔“

”گدھے کے بچتے۔ میں نے شادی کی تھی تو اپنے ہاتھ سے کچھ گنوایا نہیں تھا۔ لیا ہی لیا تھا۔“ وہ نہ کر بولا۔

”میں شادی کو دو زندگیوں کا بندھن سمجھتا ہوں، آپ کی طرح تجارت نہیں۔“ وہ رواز احمد علی کی اٹھ پیٹ سے متاثر ہوئے بغیر پورے اطمینان سے یولا۔

”اوچھر..... اب مجھے معلوم ہو گیا کہ تو بتتے ہو اٹھو۔ اگر آلوہ نہ ہوتا اپنی موت کے پروانے پر کبھی سخت نہ کرتا۔“ رواز احمد علی نے اسے اپنی بڑی بڑی خونی آنکھوں سے دیکھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”اور وہ کافنڈ جو تو نے تیار کرو کر اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔ جس میں تو نے اپنے حصے کی جاندا رہا۔“

”بلکہ کمر اور طلاق کا حق لڑکی کے نام منتقل کرو یا۔ وہ سب کیا ہے۔“

”میں نے ایسا کوئی کافنڈ نہیں تیار کروایا۔“

”اچھا، ایک تو حماقیں کرتا پہرتا ہے اور اور پر سے جھوٹ بھی بولتا ہے۔“ رواز احمد علی نے غصے سے ملا۔

”پھر وہ اقبال راؤ سے مخاطب ہو کر بولا۔“ اقبال راؤ، اس ڈاغنڈ کی فزوں ایشیت تو کھا اس بدجنت

اقبال راؤ نے میزکی و راز سے ایک کافنڈ نکالا اور رواز احمد علی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رواز احمد علی نے اس

اندر پر ایک نظر ڈالی اور اس کی طرف اچھا لئے ہوئے بولا۔ ”لے دیکھ اسے اور اب کر انکار۔“

تمی کہ اپنی انگلی میں مخفی کی انگوٹھی پہن کر بیٹھ جاتی۔ تانیہ کو دیسے بھی وہ بہت چاہنے لگی تھی۔ اس کا درکے اب اپنا دکھ تھا۔

اکل عامر نے تانیہ، ناورہ اور خالہ فرزانہ کو افضل کے ساتھ گھر روانہ کر دیا اور وہ خود وہیں رہ گئے۔ اس وقت وہ شدید صدمے سے ووچار تھے۔ خدا غدا کر کے تو یہ وقت آیا تھا۔ محض اور تانیہ کو ایک طویل عرصے کے بعد خوشیاں میر آئی تھیں۔ اعتبار راؤ سے مخفی کرانے میں اکل عامر نے بھی کوشش کی تھی۔ وہ دل سے چاہتے کہ یہ خاندان کی طرح ایک ہو جائے اُگر خاندان ایک نہ ہو تو وہ شمنوں کا کوئی ایک فردی ووست ہو جائے۔

اعتبار راؤ خود ہی وشمنوں کی صفت سے نکل آیا تھا اور ان لوگوں نے اسے وحکما نہیں تھا، خوشیوں سے اپنا لیا تھا اپنا بنا لیا تھا لیکن یہ بات و شمنوں کو اچھی نہ گئی تھی۔

اور عین اس وقت جب وہ مخفی کی انگوٹھی پہننے جا رہا تھا۔ اسے اس کے باپ نے ان غواء کروالا تھا۔

رواز احمد علی اس وقت حیلی کے برآمدے میں بے چینی سے مل رہا تھا۔ بار بار اس کی نظر کلائی کی گھڑی پر پڑ رہی تھی۔ آفتاب اور اقبال راؤ بھی اپنے کمروں سے نکل آئے تھے۔ وہ بھی اعتبار راؤ کی آمد کے منتظر تھے۔

توہڑی دیر کے بعد ہی حیلی کا گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ اور اس کے بعد وہ گاڑیاں اندر واصل ہوئیں۔ گاڑیوں کو وکھے کر رواز احمد علی حیلی کے اندر چلا گیا۔ اور اپنے کمرے میں جا کر اس اونچی کر سی پر بیٹھ گیا جس پر بیٹھ کر وہ انسان نہیں رہتا تھا۔

پکھو دیر کے بعد اپنے اپنی میں بھاری قدموں کی آواز آئی۔ پھر کھلے دروازے سے سب سے پہلے اعتبار راؤ واصل ہوا اس کے پیچھے دسلی بندے تھے۔ جو دروازے پر ہی رک گئے۔ اعتبار راؤ سینہ تانے پر قدر چال چلتا ہوا باپ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ آفتاب راؤ اور اقبال راؤ، اپنے باپ کے وائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

”آئیے، آئیے، ولما میاں تشریف لائیے۔“ رواز احمد علی نے اپنی بڑی بڑی خونی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اپنی بھاری مٹھیں مروڑنے لگا۔ ”آپ کو مخفی مبارک ہو۔“

”ابھی، یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔“ اعتبار راؤ نے غصے سے کہا۔ ”رواز احمد علی نے سخت لمحے میں کہا۔“ اور یہ تو نے اچھا کیا ہے کہ باپ سے پوچھنے بغیر مخفی طے کر لی۔ ”رواز احمد علی نے سخت لمحے میں

”میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہوں۔“

”تھمی ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے چلا ہے، جس کے باپ کا بھی پتہ نہیں۔“ رواز احمد علی نے اڑام لگایا۔ ”تانیہ، میرے تیار اور شادا علی کی بیٹی ہے۔“ اعتبار راؤ نے بڑے عینے سے کہا۔

”اوہ، تایا۔“ رواز احمد علی نے طنزیہ اندازی کی۔ ”تجھے شاید معلوم نہیں کہ اس کے بیان جو یعنی ہوئی تھی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہمارے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“

”میں بھائی، یہ سب آپ کے بھلے کے لئے ہے۔ ہم آپ کو انھے کنوں میں نہیں گرنے دیں گے، آپ بہت سیدھے آدمی ہیں۔ وہ لوگ آپ کو لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے بھائی کو لٹنے نہیں دیں گے۔“ اقبال راؤ نے کہا۔

اعتبار راؤ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اس نے خاموشی سے آگے قدم بڑھا دی۔ اور سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

اس کے کمرے میں واخن ہوتے ہی وروازہ بند ہو گیا، اور اعتمدار راؤ نے تالاڑا لے جانے کی آواز سنی۔

اعتبار راؤ نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ گھمائی۔ اور پھر ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ اسی کام کرہ تھا۔ اس کمرے کو چھوڑے ہوئے اسے ایک طویل عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کی ساری چیزیں جوں کی توں تھیں۔ طویل عرصے تک کرہ بذریعے کی وجہ سے یہاں گرو و غبار ہونا چاہئے تھا، لیکن ایسا نہیں تھا۔ کمرے کی ہر چیز آئینے کی طرح چکر ہی تھی۔ اس کی آمد سے پسلے یہاں کی صفائی کرو گئی تھی۔ گویا ان کو اعتمدار راؤ کے اغوا کا یقین تھا۔

اعتبار راؤ کو یکایک لاہور کی یاد آئی۔ اس کے ول کی ہڑکن تیز ہو گئی۔ وقت مقررہ پر ہوٹل نہ مچنپے پر جانے والے کیا ہوا ہو۔ تانیہ تو اس کی طرف سے پسلے ہی ملکوں تھی، اب عین وقت پر غائب ہو جانے کی وجہ سے اس کا شہر یقین میں بدلتا ہوا گا۔ اس پر سے اس کا اعتمدار اٹھ گیا ہوا گا۔ وہ اس کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا۔

وہ پریشانی کے عالم میں اٹھ کر ٹھلنے لگا۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد وروازے پر کھڑک رہا۔ ہمیں قتل کھولا جا رہا ہو۔ پھر وروازہ کھلا اور ایک ملازمہ کھانے کی ٹرے لے کر اندر آئی۔ اس نے وہ ٹرے میز پر رکھی اور پھر ہر سے موبائل انداز میں بوی۔ ”کھانا کھالیں سر کار۔“

اعتبار راؤ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ملازمہ واپس چل گئی اور وروازہ پھر سے مقتل ہو گیا۔ دوسرا دن صبح کو جب اقبال راؤ ایک ملازم کے ساتھ ناشترے لے کر آیا تو اس نے ویکھا کہ اعتمدار راؤ سوٹ پسے پیڑ پر پڑا سورا ہے۔

اقبال راؤ نے اسے ہلا کیا۔ ”بھائی ناشترے کرلو، اٹھ جاؤ، صبح ہو گئی۔“

اعتبار راؤ نے آنکھیں کھول دیں اور پھر فرآئی اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”اقبال مجھے نیلیفون چاہئے۔“

”بھائی کیا پولیس کو فون کرنا ہے۔؟“ اقبال راؤ نے بڑی مخصوصیت سے پوچھا۔

”فضول باتیں مت کرو، میں تانیہ سے بات کرنا چاہتا ہوں..... بے شک تم مجھے نمبر ملکر دے دیں۔“

”ابا جی سے پوچھنا پڑے گا۔“ اقبال راؤ بولا۔

وہ کافی اعتبار راؤ کے قدموں میں گرا۔ اس نے جگ کر اسے اٹھایا اور جب اس پر نظر راوی تو اس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ یہ اسی کاغذ کی فتوٹ کا پلی تھی جو اس نے تیار کر رکھا تھا۔ لیکن اس کاغذی نظر پر شباز کے ذریعے ہوا ہے۔ وہ راوی احمد علی سے ملا ہوا ہے۔ یہ کام تیجی طور پر شباز کے ذریعے ہوا ہے۔ انسان کو بکتے کیا ویر گئی ہے۔

”یہ کاغذ آپ کو کس نے فرمایا کیا؟“ اعتمدار راؤ نے دھیرے سے پوچھا۔

”کالے چور نے۔“ راوی احمد علی نے غصے سے کہا۔ ”کسی نے بھی دیا ہو۔ تجھے اس سے کیا، تو یہ بتا کر یہ غلط ہے۔“

”میں، یہ بالکل صحیح ہے، یہ کاغذ میں نے ہی تیار کروا یا ہے۔“ اعتمدار راؤ نے بالآخر اقرار کر لیا۔

”راوی احمد علی کا بیٹا اور اس قدر گدھا..... ارے امتحن یہ تو کیا کرنے جا رہا تھا۔ تجھے کچھ اندازہ ہے۔ ایسا اس لڑکی میں کیا ہے۔ کچھ دیرے لگے ہیں اس میں اس سسری کے توباب کا بھی پتہ نہیں۔ اعتمدار راؤ تو نے تولیا ہی ڈبو دی۔ اب بتا، میں تیرا کیا کروں۔“

”میں لاہور جاؤں گا اور رہنمیت پر شادی کروں گا۔“ اعتمدار راؤ نے پناہی صلہ سادا یاد کیا۔

”شادی تو تو بعد میں کرے گا پسلے تو لاہور جا کر وکھ۔“ راوی احمد علی غصے سے کھڑا ہو گیا اور پھر اقبال راؤ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اقبال، اس بے وقوف کو کچھ عقل سکھا۔ اور جب تک اسے عقل نہ آجائے۔ انتہے حوالی میں قید رکھ۔ جا اس آلو کو میرے سامنے سے لے جا۔ کہیں یہ میرے ہاتھوں مارانے جائے۔“ یہ کہ کروہ کرے سے نکل گیا۔

”آؤ، چلو بھائی۔“ اقبال راؤ اس کے نزدیک آکر بولا۔

”اقبال میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”بھائی آپ نے کہیں نہیں جانا، صرف اپنے کرے تک جانا ہے۔ وہاں چل کر آپ آرام سے رہیں۔“

”میں، ہر گز نہیں، میں اس منہوس حوالی میں ایک لمحہ بھی نہیں رکوں گا۔ میں اسی وقت لاہور جاؤں گا۔“ اعتمدار راؤ نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

تب اقبال تیزی سے قدم بڑھا کر اس کے سامنے آگیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلایا کہ اس کا راستہ روک لیا۔ اور آفتاب راؤ کو کوئی اشارہ کیا۔

آفتاب راؤ نے اس کا اشارہ سمجھتے ہی زور سے آواز لگائی۔ ”کالو، بندے، شاہ۔“ اس کی آواز سن کر پلک چھکتے ہی تین خونوار بندے اندر واخل ہوئے۔ وہ تینوں مسلح تھے۔ اندر آگر اقبال راؤ کے پیچے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”حکم سرکار۔“

”اب کیا کہتے ہو بھائی۔“ اقبال راؤ نے مکرا کر اسے ویکھا۔

”تم مجھ پر ظلم کر رہے ہو، اقبال۔“

ہو کر لٹا۔ اسے بہت زور کی بھوک لگی تھی خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اور اقبال راؤ کے آنے کا انتظار رنے لگا۔

دوپہر کو ایک ملازمہ کھانا لے کر آئی اور اقبال کا پیغام دے گئی کہ وہ چار بجے تک آئے گا۔ اقبال راؤ پنے وعدے کے مطابق اس کے کرے میں آپ سچا۔ یہ وہ وقت تھا جب راؤ احمد علی آرام فرمایا کرتے تھے۔ آرام تو آفتاب راؤ بھی کرتا تھا لیکن وہ آج صبح ہی سے کہیں گیا ہوا تھا۔

لاسن لکیر تھی لیکن اقبال راؤ اپنا طینان کر لیتا چاہتا تھا۔ اس نے اعتبار راؤ سے پوچھا۔ ”بھائی، آپ نے تانیہ سے کیا بات کرنی ہے۔“

”صرف یہ کہنا ہے کہ میں خیریت سے ہوں۔“

”آپ کے خیال میں کیا سے آپ کے ان غواء کی اطلاع ہو گئی ہوگی۔“

”ہاں بالکل..... اس لئے کہ میرے پڑوی نے مجھے ان غواء ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔“

”لیکن آپ ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ اسے یہ مطلع کرنے کی کوشش مت یکجھے گا کہ آپ اس قت کماں پیں اور آپ کو کس نے ان غواء کروا دیا ہے۔ اگر بھائی آپ نے ایسا کیا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”میں آپ کو ایک جملے سے زیادہ نہیں بولنے والوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اعتبار راؤ نے یہ بات بھی مان لی۔

”آج ایسیں پھر۔“ اقبال راؤ اخalta ہوا بولا۔

”ہو اسے اپنے ڈرائیکٹر دوم میں لے آیا اور اپنی گود میں ٹیلیفون رکھ کر بولا۔“ ہاں، بھائی نمبر ناؤ۔ اعتبار راؤ نے نمبر داں کیا۔ اس نے نمبر داں کیا۔ لاسن فوراً مگر وہ گھنٹیاں بجھنے کے بعد ادھر سے شفٹ نے فون اخھایا۔ ”بیلو۔“

”مجھے تانیہ بی بی سے بات کرنی ہے۔ انہیں جلدی بلاسیں۔“ اقبال راؤ بولا۔

”اچھا ہی، آپ ایک سیکنڈ ہولڈ کریں۔“ یہ کہہ کر سبق نے رسیور رکھ دیا۔

”کسی مروں نے ٹیلیفون اخھایا تھا، اب وہ تانیہ کو بلا نے گیا ہے۔“ اقبال راؤ نے رسیور پر ہاتھ رکھتے ہوئے اعتبار راؤ کو اطلاع دی۔

”فوراً ہی ایک نوافی آواز سنائی وی۔“ ”بیلو۔“

”آپ کون ہیں؟ کیا آپ تانیہ ہیں۔“ اقبال راؤ نے پوچھا۔

”بھی، بھی..... میں تانیہ بول رہی ہوں۔“ ادھر سے گھبرا کر کہا گیا۔

”یجھے اعتبار راؤ سے بات یکجھے۔“ یہ کہہ کر اقبال راؤ نے رسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور ٹیلیفون پنی گود میں ہی رہنے والے۔ اور اپنی انگلی ٹیلیفون کی لاسن کاٹنے کے لئے تیار کر لی۔

”تانیہ میں جہاں بھی ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔ اثناء اللہ جلد تم تک پہنچوں گا، کسی قسم کی فکر نہ رہا۔“

”کیا تم سارے کام ابھی سے پوچھ کر کرتے ہو۔ تم اتنے فربانہ دار کب سے ہو گے۔“

”جب سے بھائی تم نیمان آئے ہو۔“ اقبال راؤ نے فس کر کہا۔ ”بھائی ایک بات بتاؤ۔ تم تانیہ کے چکر میں کس طرح پڑ گئے۔“

”تم لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے۔“ اعتبار راؤ نے صاف گوئی اختیار کی۔

”اچھا بھائی، اب خدا کے لئے عذاب ٹوپ پر تقریر شروع نہ کر دتا۔ ہم دنیا میں اس لئے نہیں آئے کہ عذاب ٹوپ کا حساب لے کر بیٹھے جائیں۔ ودون کی زندگی ہے۔ اگر وہ بھی عیش میں نہ گزاری تو پھر ایسی زندگی کا کیا فائدہ۔“

”جس طرح کی زندگی تم لوگ گزار رہے ہو بالآخر اس کا ایک ون خیاہہ ہجھتو گے۔“

”بھائی ہم تو خود مظلوم ہیں، ویکھتے نہیں ابھی جانکرو اور ساتھ بنے بیٹھے ہیں۔ بندھی کی رقم ملتی ہے۔ تم تو پھر خوش قسمت ہو کہ لاہور میں عیش کرتے ہو۔ ابھی نے تمہیں اتنا کچھ دے دیا۔“

”مجھے جو کچھ انہوں نے دیا ہے، وہ میرے ہے کی جانکرو اکا ایک فیصد بھی نہیں اور یہ بات تم اپنی طرح جانتے ہو۔“

”لیکن بھائی تم تو درویش آدمی ہو، تمہیں جانکرو کی طلب ہی نہیں۔ تم نے اپنے ہے کی جانکرو بھی اس لڑکی کے نام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بھائی کیا تانیہ سے تمہیں بت محبت ہے۔“

”میں تم سے محبت کے موضوع پر کیا بات کروں، تم کیا سمجھو گے۔ تمہاری جان تو صرف پیسے میں ہے۔“

”تانیہ کو فون کر کے کیوں نہ تاوان طلب کیا جائے۔ یہ خیال ابھی آیا ہے۔“ ”وہ ڈھیٹ پن سے بولا۔“

”اسے کیا ضرورت پڑی ہے تاوان دینے کی۔“ اعتبار راؤ نے جواب دیا۔

”کیوں وہ تمہاری ہونے والی بیوی ہے، تمہاری محبت ہے۔ اگر وہ تاوان نہیں دے گی تو اور کون وے گا۔“

”تمہیں تاوان چاہئے۔“ اعتبار راؤ نے اسے گھور کر ویکھا۔

”بھائی تمہیں آزادی چاہئے۔“ اس نے اس سے لٹاسوال کیا۔

”ہاں، مجھے تو آزادی چاہئے۔“ اعتبار راؤ نے ووٹک لجھے میں کہا۔

”اچھا، پھر کچھ سوچتے ہیں۔“

”نی اخال ٹیلیفون کے بارے میں سوچو۔“

”بھائی تم کچھ تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھولو، ناشتہ کر لو، پھر میں جو یہی کا ایک چکر مار کر آتا ہوں۔“

اس کرے میں ٹیلیفون نہیں آسکتا۔ میں تمہیں اپنے کرے سے ٹیلیفون کرواؤں گا لیکن اس معاملے کی ہوا آفتاب بھائی یا ابھی کو نہیں لگانا چاہئے۔ میری بات سمجھے میں آگئی تا۔“ اقبال راؤ نے رازواری سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اعتبار راؤ فوراً کھڑا ہو گیا اور کچھ لے کر باقاعدہ روم میں گھس گیا۔ وہاں سے وہ نہ

”بس۔“ یہ کہہ کر اقبال راؤ نے لائیں کاٹ دی۔ ادھر سے وہ تانیہ کا جواب بھی نہ سن پا۔
”بھائی تانیہ سے بات ہو گئی، اب تو خوش ہو۔“ اقبال راؤ نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

”اقبال میں تمہارا شتر گزار ہوں۔“ ”اعتبار راؤ نے کہا۔

”یہ کام میں نے زبردست رسک لے کر کیا ہے۔ اگر ”جیل صاحب“ کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں نے ان کے قیدی کو نیلیفون کی سولت فراہم کی ہے تو وہ میری گردن اڑوا دیں گے۔“ اقبال نے مکراتے ہوئے کہا۔

”تم اب ابھی سے اس قدر ڈرتے کیوں ہو؟“

”بھائی آپ اب ابھی کو نہیں جانتے۔“

”میں جتنا انہیں جانتا ہوں، اس سے زیادہ جاننے کی خواہش بھی نہیں۔“ اعتبار راؤ نے بے نیازی سے کہا۔ ”لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ ٹلمکی ترسی کھینچنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اب ابھی سچھری بنائے بغیر و کٹ نہیں چھوڑیں گے۔“ اقبال راؤ نے ہنس کر کہا۔

”آج، بھائی چلوپانے کرے میں۔ آپ کی ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔“

اعتبار راؤ خاموشی سے اٹھاوارا پانے کرے میں آگیا۔

اقبال راؤ رات کو آنے کا وعدہ کر کے، دروازہ مغلن کر کے چلا گیا۔

وہ پہنچنیں رات کا کونسا پر تھا کہ اچانک اعتبار راؤ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا گلا خٹک ہو رہا تھا۔ اس

نے اٹھ کر پانی پا، گاتر ہونے پر اس کے کچھ حواس بحال ہوئے۔ اس نے سکے کے نیچے سے اپنی کلائی کی

گھڑی نکالیں اور وقت دیکھا۔ اس وقت ایک نج رہا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف آیا۔ اس نے کھڑکی کو کیوں تو ایک دم پروں کی پھرپھڑاہٹ سنائی دی۔ چیز

کوئی لڑکی پسند کر لی ہے۔“ کامنی نے ایک ادائے خاص سے کہا۔

”تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ اعتبار راؤ نے سچھری لجھے لجھے میں کہا۔

”لو بھلا، میں کیوں کروں گی، اعتراض..... مجھے تو خوشی ہے۔ آپ اپنی شادی میں مجھے تو بلا کیں گے

۔“

”شادی میں تو اس وقت بلاؤں گا جب تم لوگوں کی قید سے آزاد ہوں گا۔“

وہ ابھی کھڑکی بند کر ہی رہا تھا کہ پروں کی پھرپھڑاہٹ پھر سنائی دی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پسند

درخت پر آکر بیٹھا ہو۔ چند لمحوں بعد آواز آئی شروع ہو گئی۔ یہ آلو کے بولنے کی آواز تھی۔ بڑی عجب

اور پراسراری۔ اس نے سامنے نظر ڈالی تو اسے دو گول گول آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر دیکھا لیکن اندر ہی میں کچھ نظر نہ آیا۔ کھڑکی میں

سلالیں گی ہوئی تھیں۔ اس نے دو سلاخوں کو پکڑ کر زور سے ہلایا لیکن وہ نہ سے من نہ ہو گیں۔

وہ ابھی کھڑکی بند کر ہی رہا تھا کہ پروں کی پھرپھڑاہٹ پھر سنائی دی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پسند

درخت پر آکر بیٹھا ہو۔ چند لمحوں بعد آواز آئی شروع ہو گئی۔ یہ آلو کے بولنے کی آواز تھی۔ بڑی عجب

اور پراسراری۔ اس نے سامنے نظر ڈالی تو اسے دو گول گول آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دکھائی دیں۔ اس نے فرو

کھڑکی بند کر دی کھڑکی بند کرتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے آلوں نے ایک ساتھ چینا شروع کرو یا ہو۔

اعتبار راؤ نیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ نحوس بھری آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ جس جگہ

آلوبولے شروع ہو جائیں۔ وہاں دیرانی اور دھشت بر شا شروع ہو جاتی ہے۔ کیاں حولی کا آخری وقت

آگیا۔ وہ ابھی اس طرح کی باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر کھڑک رہا ہٹ محسوس ہوئی۔

اعتبار راؤ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اس وقت اس سے کون ملنے آ رہا ہے۔ اگرچہ اقبال راؤ

نے رات کو آنے کو کہا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کیا وہ آ رہا ہے۔ رات کے ایک بجے جب
چاروں طرف گورپ اندر ہی را چھایا ہوا ہے اور اُگوائی نحوس بھری آوازوں میں بول رہے ہیں، یہ ملاقات کا
کوشاو قت ہے بھلا۔

دروازہ کھلتا تو وہ چونک اٹھا۔ اقبال راؤ کی بیوی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی لیکن وہ اکیلی نہ تھی۔
فوراً نی اقبال راؤ کا چڑہ دکھائی دیا، اس نے اندر آ کر کرے کا دروازہ بند کر دیا۔
”بھائی، جاگ رہے تھے؟“ کامنی مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔

”بھائی، کامنی آپ سے ملے کی ضد کر رہی تھی، میں نے کہا کہ دن کی روشنی میں تو یہ ممکن نہیں،
رات کو چلیں گے۔ سو یہ مجھے اٹھالی۔“ اقبال راؤ نے باط بچھائی۔

”ہاں، آؤ کامنی، بیٹھو۔“ اعتبار راؤ نے کر سی کی طرف اٹھا رہے کیا۔ ”بس، ابھی تھوڑی دیر پہلے
میری آنکھ کھلی تھی۔ اٹھ کر پانی پا تو یہ سے آلوں کے بولنے کی آوازیں آئے گیں۔ یہ بڑی نحوس
کی شانی ہے۔ جان آلو بولنے شروع ہو جائیں، اس جگہ کو ویران ہوتے زیادہ دیر نہیں گئی۔“
”اوہ بھائی آپ بھی کیا عورتوں کی طرح باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ یہ کامنی تو مجھے کئی روز سے کہہ رہی
ہے۔ یہ کہ رات کو آلو بولنے لگے ہیں۔ میں کہتا ہوں، یہ کوئی نئی بات ہے۔ آلو رات میں ہی بولتے
ہیں۔“

”بھائی، الوکی آوازیں سن کر میرا دل بست ڈرتا ہے۔ یہ بڑا نحوس پر نہ ہے لیکن انہیں کسی بات کی
پرواہی نہیں۔“ کامنی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا بے وقوف جیسی بات کر رہی ہے۔ میں بھلا کیا کروں، انہیں بولنے سے کیسے روکوں۔“
”اچھا، چھوڑو، فضول باتیں، مجھے بھیسا سے باتیں کرنے دو، ہاں بھیا آپ سنائیں۔ سناء ہے آپ نے
کوئی لڑکی پسند کر لی ہے۔“ کامنی نے ایک ادائے خاص سے کہا۔

”تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ اعتبار راؤ نے سچھری لجھے لجھے میں کہا۔
”لو بھلا، میں کیوں کروں گی، اعتراض..... مجھے تو خوشی ہے۔ آپ اپنی شادی میں مجھے تو بلا کیں گے

۔“

”شادی میں تو اس وقت بلاؤں گا جب تم لوگوں کی قید سے آزاد ہوں گا۔“

”تو بھیا، یہ کوئی مشکل بات ہے۔ آپ زمینوں کے کافنڈ پر دستخط کر دیں۔ پھر آزادی ہی آزادی
ہے۔“

”بھائی، بات یہ ہے کہ آپ کو زمین جاندہاد سے کوئی بچپی تو ہے نہیں۔ آپ نے ویسے ہی اپنے
حصے کی زمین جاندہاد تانیہ کے نام منتقل کرنے کے کافنڈات تیار کرو کر رکھے ہوئے ہیں۔ بھائی آپ ایسا
کیوں نہیں کرتے کہ.....“ اقبال راؤ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس نے اپنی بیوی کامنی کی طرف دیکھا
اور بولا۔ ”تو بول نا۔“

کامنی کا اصل نام کوک تھا۔ ایک بد صورت سی موٹی بھددی عورت تھی۔ اس کے گھر والے اے

بیار سے کامنی کرتے تھے۔ اس حولی میں بھی آکر اس نے خود کو کامنی کہلوا یا۔ وہ ایک بڑے زمیندار کی

پھر اقبال راؤ ٹھیک چار بجے آپنچا۔ وہ دونوں حولی کے ایک خفیہ دروازے سے باہر لگئے۔ دروازے پر جیپ موجود تھی۔ وہ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ اعتبار راؤ نے دیکھا کہ ڈرائیور کے پر ابر ایک مسلح آدمی بیٹھا ہے۔ جیپ چل پڑی۔

”اقبال راؤ کیا باتی کو ہمارے یہاں سے جانے کا علم ہے۔؟“ اعتبار راؤ نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔ اگر انہیں علم ہوتا تو ہمیں خفیہ دروازے سے لٹکنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ظاہر ہے۔ یہ بات جبھی تو نہیں رہ سکتی۔ انہیں معلوم ہوا تو پھر کیا ہو گا۔“

”تم بے فکر ہو۔“ اقبال راؤ نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”باتی کو اب میں دیکھ لون گا۔ ان سے اب دو دو ہاتھ کرنے کا وقت آگیا ہے۔“

”بپ سے لڑو گے؟“

”جب کوئی باب حق نہ دے تو پھر حق چھیننا پڑتا ہے۔ بہت فرمادی داری ہو گئی بھائی۔“

اقبال راؤ صبح چار بجے حولی سے نکلا تھا، اسی دن مغرب سے پہلے وہ حولی والیں پہنچ گیا۔ وہ اپنی بیوی کو سمجھا کر نکلا تھا کہ اگر راؤ احمد علی اس کے بارے میں پوچھیں تو کیا جواب دیتا ہے۔ آقتاب راؤ کی طرف سے اسے کوئی ٹکرنا تھی کیونکہ وہ اسلام آئا گیا تو احترا۔ ایک ہفتے سے پہلے اس کی آمد ممکن نہ تھی۔ یہ وہ پارٹی کا نکٹ حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلا ہوا تھا۔ ایک ہفتے سے پہلے اس کی آمد ممکن نہ تھی۔ یہ بہترین وقت تھا۔ اقبال راؤ اس وقت سے فائدہ اٹھایا۔ چاہتا تھا۔

وہ لاہور سے راؤ احمد علی کا تختہ اتنے کا پورا اپورا انتظام کر کے آیا تھا۔ آج کی رات بڑے معركے کی رات تھی۔ اقبال راؤ حولی پہنچتے ہی سیدھا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراتی اور بولی۔

”سب خیر ہے؟“

”ہاں، میری طرف تو سب خیر ہے تو یہاں کی بتا۔“ اس نے پوچھا۔

”اوہ بھی سب خیر ہے۔ باتی آج جانیے ہی چکروں میں لگ گئے ہیں۔“ کامنی معنی خیز لمحے میں بولی۔

”چلو۔ یہ تو اچھا ہوا۔“ اقبال راؤ خوش ہو کر بولا۔

اسے اپنے باب کے سارے ”چکروں“ کا پتہ تھا۔ اسے یہ بات ابھی طرح معلوم تھی کہ ہر پندرھویں دن باتی کے خاص کمرے میں کیا ہوتا ہے۔ قھر کتے دن، طبلے کی تھاپ، گھنگھروں کی جھکار، مہ رخوں کے جلوے، بیناکی قفلش، جاموں کی کھنک، رات گئے تک چلتا ہایہ سلسلہ..... اقبال راؤ سب جانتا تھا، اسے کیا معلوم نہیں تھا۔

رات کے سازھے تین بجے جب یہ محفل ختم ہوئی اور راؤ احمد علی کمرہ خاص سے اپنے بیڈ رومن میں آکر کپڑے تمدیل کر رہا تھا۔ تو اقبال راؤ کمرے میں داخل ہوا۔

راو احمد علی سائینسگ گاؤں کی ڈوریاں کست اور اپنی بھدی آواز میں گنگتا تباہت رومن سے برآمد ہوا۔ اس نے اقبال راؤ کو اپنے کمرے میں مودبانہ کھٹے دیکھا تو ایک لے کوچ نکا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور بولا۔ ”اقبال کیا ہوا؟“

بیٹی تھی اور جیزیں بہت کچھ لائی تھی۔ بنیادی طور پر وہ ایک لالچی عورت تھی۔ اس کا شہر بھی ہوس کاماڑا تھا۔ دونوں ایک جیسے مل گئے تھے اور اب ایک ہو کر اعتبار راؤ پر داؤ چلانے آئے تھے۔

”بات یہ ہے بھیا کہ یہ دنیا کچھ لو کچھ دو کے اصولوں پر چل رہی ہے، آپ کو آزادی چاہئے، ہمیں آپ کا حصہ چاہئے۔ آپ اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤ۔ ہم آپ کو آزادی دیتے ہیں۔“

”واہ، کامنی بہت خوب، تم تو اپنے شہر سے بھی دو ہاتھ آگے لٹکیں۔“

”کیا کروں، بھیا، پچوں کے لئے آخر کچھ سوچنا ہی پڑتا ہے۔ اسیں تو اپنے پچوں کے مستقبل کی کوئی

نکر ہے نہیں۔“ کامنی نے بڑی ڈھنائی سے جواب دیا۔

”مجھے منظور ہے۔“ اعتبار راؤ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”ایں..... کیا کہا؟“ اقبال راؤ کو اس کا جواب سکریقت نہ آیا۔ اسے تو قندھی کہ محسن راؤ اس

قدر جلد مار بائے گا۔

”میں یہ کہ رہا ہوں کہ مجھے منظور ہے۔ مجھے واقعی زمین جاندا ہے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ تانیہ کو

ہے۔ وہ جب سنے گی کہ میں اپنے حق سے دستبردار ہو گیا ہوں تو وہ یقیناً خوش ہو گی۔“

”خوش ہو گی، ہائے کیسی لڑکی ہے وہ..... کیا ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ دنیا میں۔“ کامنی حیرت سے بولی۔

”ہاں، یہ دنیا عجائب خانہ ہے۔ یہاں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک ایک پیسے پر جان دینے والے اور کروڑوں روپوں کو ٹھکرایا دینے والے بھی۔“ اعتبار راؤ نہیں کر کر کہا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھنا اقبال راؤ، اپنے حق سے دستبردار ہونے والے کاغذات پر میں یہاں دستخط نہیں کروں گا۔“

”پھر کہاں کرو گے بھائی۔“ اقبال راؤ نے پوچھا۔

”لاہور میں، اپنے گھر میں پیٹھ کر..... میری یہ شرط منظور ہو تو ٹھیک ہے ورنہ جو مرضی آئے کرو۔“

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے کاغذات پر بھی دستخط کرواں گا اور یہاں سے جانے بھی نہیں دوں گا۔“

”ہاں، میں یہی سمجھتا ہوں۔“ اعتبار راؤ نے صاف لہجے میں کہا۔

”اور بھائی تم اپنے علاقے میں جا کر بدلتے ہے۔ تم نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر کیا ہو گا؟“

”اقبال راؤ، تم جانتے ہو کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ زبان سے ایک مرتبہ جوبات کہہ دی تو کہ دی۔ میں اپنے عمد سے پھر نے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”ہاں، یہ میں جانتا ہوں۔ تو پھر بات پکی۔“ اقبال راؤ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سو فیصد پکی۔“ اعتبار راؤ نے بے نیازی سے کہا۔

”اچھا، پھر میں چلتا ہوں۔ صبح چار بجے آؤں گا۔ تیار رہنا۔ یہاں سے نکل چلیں گے۔“

"پچھے نہیں ابادی، بس ذرا آپ سے بات کرنا تھی۔ کافی دیر سے آپ کے فارغ ہونے کا منتظر کر رہا تھا۔ جیسے ہی اطلاع ملی کہ آپ اپنے بیٹھ روم میں چلے گئے ہیں، میں آپ سے ملنے آگیا۔"

"ایسی کیا یہ جنسی ہو گئی، صحیح آجاتا۔" راؤ احمد علی اس وقت بات کرنے کے موذیں نہ تھا، اس نے تالا چالا۔

"صحیح ہو رہی ہے ابا۔ یہ کوئی رات ہے۔ ذرا وقت تو دیکھیں۔"

"اچھا، بات کر جلدی..... مجھے نیند آرہی ہے۔" راؤ احمد علی نے اپنے روایتی اکھڑبیں سے کما۔

"ابادی، آپ کے دستخط لیتے ہیں۔" اقبال راؤ نے سازش کی پتاری کھولی۔

"دستخط..... وہ کس لئے؟" راؤ احمد علی کے لیے میں بدستور غصہ تھا۔

"ابادی، یہ آپ کے یادگار دستخط ہوں گے، ان دستخطوں کے بعد مجھے پھر آپ کے دستخطوں کی کمی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"کیا کواس کر رہا ہے۔ کھل کر بات کر۔" راؤ احمد علی نے بڑی بڑی خونی آنکھوں سے گھورا۔

"ابادی" اقبال راؤ نے کہا۔ وہ ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ پیچھے تھے۔ اب اس نے دونوں ہاتھ آگے کئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس فائل میں کافیات تھے۔ وہ فائل لے کر آگے بڑھا۔ راؤ احمد علی اپنی اس کری پر بیٹھ چکا تھا، جس پر بیٹھ کر وہ انسان نہیں رہتا تھا۔

"ابادی..... ان کافیات پر نظر ڈال لیں۔" اقبال راؤ نے بڑے مودبانتہ انداز میں کہا۔

"کس قسم کے کافیات ہیں یہ۔" راؤ احمد علی نے فائل لے کر، فائل کھولے بغیر پوچھا۔

"اعقب راؤ اپنے حق سے دستبردار ہو چکا ہے۔ اس پر آپ نے دستخط کرنے ہیں، کیونکہ اب آپ بڑھے ہو چکے دستخط کر دیے ہیں تیراخ قرار نامہ ہے۔ اس پر آپ نے دستخط کرنے ہیں، زمین جاندار کا انتظام سنجھانا اب آپ کے میں کا نہیں رہا۔ آج کے بعد سے یہ انتظام میں سنجھالوں گا۔"

"اچھا تو نے میرے اعتماد کا تاجرز فائنڈر اٹھا کر یہ کھیل کھیل لیا۔ چلو اچھا ہوا کہ تیری حقیقت بھی میرے سامنے آگئی۔ میں تو مجھ پر بہت بھروسہ کرنے لگا تھا۔" راؤ احمد علی کی آواز اچانک دھیکی ہو گئی۔

"ابادی، میرے پاس وقت کم ہے۔ آپ براہ کرم اس محترمانے پر دستخط فرمادیجھے۔" اقبال راؤ بولا۔

"یہ دستخط تو میں نہیں کروں گا۔" راؤ احمد علی کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

"ابادی، دستخط تو آپ کو کرنے پڑیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے کوٹ کی حیب سے ریوالر نکال لیا اور راؤ احمد علی کی طرف تائیتھے ہوئے بولا۔ "جلدی ابادی۔"

"اوہ۔" راؤ احمد علی نے پہلے ریوالر پر اقبال راؤ کو دیکھا۔ "اچھا، کرتا ہوں دستخط۔ لپاچتھہ اور

تم تو راز سے نکال لوں۔"

"نمیک ہے۔" اقبال راؤ نے اتنی محلت دے دی۔

راؤ احمد علی اپنی اوپھی کرسی سے اٹھا۔ اپنے بیٹھ کے نزدیک آیا۔ سائیڈ نیبل کی پہلی دراز کھول کر جھک کر اندر ہاتھ ڈالا۔ دراز کے اندر لگے ہوئے ایک بن کوتین بار جلدی جلدی دبایا۔ پھر اسی دراز میں رکھا، چشمہ اور بین اٹھا لیا۔

چشمہ اور بین لے کر وہ پھر اپنی اسی اوپھی کرسی پر آبیٹھا جس پر بیٹھ کر وہ انسان نہیں رہتا تھا۔ اقبال راؤ ابھی تک ریوالر تائیتھے ہوئے تھا۔ باپ کو عیک آنکھوں پر لگا کر بین کھولتے دیکھ کر اس نے ریوالر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ جیسے اب کوئی خطرہ نہ رہا ہو۔

راؤ احمد علی نے فائل کھول کر پوچھا۔ "کہاں کروں دستخط۔؟"

"میں بتاتا ہوں ابادی۔" یہ کہہ کر وہ خوشی سے جھومتا آگئے بڑھا۔ کامیابی دو قدم کے فاصلے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

تبھی دھاڑ سے بیڈ روم کا دروازہ کھلا۔ اقبال راؤ نے چھپے مزکر دیکھا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ چار تھے۔ اور چاروں جدید آٹو یونک تھیاڑوں سے لیس تھے۔ وہ تربیت یافتہ کمانڈوز کی طرح آگے بڑھے اور چشم زدن میں اقبال راؤ کو گھیرے میں لے لیا۔

راؤ احمد علی نے پین بند کر کے چشمہ آنکھوں سے اتارا۔ اسے پورے اطمینان سے کیس میں رکھا۔ فائل بند کی۔ اور مسکرا کر اقبال راؤ کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔

"اقبال تیری جیب میں ریوالر موجود ہے۔ چاہو تو شوق پورا کرو۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے ریوالر سے ایک گولی نہیں لٹکے گی، اتنی دیر میں کم از کم سو گولیاں تمہارے جسم میں پوسٹ ہو جائیں گی۔"

اقبال راؤ نے ان چاروں گو دیکھتے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ لیکن اب جیب سے ریوالر نکالنا ضرور تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ باہر نکال لیا، وہ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا خلاف توقع ہوا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ راؤ احمد علی نے کسی آڑے وقت کے لئے یہ "ریرو فورس" رکھی ہوئی ہے، وہ یہ بھی اندازہ نہ کر پا یا کہ "ریرو فورس" اچاک ایکشن میں کس طرح آگئی۔ بہر حال پانس بلٹ گیا تھا۔ ساون پور پر اس کی حکمرانی کا خواب چکنا چور ہو گیا تھا۔

راؤ احمد علی نے وہ فائل اقبال راؤ کے منہ پر دے ماری۔ اس کے کافیات ادھر ادھر بکھر گئے۔

"تم نے کیا سمجھا تھا کہ تم ریوالر کے زور پر مجھ سے مختار ناہے پر دستخط کرو والے۔ تم شاید یہ بھول گئے کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ میں یوڑھا ہو گیا تو کیا ہوا لیکن میرا دماغ ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے۔"

"ابادی، مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دیجئے۔" اقبال راؤ یہ کہہ کر راؤ احمد علی کے پاؤں پر نکل گئے۔

"نہیں۔" راؤ احمد علی اتنے زور سے چیخا کہ وہ قدموں میں جکلتا جکلتا سیدھا کھڑا ہوا اور پھر ڈر کر دو رہ چکھے ہٹ گیا۔

آسانی سے دو دھ میں سے کمھی کی طرح نکال پھینکوں گا۔ جب زمین جاندہ کی ساری پادری میرے پاس ہو گی تو انہیں میرے سامنے گھٹنے لئے کے سوا اور کونساست ہو گا۔ ”اقبال راؤ نے بنتے ہوئے کہا۔ جب کانڈات وغیرہ تیار ہو کر آگئے تو اعتبار راؤ نے وکیل کے یہاں ہی حق دستبرداری پر دخخط کر دیئے اور اپنے گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اقبال راؤ اسے باہر تک چھوڑنے کے لئے آیا۔ جب اعتبار راؤ نے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اقبال راؤ سے ہاتھ ملایا تو اقبال راؤ بڑے شاطرانہ انداز میں مسکرایا اور رازدارانہ لجھے میں بولا۔ ”بھائی آپ کو تانیہ مبارک ہو، دیکھیں ہمیں اپنی شادی میں بلانا ہے جھوپیں۔“

”اچھا۔“ اعتبار راؤ نے گھر اٹھنہ اسافی لے کر کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اور پیچھے پٹ کر کھینچ دیکھا۔ اس منہوس کو وہ کیا دیکھتا جس نے بھائی ہو کر اتنا تانی خالمانہ سلوک کیا تھا۔ پسلے اس نے سوچا کہ اپنے گھر من آباد جائے۔ پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ نیس تانیہ کے پاس جانا چاہئے۔ اس نے ماہل نادن کا رخ اختیار کر لیا۔ اس نے سوچا اگر تانیہ گھر پر نہ ملی تو پھر آرٹ گلری کا رخ کرے گا۔ وہ اچانک اس کے سامنے پہنچا چاہتا تھا، اسے سربراہ زندگی بنا چاہتا تھا۔ جب وہ ماہل نادن پہنچا تو سائز ہے بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس نے گاڑی سے اتر کر بیتل بھائی اور پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد رفیق نے گیٹ کھولوا اور اعتبار راؤ کو گاڑی میں بیٹھا دیکھ کر ایک دم خوش ہو گیا۔ وہ واپس پٹ کر جانے لگا تو اعتبار راؤ نے اسے آواز دی۔ ”رفیق۔“

”بھی صاحب۔“

”کماں بھاگے جارہے ہو۔؟“

”تانیہ بی بی کے پاس جا رہا ہوں۔ انہیں خوشی کی خبر سنانے۔“

”میں رفیق یہ کام تم نہیں کرو گے خود میں کروں گا۔ مجھے یہ بتاؤ تانیہ بی بی کماں ہیں۔؟“

”اپنے کمرے میں ہیں جی دہ۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم گیٹ کھولو۔“

رفیق نے گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیئے، اعتبار راؤ اپنی گاڑی اندر لے گیا۔ ایک گارڈ اندر الٹ لھڑا تھا۔ اس نے آنے والی گاڑی کو غور سے دیکھا، پھر اعتبار راؤ کو پہچان کر اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔

اعتبار راؤ گاڑی بند کر کے اندر پہنچا۔

تانیہ کے کمرے کا دروازہ شم و تھا۔ اعتبار راؤ نے کھڑے ہو کر ایک نظر اندر ڈالی۔ تانیہ بیٹھ پر سر کاٹے اس پیٹھی تھی۔ وہ کسی گھری سوچ میں تھی۔ اس نے دروازہ تھوڑا اور کھول دیا لیکن تانیہ نے اپنی انداخت کرنہ دیکھا۔

”تب اعتبار راؤ نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور پر سرت لجھے میں پوچھا۔ ”کیا میں اندر ملتا ہوں۔“

تانیہ نے آوازن کرائی ہی بے خیالی میں دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی تو دنیا ہی بدل گئی۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ راؤ احمد علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ پھر وہ ان چاروں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اس منہوس کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔ ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔ اس کا فیصلہ میں صحت کروں گا۔ جاؤ لے جاؤ اسے۔ ہاں ایک بات کا خالی رکھنا یہ بہت شریر ہے۔ اگر کوئی شرات کرے تو اس کے جسم میں اتنی گولیاں اتار دیں کہ سانس لینا مشکل ہو جائے۔“

”پلیز اب ابی، مجھے معاف کر دیں۔“ اقبال راؤ نے ہاتھ پر جوڑے۔

راؤ احمد علی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ تب وہ چاروں اپنے ہتھیاروں سمیت بڑے خونوار انداز میں آگے بڑھے۔ اقبال راؤ کمرے سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔

اقبال راؤ کے جانے کے بعد راؤ احمد نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور گاؤں کی ڈوریاں کھولتے ہوئے بیڈ کی طرف بڑھے۔ بیڈ پر بیٹھ کر اس نے ایک زور دار جہاںی لی اور نرم ملائم کبل اوزھ کر پر سکون انداز میں ناٹکیں پھیلا لیں۔

وہ مت کے بعد اس کے خوفناک خرائے کر کے میں گوئنچے لگے۔

اپنی زمین جاندہ اور اقبال راؤ کے نام کرتے ہوئے اسے ذرا بھی افسوس نہ ہوا تھا۔ اسے پیسے کی ہوس نہ تھی۔ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے کافی تھا۔ ایک چلتا ہوا سینما ہاں، ترقی کرتا ہوا تقسیم کار ادارہ۔ اپنا گھر اور گاڑی۔ کیا کچھ نہیں تھا اس کے پاس پھر ایسی زمین کاہدہ کیا کرے۔ جس پر اقبال راؤ جیسے اٹھ دے اپنی زبان پلپاٹتے ہوئے پھر رہے ہوں۔ زندگی بڑوقت خطرے میں ہو۔ اسی نئے اعتبار راؤ نے زمین جاندہ دے کر سکون خرید لیا تھا۔ وہ تانیہ کی زندگی میں کسی قسم کا زہر نہیں گھوانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایک بھپور اور خوشیوں بھری زندگی گزارنے کا خواہ شند تھا اور یہ پر سکون زندگی اسی وقت ممکن تھی جب وہ زمین جاندہ دے سے دستبردار ہو گا۔

اقبال راؤ سورج نکلتے ہی لاہور پہنچ گیا تھا۔ وہ اعتبار راؤ کو اپنے ایک شناساویں کیلے کے یہاں لے گیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے کاغذات تیار کر دیے۔ اعتبار راؤ کی طرح اس نے محض راؤ اور تانیہ کی طرف سے بھی کاغذات تیار کر دیئے۔ اور اعتبار راؤ کو تباہی دیا کہ وہ ان دونوں کے جعلی دستخط کروا کے ابھی کے سامنے رکھے گا۔

پھر اس نے ایک مقنار نامہ تیار کرایا۔ اس مقنار نامے میں اس نے ہر طرح کا اختیار اپنے نام نکھوں لیا اور یہ بات بھی اس نے اعتبار راؤ کو بتا دی کہ وہ اس مقنار نامے پر ابھی کے دستخط کروا دے گا۔

”مجھے امید نہیں کہ ابھی اپنی موت کے پروانے پر اس قدر آسانی سے دستخط کر دیں گے۔“ اعتبار راؤ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”آسانی سے نہ کئے تو مغلی سے کریں گے۔ دستخط انہیں ہر حال میں کرنا پڑیں گے۔ چاہے ریواں کے زور پر ہی کیوں نہ کریں۔“ اقبال راؤ نے بڑی سفکی سے کہا۔

”اور بھائی آفتاب کا کیا ہو گا۔؟“ اعتبار راؤ نے پوچھا۔

”انہیں سیاست کا چکا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ انہیں سیاست آتی نہیں ہے۔ انہیں بہت

ان کی اس بات پر سارے لوگ ہٹ پڑے۔ رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ رات کو تانیہ جب بیدر لیٹی تو وہ بہت خوش تھی۔ ورنہ بچپلی دور تاں تو اس پر قیامت بن کر گزری تھیں۔ دونوں راتیں آنکھوں میں کئی تھیں۔ وہ مستقل روتنی تھی۔

اور انہی آنسوؤں کے درمیان اسے کالا چراغ یاد آگیا تھا۔ وہ کس قدر مریان غصہ تھا۔ اس نے تانیہ کی کس قدر مدد کی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو تانیہ اور محسن راؤ کا صحراء واپس آنا ممکن نہ تھا۔ روتے روتے اس نے کئی بار سوچا تھا کہ کیا وہ دوبارہ اس کی مدد کو نہیں آسکتا۔ اس کی گفتگو سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا میں متعدد بار آچکا ہے۔ اور یہاں کے تمام علاقوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن شاید اب آنا ممکن نہ تھا۔

آج رات وہ بستر لیٹی تو خوشی اس کے انگ اٹک سے پھوٹ رہی تھی۔ اب جبکہ اعتبار راؤ آزاد ہو کر آگیا تھا تو جانے کیوں تانیہ کو یہ محسوں ہو رہا تھا جیسے اس بھائی میں کیس نہ کیس کا لے چراغ کا ہاتھ ہے۔ یہ خیال اسے کیوں آیا تھا۔ اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

جب اس نے کروٹ بدی تو اس کی نظر کر مٹل کے نازک گلدن میں لگی گلاب کی لکی پر پڑی۔ وہ پوری طرح تو تازہ تھی اور خوب ممکن رہی تھی۔ تانیہ اس کلی کو غور سے دیکھنے لگی اور دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہوئے گئیں۔ بالآخر وہ سوگی۔

صحیح نہیں کیا میرے جب وہ پکنی تو اس کے چرپے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔ رات کو وہ جس قدر خوش تھی اس وقت اسی قدر پریشان تھی۔ محسن نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ خود بھی پریشان ہو گیا۔ کی جاں حال خالہ فرزانہ کا ہوا۔

”کیا ہوا تانیہ؟“ ”محسن راؤ نے پوچھا۔

”بھائی رات کو میں نے دادا عظیم کو خواب میں دیکھا ہے۔“

”اے دادا عظیم کو۔“ خالہ فرزانہ دادا عظیم کا نام سنتے ہی فکر مند ہو گئیں۔ ”کیا کہہ رہے تھے“؟

”خالہ، وہ، ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ جب میں ان کے سامنے پہنچی تو انہوں نے مجھ دیکھتے لی کہا۔ ارے اس نحوست کو نکالو گھر سے ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گی..... اس سے پہلے کہ میں اس نوست کا نام ان سے پوچھتی کہ اچانک ایک بہت بڑا ریپکھ کیس سے نمودار ہوا اور میری طرف لپکا۔ میں سے دیکھ کر جیجنی ہوئی بھائی مجھے شکر لگی..... تبھی میری آنکھ کھل گئی۔“ تانیہ نے بتایا۔ پھر وہ پریشان رکر بولی۔ ”اللہ رحم کرے بھائی جان۔ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔“

”ارے کچھ نہیں ہو گاتا تانیہ..... تم پریشان مت ہو؟“ ”محسن راؤ نے تسلی دی لیکن یہ بھوٹی تسلی تھی، نہ راؤ اندر سے خود پریشان ہو گیا تھا۔

”نہیں بھائی جان، ضرور کوئی گزیرہ ہے۔“ وہ فکر مند ہو کر بولی۔ ”میری یہ بات سمجھ میں نہیں رہی کہ ہمارے گھر میں ایسی کیا ناخوش چیز ہے جسے نکالا جائے۔ وہ کبھتی ریپکھ جانے کماں سے

اداسی ایک دم مرت میں تبدیل ہو گئی۔ بڑے طرف رنگ ہی رنگ کھفر گئے۔ یہ کون آیا؟ وہ بے اختیار ہو کر اٹھی اور دوڑ کر اعتبار راؤ سے لپٹ گئی۔ پھر فوراً اسے اپنے اس اضطراری عمل پر جاپ آیا۔ وہ ایک دم پیچے ہٹیں لیکن اعتبار راؤ نے اسے پیچے ہٹنے دیا۔ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں جکڑ لیا۔

”اعتبار، کیا ہوا تھا۔؟“ تانیہ نے اس کے سینے میں منہ چھپائے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔“ اعتبار راؤ نے اسے اپنی بانہوں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

”کون تھے وہ لوگ۔؟“ ”یہ دنیا کا سب سے انوکھا اغوا تھا..... باپ نے بیٹے کو اغوا کروا یا تھا۔“ اعتبار راؤ کری پر بیٹھتا ہوا بولا۔

”راو صاحب نے، جیرت ہے۔ پھر انہوں نے چھوڑ کیے ویا؟“ ”ابا نے نہیں، مجھے اقبال راؤ نے آزاد کیا ہے۔ اور آزاد بھی یوں ہی نہیں کر دیا۔ مجھے اپنی زمین جاندار کے حق سے دستبردار ہوتا پڑا ہے۔“ اعتبار راؤ نے بتایا۔

”لغت سیمیں زمین جاندار پر، وہ آپ کی زندگی سے قیمتی نہیں، بس آپ آگئے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔“ تانیہ نے بڑی محبت سے کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تم میں کوئی، اس لئے میں بڑے اطمینان سے کاغذ پر دستخط کر آیا۔“ اعتبار راؤ نے اس کی بات سن کر سکون کا سائز لیا۔

”میں بھائی کو اطلاع کر دوں۔ ویسے وہ آئے ہی والے ہوں گے۔“ تانیہ نے گھری پر نظر ڈال کر کہا۔

”خالہ فرزانہ کماں ہیں۔؟“

”بیسیں ہیں۔ وہ بہت پریشان تھیں۔“ تانیہ نے بتایا۔

”کیا تم سے بھی زیادہ۔؟“ اعتبار راؤ نے پوچھا۔

”ہاں، مجھ سے بھی زیادہ۔“ تانیہ نے کہا اور اسے گھری نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا دی۔ پھر جیسے جیسے اعتبار راؤ کی آمد کی اطلاع ہوتی گئی، دیے دیے لوگ آتے گئے۔ شام کی چائے پر سب لوگ اکٹھا ہو چکے تھے۔ محلی مغلوائی گئی، محلی کھانی گئی۔

اعتبار راؤ نے نادرہ سے خاص طور پر مقدرت کی، وہ بولا۔ ”نادرہ صاحب، میں آپ سے بہت شرمende ہوں، میری وجہ سے آپ کی ملکنی بھی رک گئی۔“ ”تو پھر کیا ہوا۔“ نادرہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”نہ ہم کمیں کئے ہیں اور نہ محسن کمیں کئے ہیں۔

پھر ہو جائے گی ملتی۔“ ”اے نادرہ! خیر سے ملتی تو پھر ہو جائے گی لیکن تم ذرا اعتبار راؤ سے وعدہ لے لو، کمیں یہ پھر تو اغوا نہیں ہو جائیں گے۔“ خالہ فرزانہ نے ہٹنے ہوئے کہا۔

”محجے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ آپ نے اسے کیوں دے دیا۔ اسے کہیں باہر کیوں نہیں پہنچکوادیا۔“

”ایک رات اور دیکھنا چاہتا ہوں۔“ محسن راؤ نے کما در پھر ناشتے کی میز پر آگیا۔ بیٹھے بھائے یہ ایک اور مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ دادا عظیم نے بھی کوئی بات کھل کر نہیں کی تھی۔ حالاً لکھ ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ جب بھی خواب میں نظر آئے تھے۔ انہوں نے بڑی وضاحت سے ہدایت سمجھائی تھی۔ اب چوتھے نہیں اسی چاقو تو انہوں نے منہوس قرار دیا تھا۔ یا گھر میں کوئی اور چیز تھی جس پر ہماری اب تک نظر نہیں گئی تھی۔

پھر یہ معاملہ زیادہ دیر تک معتمد نہ رہا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ کچھ دیر کے لئے لیٹنی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں پھر اس نے دادا عظیم کو دیکھا وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ یہ کوئی ہر ابھر اباغ تھا۔ چاروں طرف پھول کھلتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ تانیہ بھی اس باغ میں ملٹی ہوئی دہا جانکی تھی جماں وہ بیٹھے تھے۔

تانیہ کو دیکھتے ہی انہوں نے اسے ڈانتا۔ ”ارے کیا بے وقوفی کر رہے ہو تم لوگ..... اس نخوست کو نکالو گھر سے، نہیں تو خون کی ندیاں بہے جائیں گی۔“

”دوا کیا آپ کا شارہ چاقو کی طرف ہے۔“ تانیہ نے فوراً پوچھا۔

”ہاں..... اسے فرو گھر سے نکالو۔“

”پر دادا کیا کریں اس کا..... اسے توڑ کر پچینک دیں۔ یاد ریا میں ڈلوادیں۔ کیا کریں۔“ ”اسے جلد از جلد کسی ٹوٹی قبر میں پھکوا دو اور یہ کام خود محسن کرے۔“ دادا عظیم نے ہدایت کی۔

تانیہ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ چاقو پر کیا پڑھ کر پھوٹکنا اور ٹوٹی قبر میں اسے کس طرح ڈالنا ہے۔

تجھی اس کے کافلوں میں، تانیہ، تانیہ، کی آوازیں آنے لگیں کوئی اسے اٹھا رہا تھا۔ ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی اس کے سامنے خالہ فرزانہ کھڑی تھیں۔

”ہی خالہ۔“ تانیہ نے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا۔

”وہ اعتبار راؤ آئے ہیں۔ ڈرانگ رومن میں بیٹھے ہیں۔“

”اچھا خالہ..... میں اٹھتی ہوں۔“ تانیہ نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بھائی جان ہیں گھر میں۔“

”ہاں، وہ اعتبار راؤ کے پاس بیٹھے ہیں۔“ خالہ فرزانہ نے بتایا۔

”خالہ، میں نے پھر دادا عظیم کو خواب میں دیکھا۔“

”اچھا..... کچھ مسئلہ حل ہوا۔؟“

”ہاں، ساری بات تفصیل سے ہو گئی۔“ یہ کہہ کر اس نے ساری تفصیل بیان کر دی۔

آگیا۔ ورنہ میں داوا سے اس چیز کا نام ضرور پوچھ لیتی۔“

”اوہ۔“ محسن راؤ کا منہ اچانک کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ آگیا ہو۔

”آپ کو کیا ہوا؟“

”تم یہ تھا، تم پر ریپکھ جھپٹا تھا؟“ محسن راؤ نے تصدیق چاہی۔

”جی..... اسی کی وجہ سے توبات اوہ سو رہ گئی۔“

”بات میری سمجھ میں آگئی۔“ محسن راؤ نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر محسن راؤ روا بائٹھ گیا۔

وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں گیا۔ اس نے اپنے بیڈ کی سامنے نیبل پر ایک خوبصورت پلیٹ میں کھلا ہوا چاقو رکھا ہوا تھا۔ یہ چاقو راجہ مداری کا تھا۔ اور راجہ مداری کے جسم پر اس قدر بال تھے کہ وہ انسان کم بھالو زیادہ لگتا تھا۔ دادا عظیم نے خواب میں جو اشارے دیئے تھے۔ وہ واضح طور پر اس چاقو کی نشاندہی کر رہے تھے۔

محسن راؤ نے اس چاقو کاٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس پر نظر پڑتے ہی اس کا ہاتھ خود بخورد کر گیا۔ چاقو کے پھل پر تازہ تازہ خون لگا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی اس سے کسی کو ذبح کیا گیا ہو۔

اس نے پیس کھڑے کھڑے رفیق کو آواز دی۔ ”رفق، جلدی آؤ۔“ رفیق ڈائیگ نیبل کے نزدیک ہی کھڑا تھا، وہ محسن راؤ کی آواز سن کر فوراً اس کے کمرے کی طرف بھاگا۔

”جی صاحب۔“ اس نے کمرے میں ٹنچ کر پوچھا۔

”محسن کیا ہوا، خیر تو ہے۔“ خالہ فرزانہ اور تانیہ بھی بیچھے بیچھے آگئیں۔

”رفق، تم نے اس چاقو سے مرغی وغیرہ تو ذبح نہیں کی۔“ محسن راؤ نے چاقو کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں صاحب۔ میں بھلا ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ پچن میں کئی چاقو موجود ہیں۔“

”پھر اس پر خون کیسے لگ گیا۔“

”خون۔“ خالہ فرزانہ خوفزدہ ہو کر وقدم پیچھے ہٹ گئیں..... تانیہ نے وقدم آگے بڑھ کر چاقو دیکھا۔ ”ہاں واقعی اس پر تو خون لگا ہوا ہے..... یہ خون کیسے لگا۔“ وہ رفیق کی طرف مڑ کر بولی۔

”مجھے نہیں معلوم ہی بی۔“ رفیق نے سیدھے اور صاف لجج میں کہا۔

”رفیق اسے پلیٹ سیتی بیاں سے اٹھا کر لے جاؤ۔ اور اسے دھو کر اپنے کمرے میں رکھ لو۔“

محسن راؤ نے ہدایت کی۔

”جی ٹھیک ہے صاحب۔“ یہ کہہ کر اس نے پلیٹ اٹھا لی اور اس خون آکو ڈاکو تو غور سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

”مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دادا عظیم نے اس چاقو کی طرف اشارہ کیا ہو۔“

کیا۔

”بات تو خیر سے سو نیصد مانے والی ہے۔“ تانیہ نے انہیں الجھانے کی کوشش کی۔
”پھر کوئو۔“ انہوں نے وضاحت طلب کر لی۔

”آپ رات کو گھر آئیں گے تو پھر کوئی گی اور جو کوئی گی، وہ آپ سے منوں گی لول گی۔“
”تم مجھے بہت پیاری ہو، یہ بات تم تمچی طرح جانتی ہو، مجھے کوئی الی بات نہ کرنا جس سے یہ بھرم ثوٹ جائے۔“

”اچھا، آپ آئیں تو..... پھر ہو گی بات۔“

رات کو انکل عامر آئے تو وہ خاصے بجے سورخے تھے۔ وہ یہی اچھا بس پہنے کے عادی تھے لیکن آج انہوں نے نیا اور قیمتی سوت پہنوا تھا۔ شام کو ہی دل لگا کر شیو کیا تھا۔ نہاد ہو کر خود کو پرنسپم میں بسایا تھا۔ تانیہ نے ان کی آمد پر خود جا کر گیٹ کھولا۔ وہ ایک لمحے کو انہیں دیکھتی رہ گئی۔ خوبصورت جھوکے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

”واہ، انکل آج تو آپ دھماکہ خیز لگ رہے ہیں۔“ تانیہ نے خوش ہو کر جملہ کہا۔

”تانیہ، میں انسان ہوں، بارود سے بھری بوری نہیں ہوں۔“ انکل عامر نے اس کے سر پر چپٹ گلتے ہوئے کہا۔ ”محسن کہاں ہیں؟“

”غالہ اپنے کمرے میں ہیں۔“ سوال کچھ جواب کچھ۔

”اڑے، تانیہ تم کچھ اونچا سنئے گی ہو، اس طرح تو بچارے اعتبار راؤ کو بڑی پریشانی ہو جائے گی۔“ وہ بچارا کوٹ مانگے گا، تم اس کے ہاتھ میں لوٹا پکڑا دو گی۔ میں پوچھ رہا ہوں محسن کہاں ہیں۔ تم جواب دے رہی ہو، غالہ اپنے کمرے میں ہیں..... بھائی تم اپنے کان کی صفائی کرواؤ۔“
”ہاں تو آپ نے بات ہی غلط پوچھی۔ آپ کو اس وقت خالہ فرزانہ کے بارے میں پوچھنا چاہئے تھا۔“

”تم شرارت سے باز نہیں آؤ گی۔“ انکل عامر نے ڈرائیکٹ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”بھائی جان کے کمرے میں چلیں، وہ وہاں موجود ہیں۔“ تانیہ نے انکل عامر کا راستہ روکا۔

”وہ کون؟“ انکل عامر نے وضاحت چاہی۔

”بھائی جان..... اور کون؟“ تانیہ نے بہن کر کہا۔ ”انکل عامر آپ میری طرف سے اس قدر مشکوک کیوں ہو گئے ہیں۔“

”بھی مجھے تواب تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔“ انکل عامر نے محسن راؤ کے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا، انکل عامر آئے ہیں۔ انکل آپ کو کون ڈرا رہا ہے۔“ محسن راؤ نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

”بھی، یہ تمہاری بہن..... آج کل شرارت پر اتری ہوئی ہے۔“ انکل عامر کرسی پر بیٹھتے ہوئے

خالہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ گبیہر مسئلہ کسی طرح حل تو ہوا، اب بس اس کی ”تدفین“ باقی تھی۔

تانیہ نے محسن راؤ کو بھی اس خواب سے آگاہ کر دیا، پھر وہ اور اعتبار راؤ اس چاقو کو لے کر قبرستان پلے گئے۔ کافی ڈھونڈ تلاش کے بعد انہیں ایک قبر ٹوٹی ہوئی نظر آئی۔ اس میں کافی برا سوراخ تھا۔ محسن راؤ اور اعتبار راؤ نے اس قبر میں جما کنکے کی کوشش نہ کی۔

محسن راؤ نے دادا عظیم کی ہدایت کے مطابق پڑھ کر اس چاقو پر پھونکا۔ اور اسے بند کر کے اپنی مٹھی میں جکڑا پھر اس نے زمین پر پیش کر اپنا ہاتھ قبر میں ڈالا اور کچھ پڑھ کر چاقو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اور فوراً یہچے ہبھے کر کھڑا ہو گیا۔

چاقو کے قبر میں گرتے ہی، سوراخ سے وہیں کا ایک مرغولہ سانکلا۔ اور فضائیں تخلیہ ہو گیا۔ اس کام کو ختم کر کے وہ قبرستان سے نکل کر باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھے اور ریستوران کی طرف چل گئے۔ ریستوران پنجھ کر محسن نے تانیہ کو فون کر دیا۔ اسے بتا دیا کہ وہ پریشان نہ ہو، اس چاقو کی ”تدفین“ بجیہ و غولی کردی گئی ہے۔

تانیہ نے یہ سن کر سکون کا سانس لیا۔ اس کے گھر میں رہنے سے جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ دادا عظیم نے بروقت مدد کر کے اس گھر کو آنے والی تباہی سے بچایا تھا۔

محسن راؤ کا فون سن کر اس نے انکل عامر کو رنگ کیا۔ اور چاقو سے متعلق ساری بات تفصیل سے بتائی اور پھر ان سے آج رات آنے کی ورخاست کی اور وہ بھی اکیلے۔

”تانیہ، خیز پڑھ رہے تھے۔“ انکل عامر نے پوچھا۔
”ہاں، انکل خیری خیر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ بہت یاد آرہے ہیں۔“ تانیہ شرارت سے

ہنسی، اوہر سے کوئی سوال نہ ہوا تو وہ فوراً بولی۔ ”پوچھنے گے نہیں، آپ کے یاد آرہے ہیں۔“
”بھی غاہر ہے تمہیں یاد آ رہا ہوں گا۔“ انکل عامر نے چکتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں۔“ تانیہ نے فوراً تردید کر دی۔
”تو پھر۔“ وہ حیران ہوئے۔
”ہماری خالہ فرزانہ کو، وہ کہہ رہی تھیں کہ بہت دن سے تمہارے انکل نہیں آئے۔“ تانیہ نے

سفید جھوٹ بولتا۔
”بہت دن ہو گئے۔ بھی میں کل ہی تو آیا تھا۔“ انکل عامر نے تانیہ کی بات کو سرسری لیا۔

”چوہیں گھنٹے تو ہو ہی گئے۔“ تانیہ ہنسی۔ ”یاد آنے کے لئے یہ وقفہ اچھا خاصا ہے۔“
”تانیہ، آخر تھم اس قسم کی باتیں کیوں کرنے لگی ہو، تم کیا چاہتی ہو؟؟“ انکل عامر نے سمجھی گی اختیار کی۔

”میں جو چاہتی ہوں، اگر وہ بتا دوں تو کیا آپ مان جائیں گے۔“
”اگر ماننے والی بات ہوگی تو ضرور مان جاؤں گا۔“ انکل عامر نے یقین دلانے والا الجھ اختیار

راو خاموشی سے گھوڑے سے کوڈ آیا۔ تب اس کا لباس والے نے اس کا ہاتھ کپڑا اور اسے اپنے ساتھ کھینتوں میں کھینٹا ہوا لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کھیتوں سے برآمد ہوا تو اقبال راؤ اس کے ساتھ نہ تھا۔ وہ کھیت میں بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ سرخ موئی اپنی جھیل کندھے پر ڈالے اور میں ہاتھ میں لئے کھیتوں سے نکل کر گینڈنٹی پر آیا تو دو گھنٹے سوار سے تیری سے اس کے پاس آگر رک گئے۔

”وہ سامنے کھیت میں اس کی لاش پڑی ہے۔ جا کر بڑے سرکار کو اطلاع کر دو۔“
 ”ٹھیک ہے۔ اب تم جلد از جلد بوڑھے برگد کے نیچے پہنچ جاؤ۔ وہاں ایک جیپ کھڑی ہے وہ تمیں تتمارے ٹھکانے تک پہنچاوے گی۔“

سرخ موتی خاموشی سے بوڑھے برگدکی طرف چل پڑا، جب وہ دونوں گھر سوار ایک نظر اقبال راؤ کی لاش پر ڈال کر والپس حوالی کی طرف چلے گئے تو سرخ موتی نزدیک ہی ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ پکھڑ دیر کے بعد ایک جیپ کھیتوں کو رومندی ہوئی اس کھیت کے نزدیک ایک رک گئی جہاں اقبال راؤ کی لاش پڑی تھی۔ جیپ سے راؤ احمد علی برآمد ہوا۔ اس نے ایک نظر پیچھے ڈالی تو اسے دور ساون پور کے لوگ اپنی طرف دوڑ کر آتے ہوئے دکھائی دیئے، وہ کیسے بھاگ کر نہ آتے۔ ائم بنا یا گیا تھا کہ اقبال راؤ کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ ساون پور کے جس شخص نے بھی اس خبر کو سنا، وہ کھیتوں کی طرف دوڑ پڑا۔ راؤ احمد علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اس کھیت میں داخل ہو گیا جہاں اقبال راؤ کی لاش پڑی تھی۔

اور ابھی راؤ احمد علی نے ”میرے بیٹے“ کہہ کر میں شروع کیا ہی تھا کہ وہ ”لاش“ بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس لاش کے باتحہ میں ایک چمکتی ہوئی کھڑاڑی تھی۔

اقبال راؤ کو نہ اور اس کے ہاتھ میں چکتی ہوئی تیز دھار کی کلماڑی دیکھ کر راؤ احمد علی کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ تو برا خوش خوش لبے لبے ڈگ بھرتا، کھیت میں پہنچا تھا۔ بن اس ڈرائے کا آخری سین رہ گیا تھا، اس سین کو اس نے ساڈن پور کی رعایا کے سامنے پیش کر کے اپنے فن کی دادیتھی۔ لیکن یہاں تو حاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔

راو احمد علی نے حسب معمول عیاری دکھاتے ہوئے کچھ اس طرح منصوبہ بندی کی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اقبال راؤ کو موت سے ہمکنار کر دیا جائے اور اس قتل کا الزام بھی اس کے سر نہ آئے۔

ایک سپیرے کو بھاری رقم دے کر اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ کیسے کرتا ہے، کیا کرتا ہے۔ پھر اقبال راؤ کو جھوٹ بول کر سر مقل میجھا گیا۔ سپیرے نے کھیوں سے نکل کر اسے روکا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ لکھیت میں لے گیا۔ اس سپیرے نے جسے اس کے قتل پر مامور کیا گیا تھا، اس نے ساری صور تحال صاف صاف بتا دی کہ کچھ دیر کے بعد یہاں کیا وہ اس ہونے والا ہے۔

وہ ملازم اور سرخ موئی کمرے سے باہر نکل گئے۔
 ○○.....○○.....○○
 اقبال راؤ کو آج تین دن کے بعد تھے خانے سے باہر لایا گیا، ان تین دنوں میں اس کے ساتھ کسی تم
 کی پر سلوکی نہیں کی گئی۔ وقت پر بہترین کھانا، چائے پانی، کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ البتہ قیدِ تعلیٰ ضرور
 تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کی لفڑی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کو اچھی طرح جانتا
 تھا۔ اس نے کبھی کسی کو معاف کرنا تو سیکھا ہے تھا۔ پھر اقبال راؤ جیسے مجرم کو تو وہ بھول کر بھی معاف
 نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے صرف جانکار پر بغضہ جمانے کی کوشش کی تھی بلکہ ریواں والوں کی تان لیا تھا۔
 وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سزا میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اقبال راؤ کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ اب کسی
 صورت میں بھی کوئی مدد نہیں سکے گا۔

پھر تیرے دن کا سورج طلوع ہوا، یہ سورج اس کے لئے بیک وارنٹ لے کر نکلا۔
دو صلح افراد تھے خانے میں داخل ہوئے۔ اسے باہر چلنے کا اشارة کیا گیا۔ ”چھوٹے سرکار، باہر
چلنے۔“

وہ خاموشی سے میرے ہیں چھٹا تھے خانے سے باہر نکل آیا۔ پھر اسے جیپ میں بٹا کر جو لی کے گیٹ پر لے جایا گیا۔ گیٹ پر ایک گھوڑا کسا ہوا تیر کھڑا تھا۔ ایک سملئے فرد نے اسے گھوڑے پر سوار ہونے کا اشارة کیا۔ جب اقبال راؤ گھوڑے پر سوار ہو گیا تو اس مسلح شخص نے ٹھاٹا۔ ”بڑے سر کار، بوڑھے بر گد کے نیچے گھوڑے پر سوار آپ کے منتظر ہیں۔ شاید وہ آں کو شکار رلے جانا جاتے ہیں۔“

”اچھا۔“ اقبال راؤ نے گھوڑے پر منجل کر پڑھتے ہوئے کہا۔
”اک بات کا اور، خلا رکھنے گا جھٹے سر کار۔ سیدھے بوڑھے بر گدکی طرف ہی جائیے گا۔ اگر

اولہ ادھر بھکنے کی کوشش کی تو بہنک نہ پائیں گے، ہر طرف خکاری کتے موجود ہیں۔ ”
اقبال راؤ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جانتہ ہوں۔ ”
”تو پھر جائے جھوٹے سر کار..... اللہ حافظ۔ ”

وپر بیس پوکے اور بڑا گھوڑے کو ایڈ لگائی اور بوڑھے برگد کی جانب چل دیا، یہ بوڑھا برگد حولی سے کوئی اقبال راؤ نے فوراً گھوڑے کو ایڈ لگائی اور بوڑھے برگد کی جانب چل دیا، یہ بوڑھا برگد حولی سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اس برگد کے چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ جب اقبال راؤ ایک گینڈ نیزی پر پانچ گھوڑا دوزارہ تھا تو ایک کالے کپڑوں میں ملبوس اونچے قد کا شخص جس کے ہاتھ میں بین تھی، اچانک کھیتوں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ اسے ہاتھ پھیلایا کر رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

اقبال راؤ نے فوراً اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ یہ شخص اس کے لئے قطعاً اجنبی تھا۔ ہاتھ میں بین ہونے کی وجہ سے وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی پسیرا ہے۔

جب اقبال راؤ اس کے نزدیک کھینچ گیا تو اس نے اس گھوڑے سے بیچ اترنے کا اشارہ کیا۔ اقبال

اس نے وقت ضائع کئے بنا کلماڑی تواریکی طرح گھمائی۔ راؤ احمد علی کا سر پر ٹوڑو راس کے تن سے جدا ہو کر زمین پر جا پڑا۔ پھر بغیر سر کا جسم کسی مشہیر کی طرح زمین پر آہرا۔ اقبال راؤ جوں سوار ہو چکا تھا۔ اس نے تیز کلماڑی کے ذریعے راؤ احمد علی کے جسم کو لکڑی کی طرح پھاڑ کر رکھ دیا۔

آفتاب راؤ جب کھیت میں داخل ہوا تو اقبال راؤ کو زندہ دیکھ کر اس کے جسم میں سننی پھیل گئی۔ وہ خون میں نمایا ہوا تھا اور دھڑکن کلماڑی بر سار ہا تھا۔ آفتاب راؤ نے فوراً ریوالر نکال لیا، اور اس سے پلے کہ اقبال راؤ کی طرف متوجہ ہوتا، اس نے ریوالر کی تمام گولیاں اس کے سر اور پیٹ پر خالی کر دیں۔

اقبال راؤ اپنے اوپر گولی چلانے والے کو نہ دیکھ سکا۔ وہ اپنے باپ کی لاش کے گلروں پر گرا اور جان بحق ہو گیا۔

المی کے گھنے درخت پر بیٹھا ہو شخص اس منظر کو دیکھ کر مسکرا یا۔ بالآخر ظلم انتقام کو پہنچا۔ ہر ظلم کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد سے نکلا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ ظلم کے دو نشان صفة ہستی سے مٹ گئے تھے۔ بس ایک ظالم باقی پیچا تھا، اس کا انجام بھی زیادہ دور نہیں تھا۔

وہ کا لے کر پڑے والا سپیرا جس نے اپنا نام سرخ موتی بتایا تھا، درخت پر ایک خالی بخرو لئے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی آفتاب راؤ نے اقبال راؤ کا بدن جھلنکی کیا، اس نے خالی پنجرے کا بڑا سارہ روازہ کھول دیا۔

دوازہ کھلنا تھا کہ پروں کی پھرپڑیا ہت شروع ہو گئی۔ اس خالی پنجرے سے بڑے بڑے اٹو نکل کر رضا میں اڑنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یکلروں گلوؤں نے اس کھیت کو اپنے حصار میں لے لیا جس میں راؤ احمد علی کے جسم کے نکٹے اور اقبال راؤ کی لاش پڑی تھی۔

ان گلوؤں کو دیکھ کر آفتاب راؤ کی شی گم ہو گئی تھی۔ وہ بھاگ کر اپنی جیپ میں پہنچا اور شیشے چڑھا کر بیٹھ گیا۔ ساون پور کے لوگ جواب نزدیک آگئے تھے۔ وہ بھی پیچھے ہی رک گئے۔

ان اڑتے ہوئے بے شمار گلوؤں نے ہر شخص کو در طبع حیرت میں ڈال دیا تھا۔ پھر ساون پور کے عوام اور آفتاب راؤ نے عجیب منظر دیکھا۔ وہ اُتو راؤ احمد علی کے جسم پر جھپٹے اور اس کے مختلف اعضاء اپنے پنجروں میں دبا کر اڑنے لگے وہ اُتو بہت جیسم تھے۔ راؤ احمد علی کی لاش کے نکٹے لے کر اڑاناں کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔

آفتاب راؤ نے ایک اُٹو کو اپنے باپ کے سر کو پنجروں میں دبائے اڑتے دیکھا۔ اس اُٹو کا رخ حوصلی کی جانب تھا۔ آفتاب راؤ نے اسے کچھ دور تو اڑتے دیکھا، پھر وہ اچانک ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہی حال دوسرے اُٹوؤں کا بھی ہوا۔ وہ جس تیزی سے نمودار ہوئے تھے، اسی تیزی سے غالب ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد آفتاب راؤ جیپ سے اتر، پیچے اتر کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ اب دور تک کوئی اُٹو اڑتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ بھاگ کر کھیت میں پہنچا۔ اقبال راؤ کی لاش موجود تھی لیکن ان گلوؤں نے اس کا حال کچھ اس طرح کر دیا تھا کہ وہ پہنچانی نہیں جا رہی تھی اور راؤ احمد علی کے جسم کا ایک لکڑا بھی زمین پر موجود نہ تھا۔ وہ گدھ نما

اقبال راؤ کو اپنے قتل کے منصوبے کے اکٹھاف پر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا سفاک باپ اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑے گا اور قتل بھی اس طرح کرے گا کہ وہ صاف بیچ کر نکل جائے۔ لہذا اس کا یہ منصوبہ بے داغ اور اسے مخصوص ثابت کرنے کے لئے لا جواب تھا۔ اقبال راؤ کو حیرت اس بات پر ہوئی کہ سپیرے نے بھاری رقم لے کر کیوں پلانا کھایا۔ اس نے اس منصوبے کا اکٹھاف کیوں کیا۔

”جوگی، ایک بات بتا، میرے باپ نے تو اپنی فطرت کے مطابق جو کچھ کیا تھیک کیا۔ لیکن تو نے رقم لینے کے باوجود وعدہ خلافی کی، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟“ اقبال راؤ نے پوچھا۔

وہ کا لے کر پڑے والا سپیرا جس کا سوال سن کر مسکرا یا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پر کشش تھی۔ اس نے کہا۔ ”اقبال راؤ پہلی بات تو یہ کہ میں وہ سپیرا جیسیں ہوں جس نے رقم وصول کی ہے۔ وہ سپیرا تو اپنی جھونپڑی میں مرا پڑا ہے۔ ویسے بھی راؤ احمد علی نے تمہارے قتل کے بعد اسے مردا و ناٹھا۔ رہ گئی یہ بات کہ میں نے تمہیں اس سازش سے کیوں آگاہ کیا، اس کے پیچے ایک راز ہے۔ میں وہ نہیں ہوں جو تمہیں نظر آرہا ہوں۔ نہیں کوئی سوال مت کرو، وقت بہت کم ہے۔ میرے پاس بھی اور تمہارے پاس بھی۔ یہ کلماڑی پکڑو اور اس کے اوپر لیٹ جاؤ۔ جب تمہارا باپ تمہاری لاش پر رونے آئے تو تلاٹھی کی طرح سیدھے کھڑے ہو جانا۔ اگر تم وار کرنے سے ایک لمحہ بھی پوک گئے تو پھر تمہاری زندگی کی خاتمت ختم ہو جائے گی۔ لو یہ کلماڑی پکڑو۔ اس سفاک شخص کے جتنے بھی نکلوے کئے جاسکیں کرو۔“

اقبال راؤ نے پھر اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ اب سوال کی کوئی گنجائش بھی نہ رہی تھی۔ اس نے کلماڑی زمین پر ڈالی اور اس پر لیٹ کر اسے اپنے جسم کے جتنے بھی نکلے۔

راؤ احمد علی جس جیپ میں یہاں تک پہنچا تھا، اسے آفتاب راؤ کو ایک یوکرہا تھا۔ وہ کل رات ہی اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔ اسے پارٹی کا نکٹ نہیں مل سکا تھا۔ ساون پور میں قبیح کر آفتاب راؤ کو ایک مختلف ہی کمانی سننے کو ملی۔ جورنچ اسے نکٹ نہ ملنے پر ہوا تھا، وہ رجن اچانک خوشی میں تبدیل ہو گیا تھا کیونکہ مستقبل میں ساون پور کا سب کچھ اس کا ہونے والا تھا ساون پور کا حکمران ہونے کی صورت میں ہر پارٹی اسے نکٹ دینے پر مجرور ہو جائے گی۔

راؤ احمد علی کے پیچھے وہ اڑا۔ وہ اپنے باپ سے دس پندرہ قدم پیچھے تھا۔ اس کے دل میں بھی اللہ پھوٹ رہے تھے۔ بس اب آخری منظر ہی کیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ساون پور کے لوگ اپنے چھوٹے سر کار کی لاش دیکھیں گے جنیں کسی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی جا گیر کی سیر کو نکلے تھے کہ ایک کھیت میں انہوں نے خوبصورت لڑکی دیکھی۔ وہ گھوڑے سے اتر کر لڑکی کے پیچے گئے۔ کھیت میں ایک کالانگ موجود تھا، اس نے انہیں ڈس لیا۔

اقبال راؤ کی موت کی یہ کمانی گھڑی آئی تھی۔ اس ڈرامے کا ہر کروار اپنی جگہ مستعد تھا۔ اور اپنی باری آئنے پر مکالے بولنے کا منتظر..... لیکن یہاں تو بساط ہی الٹ گئی تھی۔

وہ کا لے لیں والا سپیرا جس بساط کو الٹ گیا تھا۔ اقبال راؤ کے کاؤن میں ابھی ”میرے بیٹے“ کی آواز ہی آئی تھی کہ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا، اور پھر

تھی۔ جو پانی لے آیا تو اعتبار راؤ نے بمشکل اس کے ہاتھ میں گلاس تھما یا اور بولا۔ ”کامنی، پانی پی لے۔“

کامنی نے بڑی مشکل سے پانی پیا، پھر وہ بڑی مشکل سے چپ ہوئی۔ وہ بڑی موقع شناس اور شاطر جیز
تھی۔ سراور شوہر کے انتقال کے بعد آفتاب راؤ جوہلی میں بچا تھا۔ آفتاب راؤ کی بیوی سے کامنی کی بنتی
تھی۔ اسی صورت میں زمین جامداد ساری کی ساری آفتاب راؤ نے ہرپ کر جانی تھی۔ کامنی نے
اعتعاب راؤ کو پرکھ لیا تھا۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھا۔ لاق، حرص و ہوس سے کسوں دور۔ بنیاز
اور قاعع پسند۔ اب وہ اسے انصاف میا کر سکتا تھا۔ اعتعاب راؤ سے اگرچہ کامنی اور اقبال راؤ نے مل
کر اس کی جامداد خصم کرنے کے لئے دھیخت کروا لئے تھے۔ اس کے باوجود کامنی کو امید تھی کہ وہ جب
آن سوہا کر اس کے قدموں میں گرے۔ مگی تو وہ یقیناً اسے معاف کر دے گا۔ اُنی لئے وہ سید ہی ساون پور
سے لاہور آئی تھی۔ وہ اپنا دھپہ بیان کر کے اس کی ہمدردی سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اور ہوا بھی کیسی وہ اپنی
شاطر انہ چال کر اس کی ہمدردی سمجھنے میں کامیاب ہو گئی۔

ساؤن نپور سے وہ ایک بڑی اور بُری خبر لے کر آئی تھی۔ اعتبار راؤ کا باپ اور بھائی دونوں ایک ساتھ ہی چل بے تھے۔ یہ ایک پاگل کر دینے والا حادثہ تھا۔ لیکن اعتبار راؤ نے جب دونوں کی موت کے پارے میں سناؤ تو اس کے چھرے سے ذرا سا بھی دکھ ظاہر نہ ہوا۔

دو ظالم اپنے ہی ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ اگرچہ باپ بھائی تھے لیکن ان کی زندگی میں ہی یہ رشتہ دفن ہو گئے تھے۔ وہ کسی کے باپ بھائی نہ تھے۔ پس ان کا باپ اور سرمایہ ان کا بھائی تھا۔ ایسے لوگوں کی موت کیا دکھ کا اظہار کرتا، کیوں خواہ مخواہ آنسو سہانا۔

کامنی اگرچہ تھا وابس جانے کو تیرنہ تھی۔ وہ انتبار راؤ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی لیکن اعتبار راؤ نے اسے جھوٹے دلائے دے کر اسی رات ساون پور کے لئے روانہ کر دیا۔ جن لوگوں کے چہرے وہ حصے جی دیکھنا گوارا منس کرتا تھا، مرنے کے بعد بھال انہیں کیا دیکھتا۔ اور کبھی ویکھتا۔

کامنی کے جانے کے بعد اعتبر راؤ نے ملیفون اخایا اور اپنے بیٹھ پر بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اوہر گھنٹی بجا شروع ہوئی تو اعتبر راؤ نے دیوار گیر گزی پر نظر ڈالی اس وقت رات کے نونچ رے تھے۔

تیری گھٹی کے بعد ادھر سے کسی نے فون اٹھایا اور جب ”ہیلو“ کی آواز آئی تو وہ آواز اعتبار راؤ نے پچھاں لی۔ وہ محسن راؤ کے ملاズم رفتق کی آواز تھی۔
”ہاں، رفتق میں اعتبار راؤ بول رہا ہوں۔“ اعتبار راؤ نے کہا۔ ”سب لوگ کہاں ہیں؟“

”صاحب جی، سب لوگ کھانا کھارے ہیں؟“ رفق نے بڑے مودبانہ لمحے میں کما۔ پھر بولا۔
 ”صاحب جی آپ ہولڈ سکتے۔ میں جا کر بتاتا ہوں۔“
 ”ٹھہرو، رفق۔ میری بات غور سے سنو..... میں فون بند کر رہا ہوں، آدھے گھنٹے کے بعد دوبارہ
 لردوں گا، تم نے ہرگز میرے فون کے بارے میں نہیں بتاتا ہے۔ میری بات سمجھ گئے تا۔“

اور انہیں اسے وچار میں سے رکھ دیا۔ اور کھنی الٹی پر بیٹھا، وہ کالے لباس والا، وہ سرخ موٹی بھی غائب ہو چکا تھا۔ اب درخت پر نہ جھولی تھم، نہ بڑا، تھم، اور نہ خالی پیچہ تھا۔

اعتبار راوی عموماً سینئڈ شو، شروع کرو اکر سینما سے اٹھ جاتا تھا۔ آج صحیح سے ہی اس کی طبیعت کچھ عجیب ہی ہو رہی تھی۔ ایک بے گلی اور بے چینی کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ لذادہ فرست شو شروع ہوتے ہی سینما اٹھ کر اپنا سارا سچ تک مل دانے کا گھم پہنچ گتا تھا۔

یہ ایک بے انتہا سلسلہ تھا۔ ایک ادھیر عمر کا تجربہ کار شخص تھا، یہ پہلے جن لوگوں کے پاس اس نے ایک نیا ملازم رکھ لیا تھا۔ اسکا ایک ادھیر عمر کا تجربہ کار شخص تھا، یہ پہلے جن لوگوں کے پاس تھا، وہ فیصلہ مستقل امریکہ شفت ہو گئی تھی۔ اس ملازم کو اعتبار راوی ان سے مانگ لیا تھا۔ اس طرح اس ملازم کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور وہ لوگ بھی مطمین ہو گئے تھے کہ ان کا ملازم جوان کے گھر کے فرد کی طرح تھا ایک ایسے شخص کے پاس چلا گیا تھا جو اسے گھر کے فروہی کی طرح رکھے گا۔ اس ملازم کا نام مجید تھا لیکن سب اسے مجوہاں کہتے تھے۔
مجوہاں وقت کھانا تیار کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے گیٹ کھولا تو اعتبار راوی خاموشی سے اپنے بیڈر روم میں جلا گا۔ اس کا بستہ تباہا۔ جو کہ بڑگا۔

اعتبار اروکو خاموش دیکھ رکھوں کے پیچے پیچے گیا۔ جب وہ بے سدھ ہو کر بیڈ پر لیٹ گیا تو جو نے دیکھے سے لوچا۔ ”سرجی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

”نمیں جو۔ کچھ مگر بڑے ہے۔ تم ایسا کرو کہ چائے بنالاؤ۔“
”سرجی، اگر آپ کو تھکن محسوس ہو رہی ہے تو جو سند دے دوں۔“ جو نے تجویز پیش کی۔

”شیں بھائی، مجھے چائے چاہئے۔“

”ٹھیک ہے سرجی۔“ یہ کہہ کر باہر جانے لگا تو کھر کی علیل تجی۔
”مجو دیکھو کون ہے، دروازے پر۔“ اسکے بعد سیدھا ہو کر لیٹھتے ہوئے کہا۔
جو تھوڑی دری کے بعد اندر آیا اور بولا۔ ”سرجنی، گاڑی میں ایک نیگم صاحبہ بیٹھی ہیں، وہ کتنی میں
ساوان بور سے آئی ہیں، اور اسنا نام کامنی بتاتی ہیں۔“

”کامنی۔“ اعتبار را و بستر سے کچھ اس طرح اٹھا جیسے اسے کسی پہنچو نے کاٹ لیا ہو، پھر وہ تمیزی سے اٹھ کر باہر پہنچا، جیپ میں واقعی کامنی ہی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی نیچے اتر آئی۔

”کامنی، کامنی؟ خرم تو ہے۔“

”خیر کماں بھا..... ہمارا سب کچھ برپا ہو گیا۔“ یہ کہہ کر وہ انتبار راؤ سے لپٹ گئی اور سک سک کر روئے گئی۔
انتبار راؤ نے بھسل کے اپنے سے الگ کیا اور اسے سارا دے کر اپنے کمرے میں لا یا۔ مجھے پانی
لانے کو کہا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں، کامنی بتاؤ، کیا ہوا؟“
کامنی نے پھر رونا شروع کر دیا۔ وہ دھاڑیں مار کر رورہی تھی اور ساتھ میں سینہ کوبی بھی کرتی جاتی

جب وہ ساون پور پہنچ گئی تھی۔ گاڑی محسن راؤ ڈرائیور کر رہا تھا۔ محسن کے برادر اگلی سیٹ پر انکل عامر بیٹھے تھے اور مچھلی سیٹ پر اعتبار راؤ اور تانیہ تھے۔ تین چار گھنٹے کا یہ سفر تقریباً خاموشی میں کلنا تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ سوچوں میں گم تھا۔

محسن راؤ کو اپنا چھپن یاد آ رہا تھا۔ انکل عامر کی نگاہوں میں اپنا دوست راؤ شمسا در علی گھوم رہا تھا۔ تانیہ کو وہ تمہاریاں وہ محرومیاں یاد آ رہی تھیں جو سے راؤ احمد علی کی وجہ سے میں۔ اعتبار راؤ مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اب آفتاب راؤ اس کے ساتھ کس طرح کارویہ اختیار کر گا۔

جب وہ لوگ حیلی پنچ تو سورج مشرق سے اپنا سر ابھارہا تھا۔ ساون پور کی فضائیں یہ ایک نیا سورج تھا جس کی نرم کرنیں حویلی کے اوپے دروازے کو روشن کر رہی تھیں، ظلم کا اندر ہیرا دور ہو رہا تھا۔ ایک نئی چکیلا رسم کا آغاز تھا۔

حوالی کے دو کالے سورج غروب ہو چکے تھے۔ ایک آفتاب رہ گیا تھا، اس کے بارے میں بھی ایک پیری خبر حوالی میں ان کی منتظر تھی۔

بیوں بیری میں اسیں رکھ دیا۔ حولی کا آخری کالاسور جب بھی چل بسا تھا۔ آفتاب راؤ جب اقبال راؤ کو قتل کرنے کے بعد جیپ میں بیٹھا تو بے شمار اتواس کی توجہ کامرز بن گئے۔ راؤ احمد علی کی لاش کے ٹکڑے غائب ہوئے، اقبال راؤ کی صورت منجھ ہوئی۔ اب آفتاب راؤ کے لئے میدان صاف تھا، وہ اندر سے بہت خوش تھا۔ اب اس کو لیڈر ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

وہ خوش خوبی کی طرف چلا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اچانک اسے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر ایک بے حد خطرناک کالانگ کئنٹی مارے بیٹھا تھا، وہ اچانک ہی کیس سے نمودار ہوا تھا۔ اس ناگ نے آفتاب راؤ کو سنبھلے کاموئی نہ دیا۔ اس نے تیری سے سیٹ پر چڑھ کر اس کی گردان میں دانت گاڑ دیئے۔

پھر چلتی گاڑی خود ہی رک گئی۔ اور کیون نہ رکتی خود آفتاب را ذکری زندگی کی گاڑی جو تباہ ہو چکی تھی۔

○○.....○○.....○○

وقت نے ایک نئی کروٹ لی۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ظلم کے بادل، انصاف کی ہوائیں لے اڑیں۔ گھور اندر ہیراچھت گیا۔ ہر طرف خوشبو بھری ہوائیں چلنے لگیں۔ شگونے پھوٹنے لگے۔ بمار کا موس اگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ ٹند میڈ درخت پھولوں کا لباس پہننے لگے۔ بھنورے تکل آئے۔ وہ ڈال ڈال گھومنے لگے۔ تینیاں اپنے شوخ رگنوں سے دل لبھانے لگیں۔ ہر طرف حسن ہی حسن بکھر گیا۔ اب بھلا کیار کاٹ ہو سکتی تھی۔ سب سے پلا مرحلہ تو خالہ فزانہ اور انکل عامر کی شادی کا تھا۔ تانیہ کو انیس سیکھا دیکھنے کی بڑی خواہش تھی، اس نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے، وہ دونوں کو ایک کر کے رہے گی۔ اور اس کی کوششوں کا ہی تجھے تھا کہ وہ بالآخر ایک ہونے پر راضی ہو گئے تھے۔

”جی صاحب، سمجھ گیا۔“ رفق نے کہا۔
رفق نے کھانے کے دوران تو نہ بتایا لیکن جیسے
مار، صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

تامیز فورافون کی طرف بڑھی۔ اس نے جلدی اعلان کا نمبر ڈائل کیا اور اس کے فون اٹھاتے ہی بہت نرم لمحے میں بولی۔ ”آپ نے فون کیا تھا۔“

”جی، کیا تو تھا۔“ اعتبار راؤ نے سنجیدگی سے کہا۔

”رفق کو منع کیوں کیا تھا۔ آخر اپنی عیرتی کیوں برستے ہیں۔ لیا میں لھانا پھوڑ راپ کا فون بھی نہیں سن سکتی۔“ تانیہ کے لجے میں شکایت تھی۔

”تانیہ ایک بخشنود تمثیل بابا کا قاتل، اس دنیا سے اٹھ گیا۔“ اعتبار راوی نے اس کی بات نظر انداز کر کے اینی خبر نہیں۔ یہ خبر نہ ساتھ ہوئے اس کا لجو ایک دم پاٹ تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“
”او، تمہارے بھائی کے قاتل کی سماں

”اور تمہارے بھائی کے قتل کی سازش میں شریک ہونے والا شخص بھی چل بسا۔“
 ”اعتبار..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ٹھہریں میں بھائی جان کو بیان

محن راؤ کو جب اعتبار راوے نے کھل کر سارا واقعہ بیان کیا تو اس نے فوراً کہا۔ ”اعتبار راوے، میں ابھی تمہارے پافن آرہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ پھر فوراً ہی رسیور اٹھایا اور انکل عامر کے گھر کا نمبر لٹا لایا۔

بڑی اکل عالم کو اس نے سارا واقعہ بیٹایا تو انہوں نے کہا۔ ”محسن، وہ لوگ جیسے بھی تھے، بالآخر اعتبار کے باب پہنچائی تھے، یہیں فروز اس کے پاس تعریث کے لئے چنا جائے گا۔“

”جی انکل۔ میں تانیسے کو لے کر دیں جا رہا ہوں۔ آپ بھی وہاں پہنچ جائیں۔“
جب محسن راؤ تانیسے کے ساتھ اس کی کوششی پر پہنچا تو امیر برادر اسے دیکھتے ہی بے اختیار لپٹ گیا اور
روئے لگا۔ محسن راؤ نے اسے زور سے پہنچ لیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا کندھا تھیکنا رہا۔ بولا کچھ
نمیں۔

کچھ دیر کے بعد اعتبار راؤ اس سے الگ ہوا، اور اپنی آنسو بھری آنکھوں کو پوچھتا ہوا بولا۔ ”یہ مت
بھیجئے گا کہ میں اپنے باپ بھائی کی موت پر آنسو بمار ہوں۔ مجھے تو اس بات پر رونا آہتا ہے کہ میں ایک
شیطان باپ کا بیٹا اور خالِم بھائی کا بھائی ہوں۔ اس لکھ کے لیکے کو میں اپنی پیشانی سے ہٹانا چاہوں بھی تو

”اعتبار مت کر دی، ایسی باتیں میں نے اپنے باپ کے قاتل کو معاف کیا میں نے اپنے قاتل کر، از شکر نہوا لے کو بھیج، معاف کیا کہا، تابہ تم کہا کہتے ہو؟“

”میں بھی وہی کہتی ہوں، جو آپ نے کہا ہے۔“ تانیہ نے تائید کی۔

تائیں چاہتی تھی کہ ان کی شادی و حوم دھام سے ہو لیکن اس بات پر وہ دونوں راضی نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اب خاموشی سے نکاح ہو جائے اور یہ نکاح بھی انکل عامر ان دونوں کی شادی کے بعد کرنا چاہتے تھے۔ اوہر محن راؤ کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی شادی سے پہلے تائیں کو رخصت کرے۔ اور تائیں چاہتی تھی کہ وہ پہلے بھائی گھر میں لائے چکر اس گھر سے جائے۔

بجٹ و مباحثہ ہوتا ہے۔ بالآخر اس ملے کایہ حل نکالا گیا کہ ”پہلے آپ، پہلے آپ“ کی بجائے ہم سب ایک ساتھ، پر عمل کیا جائے۔

ایک بڑے ہوٹل میں اس کاشادی ہال بک کروالیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تمیں سوہنٹ ریزرو کئے گئے تھے۔ یہ تیوں کمرے برابر برابر تھے اور دس دن کے لئے بک کئے گئے تھے۔

اشیج پر تین دو ماہ اور تین دلیش میوندو تھیں، سب سے دلچسپ ہوڑی خالہ فرزانہ اور انکل عامر کی تھی۔ خالہ فرزانہ کو یہ ٹپ پارلر والوں نے بڑے سلیقے سے سنوارا تھا۔ اس عمر میں بھی ان کے چہرے پر دلنوں والا روپ آگیا تھا۔ وہ بہت پیاری الگ رہی تھیں۔

تائیں اور نادرہ تو خیر تھی ہی جیسیں۔ لیکن میک اپ نے نادرہ کی عمر کچھ اور گھٹا دی تھی۔ ان تیوں میں سب سے کم عمر دلنوں تائیں تھی۔ اسے نیز سے کسی میک اپ کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ٹپ پارلر والوں نے پھر بھی اس پر طبع آزمائی کی تھی اور اس کے حسن کو مزید چوکانے کی کوشش کی تھی۔

تیوں دلنوں کے ایک حصے ڈریس تھے۔ یہی حال دلماں کا تھا۔ ان کے سوٹ بھی ایک رنگ کے تھے، جس طرح تائیں دلنوں میں نمبرون تھی، ویسے ہی محن راؤ، دلماں میں نمبرون تھا۔ اس کے بعد اعتبار راؤ، پھر انکل عامر۔

بالآخر شادی کی یہ انوکھی تقریب اختتام کو پہنچی، رخصتی کا وقت آیا۔ سب سے پہلے محن راؤ نے اپنی بہن کو رخصت کیا۔ پھر انکل عامر نے محن راؤ اور نادرہ کو الوداع کہا۔ آخر میں وہ رہ گئے۔ انکل عامر اور خالہ فرزانہ کو آصف صدیقی نے ان کے کمرے تک پہنچایا۔ وہ ایک بے حد حسین رات تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ چھ دلوں کے ملاپ کی رات تھی۔ وہی آجخ دیتی ہوئی سرگوشیاں، سانسوں کی ممک، مسکراہٹ، نیچی نگاہوں کی گل کاریاں، ہکلتی چڑیاں، ہکلتی ہوئی زلفیں، خوشبو بھرے پدن، سنتی پھیلائی ہوئی خواہشیں۔ بکھرتے ہوئے اریان، چنبات کی آسودگیاں۔ کیا نہیں تھا وہاں۔ وہ ایک بست حسین رات تھی۔

○○.....○○.....○○.....○○.....○○.....○○

پر وہ رات را کھی پر قیمت بن کر گزری۔ اسے کسی کردٹ چین نہ تھا۔ بالآخر وہ اپنی جھونپسی سے باہر نکل آئی۔ اس پر وحشت سی طاری تھی۔ یہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اس کا گلا دبارا ہا۔ دل بند ہوا جا رہا تھا۔ اسی وحشت میں اس نے اپنے ریچھ کو کھول لیا۔ قریب ہی بندر سورہ رہا تھا۔ وہ را کھی کو رقبہ پا کر فوراً اٹھ گیا۔ اور ”کوں کوں“ کر کے قلابازیاں کھانے لگا۔ را کھی نے اس کی بھی رسی کھول لی اور ان دونوں سے مخاطب ہو کر بولی۔

”چلورے میرے ساتھ۔“

وہ دونوں بڑی سعادت مندی سے اس کے ساتھ ہو لے۔

کھڑپ کی آواز کر پڑوں کی جھونپسی میں رہنے والی شاداں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اتنی رات کے را کھی کو اپنے جانوروں کے ساتھ نکلتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ فوراً اٹھ کر باہر آئی اور را کھی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”ری کاں جاوے ہے ری را کھی..... اتنی رات ما۔“

”کیس نہیں موی تو سوجا۔“ را کھی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”اری پھر بھی کچھ بتاؤ۔“ موی شاداں فکر مند ہو گئی۔

”کیا تیاؤں موی، مجھے تو خود بھی کچھ معلوم نہیں۔“ را کھی پر جانے کیا بیت رہی تھی۔

”ری تو پکی ہوئی ہے کا۔“ موی شاداں نے اسے ڈانٹا۔

”ہاں، موی، پاگل ہو گئی ہوں۔ میں جاری ہوں موی، مجھے اب مت ڈھونڈتا، میں کسی کے ڈھونڈے سے نہیں ملوں گی۔“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا، یہ کہتے ہوئے اس کا گلارنڈ گیا تھا۔

پھر وہ رکی نہیں۔ اپنے ریچھ اور بندر کے ساتھ چل پڑی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے۔ بس قدم اٹھ رہے تھے اور وہ چلی جا رہی تھی۔

جانے والے کب تک چلتی رہی۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ دل پر وحشت طاری تھی اور وحشی دل اسے لئے جاتا تھا۔ اب وہ اپنی بستی سے بہت دور نکل آئی تھی اور ریل کی پڑی کے ساتھ ساتھ چلی جاتی تھی۔

اس کی نگاہوں میں محن گھوم رہا تھا۔ بیتی ہوئی زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے جا گا رہی تھی۔ اور اس کا ذہن ار گرد سے بیگانہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا، وہ کہاں چل رہی ہے، کیوں چل رہی ہے۔

وہ ٹرین اچانک ہی اس کے سر پر آپنچی تھی۔ وہ پڑیوں کے درمیان چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ریچھ تھا اور ریچھ کی پیٹھ پر بندر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ اسے کچھ ہوش آتا۔ پوری ٹرین اس پر سے گز رہی۔

ان تیوں میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔

○○.....○○.....○○.....○○.....○○.....○○

اس خبر کو سب سے پہلے آصف صدیقی نے دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ را کھی کی صورت سے واقف نہ تھا لیکن س کی تصویر دیکھ کر اور اس کا نام پڑھ کر جانے اسے یہ کیوں احساس ہوا کہ یہ محن راؤ ایسی ہی را کھی ہے۔

ٹرین کے حادثے نے اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا تھا، اس کا چڑھہ بالکل صاف تھا، کوئی چوٹ وغیرہ ہاٹھاں نہ تھا۔ وہ موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں۔ حادثے

کے باوجود چرے پر کسی کرب کے آثار نمایاں نہ تھے البتہ انتظار کی کیفیت ضرور جھلکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دونوں وقاردار جانور بھی چل بے تھے۔
خبر پڑھنے کے بعد آصف صدیقی نے چاہا کہ محسن راؤ کو فون پر اس حادثے کا بتائے لیکن پھر وہ رک گیا۔ خواہ مخواہ انہیں کیوں ڈسٹرپ کرے۔ اس نے اس اخبار کو سنبھال کر رکھ لیا۔
تیرے دن آصف صدیقی نے ان تینوں جوڑوں کی دعوت کی، جب رات کو سب لوگوں نے کھانا غیرہ کھالیا اور گپیں شروع ہو گئیں تو آصف صدیقی سنبھالا ہوا اخبار نکال لایا۔ اور محسن راؤ کے قریب بیٹھ کر اس نے اس حادثے کی تصویر دکھائی۔

”یار، یہ دیکھنا۔“

محسن راؤ نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر جیسے ہی اس تصویر پر نظر ڈالی، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، وہ بولا۔ ”ارے یہ تو راہی ہے۔“

راہکی کا نام سن کر نارہ ایک دم چوکی۔ وہ فوراً اٹھ کر محسن راؤ کے پاس آگئی۔

تانية نے اٹھنے کے بجائے دور سے بیٹھے پوچھا۔ ”کیا ہوارا کھی کو۔“

”وہ ریل کے پیچے آکر کٹ گئی۔“ آصف صدیقی نے زور سے کہا۔

”چلو اچھا ہوا، ورنہ وہ میرے ہاتھوں ماری جاتی۔“ تانية نے بڑے جوش سے کہا۔

اس کی اس بات پر محسن راؤ نے اسے گھوڑ کر دکھالا لیکن بولا کچھ نہیں۔

”یار محسن، وہ شادی والی رات ہی مری ہے۔ وہ کیا چھوپیں تھی۔ ایک طرف ہیرا اپنے جلدہ عروی میں نبی زندگی کا آغاز کر رہا ہے تو دوسرا طرف انہیں رات میں ریل کی پیڑی پر ایک ٹھکرائی ہوئی عورت اپنی زندگی کا اختتام کرنے جا رہی ہے۔ وہ کیا چھوپیں ہے۔ کٹ ادھر، کٹ ادھر۔ ایک طرف روشنی، ایک طرف انہیں۔“ آصف صدیقی اپنی دھن میں گمن فلم کی شونک کے جا رہا تھا۔ پھر وہ یکاکی سخیہ ہو کر بولا۔ ”یار محسن، یہ لتنی عجیب بات ہے کہ اس کی موت کا وقت وہی ہے جو تمہاری شادی کا ہے۔ کیا وہ تمہاری شادی برداشت نہ کر سکی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اسے تمہاری شادی کا کیسے پہنچا۔ پھر اپنے تین توہ تمیں قتل کر چکی ہے۔ یار یہ کیا گور کھ دھندا ہے، میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے باب کا بدلا لینے کے لئے تم پر حملہ ضرور کیا لیکن قاتلانہ نہیں۔“

آصف صدیقی جانے کیا کہتا رہا لیکن محسن راؤ اس کی بات توجہ سے نہیں سن پا رہا تھا۔ وہ اخبار پکڑ بے راہکی کی تصویر کو بغور دیکھ جا رہا تھا۔ اور دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر ایک اوسی کاٹاڑا اہرتا آ رہا تھا۔

پھر اسی طرح کی اوسی سے تانية کو بھی واسطہ پڑا۔

ہوٹل میں خوشیوں کے وس ون گزارنے کے بعد اعتبار راؤ نے سمن آباد، محسن راؤ نے ماؤں ٹاؤن اور انکل عامر نے راوی روڑ کا رخ اختیار کیا۔ تینوں اپنی اپنی دہنوں کو اپنے اپنے شہکانوں پر لے گئے۔ یہ دس ون چیزیں پلک جھکتے میں گز گئے۔ تینوں کے کمرے کیونکہ برابر برابر تھے لہذا خوب ہلا گلارہ۔ انہیں

تمانی بھی میسر تھی اور باہر نکلتے تو اپنے لوگوں کی صورتیں دکھائی دیتیں۔ تینوں نے طے کیا تھا کہ یہ دس ون ہوٹل میں ہی گزاریں جائیں گے کوئی شخص شر سے باہر نہیں جائے گا۔ اور یہ انہوں نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ ایسے یاد گار دن بھلا کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ ہمیں موں پر تو آدمی بھی بھی جا سکتا ہے۔

بارہویں دن محسن راؤ نے اپنے گھر سب کو مدعا کیا۔ تانية گھر پہنچتے ہی سیدھے اپنے بیٹھ روم کی طرف گئی۔ اس کا بیٹھ روم مقتل تھا۔ رفتہ نے تالا کھولा۔ بیٹھ روم میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ اس کے کمرے میں ایک عجیب سی ادائی پیچلی ہوئی تھی جیسے کمرے کی ہر شے اس کی یاد میں اداس ہو۔

بیٹھ پر پس پھیٹک کر وہ سب سے پہلے کرشل کے اس نازک گلدن کی طرف متوجہ ہوئی جس میں راشمن کی دی ہوئی کلی کجی رہتی تھی، جو ایک طویل عرصہ گز جانے کے باوجود بالکل ترواتہ تھی اور ہر وقت ممکنی رہتی تھی۔ لیکن اب جو اس نے اس پر نظر ڈالی تو وہ گلدن پر لکھی ہوئی نظر آئی۔ وہ مر جما چکی تھی۔ اس کی خوبیوں بھی ختم ہو چکی تھی۔ راشمن نے اس کلی کو دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب یہ کلی مر جما جائے تو کچھ لینا، میں اس دنیا میں نہیں رہا۔

اہ..... تانية کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ یہ کیا ہو گیا۔ وہ کیوں مر گیا۔ اس کلی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے اسے سرمجا ہے ہوئے دس بارہ دن ہو چکے ہوں۔ اوه تو کیا، راشمن، تانية کو کسی اور کی بُتی دیکھ کر برداشت نہ کر سکا۔ یہ دو دنیاوں کا مسئلہ تھا، اگر وہ اس کے دل کی دنیا میں نہیں رہ سکتا تھا تو پھر جیسے کافا نہ کیا تھا۔ وہ اپنی دنیا سے ہی اٹھ گیا۔

راشمن مجھے معاف کر دیا۔ تانية نے اس سوکھی کلی کو گلدن سے نکال کر آہستہ سے اپنے نازک لب اس پر رکھ دیئے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دو آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے رخادروں پر بہ کئے۔

اس نے وہ سوکھی کلی اپنے پرس میں ڈال لی۔ تب اپاٹک اس کی نظر گلدن پر پڑی۔ گلدن کے نیچے کانڈ کھوں کر دیکھا تو اس پر کچھ لکھا ہوا نظر آیا، وہ جلدی جلدی ان چند سطروں کو پڑھنے لگی۔ ملتگی والی رات جب اعتبار راؤ اخواع ہوا تو وہ رات تم پر قیامت کی طرح ٹوٹی۔ اس رات تم نے مجھے رو رو کر یاد کیا۔ تم جاتی ہو کہ میں تمیں دکھ میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے تمہاری زندگی کا خانے اپنی آنکھوں سے چن لئے۔ تمہارے دشمنوں کو چن چن کر مار دیا۔ اب تمہاری اور تمہارے بھائی کی زندگی میں کوئی دشمن نہیں۔ میں تمیں خوشیوں بھری زندگی کی نوید دیتا ہوں۔ سدا خوش رہو، یہی دعا کر سکتا ہوں۔

تمہارا اپنا : کالا چراغ

خط پڑھتے پڑھتے وہ لفظ وہندلانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ کورا کاغذ رہ گیا۔ اس نے سادہ کاغذ کو مٹھی میں بھیجن لیا۔ آپ بہت عظیم ہیں کالا چراغ۔ میری زندگی کی تمام خوشیاں

ہو یہ رہتا ہے کہ جیسے ہی حوصلی کا کوئی نیا کرکہ توزا جاتا تو اس کرے میں راؤ احمد علی کی وہ اونچی کرسی موجود ہوتی جس پر یعنی کہ کروہ انان نہیں رہتا تھا اور اس کری سی پر ایک بھی لینک کھوپڑی رکھی ہوتی۔ جب دروازہ کھوبلنے والے مزدور خوف کے مارے بھاگ کر حوصلی میں کام کرتے ہوئے دوسرے مزدوروں کو اکٹھا کرتے تو وہ کرسی اور کھوپڑی غائب ہو جاتی۔

میکیدار نے جب ساری رواد محسن را کو سنائی تو وہ فرمائی ساون پور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ ساون پور کے نزدیک بارش نے آگھرا۔ تیز ہوا اور موسلادھار بارش۔ ساون پور کی سڑک۔ محسن را بڑی سنبھال کر جیپ چلا رہا تھا۔ اس کے بر ابر والی سیٹ پر میکیدار موجود تھا۔ ایک گھنٹے پہلے تک موسم اچھا خاصاً خوبی کر رہا تھا۔ بن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے۔ کامی گھٹاؤں نے سپر کے چکتے سورج کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ دن ہونے کے باوجود ہر سو اندر ہر اچھا گیا اتنا نیز ہر اک محسن را دو کو جیپ کی ہیڈ لائنس آن کرنا پڑیں۔ اور ابھی وہ تھوڑا سایہ آگے بڑھتے تھے کہ انہیں ہیڈ لائنس کی روشنی میں کچی سڑک کے درمیان ایک سفید پوش بزرگ دکھائی دیئے جو اپنے دونوں بازو پھیلائے کھڑے تھے۔

کن راؤے فوراً اپنی گاڑی روک لی، اور ہٹلی کاشیش امار کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ ”کوئی بات نہیں بیٹا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ تم آ جاؤ تو تمہارے ساتھ ساون پور چلو۔“

محسن راؤ ان بزرگ کی بات نہ سمجھ سکا۔ تاہم اس نے گازی کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور بولا۔
”آجھے بیٹھے جائے۔“

وہ بزرگ ہرے اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گئے گاڑی اشارت کرنے سے پہلے محسن راؤ نے گردن گھما کر ان بزرگ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کی حیرت کی انتہاء رہی جب اس نے دیکھا کہ بارش میں کھڑے ہونے کے باوجود ان کے کپڑے باکل سوکھے تھے۔ محسن راؤ نے ان کا چہرہ غور سے دیکھنے کے لئے آمینہ کا زاویہ ٹھیک کیا۔ وہ ایک عمر سیدہ بزرگ تھے۔ سفید لباس سر پر سفید ٹوپی۔ بھنوں تک سفید۔ لیکن چہرے پر سرفی۔ ایک عجیب طرح کافور۔ ان کے بیٹھتے ہی جیپ میں بڑی مسحور کن خوبصورتی پہلی گئی تھی۔

”بیٹا، اب مجھے دیکھتے ہی رہو گے یا گاڑی بھی آگے بڑھاؤ گے۔ تم اس شیطان کے پچے کو نہیں

جانستے۔ آج اس نے خون خراب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ”انہوں نے ایک عجیب بات کی۔
محسن راؤ نے گھبرا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی اور گھبرا کر ہی پوچھا۔ ”آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“

”اس کھوپڑی والے کی جو مرنے کے بعد بھی کرسی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ میری بات سمجھ گئے ہو یا اس خیست کا نام بھی بتاؤ۔“ بزرگ نے آگے جھک کر کہا۔
اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت کماں رہی تھی۔ اب تو وہ جلد سے جلد حوالی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ حولی پہنچتے پہنچتے بارش بند ہو چکی تھی۔ باول پھٹ گئے تھے اور سورج پھر سے نکل آیا تھا۔

آپ کے دم سے ہیں۔ آپ میرے حسن ہیں۔ میں آپ کو سلام کرتی ہوں۔ میرے دل میں آپ کی روشن چراغ کی طرح سدا بیگنگاتے رہیں گے۔

○○.....○○.....○○
اب سب کچھ اعتبار راوے کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اعتبار راوے نے سب کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ اس نے آنفل اور اقبال کے بیوی بچوں کو جوان کا حق بنتا تھا، وہ تو ویاہی۔ اس کے علاوہ بھی اس نے انہیں بہت کچھ بخش دیا۔

محسن راؤ کو مناظر فطرت سے فطری لگاؤ تھا۔ دیسات کی زندگی اسے بہت پسند تھی۔ وہ حولی کو نئے سرے سے بنانے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ آج اس کا یہ خواب پورا ہو گیا تھا۔ اس نے یہ حولی خریدل تھی۔ اس حولی میں جس کا مختصر حصہ بنتا تھا، وہ اس نے ادا کر دیا تھا۔

ظلم کی اس جویلی کو توڑا جا رہا تھا۔ ظلم کو مسماں کیا جا رہا تھا اسکے نئی بنیادیں اٹھا کر انصاف کا بول بالا کیا جائے۔ ساون پور کے لوگوں نے آج تک ظلم ہی سے تھے۔ اب انہیں بتایا جائے ظلم کی طویل رات ختم ہوئی۔ اس انہیں کوئی نہیں ستائے گا۔ اب ہر طرف خوشیاں ہوں گی اور وہ ہوں گے۔

محسن راؤ نے طے کر لیا تھا کہ وہ ساون پور کے لوگوں کا اس قدر خیال رکھے گا کہ لوگ راؤ احمد علی کے ظلم کو بھول جائیں گے۔ یہ راؤ احمد علی بھی بڑا عجیب شخص تھا، روپے پیسے کی ہوس نے، زمین جاندے اور کی طلب نے اسے انداز کر دیا تھا۔ اس کے کان کوئی اچھی بات مشناہنے چاہتے تھے۔ دل سے پیسے کی محبت کے سوا ہر محبت نہیں تھی۔ بھائی کو اگر قتل کر کے جاندے اور حاصل کی جاسکتی ہے تو کر لی جائے۔ بیٹا اگر اپنا حق مانگنے کے لئے کھڑا ہو جائے تو اس گستاخی کی سزا، اسے موت کی صورت میں دی جائے۔ دوسروں کے لئے موت خریدنے والا بالآخر خود موت کے منہ میں چلا گیا تھا اور موت بھی کیسی عبرت ناک۔ لاش بھی ثابت نہ رہی۔ وہ زمین کے مکڑے نہیں ہونے دینا چاہتا تھا لیکن اپنے جسم کو مکڑے ہونے سے نہیں بچا۔ کس قدر بے کسی کی موت تھی اس کی۔ جس زمین کو وہ اپنے سینے سے لگ کر رکھنا چاہتا تھا، اس زمین میں وہ دفن بھی نہ ہو سکا، جس حویلی کے بارے میں اس کا یقین تھا کہ اس کی قلمبندیاں یاریں یہیشے اس کی حفاظت کریں گی، اب واقعی دیواریں توڑی جا رہی تھیں۔

پر وہ بھی راہ احمد علی تھا۔ ایک داؤ بیسھے بچا کر رکھتا تھا اور اس داؤ سے وہ اچانک پانس پلٹ دیا کرتا تھا۔ انسان تو وہ تھا ہی نہیں۔ شیطان کی کھوپڑی تھی اس کے پاس۔

جس ملکیکار کو حوالی توڑنے کا کام دیا گیا تھا، اس کے لئے یہ کام جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ جوں جوں یہ واقعہ تو اتر سے پیش آ رہا تھا توں توں مزدور بھاگتے جاری ہے تھے۔

پلے ٹھیکدار کو بھی اس بات کا یقین نہ تھا لیکن جب اس نے اپنی آنکھ سے سب کچھ دیکھ لیا تو پھر اسے بھی مزدوروں کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ لاہور جا کر محسن راؤ کو ساری صورت حال بتا دے کیونکہ اس مظفر کی دوستی سے ایک کنڈر دل مزدور بخار میں بتتا ہو کر چل بسا تھا۔

ان بزرگ نے محسن راؤ سے راڈ احمد علی کے بیدر روم کی طرف لے جانے کو کہا۔ راڈ احمد علی کا بیدر روم توڑا جا چکا تھا، البتہ اس کی بنیادیں باقی تھیں، محسن راؤ نے ان بزرگ کو بیدر روم کے پاس چھوڑا۔ پھر اس نے جلد از جلد ان بزرگ کے حکم کے مطابق بے شمار سوکھی لکڑیوں سے اس کرے کو بھروادیا۔ وہ بزرگ لکڑیوں کے ڈھیر سے ذرا فاصلے پر ایک بچر پر بیٹھے گئے۔

وہ کچھ پڑھنے لگے۔ پھر انہوں نے پڑھتے پڑھتے محسن راؤ کو اشارہ کیا، ان لکڑیوں پر مشی کا تینی چھڑ کا جا چکا تھا محسن راؤ نے لکڑیوں کے اس ڈھیر کو آگ دکھادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے آسمان سے باشیں کرنے لگے۔ حولی سے شعلے اٹھتے دیکھ کر سماں پور کے لوگ حولی کی طرف بھاگنے لگے۔

پھر محسن راؤ نے ایک عجیب مظہر دیکھا۔ اس نے ایک کرسی پر آگ کے شعلوں پر اترنی دیکھی۔ اس کرسی پر ایک بھیانک کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔ وہ کرسی دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں میں گری۔ تب ایک ولدوز چیخ سنائی دی۔

پھر کچھ باقی نہ پچا۔ نہ وہ کرسی رہی، نہ اقتدار رہا اور نہ وہ اقتدار والا رہا، سب کچھ جل کر بھیم ہو چکیا۔

محسن راؤ فوراً پلت کر ان بزرگ کے نزدیک پہنچا لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ پتھر خالی پڑا تھا جس پر وہ بزرگ بیٹھے تھے۔

بعد میں لاہور پہنچ کر جب محسن راؤ نے پورا واقعہ تائیہ اور اعتبار راؤ کو سنا یا تو تائیہ نے ان بزرگ کا حلیہ پہنچا۔ محسن راؤ نے ان کا حلیہ پوری تفصیل سے بتایا۔

ان بزرگ کا حلیہ سننے کے بعد تائیہ خوشی سے چینی۔ ”ارے، وہ تو وادا عظم تھے۔“

(ختم شد)